ماہنامہ

کرن

جون 2013

اس شمارے کے ساتھ
کرن کتاب

موسم کے رنگ

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 6000 روپے

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

جون 2013

جلد 36 شمارہ 3

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

اداریہ

جون کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

جون 2013ء کو ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک سیاسی و جمہوری حکومت سے دوسری منتخب سیاسی و جمہوری حکومت کو ووٹ ہی کے ذریعے پُرامن انتقالِ اقتدار کا عمل شروع ہو رہا ہے۔

حقیقی طور پر اقتدار کی تبدیلی کا احساس عوام کو اس وقت ہوگا جب نئی حکومت جمہوری انداز میں کام کر کے عوامی فلاح و بہبود کے منصوبے عملی طور پر پورے کرتی نظر آئے گی۔ اس سے پیشتر ہر آنے والی حکومت نے عوامی فلاح و بہبود کے بے شمار منصوبے بنائے لیکن ان پر عمل نہیں ہو سکا، نو منتخب حکومت کو بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔ ان میں سرِفہرست بے روزگاری، مہنگائی، لوڈشیڈنگ اور امن و امان کی صورتِ حال ہے۔ عوام نے حکمرانوں سے بہت سی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ انہیں توقع ہے کہ ان کے مسائل ختم نہیں تو کم ضرور ہو جائیں گے۔ ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نئی منتخب حکومت کو توفیق دے کہ وہ عوامی توقعات پر پورا اُترے اور مسائل کے حل کے لیے اپنی ذمہ داریوں سے ایمانداری سے عہدہ برآ ہو سکے۔ مفاد پرست اور جمہور دشمن عناصر کو اللہ تعالیٰ نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- "سلومیں" اور "متاعِ جاں ہے تو" کے ہیرو "عدیل حسین" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- "میری بھی سُنیے" میں فائزہ حسن کی باتیں،
- "آواز کی دُنیا سے" فرحت علی گوہر سے ملاقات،
- "ماں" کو صدف ریحان گیلانی کا سلام،
- "مقابل ہے آئینہ" میں صائمہ امتیاز ساہی
- "میرے ہمنوا کو خبر کرو" فاخرہ گل، نادیہ امین اور سمیرا حمید کے مکمل ناولز،
- سلسلے وار ناولز "دردِ دل" اور "دستِ کوزہ گر" کی اقساط،
- ریحانہ امجد بخاری اور رفاقت جاوید کے ناولٹ،
- حنا یاسین، عائشہ نصیر، عنبر نوشین اور فوزیہ سلیم کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

مُفت،

معلوماتی کرن کتاب "موسم کے رنگ" پڑھیے اور گرمیوں سے لطف اندوز ہوں۔ کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مُفت پیشِ خدمت ہے۔

حمد باری تعالیٰ

میرے خدا مجھے وہ تاب نوائی دے
میں چپ رہوں بھی تو نغمہ مرا سُنائی دے

گدائے کوئے سخن اور تجھ سے کیا مانگے
یہی کہ مملکتِ شعر کو خدائی دے

نگاہِ دہر میں اہلِ کمال ہم بھی ہوں
جو لکھ رہے ہیں وہ دُنیا اگر دکھائی دے

چھلک نہ جاؤں کہیں میں وجود سے اپنے
ہُنر دیا ہے تو پھر ظرفِ کبریائی دے

مجھے کمالِ سخن سے نوازنے والے
سماعتوں کو بھی اب ذوقِ آشنائی دے

عبیداللہ علیم

نعت رسول مقبول ﷺ

تعلق اُن سے بنالیا تو بہشت رستوں پہ ڈال دے گا
وہی تعلق تمہارے دِل سے تمام کانٹے نکال دے گا

وہ جس نے طائف میں کھا کے پتھر عطاو بخشش کی دی دُعائیں
وہ کملی والا ہمارے سر پہ بھی اپنی رحمت کی شال دے گا

کسی بھی حصے میں زندگی کے کسی بھی شعبے میں بندگی کے
اگر ضرورت پڑی جہاں کو وہ آپ ہی کی مثال دے گا

دُرود پڑھ کر سلام پڑھنا سلام پڑھ کر دُرود پڑھنا
یہ وِرد ایسا ہے تیرے دِل کو تیرے بدن کو اُجال دے گا

یہ آرزو تھی کہ میں بھی آصف ثنائے خیر الانام لکھوں
خُدائے برتر مجھے بھی اِک دن سخنوری کا کمال دے گا

آصف راز

عدیل حسین سے ملاقات

شاہین رشید

"دام" "متاع جاں ہے تو" اور "مورا پیا" یہ ڈراما سیریل ایسے ہیں کہ ان کے نام کے ساتھ ہی ایک ہی چہرہ سامنے آتا ہے اور وہ چہرہ "عدیل حسین" کا ہے جن کا لیڈنگ رول تو تھا ہی لیکن ان کی پرفارمنس بہت عمدہ تھی - لیڈنگ رول ہونا اتنا اہم نہیں ہے جتنا پرفارم کرنا اہم ہے۔ عدیل حسین کو اس فیلڈ میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن انہوں نے بہت جلدی اپنی جگہ بنائی ہے۔ آج کل ان کی سیریل "سلوٹیں" اور "جیانہ جائے" آن ایئر ہیں۔

★ "کیسے ہیں عدیل حسین' آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

✳ "آج کل مصروفیات تو کافی ہیں کچھ کام مکمل بھی ہیں اور کون سا کام پہلے ان ایئر ہو گا کچھ کہہ نہیں سکتا اور جو بھی آن ایئر ہو گا ان شاء اللہ ناظرین پسند کریں گے.... انڈر پروڈکشن کتنے کام ہیں میں یہ نہیں بتاؤں گا کیونکہ اس کو بتانے سے بڑا نقصان ہوتا ہے.... میرا اپنا یہ خیال ہے۔ اس لیے میں کسی کو نہیں بتاتا کہ انڈر پروڈکشن کتنا کام ہے.... جو بھی کام ہو گا وہ سب کے سامنے آجائے گا۔"

★ "آپ کے تین سیریلز "متاع جاں ہے تو' دام اور مورا پیا" بہت پسند کیے گئے.... آپ بتائیں کہ ان تینوں میں سب سے اچھا رسپانس کس میں ملا؟"

✳ "آپ میرے سیریل "میرا نصیب" کو بھول گئی ہیں میرا یہ سیریل بھی بہت اچھا تھا۔ ناظرین نے بہت پسند کیا تھا اور میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے اپنے ہر کام میں بہت زیادہ ایکسائٹمنٹ ہوتی ہے "میرا نصیب" اور "دام" کا رول ایک لحاظ سے بریک تھرو رول تھا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ہر پروجیکٹ میں کوئی نہ کوئی نئی چیز ضرور ہوتی ہے جو آپ انجوائے کرتے ہیں۔ نئی ٹیم ہوتی ہے' نئی کہانی ہوتی ہے تو مزا آتا ہے۔ میں تو پہلے ہی کام کے معاملے میں بہت چوزی ہوں اس لیے وہی کام کرتا ہوں جو مجھے پسند ہوتا ہے۔ مجھے سب کا ہی بہت اچھا رسپانس ملا۔ خواہ وہ "مورا پیا" ہو یا دیگر سیریلز ہوں۔ ایک کو دوسروں پر ترجیح نہیں دیتا جو پروجیکٹ میں کر رہا ہوتا ہوں وہی میرے لیے اہم ہوتا ہے۔"

★ "آپ کے رولز بہت مختلف ہوتے ہیں۔ بہت دیکھ بھال کر رول لیتے ہیں یا اچھی آفر کو اہمیت دیتے ہیں؟"

✳ "مجھے میرا سیریل "میرا نصیب" بہت پسند ہے حالانکہ اس میں میرا رول بہت چھوٹا تھا۔ مجھے جو کہانی دلچسپ لگتی ہے اسی کو منتخب کرتا ہوں۔ کیونکہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس میں کوئی نئی بات ہوگی۔ پھر کردار کے چھوٹے بڑے ہونے سے فرق نہیں پڑتا بس کردار پاور فل ہونا چاہیے اور چیلنجنگ بھی ہونا چاہیے۔ مجھے اپنے آپ کو ریپیٹ کرنے کا شوق نہیں ہے۔"

★ "اداکاری کے علاوہ بھی شوبز کے دیگر شعبوں سے لگاؤ ہے آپ کو؟"

✳ "جی بالکل لگاؤ ہے اداکاری کے علاوہ مجھے ہدایت کاری کا بھی شوق ہے اور میں ڈائریکشن بھی کرتا ہوں۔ مجھے فوٹو گرافی کا بھی بہت شوق ہے اور فوٹو گرافی بھی کرتا ہوں اور بہت کچھ جمع کیا ہے ان شاء اللہ بہت جلد اپنی فوٹو گرافی کے شاہکار کو لاؤنچ کرنے کا ارادہ بھی ہے میرا کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ میرا یہ کام بھی آگے آنا چاہیے۔"

★ "کیا پروڈکشن ہاؤس ہے آپ کا؟"

✳ "نہیں پروڈکشن ہاؤس تو نہیں ہے میں فری لانس پروڈکشن کر رہا ہوں کچھ برانڈز کے لیے کام کیا ہے کچھ دستاویزی فلموں کے لیے کام کیا ہے "ایوا" کے لیے میں نے ایک پروموشنل فلم کی ڈائریکشن کی تھی تو اس طرح کے چھوٹے موٹے کام کافی کیے ہیں اور مزید کرنے کا بھی ارادہ ہے۔ مگر پروڈکشن ہاؤس بنانے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

★ "چلیں پہلے کچھ اپنے بارے میں بتائیں پھر آگے چلتے ہیں؟"

✳ "بالکل ٹھیک.... میرا نام سید عدیل حسین ہے لوگوں نے نام بگاڑنے کی کوشش کی مگر بگڑا نہیں۔ کسی

نے عدو کہا کسی نے عدیلو کہا اور پھر خود ہی بے زار ہو کر کہا کہ یار مزا نہیں آیا عدیل ہی ٹھیک ہے اور مجھے خود بھی اچھا نہیں لگتا کہ کوئی میرا نام بگاڑے۔۔۔ خیر میں 30 جون 1978ء کو کراچی میں پیدا ہوا اللہ تعالیٰ نے اچھے قد کاٹھ سے نوازا ہے 5 فٹ 1/2 '9 انچ میرا قد ہے اور کینسر اسٹار ہے۔ ہم دو ہی بھائی ہیں میں اور میرا چھوٹا بھائی۔"

★ "تعلیم کے بارے میں بتائیں۔۔۔ اور شادی کے بارے میں بھی؟"

✳ "ایم آئی ایس میں بیچلر ہوں اور ایم بی اے ہوں مارکیٹنگ میں اور آئرلینڈ سے اپنی تعلیم مکمل کی ہے میں سمجھتا ہوں کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے۔ میرا یہ نظریہ ہے کہ پڑھائی لکھائی کبھی ضائع نہیں جاتی ایک زمانہ تھا جب آپ کو کوئی گائیڈ نہیں کرتا تھا کہ تعلیم کے لیے کون سا راستہ مناسب ہے اچھا ہے۔ بندہ جو کچھ کرتا تھا اپنے رسک کرتا تھا مگر آج کل انٹرنیٹ انفارمیشن کے ذریعے سے لوگوں کو تعلیم میں اپنی لائن منتخب کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ آج کل کے دور میں تو تعلیم بہت ضروری ہو گئی ہے اور آرٹسٹوں کو تو ضرور ہی پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔ کیونکہ اکثر لوگ آرٹسٹوں کے لیے یہ سوچتے ہیں کہ یہ تو آرٹسٹ ہیں ان کی عقل میں دوسری باتیں کیا آتی ہوں گی۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میرے لیے کوئی ایسا نہیں سوچ سکے گا اور شادی نہیں ہوئی اور میں اپنی پرسنل لائف کو زیادہ ڈسکس کرنا بھی مناسب نہیں سمجھوں گا۔"

★ "جیسے آپ کی خوشی۔۔۔ شوبز میں کیسے آئے؟"

✳ "شوبز میں آمد ایسے ہوئی کہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ پینٹنگ بھی کرتا رہتا تھا اور ڈرائنگ پینٹنگ کرنے کا شوق تو بچپن سے ہی تھا اور جب میں پڑھنے کے لیے ملک سے باہر گیا تو مجھے ایسا لگا کہ جو میں کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ کر ہی نہیں پا رہا میڈیا میں آنے کا شوق تھا اور ملک سے باہر رہ کر ہی مجھے پتا چلا کہ پاکستان میں میڈیا آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ بس ایک دم سے ذہن میں خیال آیا کہ مجھے اداکاری کرنی ہے اور ڈائریکشن بھی دینی ہے۔ بس یہ دونوں شوق مجھ پر حاوی ہو گئے اور جب پاکستان آیا تو اداکاری ڈائریکشن اور فوٹو گرافی میں چھلانگ مار دی۔ ایڈورٹائزنگ میں اور میڈیا کے کچھ لوگوں کو جانتا تھا انہی کے ذریعے اس فیلڈ میں آیا۔۔۔ ساتھ ساتھ ریڈیو ایم ایف بھی جوائن کیا۔ ٹی وی اور ڈائریکشن بھی اور اب ڈھائی تین سال ہو گئے ہیں مجھے اس فیلڈ میں۔"

★ "پہلا پروگرام کیا تھا اور کس پروگرام نے آپ کو "ان" کیا؟"

✳ "پہلے پروگرام کے بارے میں تو خیر میں نہیں بتاؤں گا۔ کچھ وجوہات کی بنا پر البتہ شہرت تو سیریل "دام" نے ہی دی۔۔۔ دام سے پہلے بھی کچھ کام کیا جس میں "دل کی مدھم بولیاں" ٹیلی فلم "دنیا گول ہے" وغیرہ تھیں مگر میری پہچان نہ بن سکیں حالانکہ میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی کہ کوئی یونیک کام کروں۔ بہرحال دام اور پھر اس کے بعد جتنے بھی پروجیکٹ کیے سب ہی شہرت کا باعث بنے۔"

★ "ڈگری کسی فیلڈ کی اور کمائی کسی اور فیلڈ کی گھر والوں کا کیا ردعمل تھا؟"

✳ "کسی نے کوئی مخالفت نہیں کی کیونکہ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں گھر کا بڑا ہوں اور میں ہی گھر کو سپورٹ کرتا ہوں۔ باقی جو دیگر لوگ ہوتے ہیں انہیں تھوڑا اعتراض تھا کہ یہ کیا کر رہے ہو۔ اس کا کوئی اسکوپ نہیں ہے تو میں نے دوسروں کی باتوں کی پروا نہیں کی کیونکہ مجھے اپنے گھر والوں کا تعاون حاصل تھا اور اپنے دوستوں کا بھی۔"

★ "پریکٹیکل لائف میں آئے تو پہلے کیا کیا آپ نے؟"

✳ "پریکٹیکل لائف میں آیا تو فارن کرنسی ٹریڈنگ کی جس سے مجھے 10 ہزار روپے ماہانہ ملتا تھا۔ یہاں دو مہینے کام کیا اور پھر چھوڑ دیا۔۔۔ کیونکہ مزا نہیں آیا کام میں۔"

★ "پریکٹیکل لائف میں آ کر کیا سیکھا؟"

✳ "بہت کچھ سیکھا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ زندگی آپ کو کہاں کہاں لے کر جاتی ہے کام آپ کو کہاں کہاں لے کر جاتا ہے۔ کام کے سلسلے میں دوسرے ملکوں میں بھی جانا پڑتا ہے۔۔۔ اور سچ پوچھیں تو جہاں جہاں گیا تجربات بھی حاصل ہوئے اور سیکھا بھی بہت کچھ، یورپ مجھے بہت پسند آیا۔۔۔ امریکہ پڑھائی کے لیے گیا تو کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ دوسرے ملک میں بھی ایک گھر ہو تاکہ جب جائیں تو رہنے کے مسائل نہ ہوں۔"

★ "مستقبل میں کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

✳ "بہت زیادہ پلان کرتا ہوں مگر آگے کا حال مجھے نہیں معلوم۔۔۔ مجھے فلم بنانے کا بہت شوق ہے اور ایک فلم اگر میری کامیاب ہو گئی تو مزید کے لیے راستے کھل جائیں گے۔۔۔ مجھے لکھنے کا بھی شوق ہے اور میں لکھتا بھی ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ جو جو کام مجھے آتے ہیں انہیں ضرور پریکٹیکل لائف میں کروں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ہر وقت کام کرتا رہوں، میں کبھی کام سے بور نہیں ہوتا۔"

★ "گویا زندگی اپنی مرضی سے گزار رہے ہیں؟"

✳ "جی بالکل اپنی مرضی سے گزار رہا ہوں اور بہت خوش ہوں اپنی لائف میں بس اس بے پناہ مصروفیات میں دوسروں کے لیے خاص طور پر اپنوں کے لیے وقت نکالنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ جو ہمارے قریب ہوتے ہیں انہی کو ہم بھول جاتے ہیں۔ انہی کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں ہوتا۔۔۔ اچھے لوگ جو ہمارے لیے ہمیشہ اچھا سوچتے ہیں اور اچھا چاہتے ہیں ہمیں ان کے لیے وقت بھی نکالنا چاہیے اور ان کی قدر بھی کرنی چاہیے۔"

★ "اور دل بھی نہیں توڑنا چاہیے؟"

✳ "ہاں دل تو بالکل بھی نہیں توڑنا چاہیے اور توڑ کے جوڑنا تو ویسے ہی بہت مشکل ہے اور ویسے بھی دل اس وقت ٹوٹتا ہے جب آپ کسی پہ بہت زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور وہ آپ کے بھروسے کو توڑ دے تو پھر بہت ہی دل دکھتا بھی ہے اور ٹوٹتا بھی ہے دل توڑنے کی چیز نہیں ہے۔"

★ "آپ کو لوگ پہچان لیتے ہیں لگتا ہے کہ آپ اب دوسروں سے مختلف ہو گئے ہیں؟"

✳ "بالکل نہیں لگتا کہ میں دوسروں سے مختلف ہوں۔ سب لوگ جس طرح کام کرتے ہیں میں بھی اسی طرح کام کرتا ہوں یہ اور بات ہے کہ میرا کام دوسروں سے ذرا مختلف ہے جہاں تک پہچان کی بات ہے تو لوگ پہچان لیتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔"

★ "کس قسم کے کردار کرنے کی خواہش ہے؟"

✳ "کوئی ایک کردار نہیں ہے کہ جس کا میں ذکر کروں، بہت سے کردار ہیں جو میں کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ڈراموں میں بہت مارجن ہے کرداروں کے لیے "مورا پیا" میں مجھے اپنا کردار بہت اچھا لگا۔ ایک نوکری پیشہ انسان کا کردار تھا تو اس قسم کے کردار یا جن میں بہت کچھ کرنے کی گنجائش ہو کرنا چاہتا ہوں۔"

★ "شوبز کی فیلڈ اچھی ہے یا بری؟"

✳ "اچھی بھی ہے اور بری بھی، برائی یہ ہے کہ اچھے

لوگ سامنے نہیں آرہے اور کچھ ایسے لوگ بھی اس فیلڈ میں ہیں جنہیں کام نہیں آتا مگر وہ اس فیلڈ میں ہیں۔ اچھائی یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو کام مل رہا ہے۔"

★ "آپ کا ذریعہ روزگار بھی تو یہی ہے نا؟"

* "صرف اداکاری میرا ذریعہ معاش نہیں ہے بلکہ فوٹو گرافی اور ڈائریکشن بھی میرا ذریعہ روزگار ہے اور میں تینوں کام کرکے بہت سکون محسوس کرتا ہوں۔"

★ "پیسہ ہے اس فیلڈ میں؟..... کہاں خرچ کرتے ہیں زیادہ تر؟"

* "پیسہ ہے..... مگر بہت زیادہ نہیں ہے اور جہاں تک خرچ کی بات ہے تو اپنے کام سے متعلق جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے انہی پہ زیادہ خرچ کرتا ہوں۔"

★ "اس فیلڈ میں خواتین سے زیادہ پالا پڑتا ہوگا کوئی بات جو آپ کو بری لگتی ہو؟"

* "خواتین ہی کیا بلکہ ہر اس شخص کی بات بری لگتی ہے جو اپنے آپ کو کمزور ظاہر کرتے ہیں کہ ہم میں یہ صلاحیت نہیں ہے..... ہم ایسے ہیں وغیرہ وغیرہ میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص میں صلاحیتیں ہوتی ہیں اور وہ اس کو اگر استعمال کرنا چاہے تو بہت اچھی طرح کر سکتا ہے۔"

★ "اس فیلڈ کے کن لوگوں سے بہت متاثر ہیں؟"

* "بہت سے لوگ ہیں اور میں تو ابھی اس فیلڈ میں آیا ہوں۔ بہت سے اچھے اچھے لوگ تھے جو اب اس دنیا میں نہیں رہے وہ بہت یاد آتے ہیں۔ اگر وہ حیات ہوتے تو میری بھی ان سے ملاقات ہو جاتی..... خاص طور پر نصرت فتح علی تو مجھے بہت ہی پسند ہیں۔"

★ "آپ ملک سے باہر گئے تعلیم حاصل کی، پھر یہاں کیوں آگئے؟"

* "میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں گھر میں بڑا ہوں۔ گھر والوں کے ساتھ رہ کر ان کو سپورٹ کرنا چاہتا تھا اور پھر اپنے ملک میں بھی بہت سے مواقع مل جاتے ہیں آگے بڑھنے کے اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے بھی آگے بڑھنے کے مواقع مل رہے ہیں۔"

★ "اس انٹرویو کے ذریعے سے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

* "بالکل جی..... یہ کہنا چاہوں گا کہ اچھا کام کرتے رہیں اور معیاری کام کریں۔ اپنے معیار اور اپنی شخصیت کو گرنے نہ دیجیے گا۔ اپنے کام کے ذریعے سے اپنے آپ کو منوائیں۔"

★ "آپ کے انداز گفتگو سے پتا چل رہا ہے کہ آپ دھیمے مزاج کی شخصیت ہیں..... غصہ نہیں آتا کیا؟"

* "ایسی بات نہیں کہ غصہ نہیں آتا، جہاں کسی کی بات بری لگتی ہے غصہ آجاتا ہے اور دکھاتا بھی ہوں اور سامنے والے کی عمر کا خیال بھی کرتا ہوں۔ ویسے میرا غصہ تیز نہیں ہے۔"

★ "اپنی کوئی خاص بات بتائیں؟"

* "یہ تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں کہ مجھ میں کیا خاص بات ہے۔ البتہ میں اپنے بارے میں جو بات محسوس کرتا ہوں وہ یہ کہ میں جن لوگوں پر بھروسہ کرتا ہوں پھر ان کے اتنا قریب ہو جاتا ہوں کہ اپنے تمام مسائل ان سے شیئر کرتا ہوں اور یہ بات بھی مجھ میں خاص ہے کہ میں بہت جلد لوگوں کے قریب نہیں ہوتا پہلے ان کو پرکھتا ہوں۔"

★ "کھانے پینے کے معاملے میں کریزی ہیں؟"

* "بہت کریزی نہیں ہوں لیکن جب بھوک لگی ہو تو کوشش کرتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ کھالوں۔ شور نہیں مچاتا بس میری خواہش ہوتی ہے کہ کھانا اچھا پکا ہوا ہونا چاہیے..... خواہ کوئی بھی پکائے۔"

★ "ناشتا کرتے ہیں؟ اور گھر آکر کیا دل چاہتا ہے؟"

* "ناشتا ضرور کرتا ہوں اور ناشتے میں عام طور پر آملیٹ اور لسی کا گلاس ضرور لیتا ہوں اور جب گرمیوں میں تھکا ہارا گھر آتا ہوں تو ایک ہی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اتنا پیسہ دے کہ میں سارا دن ایئر کنڈیشن چلا سکوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عدیل حسین سے اجازت چاہی۔

☆ ☆

فائزہ حسن

شاہین رشید

1 "پورا نام؟"

☆ "فائزہ حسن۔"

2 "میرا نک نیم؟"

☆ "کوئی نہیں ہے، سب پیار سے اور غصے سے فائزہ ہی کہتے ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش؟"

☆ "5 جنوری 1982ء۔"

4 "تعلیم؟"

☆ "انگریزی ادب اور اردو ادب میں ماسٹرز کیا ہے۔"

5 "بہن بھائی؟"

☆ "میری بڑی بہن ہے۔ پھر میں اور پھر چھوٹا بھائی ہے۔"

6 "شادی/بچے؟"

☆ "اس جون میں چھ سال ہو جائیں گے اور بچے دو ہی اچھے 'ایک بیٹی ہے اور ایک بیٹا ہے۔"

7 "مجھے کنٹرول نہیں ہیں؟"

☆ قہقہہ "میرا خیال ہے مجھے کنٹرول ہے کافی حد تک۔"

8 "اگر مجھے دنیا میں کچھ چینج لانے کو کہا جائے تو کیا چینج لاؤں گی؟"

☆ "ملک کے حوالے سے چینج لاؤں گی اور جہالت کو ختم کروں گی۔ تعلیم سے بھی زیادہ جہالت ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم سے جہالت ختم نہیں ہوتی بلکہ اچھی تربیت سے ختم ہوتی ہے۔ ذہنی سوچ کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔"

9 "مجھے شاپنگ کے لیے ایک لاکھ دیں تو کیا خریدوں گی؟"
☆ "سونے اور چاندی کی چیزیں لینے کی کوشش کروں گی اور اگر یہ چیزیں ایک لاکھ میں نہیں آئیں تو پھر کپڑے جوتے لے لوں گی۔"
10 "خواتین کو بائیک چلانے کی اجازت مل جائے تو؟"
☆ "یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے اور کوئی منع بھی نہیں ہے۔ بس مسئلہ تو آدمیوں کا ہے کہ وہ اپنی سوچ کو پابند نہ کرلیں۔ ورنہ ہمارے ملک میں تو اس بات کی کوئی پابندی نہیں ہے کہ خواتین بائیک نہ چلائیں۔"
11 "میں اپنے اندر تبدیلی چاہتی ہوں؟"
☆ "میری آواز کچھ بہتر ہو جائے ..... مجھے لگتا ہے میری آواز اچھی نہیں ہے۔"
12 "جسمانی ساخت میں کیا تبدیلی چاہتی ہوں؟"
☆ "اب میں اس عمر میں آ گئی ہوں کہ دبلی ہو گئی تو ٹھیک ہے نہیں ہوئی تو کوئی ایشو نہیں ہے۔ میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتی۔"
13 "میں چاہتی ہوں کہ لوگ مجھے دیکھ کر کہیں کہ؟"
☆ " بہت اچھی فنکارہ ہے اور بہت اچھی انسان بھی ہے۔"
14 "اگر کسی ڈرامے میں گنجی ہونا پڑے یا کوئی بھیس بدلنا پڑے تو؟"
☆ "پاکستان کے کسی ڈرامے کے لیے ایسی آفر آئی تو بالکل بھی نہیں قبول کروں گی۔ ہاں اگر باہر کی فلموں میں ایسی کوئی آفر آئی تو ضرور قبول کروں گی۔"
15 "اگر تم مل جاؤ زمانہ چھوڑ دیں گے ہم۔ یہ مصرعہ میں اکثر کہتی تھی؟"
☆ "اپنے میاں کے لیے جب شادی نہیں ہوئی تھی۔"
16 "اچھی یا بری خبر سب سے پہلے کس کو سناتی ہوں؟"
☆ "زیادہ تر اپنے میاں کو ہی سناتی ہوں۔"

17 "اگر میں خودکش حملہ آور ہوتی تو اپنے آپ کو کہاں بلاسٹ کرتی؟"
☆ "میرے جیسی انسان ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔ میں اتنی بہادر نہیں ہو سکتی۔"
18 "اگر مجھ سے سیل فون کی سہولت لے لی جائے تو؟"
☆ "تو کوئی بات نہیں، دنیا پھر بھی قائم رہے گی۔ دنیا پھر بھی چلتی رہے گی کوئی فرق نہیں پڑے گا پہلے بھی تو ایسا ہی تھا۔ میرے خیال سے پی ٹی سی ایل کی ویلیو بڑھ جائے گی۔"
19 "میں امریکہ کی صدر ہوتی تو پاکستان کے لیے کیا کرتی؟"
☆ "کچھ بھی نہیں کرتی، پاکستان والے اپنے لیے خود کچھ کریں۔ میں تو اپنے ملک کو سنبھال رہی ہوتی۔"
20 "تعلیمی دور میں دوبارہ جانا پڑے تو کون سے دور میں جاؤں گی؟"
☆ "میرا خیال ہے کہ یونیورسٹی کے دور میں۔"
21 "زندگی کا ایک دن باقی ہو تو خدا سے کیا مانگوں گی؟"
☆ "اگر ابھی ایسی سچویشن ہوئی تو مزید زندگی مانگوں گی اور چاہوں گی کہ زندہ رہوں۔ ہاں بڑھاپے میں ایسا ہوا تو پھر شاید کچھ اور مانگ لوں گی۔"
22 "اگر مجھے بلینک چیک مل جائے تو کم سے کم کتنی رقم لکھوں گی؟"
☆ "بڑا مشکل ہے کہ ملے اور اگر مل گیا تو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ جائز ہے کہ نہیں پھر یہ کہ مجھے کوئی آخر بلینک چیک کیوں دے گا اور پھر بھی مل گیا تو کم سے کم 30 کروڑ تو ضرور ہی لکھوں گی۔"
23 "اگر ہوائی جہاز کا اوپن ٹکٹ مل جائے تو کہاں اور کس ملک میں جانا پسند کروں گی؟"
☆ "ساؤتھ افریقہ۔"
24 "اگر سیاست میں آنا پڑ گیا تو کس کو فالو کروں گی؟"
☆ "پاکستان میں تو ایسا کوئی نہیں ہے۔ دوسروں کو سرچ کرنا پڑے گا۔"
25 "پاکستانی سیاست میں کس لیڈر سے امیدیں ہیں؟"
☆ "عمران خان سے امیدیں ہیں، پر کچھ کہہ نہیں سکتے اچھا اس لیے لگ رہا ہے کہ اسے ہم نے ابھی تک آزمایا نہیں ہے۔ جب پریکٹیکلی گورنمنٹ میں آ گئے تو پتا چلے گا کہ کتنے پانی میں ہیں۔"
26 "اگر جادو کی چھڑی ہاتھ آ جائے تو پہلا کام کیا کروں گی؟"
☆ "میرا خیال ہے کہ ایک اچھا سا گھر سمندر کے

کنارے لینا چاہوں گی۔"

27 "اگر کسی محفل میں میرے اوپر کوئی مشروب یا کوئی چیز گر جائے تو میرا رد عمل؟"

☆ "باتھ روم میں جاکر ٹھیک کرلوں گی یا پھر میاں سے کہوں گی کہ چلیں واپس گھر چلیں۔"

28 "کوئی گہری نیند سے اٹھادے تو؟"

☆ "اٹھ جاتی ہوں' کیونکہ اب نیند مجھے اتنی عزیز نہیں رہی ہے۔ کیونکہ بچوں کی وجہ سے اکثر برباد ہوتی رہتی ہے۔ پہلے غصہ آجاتا تھا مگر اب نہیں۔"

29 "اگر کسی اینکر یا مارننگ شو پہ پابندی لگانے کی اجازت مل جائے تو؟"

☆ "میں تو مارننگ شو میں جانا پسند ہی نہیں کرتی۔ اس لیے زیادہ تر مارننگ شو پہ پابندی لگادوں گی اور جہاں تک اینکر کی بات ہے تو مجھے سونیا حسن اچھی لگتی تھیں ان کا پروگرام بہت اچھا ہوتا تھا۔ اب مارننگ شو میں کوئی میسج نہیں ہوتا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ایک خاتون جنہوں نے بہت ہی عجیب حرکتیں کی تھیں انہیں ایک چینل نے دوبارہ لے لیا اپنے پروگرام کے لیے۔"

30 "کس لمحے نے میری زندگی بدلی؟"

☆ "میری والدہ کا جب انتقال ہوا۔"

31 "رقم کو کس انداز میں محفوظ کرتی ہوں؟"

☆ "میں زیور لے لیتی ہوں۔"

32 "میں خوفزدہ رہتی ہوں؟"

☆ "اچانک کچھ ہو نہ جائے..... یہ سوچ کر۔"

33 "کس چینل کے ڈرامے شوق سے دیکھتی ہوں؟"

☆ "کوئی ایک چینل نہیں ہے۔ بس کوئی بھی ڈراما اچھا لگ جائے تو دیکھ لیتی ہوں۔"

34 "اکثر سوچتی ہوں کہ؟"

☆ "مجھے اب ڈراموں میں اداکاری کے علاوہ بھی کچھ کرنا چاہیے۔"

35 "بات دل میں رکھتی ہوں یا اگل دیتی ہوں؟"

☆ "زیادہ تر دل میں رکھتی ہوں۔"

36 "کس ڈیزائنر کے کپڑے پہننا پسند کرتی ہوں؟"

☆ "کوئی خاص نہیں۔ جس کا جو اچھا لگ جائے "ثنا سفینا" کے اچھے ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ ہی اچھا لگیں۔"

37 "کس فنکار کے ساتھ رومینٹک سین کرنا اچھا لگتا ہے؟"

☆ قہقہہ۔ "سب اچھے ہیں' میرے لیے تو سب برابر ہوتے ہیں' اب دوسروں کو شاید اچھا لگتا ہو یا نہ لگتا ہو۔"

38 "ایک ڈراما جس میں سچ مچ مار کھائی/یا مارا؟"

☆ "میں نے آج تک مار نہیں کھائی اور ذاتی طور پر مجھے پسند نہیں ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھائے خواہ وہ ڈراما ہی کیوں نہ ہو۔ اب ایکسپریشن دینا میرا کام ہے۔ البتہ میں نے کافی لوگوں کو مارا ہے مگر ان کی مرضی سے۔"

39 "میں اکثر سوچتی تھی کہ بڑی ہو کر یہ بنوں گی؟"

☆ "چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ بننا چاہتی تھی۔ جو اب ہوں اس کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں تھا۔"

40 "غصے میں کیا کرنے کا دل چاہتا ہے؟"

☆ "گالیاں دینے کا دل چاہتا ہے۔"

41 "ایک محبت جو بھول نہیں سکتی؟"

☆ "اپنے میاں کی محبت میں ہی گرفتار ہو گئی تھی اور اگر ان سے شادی نہ ہوتی تو پھر شاید کسی سے بھی شادی نہ کرتی۔"

42 "کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہوں؟"

☆ "فلم دیکھنے کے لیے سینما ہاؤس۔"

43 "کس کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی؟"

☆ "میں اتنا تھک جاتی ہوں کہ مجھے کوئی نہ بھی نظر آئے تو سو جاتی ہوں۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ بچوں کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی۔"

44 "آئینہ دیکھ کر سوچتی ہوں کہ؟"

☆ "سب کچھ ٹھیک ہے۔ کچھ برا نہیں ہے۔"

45 "کس شخصیت کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں؟"

☆ "میری والدہ.... اب وہ نہیں ہیں تو کسی کو بھی نہیں۔"

46 "شدید بھوک کو کم کرنے کے لیے کیا کرتی ہوں؟"

☆ "چائے یا پانی پی لینا چاہیے اور میں بھی ایسا ہی کرتی ہوں۔"

47 "مجھے اپنے والدین سے شکایت ہے کہ؟"

☆ "نہیں کوئی نہیں۔ میرے والدین میں علیحدگی ہو گئی تھی اس کے باوجود میری والدہ نے میری بہت اچھی تربیت کی' انہوں نے مجھے اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونا سکھادیا اور ہر لحاظ سے بڑا مضبوط کردیا۔"

48 "کچن سے میری دوستی؟..... کیا اچھی چیز پکالیتی ہوں؟"

☆ "خاصی دوستی ہے اور اچھا پکالیتی ہوں دیسی کھانے زیادہ اچھے پکاتی ہوں۔"

49 "تقدیر پر یقین ہے یا محنت پر؟"

☆ "محنت پر۔"

50 "کبھی راہ چلتے کوئی ڈرامائی سین ہوا؟"

☆ قہقہہ۔ "ہو ہی جاتے ہیں۔"

51 "کسی کی تعریف میں صرف دو ہی جملے کہتی ہوں کہ؟"

☆ "آپ بڑے اچھے لگ رہے ہیں۔"

52 "ایک کھیل جو کبھی نہیں چھوڑتی؟"

☆ "کھیلوں سے مجھے بالکل بھی دلچسپی نہیں ہے۔"

53 "پسندیدہ ملک/شہر؟"

☆ "تھائی لینڈ اور یوکے۔"

54 "پسندیدہ ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتی ہوں؟"

☆ "تھائی ریسٹورنٹ اور کیفے فلو۔"

55 "ایک صحافی جس سے شکایت ہے؟"

☆ "نہیں اتنا واسطہ ہی نہیں پڑا۔"

56 "شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کیا ضروری ہے؟"

☆ "خوب صورت ہونا زیادہ ضروری ہے بہ نسبت باصلاحیت ہونے کے۔"

57 "ایک جھوٹ جو میں اکثر بولتی ہوں؟"

☆ (ہنستے ہوئے) "میں بہت مصروف ہوں۔"

58 "اپنے ڈرامے جنہیں بھول نہیں سکتی؟"

☆ "یوں تو کافی ہیں لیکن اپنا پہلا سیریل "ساحل کی تمنا" وجود لاریب" "برنس روڈ کی نیلوفر" جس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ اتنا مقبول ہو گا۔"

59 "ایک نصیحت جو لڑکوں کو کرنا چاہتی ہوں؟"

☆ "تنگ نظر نہیں ہونا چاہیے۔ اس سوچ کو بدلیں کہ عورت کو گھر پر رہنا چاہیے یا عورت تو پاؤں کی جوتی ہوتی ہے آپ بیوی کو خوش رکھیں گے تو آپ کا پورا گھر خوش رہے گا۔"

60 "گھر آکر کیا دل چاہتا ہے؟"

☆ "کہ بس آرام کروں اور ایسا ہو نہیں پاتا۔"

61 "کن چیزوں کی شوقین ہوں؟"

☆ "میک اپ اور کپڑوں کی۔"

62 "صبح کا آغاز کس طرح کرتی ہیں؟"

☆ "الارم لگا کر سوتی ہوں تب بھی صبح افراتفری میں ہی ہوتی ہے۔"

63 "میگزین پڑھنے والوں کے لیے پیغام؟"

☆ "مطالعہ کی عادت کو اپنائے رکھیں اس سے نا صرف بندہ انجوائے کررہا ہوتا ہے بلکہ بہت کچھ سیکھ بھی رہا ہوتا ہے۔ ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے اور مطالعہ سے کبھی بھی وقت ضائع نہیں ہوتا۔"

☆ ☆

فرحت علی گوہر

شاہین رشید

آواز اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور خوب صورت آواز تو کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔ اللہ نے عورت کو صنف نازک بنایا ہے اور آواز کے معاملے میں بھی اس کے گلے میں شیرینی بھر دی ہے۔ ایف ایم کی دنیا میں خواتین کے پروگرام زیادہ سنے جاتے ہیں اور اس کی دو وجوہات ہیں ایک خوب صورت آواز اور دوسرا "انداز تکلم" فرحت گوہر اس دنیا کی ایسی ہی خوب صورت آواز ہیں جو خوب صورت لفظوں کا استعمال کر کے سامعین کو مسحور کر دیتی ہیں پھر یہ ڈاکٹر بھی ہیں لہٰذا ان کے پروگرام میں سامعین کے لیے دلچسپی اور معلومات کا عنصر زیادہ ہوتا ہے جو ہر لحاظ سے فائدہ مند ہوتے ہیں۔

★ "کیسی ہیں فرحت اور آج کل کیا مصروفیات ہیں۔"

✳ "اللہ کا شکر ہے اور مصروفیات تو ماشاء اللہ بہت ہیں۔ ریڈیو کے ساتھ ساتھ میرا اپنا پروفیشن بھی ہے۔"

★ "آپ ڈاکٹر ہیں کون سی۔ ایم بی بی ایس یا پی ایچ ڈی؟"

✳ "الحمد للہ میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں اور اپنی اس فیلڈ میں بہت مصروف رہتی ہوں۔"

★ "گویا آپ بیک وقت دو پروفیشنز کو لے کر چل رہی ہیں؟"

✳ "جی بالکل اب تو الیکٹرونک میڈیا بھی پروفیشن بن گیا ہے اور میڈیسن تو ہے ہی پروفیشن۔"

★ "اچھا یہ بتائیں کہ میڈیسن میں کہاں تک جانے کا ارادہ ہے؟"

✳ "میں اس وقت چائلڈ اسپیشلسٹ ہوں اور میری خواہش ہے کہ میں چائلڈ کنسلٹنٹ بنوں۔ میڈیسن کا شعبہ مجھے بہت پسند ہے اور میں اس فیلڈ میں بہت آگے جانا چاہتی ہوں۔"

★ "تو اتنا ٹائم مل جاتا ہے کہ آپ دونوں ذمہ داریاں احسن طریقے سے ادا کر لیں؟"

✳ "جی شوق انسان سے بہت کچھ کروا لیتا ہے۔ ریڈیو میرا شوق ہے اور میڈیسن میرا جنون ہے۔ میں دونوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

★ "میں نے دیکھا ہے کہ جو خواتین ڈاکٹر ہوتی ہیں وہ الیکٹرک میڈیا میں زیادہ سرگرم ہوتی ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟"

✳ "ہاں یہ تو میں نے بھی محسوس کیا ہے اور ایسا کیوں ہے یہ واقعی سوچنے والی بات ہے لیکن آپ نے دیکھا ہو گا کہ زیادہ تر ڈاکٹر خواتین ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اس فیلڈ میں آتی ہیں اور پریکٹس بھی نہیں کرتیں، لیکن میرا حال ان سے ذرا مختلف ہے میں تو اس وقت اس فیلڈ میں آئی جب ایک عام اسٹوڈنٹ تھی پھر اس فیلڈ کا مزا ایسا لگا کہ چھوڑنے کو دل ہی نہیں چاہا اور آج میں، میری میڈیسن اور میرا شوق سب کچھ ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔"

★ "اس ساتھ ساتھ میں ایک ساتھ کا اور بھی اضافہ ہونا چاہیے تھا۔ کیا خیال ہے؟"

✳ "جی میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ہوں کہ آپ کس ساتھ کی بات کر رہی ہیں۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ یہ 'ساتھ' ہمارے اور آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ دوسرے معاملات کی طرح اس کا اختیار بھی اوپر والے کو ہے وہ جب چاہے گا میرا ساتھ کسی کے ساتھ باندھ دے گا۔"

★ "آپ ڈاکٹر ہیں۔ میڈیا کی فیلڈ سے بھی وابستہ ہیں تو چاہیں گی کہ آپ اپنی پسند سے شادی کریں؟"

✳ "سچ بات تو یہ ہے کہ یہ بھی کب انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ لیکن میں چاہے کتنی ہی بولڈ کیوں نہ ہو جاؤں میرے اندر کی مشرقی لڑکی ہمیشہ جاگتی رہتی ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ میری اس زندگی کا فیصلہ میرے بڑے ہی کریں کیونکہ وہ تجربہ کار ہوتے ہیں اور وہ ہمارے لیے جو سوچیں گے اچھا ہی سوچیں گے۔ ہم نوجوانوں کی سوچ اتنی میچور نہیں ہوتی اور فیصلے بھی جذباتی ہوتے ہیں۔"

★ "فرحت آپ شاعرہ بھی ہیں تو یہ بتائیں کہ تسکین کس کام میں ہوتی ہے آواز کی دنیا میں لوگوں سے باتیں کر کے یا میڈیسن میں لوگوں کی خدمت کر کے؟"

✳ "میں جو کام شوق اور لگن سے کرتی ہوں اسی کے

کرنے میں مجھے مزا بھی آتا ہے۔ شاعری کی صلاحیت خداداد ہوتی ہے جو کہ مجھے خدا نے دی ہے اور میں اپنی اس شاعری کی وجہ سے آواز کی دنیا میں آئی اور ڈاکٹر بننا میرا خواب تھا مجھے لوگوں کی خصوصاً" بچوں کی خدمت کرکے اچھا لگتا ہے اس لیے میں چائلڈ اسپیشلسٹ بنی مجھے اپنے ہر کام سے تسکین ہوتی ہے کیونکہ یہ کام قدرت مجھ سے کروا رہی ہے۔"

★ "میں نے آپ کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ آپ کو قسمت پر بہت یقین ہے۔ کیا ایسا ہی ہے؟"

* "بالکل ایسا ہی ہے۔ میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ انسان کو اس دنیا میں جو کچھ بھی ملتا ہے اس کے نصیب کا ملتا ہے اور نصیب لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جو انسان پیدائش کے ساتھ اس دنیا میں لے کر آتا ہے۔"

★ "شاعری کے ذریعے آپ آواز کی دنیا میں آئیں کیسے؟ اور اتنی مصروفیات کے باوجود شاعری کا وقت مل جاتا ہے... کوئی کتاب منظر عام پر آئی؟"

* "شاعری کے ذریعے آواز کی دنیا میں اس طرح آئی کہ "بزم طلبہ" ریڈیو کا ایک پروگرام تھا جس میں "ایک منٹ" کے عنوان سے طلبہ اپنی کاوشیں پڑھا کرتے تھے۔ تو میں نے بھی اس ایک منٹ میں شرکت کی اور اپنی لکھی ہوئی غزل پڑھی اور میری اس غزل کو پہلا انعام ملا تب مجھ میں کچھ حوصلہ پیدا ہوا اور میں نے پروڈیوسر سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے ریڈیو پہ بولنے کا بہت شوق ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ آڈیشن دے دیں... کامیاب ہو گئیں تو پھر شوق سے پروگرام کریں... اور جناب میں نے آڈیشن دیا اور کامیاب ہو گئی۔ بس پھر بزم طلبہ میں ہی پروگرام "ہوسٹ" کرنے لگی اور آپ کا دوسرا سوال کہ شاعری کے لیے وقت کیسے مل جاتا ہے تو شاعری کوئی پری پلان چیز تو ہے نہیں جب فارغ ہوتی ہوں اور موڈ خوشگوار یا اداس ہوتا ہے تو شاعری اوپر سے نازل ہوتی ہے اور میں اسے تحریر میں لے آتی ہوں اور جناب جہاں تک کتاب کی بات ہے تو سب کچھ لکھا ہوا رکھا ہے۔ بس کتابی شکل میں لانے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔"

★ "پھر ایف ایم میں آمد کیسے ہوئی؟"

* "بزم طلبہ کرتی تھی تو ساتھ ساتھ پڑھائی بھی چلتی رہتی تھی۔ ایم بی بی ایس مکمل ہوا تو ہاؤس جاب شروع ہو گئی ہاؤس جاب میں مصروفیات اتنی بڑھ گئیں کہ ریڈیو کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ تھوڑی سی فراغت ہوئی تو معلوم ہوا کہ ریڈیو ایف ایم 101 میں آڈیشن ہو رہے ہیں میں نے بھی آڈیشن دے دیا مائیک پر بولنے کا تجربہ تو تھا ہی اس لیے آسانی سے کامیاب ہو گئی اور یہ بات ہے 2002ء کی۔ بس تو ریڈیو پہ بولنے کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی اور آج بھی میں ایف ایم 101 سے وابستہ ہوں۔"

★ "ریڈیو ایف ایم پہ پہلا پروگرام کون سا تھا؟ اور کبھی مشکل پیش آئی؟"

* "ریڈیو پہ میرا پہلا پروگرام "آن ڈیمانڈ" تھا یہ میوزک پروگرام تھا اور سامعین کی لائیو کالز پہ ہم ان کی فرمائش نوٹ کیا کرتے تھے اور جو فرمائش ممکن ہوتی تھی سنوا بھی دیتے تھے۔ شروع شروع میں چونکہ مجھے لائیو کالز لینے کی عادت نہیں تھی تو کافی مشکل پیش آتی تھی مگر پھر آہستہ آہستہ سیکھتی بھی گئی اور عادت بھی ہوتی گئی تو پھر کام بھی آسان ہوتا گیا اس کے علاوہ اللہ کا شکر ہے کہ کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔"

★ "اتنے سارے شوق پالنے پر گھر والوں کا کیا ری ایکشن تھا۔ خوش تھے یا کہتے تھے کہ اپنے اوپر اتنا بوجھ مت ڈالو؟"

* "جو بچے سیلف میڈ ہوتے ہیں باصلاحیت ہوتے ہیں اور کچھ کرکے دکھانا چاہتے ہیں پھر گھر والے بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ میرے گھر والے بھی میرے کام سے بہت خوش تھے۔ کیونکہ میں اپنی پڑھائی کو بھی بہت سیریس لیتی تھی اور اپنے شوق کو بھی سب سے بڑی بات تو یہ کہ میری ماں کی بہت خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں اور ٹی وی پہ نیوز پڑھوں اور اللہ کا شکر ہے کہ میں نے یہ دونوں خواہشات اپنی ماں کی زندگی میں ہی پوری کر دیں۔ وہ مجھ سے بہت خوش گئی ہیں اس دنیا سے۔"

★ "کیا مطلب آپ ٹی وی پہ بھی آچکی ہیں؟"

* "جی میں ٹی وی پہ بھی آچکی ہوں اور یہ بات ہے 2007ء کی میں نے پی ٹی وی نیوز کے لیے آڈیشن دیا اور کامیاب ہوئی تو لوکل نیوز پڑھنے لگی۔ مگر کچھ عرصے کے بعد چھوڑ دیا کیونکہ پڑھائی، ریڈیو اور پھر ٹی وی نیوز کافی تھکاوٹ ہو جاتی تھی تو پھر سوچا کہ ٹی وی چھوڑ دوں... اور ٹی وی چھوڑنے کو ترجیح اس لیے دی کہ نیوز سے کافی ٹائم پہلے جانا، میک اپ کروانا تو کافی ٹائم خرچ ہو جاتا تھا جبکہ ریڈیو میرے مزاج کے مطابق ایک سادا میڈیا ہے جس کا تعلق آواز سے ہوتا ہے آپ کے بناؤ سنگھار سے نہیں۔"

★ "گویا لوگ اب آپ کو ٹی وی پہ کبھی نہیں دیکھ پائیں گے؟"

* "ایسی بات نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ ٹی وی جوائن کرلوں کیونکہ مجھے اینکر بننے کا شوق ہے اور کیا پتا کہ میں اس میں کامیاب بھی ہو جاؤں۔"

★ "گھر سے باہر آپ کا ٹائم زیادہ گزرتا ہے... کیا محسوس کرتی ہیں لوگوں میں اور کام کے معاملے میں... کیا ہم سب ایمانداری سے اپنا کام کر رہے ہیں؟"

* "دیکھیں جی... ہر فیلڈ میں اچھے برے لوگ تو ہوتے ہی ہیں۔ جو گورنمنٹ کے ادارے ہیں وہاں کام جانفشانی سے نہیں ہو رہا ہوتا لیکن جو پرائیویٹ ادارے ہیں وہاں ہر بندہ بہت اچھا کام کر رہا ہوتا ہے اگر آپ نے کوالٹی آف ورک دیکھنا ہے تو پھر آپ پرائیویٹ اداروں میں دیکھیں۔ ویسے میں نے ایک بات شدت سے محسوس کی ہے کہ لوگوں کے پاس اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کا کافی ٹائم ہوتا ہے اپنی توجہ اپنے کام پر فوکس نہیں کرتے بلکہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں کرتے ہیں اور یہی باتیں کسی بھی فیلڈ کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔"

★ "اینکر بننے کی خواہش ہے تو پھر سیاست اور حالات حاضرہ سے بھی دلچسپی ہو گی آپ کو؟"

* "بالکل ہے اور ریڈیو کے آر جے کو تو ہر چیز سے دلچسپی ہونی چاہیے تاکہ آپ اپنے سامعین کو زیادہ سے زیادہ اچھی معلومات اور دلچسپ خبروں سے آگاہ کر سکیں۔ مجھے حالات حاضرہ میں رہنا اور معلومات رکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اس دور میں جبکہ اخبار پڑھنے کا رجحان تقریباً" ختم ہو رہا ہے میں اخبار کا مطالعہ بہت شوق سے کرتی ہوں۔"

★ "اچھا گڈ... اگر کوئی حکومتی عہدہ مل جائے آپ کو تو سب سے پہلے کیا کریں گی؟"

* "حکومتی عہدہ... سوچ میں ڈال دیا۔ ویسے اگر حکومتی عہدہ نہ بھی ہو اور مجھے کام کرنے کا موقعہ ملے تو سب سے پہلے تعلیم پر توجہ دیتی۔ کیونکہ ہمارے یہاں ساری خرابیاں تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہی ہیں۔ ہمارے اداروں میں تعلیم یافتہ افراد کی بہت کمی ہے اور اسی وجہ سے غربت بھی بہت ہے۔ تو کوشش کروں گی کہ ان دو چیزوں کو درست کروں، تعلیم کو عام کردوں اور غریبی دور کرنے کے لیے ٹھوس اقدامات کروں۔"

★ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں... کیونکہ فیلڈ کے بارے میں تو کافی باتیں ہوگئی ہیں؟"

"ہاں جی کیوں نہیں 23 جون میری تاریخ پیدائش ہے کراچی میں پیدا ہوئی۔ ہم تین بہنیں اور تین بھائی ہیں ان بہنوں بھائیوں میں میرا نمبر دوسرا ہے اور یہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ میں کیا کیا کرتی ہوں اور مزید تعلیم کے لیے ملک سے باہر جانے کا ارادہ بھی ہے۔"

"کام تو سارے سوشل ورک والے ہیں فارغ اوقات میں تو بہت بوریت ہوتی ہو۔ گی؟"

* "بالکل آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مجھے سوشل رہنا اور سوشل ورک کرنا بہت پسند ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ میرے پاس جو بھی فارغ وقت ہو وہ میں اپنی فیملی کے ساتھ گزاروں، مجھے فیملی کے ساتھ ملک کے اندر اور باہر گھومنا پھرنا اور گھر سے باہر کھانا کھانا بہت اچھا لگتا ہے اور مزا بھی آتا ہے تنہائی میں تو میرا دم گھٹتا ہے۔"

★ "گڈ... خود بھی کیا اچھا پکا لیتی ہیں؟"

* "ہاں... ہاں کیوں نہیں۔ مجھے کوکنگ سے بہت لگاؤ ہے لیکن بدقسمتی سے مجھے گھریلو امور انجام دینے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔ اس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہتا ہے۔"

★ "صبح ناشتا کر کے گھر سے نکلتی ہیں یا عجلت میں بھول جاتی ہیں؟"

* "بالکل جناب ناشتا کر کے گھر سے نکلتی ہوں، کیونکہ میرا خیال ہے کہ ناشتا آپ کو سارا دن فریش رکھتا ہے اور میں تو ناشتے کی اتنی عادی ہوں کہ مجھے تو صبح اٹھتے ہی ناشتے کی طلب ہوتی ہے اور سچ بتاؤں بھوک تو مجھ سے برداشت ہی نہیں ہوتی۔ بھوک میں نہ پڑھ سکتی ہوں اور نہ ہی پروگرام کر سکتی ہوں۔"

★ "یہ بتائیں کہ اپنی کمائی کو آسانی سے خرچ کردیتی ہیں یا جوڑ جوڑ کر رکھتی ہیں؟"

* "اپنی کمائی جیب میں ہو یا والد کی ______ میں ہمیشہ سے ہی بہت کفایت شعار رہی ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر اور ہمیشہ ضرورت کی چیزوں پر خرچ کرتی ہوں۔ فضول چیزوں پر نہیں مجھے معلوم ہے کہ پیسہ کمانا آسان نہیں ہے۔"

★ "ریڈیو کمائی کا اچھا ذریعہ ہے؟"

* "نہیں کچھ خاص نہیں بس گزارے لائق ہے ایسا نہیں ہے کہ ریڈیو کی رقم سے آپ کچھ پلان کر سکیں کہ یہ کرلیں گے وہ کرلیں گے۔ بس ریڈیو پہ کام کرنے کا شوق بھی ہے اور اب تو عادت بھی ہو گئی ہے۔ ریڈیو تو اب دوسرا گھر لگتا ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔ ہاں میرا پروفیشن ایسا ہے کہ اللہ نے میرے ہاتھ میں شفا دی ہے اور لوگ میرے پاس آتے ہیں۔"

★ "ہر وقت لوگوں سے آپ کا ملنا ملانا رہتا ہے۔ لوگوں کی شخصیت میں کیا بات نوٹ کرتی ہیں؟"

* "نوٹ کچھ نہیں کرتی لیکن جو بات کسی کی ایک دم سے متاثر کرتی ہے وہ اس کی ڈریسنگ اور پھر اس کی بول چال... یہ دو باتیں انسان کی شخصیت کی عکاس ہوتی ہیں۔"

★ "اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف سمجھتی ہیں یا سوچتی ہیں کہ میں بھی تو انہی کی جیسی ہوں؟"

* "میں اپنے آپ کو دوسروں سے بالکل بھی الگ نہیں سمجھتی۔ دوسرے انسانوں کی طرح میں بھی ایک عام انسان ہی ہوں البتہ میری مصروفیات دوسروں سے کافی مختلف ہوتی ہیں۔ اپنے پروفیشن کے لحاظ سے اور اپنے شوق کے لحاظ سے اور ہم آپ نے فارغ وقت کی بات کی تھی تو میں یہ بتانا ہی بھول گئی کہ مجھے ڈریس ڈیزائننگ کا بھی بہت شوق ہے اور میں اپنے کپڑے تو خود ہی ڈیزائن کرتی ہوں اور کبھی کبھار دوستوں کی فرمائش پر ان کے کپڑے بھی ڈیزائن کردیتی ہوں۔"

★ "کبھی موڈ خراب ہو تو پروگرام پر بھی اس کا اثر پڑتا ہوگا؟"

* "کوشش تو یہی ہوتا ہے کہ اثر نہ پڑے، کیونکہ موڈ ہمارا خراب ہوتا ہے اس میں بے چارے لوگوں کا کیا قصور۔ اس لیے اپنے خراب موڈ کو اپنی پروفیشن لائف پہ حاوی نہیں ہونے دیتی۔"

★ "اپنی کوئی اچھی بری عادت بتائیں؟"

* "اچھی عادتیں تو آپ دوسروں سے پوچھیں... میں کیا بتاؤں آپ کو ہاں بری بتا سکتی ہوں اور وہ یہ کہ مجھ میں غصہ بہت ہے کوشش کرتی ہوں کہ اپنی اس خامی پر قابو پالوں مگر ناکام ہی رہتی ہوں۔"

★ "اگر انسان یہ سوچ لے کہ اس میں یہ خامی ہے تو پھر میرے خیال میں اس خامی پر قابو پانے میں مشکل نہیں ہونی چاہیے؟"

* "ہاں کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں لیکن میرے خیال میں غصہ بھی قدرت ہی ڈالتی ہے۔ انسان کے اپنے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہوتا جبکہ میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ پڑھے لکھے انسان میں قوت برداشت ہونی چاہیے۔"

★ "آپ کے کالرز آپ کی کس بات کی تعریف زیادہ کرتے ہیں؟"

* "میری آواز اور میرے انداز گفتگو کی اور یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ میرے کالرز مجھے پسند کرتے ہیں۔"

فرحت اجازت دیں آپ سے بہت اچھی گفتگو رہی۔

☼ ☼

ماں جی

صدف ریحان گیلانی

ماں کتنا میٹھا سا نام ٔاحساس اور رشتہ ہے کہ جس کی عظمت رب کائنات نے یوں ظاہر کی "میں اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرتا ہوں" سبحان اللہ جل شانہ ٔہر لڑکی کو زندگی میں دو مائیں ملتی ہیں ایک وہ جس نے اسے جنم دیا ایک وہ جس نے اس کے شریک سفر کو جنم دیا اور ماں کیا ہوتی ہے یہ تو ہر لڑکی ماں بن کر ہی جان پاتی ہے۔ میں بھی جانتی ہوں کیونکہ خدائے بزرگ و برتر نے اپنی رحمت کے صدقے مجھے بھی یہ عظیم رتبہ عطا کیا۔

ماں ٔدنیا کا وہ واحد رشتہ جو خلوص ٔوفا ٔایثار ٔمروت اور محبت سے گندھا ہے۔ ماں جس کے چاہے دس بچے ہوں وہ سب کی ماں ہے ہر بچے سے وہی محبت ٔوہی پیار ٔاتنا ہی خیال جو سب کی فکر میں غلطاں اگر نہیں پروا تو صرف اپنی ذات کی نہ اپنے آرام کا خیال ٔنہ دن دیکھتی ہے نہ رات۔ بس ایک ہی دھن ایک ہی لگن میرے بچے ہر دکھ سے محفوظ ٔہر پریشانی ہر تکلیف سے بچے رہیں۔ مجسم دعا جس کے صرف لب ہی نہیں روم روم ہمہ وقت اپنے رب کے حضور گڑگڑاتے رہتے ہیں۔

11 فروری 1999ء جمعرات کا وہ دن میری آنکھوں سے جاتا ہی نہیں جب میری پیاری ہنستی مسکراتی ماں حوروں کا سا تقدس رکھنے والی بامروت ٔبا اخلاق سب کا خیال رکھنے والی کیا اپنے کیا پرائے سبھی سے محبت کرنے والی بالکل اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث ہمیں تنہا چھوڑ گئیں۔

اف وہ دکھ وہ غم بیکراں ٔوہ صدمہ جو میں نے کیسے اپنی ذات پر جھیلا یہ میں ہی جانتی ہوں۔ ہاں وہ ہستی ہے جس کی ضرورت بیٹی کو زندگی کی ہر سانس کے ساتھ محسوس ہوتی ہے مگر آہ کیا کیجیے کہ رب کے فیصلوں پر سر جھکانا پڑتا ہے۔ پھر یہ ظالم دنیا اور اس کے ہزار رنگ میلے جو انسان کو خود میں یوں سمو لیتے ہیں کہ اس کے ہر آرام ہر آزار پر گرد ڈالتے جاتے ہیں۔ میری ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی رفتہ رفتہ مجھے بھی اس حقیقت کو قبول کرنا ہی پڑا۔

شادی کے بعد میری خوش بختی کہ مجھے پھر ماں مل گئی۔ وہی رنگ ٔوہی روپ ٔویسی ہی فکریں ٔویسی ہی پروا ٔاسی طرح غلطیوں پر ٹوکنا کامیابیوں پر خوش ہونا جی بھر دعائیں دیتا سراپا محبت ٔصرف اپنے بچوں کے لیے ہی نہیں ٔسب سے ہی ان کا ایک سا رویہ ٔوہی الفت سب پر نچھاور کرتیں بااصول ٔخوش اخلاق جو بھی ملتا گرویدہ ہو جاتا۔ ابو جی (سسر) کے بعد مریدین پر بھی ان کا خاص دست شفقت تھا سب ہی ان کے معتقد تھے۔

چار سال قبل فالج کا پہلا حملہ ہوا۔ بالکل بستر کی ہو کر رہ گئیں لیکن اس قدر باہمت کہ ناممکن کو اپنی ول پاور سے ممکن کر دکھایا۔ صرف چند ماہ کے عرصہ میں دوبارہ اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہو گئیں۔ حالانکہ جسم کا بایاں حصہ تقریباً" کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔ لیکن وہی کسی کو بے جا تنگ نہ کرنے کی عادت ٔغضب کی خودداری نہ خود کو بیمار سمجھتیں نہ کہلواتیں پھر اتنا ہوا کہ سہارا لے کر چند قدم چلنے بھی لگیں اور جب ملازمہ کے پاس ہوتے ہوئے بھی سہارے کے لیے صرف مجھے آواز دیتیں تو میرا دل فخر سے بھر جاتا اس پر امی کے الفاظ "میری اس بیٹی کے ہاتھ مجھے یوں لگتے ہیں جیسے ماں کے ہاتھ ہوں مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے یہ مجھے گرنے نہیں دے گی۔"

امی جب کسی سے میرا تعارف کرواتیں تو بہت خوشی سے ضرور بتاتیں۔

میری بہو لکھتی ہے رائٹر ہے اور میں بس مسکرا دیتی کہ یہ تو گئے زمانے کی باتیں تھیں۔ اپنی ماں کے بعد دل ایسا ٹوٹا تھا کہ قلم سے ہی ناتا ٹوٹ گیا لکھنا مجھے دنیا کا مشکل ترین کام لگنے لگا تھا۔ لیکن پھر الحمد للہ دوبارہ قلم اٹھایا اور امی جان کا وہ پرشوق انتظار۔

"تمہاری تحریر کب لگے گی ریحان" ہر بار ان کا پوچھنا وہ مجھ سے زیادہ بے تاب تھیں اور جب تحریر لگی وہ میرے پاس نہیں تھیں چار ماہ سے وہ پھر پیرالائز تھیں اور گاؤں میں اچھے ڈاکٹرز اور عمدہ سہولیات کی عدم دستیابی کی بنا پر انہیں مجبوراً" بڑے بھائی کے پاس لاہور بھیجنا پڑا تھا فون کر کے انہیں بتایا بہت خوش ہوئیں۔

ان کا پانچ کنال پر پھیلا وسیع ترین گھر بے شمار پھلوں اور پھولوں میں گھرا ہوا جس سے چند دن کی دوری بھی انہیں گراں گزرتی۔ جب بھی کہیں جاتیں دو چار روز میں ہی اکتا کر واپس آ جاتیں۔ باقی بیٹے اور بہوئیں تو نئی منزلوں کو نکل گئے۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ میرا اور ان کا ساتھ خوب رہا اس بار بھی گئیں تو بے پناہ اداس بس ایک ہی ضد گھر واپس آنا ہے اور ہم سب مجبور کڑاکے کی سردی اور ان کی بیماری کریں تو کیا کریں۔

8 تاریخ کو بھائی کا فون آیا کہ "امی کی کنڈیشن بہت سیریس ہے انہیں ہاسپٹلائزڈ کروا دیا گیا ہے۔" رضوان (میاں) ہر کام چھوڑ چھاڑ لاہور روانہ ہو گئے میرا یہاں پل پل دعا کرتے گزرا۔

10 تاریخ کو وہ واپس آئے اور گیارہ فروری کو صبح سویرے میں اور بچے گھر سے نکل پڑے۔

امی کو دیکھا تو بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔

اوہ میرے خدا! اتنی سوئیاں ٔطرح طرح کی نالیاں ٔاتنی اذیت ٔاس قدر تکلیف ٔوہ گزشتہ چھ روز سے کومہ میں تھیں میرے آنسو نہ رکیں۔ سب مجھے بتاتے رہے امی تمہیں بہت یاد کرتی تھیں بار بار تمہارا نام لیتی تھیں کہ ریحان کو میرے پاس بلاؤ یا مجھے وہاں لے چلو

ہائے میری ماں آنکھیں کھولیں دیکھیں میں آپ کے پاس آ گئی آپ کا طیب آپ کی ننھی سہیلی اسا اور آپ کا لاڈلا محمد مومن آپ سے ملنے آئے ہیں ایک بار تو آنکھیں کھولیں۔ میں ان کا ہاتھ ہلا ہلا کر بلاتی رہی صدائیں دیتی رہی بچے آوازیں دیتے رہے مگر بے سود

رات آٹھ بجے ان کا ڈائیلاسز ہونا تھا انہیں روم سے لے جایا گیا میری شکل دیکھ کر عمران (دیور) نے مجھے وہیں ٹھہرنے کا کہا میں روتی جا رہی تھی قرآنی آیات کا ورد زبان پر مسلسل جاری تھا یا اللہ ہماری ماں کو صحت کاملہ عطا کر انہیں سکون اور شفا دے آمین۔

ڈائیلاسز کے پروسس میں دو سے اڑھائی گھنٹے لگتے ہیں مگر وہ ایک گھنٹہ میں ہی امی کو واپس لے آئے۔

عمران کی صورت پر چھایا سناٹا دیکھ کر مجھے کسی انہونی کا احساس ہوا "کیا بات ہے سب ٹھیک تو ہے نا" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"امی کی ہارٹ بیٹ بہت کم ہے ڈاکٹرز نے ڈائیلاسز نہیں کیا۔ آپ دعا کریں۔" اس کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"اللہ پاک خیر کرے گا ٔان شاء اللہ" میں نے اسے اور خود کو تسلی دی۔

مگر کیا علم تھا یہ تسلی محض اب تسلی ہی رہ جائے گی۔

ایک وہ گیارہ فروری جس کی دوپہر میں چپ چپاتے میری ماں چلی گئی میرا دل تو اسی دکھ میں ڈوبا تھا کہ یہ پھر گیارہ فروری ماں نے پھر بنا کچھ کہے سنے چپ چاپ آنکھیں موند لیں۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

دل اب دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں کیسے سانس لے گا یہ بس میرا رب ہی جانتا ہے وہ دکھ دینے والا ہمیں صبر بھی عطا کرے اور میری پیاری ماؤں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ان کی قبروں کو کشادہ کر دے ان کی مغفرت اور ان کے درجات بلند کرے۔

(آمین ثم آمین)

☼ ☼

مقابل ہے آئینہ

صائمہ امتیاز

☆ "آپ کا پورا نام ..... گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"
ج "صائمہ امتیاز ساہی، امی پیار سے اکثر رانی کہتی ہیں اور دوستیں صائم کہتی ہیں۔"
☆ "کبھی آپ نے آئینے سے یا آئینے نے آپ سے کچھ کہا؟"
ج "میں نے تو کبھی کچھ نہیں کہا مگر آئینہ اکثر کہتا ہے کہ میں بہت خوب صورت ہوں۔ (ماشاءاللہ)"
☆ "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"
ج "میری فیملی اور میری چوڑیاں اور میری خوشیاں۔"
☆ "اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟"
ج "جب ہم اسلام آباد سے واپس گجرات آئے۔ کیونکہ میری دوست عائشہ مجھ سے دور ہو گئی۔"
☆ "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"
ج "محبت ایک ایسا جذبہ ہے، جو غیر اور اجنبی لوگوں کو بھی اپنا بنا دیتا ہے اور ہر رشتہ اسی سے ہی منسلک ہوتا ہے۔"
☆ "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟"
ج "بہت سارے منصوبے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ سب پر عمل کرنا ہے مگر اپنے ابو کی خواہش پر ایم اے پنجابی مستقبل قریب کے منصوبوں میں ہے۔"
☆ "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور مطمئن کر دیا؟"
ج "ماشاءاللہ میں نے یونیورسٹی سے امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تھا اور دوسرا کرن کے شمارے میں میرا خط بھی شائع ہوا جو کہ مشکل ہی امر تھا۔"
☆ "آپ اپنے گزرے کل، آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"
ج "سچائی۔"

☆ "اپنے آپ کو بیان کریں؟"
ج "حد سے زیادہ صاف گو ہوں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتی اور مطمئن ہوں۔"
☆ "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوں؟"
ج "بس یہی خوف لاحق رہتا ہے کہ کیا جو میں چاہتی ہوں وہ کبھی کر سکوں گی؟ اگر نہ ہوا تو۔"
☆ "آپ کی کمزوری اور آپ کی طاقت؟"
ج "میری فیملی میری کمزوری اور میرے ابو میری طاقت۔"
☆ "آپ خوشگوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"
ج "اپنے خوشگوار لمحات اپنی بہنوں اقصیٰ اور اسما کے ساتھ ہنستے مسکراتے گزارتی ہوں۔"
☆ "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"
ج "دولت بس واجبی سی چیز ہے۔ کبھی ہوتی ہے کبھی نہیں تو اس کی بھلا کیا اہمیت؟ اگر قسمت میں ہو تو مل جاتی ہے ورنہ ..... خالی ہاتھ۔"
☆ "گھر آپ کی نظر میں؟"
ج "گھر ہمارے والدین کی محبتوں کا امین اور ہر لمحے کی خوشیوں کا گواہ۔"
☆ "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں"
ج "نہیں میری یہ خامی ہے میں کبھی نہیں بھولتی اور معاف بھی نہیں کرتی۔"
☆ "اپنی کامیابیوں میں کسے حصہ دار ٹھہراتی ہیں؟"
ج "میں تو اپنی ہر کامیابی میں اپنے ابو کو حصہ دار ٹھہراتی ہوں پہلا قدم بھی ان کی انگلی تھام کر اٹھایا اور پہلا لفظ بھی ان کا ہی ہاتھ پکڑ کر لکھا۔"
☆ "کامیابی کیا ہے آپ کے لیے؟"
ج "کامیابی ہی سب کچھ ہے۔ ہمیں منزل تک پہنچا دیتی ہے اور ہماری محنتوں کا ثمر ہوتی ہے۔"
☆ "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا کیا یہ واقعی ترقی ہے؟"
ج "یہ ترقی تو نہیں ہے۔ انسان پہلے ہی بڑا کام چور تھا۔"

☆ "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"
ج "خواب تو کبھی نہیں دیکھے۔ خواہشیں تو لاتعداد ہیں جیسے کہ جہاں میں ہوں وہاں اس مقام پر کوئی دوسرا کبھی نہ ہو (خواہش ہی ہے)"
☆ "برکھارت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"
ج "اپنی بہنوں کے ساتھ کبھی چھت پہ تو کبھی کاغذ کی کشتیاں بنا کر۔"
☆ "آپ جو ہیں، وہ نہ ہوتی تو کیا ہوتیں؟"
ج "ویری انٹرسٹنگ، وہی ہوتی جو اللہ نے اپنی رضا سے بنا دیا ہوتا۔"
☆ "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب.....؟"
ج "جب میری غلطی پر بھی میرے ابو میری طرفداری کرتے ہیں اور تعریف بھی کرتے ہیں اور بعد میں پیار سے سمجھاتے بھی ہیں۔"
☆ "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"
ج "خوب صورت تحریر، خوب صورت لکھائی اور خوب صورت چوڑیاں۔"
☆ "کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب پا لیا جو آپ چاہتی تھیں؟"
ج "اللہ کا شکر ہے، سب کچھ مل گیا ہے۔"
☆ "اپنی ایک خوبی اور خامی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟"
ج "خوبی یہ ہے کہ بلاوجہ کسی کا دل دکھاتی ہوں نہ توڑتی ہوں اور خامی یہ ہے کہ غصہ بہت آتا ہے جب آتا ہے خود پہ قابو نہیں رہتا۔"
☆ "کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کر دیتا ہو؟"
ج "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے۔"
☆ "کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوفزدہ ہو جاتی ہیں؟"
ج "انجوائے ہی کرتی ہوں ۔ مقابلہ ہے ہی انجوائمنٹ کا دوسرا نام۔"
☆ "متاثر کن کتاب، مصنف، مووی؟"
ج "مصحف ناول، عمیرہ احمد، ہمن اور ویر زارا۔"
☆ "آپ کا غرور؟"
ج "میری خوب صورتی اور حاضر جوابی۔"
☆ "کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو اداس کر دیتی ہو؟"
ج "ہاں جی ایف اے میں میری بیسٹ فرینڈ صائمہ پاس ہو کر بی اے میں چلی گئی اور میں بدقسمتی سے پیچھے رہ گئی۔ وہ لمحات آج بھی اداس تو کیا رلا بھی دیتے ہیں۔"
☆ "کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہو؟"
ج "حسد میں تو مبتلا نہیں کیا بس رنجیدہ ہو جاتی ہوں ۔ مس شفقت ہیں جو ہماری انگلش کی لیکچرار ہیں۔"
☆ "مطالعہ کی اہمیت آپ کی نظر میں؟"
ج "بہت زیادہ اور فارغ اوقات کا بہترین مصرف۔"
☆ "آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی کیا ہے۔ جو آپ اپنے علم، تجربہ اور مہارت میں استعمال کرتے ہیں؟"
ج "زندگی تو وہ ہے، جو موت سے بچ جائے۔ علم، تجربہ اور مہارت یہ تو سب ذہنی صلاحیتیں ہیں شاید۔"
☆ "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"
ج "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر میرے ابو۔"
☆ "ہمارا پیارا پاکستان سارا کا سارا خوب صورت ہے۔ آپ کا کوئی خاص پسندیدہ مقام؟"
ج "اسلام آباد جہاں اپنی زندگی کے ..... خوب صورت سال گزارے۔"

☆ ☆

سنبلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا بے بسی اور مجبوری اسے تنگ آخر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

[illegible] آزر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی [illegible] دیتی ہیں۔

۳۲

بتیسویں قسط

اور زندگی کی اس مات پہ دل آور شاہ تو جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ بے دم سے ہو کر پہلو میں آگرے تھے اور اس کی بے یقین، پتھرائی ہوئی اور پھٹی پھٹی آنکھیں بتول شاہ کے ایکدم سے پرسکون ہو جانے والے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں اور وہ دم بخود سا کھڑا بس دیکھتا رہ گیا تھا۔

"دل آور صاحب...! آپ باہر آجائیں پلیز...." اس کی حالت کے پیش نظر ایس پی کامران مہدی نے تیزی سے اٹھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا تھا اور اسے اپنے ساتھ لیے آئی سی یو سے باہر نکل آئے۔

ادھر علیزے بھی ساکت وصامت سی بیٹھی آنکھیں پھیلائے ہوئے بے یقین سی نظروں سے بتول شاہ کے بے جان جسم کو دیکھ رہی تھی، کیونکہ اسے واقعی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے بعد حقیقتاً "اس دنیا کو خیرباد کہہ چکی ہیں...

"علیزے بی بی...! آپ بھی باہر آجائیں۔ ڈاکٹرز کو اپنا کام کرنے دیں۔" ڈاکٹر صاحب کے اشارے پہ گلاب خان نے علیزے کو متوجہ کیا تھا اور وہ یکدم چونک گئی تھی۔

"اور آنٹی...؟" علیزے جیسے باہر جانے کو تیار نہیں تھی۔

"پلیز میم...! بس چند منٹ ویٹ کریں، پھر آپ کو ڈیڈ باڈی مل جائے گی، آپ پریشان نہ ہوں۔" ڈاکٹر نے علیزے کی پریشانی دیکھتے ہوئے خود اسے تسلی دی تھی اور وہ اس تسلی پہ بڑے ضبط سے محض سر ہلا کر وہاں سے اٹھ کر گلاب خان کے ساتھ آئی سی یو کے دروازے تک آگئی تھی، لیکن دروازے تک آکر اس کے دل کو نجانے کیا ہوا تھا کہ وہ دوبارہ لپک کر بتول شاہ کے بیڈ کے قریب آئی تھی اور بے اختیار بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ جھک کر ان کے ماتھے پہ بوسہ دیا تھا۔ عزت... عقیدت... اور محبت بھرا بوسہ...!

"آئی مس یو آنٹی... آئی ریئلی مس یو... اینڈ... اینڈ... آئی ریئلی لو یو..." علیزے اپنے جذبات اور محسوسات کو دبا نہیں پائی تھی اور اس کے ایسے اظہار پہ گلاب خان کی آنکھیں بھی بے ساختہ پانی میں بھیگ گئی تھیں، البتہ آئی سی یو کے ادھ کھلے دروازے سے نظر آتے اس منظر کو دل آور نے محض خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا، مگر کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ واقعی اس وقت اتنے گہرے صدمے سے پتھر کا ہو چکا تھا۔

"علیزے بی بی...!" گلاب خان نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے ایک بار پھر متوجہ کیا تھا اور علیزے تیزی سے اٹھ کر آئی سی یو سے باہر نکل آئی تھی اور اس کے پیچھے گلاب خان بھی باہر نکل آیا تھا۔

☼ ☼ ☼
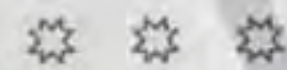
عائشہ آفندی نے زہرہ بتول شاہ کا ایکسیڈنٹ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا تھا۔ وہ شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ اپنی نظروں کے سامنے ایسا ہولناک منظر دیکھ کر برداشت نہیں کر پائی تھیں اور کھڑے قد سے تیورا کر نیچے زمین پہ آگری تھیں۔ اور محض دو فٹ کے فاصلے سے ان کے پیچھے آنے والے دانیال کے بھی ان کو اس طرح نیچے گرتے دیکھ کر حواس اڑ گئے تھے اور وہ آگے پیچھے کچھ دیکھے بغیر بے ساختہ ان کی طرف بھاگا تھا اور ان کے قریب پہنچ کر ان کو سنبھالنے میں لگ گیا تھا، اس لیے اسے نہیں پتا تھا کہ چند قدم کے فاصلے پہ کس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے؟ لوگوں کا اتنا ہجوم کیوں جمع ہے؟ اور آخر عائشہ آفندی اس طرح اچانک بے ہوش ہو کر کیوں گری ہیں؟

اسے اس وقت بس ان کی فکر ہو رہی تھی، باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ زہرہ آنٹی کے پیچھے اسپتال سے نکلی تھیں تو پھر زہرہ آنٹی کہاں ہیں؟ اور انہیں اچانک کیا ہوا ہے؟

اس کا تو ذہن بس عائشہ آفندی کی طرف تھا۔ اس نے انہیں اٹھا کر صرف اسپتال پہنچنے کی کوشش کی تھی ان کی ایسی حالت دیکھ کر اس کے اپنے ہاتھ پیر پھول رہے تھے، وہ بڑی ہمت اور بڑی عجلت میں اسپتال پہنچا تھا، جہاں آذر بھی ایسی صورت حال دیکھ کر ایکدم پریشان ہو گیا تھا اور فوراً "ڈاکٹرز کی طرف دوڑ لگادی تھی۔ ڈاکٹرز نے وقتی طور پہ عائشہ آفندی کی کنڈیشن دیکھتے ہوئے انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا تھا جس پہ آذر، دانیال اور آسیہ آفندی تینوں ہی بے حد پریشان ہوئے تھے کیونکہ ابھی ابھی وقار آفندی کی بھی حالت اچانک اتنی بگڑ گئی تھی کہ مجبوراً "ڈاکٹرز کو انہیں نیند کا انجکشن دینا پڑا تھا اور محض چند منٹ میں ہی وہ انتہائی گہری اور پرسکون نیند سو گئے تھے۔ ان کی پریشانی سے نکلے تھے تو عائشہ آفندی کی پریشانی نے آگھیرا۔

اسی پریشانی پریشانی کے چکر میں انہیں یہ بھی احساس نہ ہوا کہ آج ان کی علیزے واقعی ان کے لیے "پرائی" ہو گئی ہے۔ اتنی پرائی جتنا دل آور شاہ پرایا تھا۔

وقار آفندی کے لیے بھی اور آذر آفندی کے لیے بھی...!

آج سے ان کا علیزے پہ نہ کوئی حق تھا اور نہ کوئی اختیار...!

اور اس چیز کا اگر انہیں پتا چلتا تو یقیناً "جیتے جی مر جاتے...!

کیونکہ اصل نکاح تو آج ہی ہوا تھا نا؟ اور اس اصل اور نقل کی حقیقت واقعی مار دینے کے لیے کافی تھی۔

☼ ☼ ☼

فجر کی پہلی اذان ہو رہی تھی جب علیزے اور دل آور شاہ، بتول شاہ کی ڈیڈ باڈی لے کر گھر پہنچے تھے اور ان کی ڈیڈ باڈی دیکھتے ہی گل اور زلفی ہچکیوں سے رونے لگے تھے۔

لیکن دل آور کو کچھ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ کون رو رہا ہے اور کون ہنس رہا ہے؟ کون چپ ہے اور کون تڑپ رہا ہے....؟

خاموشی سے کسی روبوٹ کی طرح ایمبولینس سے اسٹریچر اتروا رہا تھا اور اسی ایمبولینس کی آواز پہ آس پاس کے کئی لوگ پریشانی اور تشویش سے گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور پھر جس جس کو بھی بیرسٹر دل آور شاہ کی والدہ ہونے کے ناتے بتول شاہ کی ڈیتھ کا پتا چلا تھا سبھی نے بے حد افسوس کا اظہار کیا تھا اور وہ چپ چاپ سر جھکائے سب کے تعزیتی کلمات سن رہا تھا، حالانکہ سمجھ کچھ بھی نہیں آرہی تھی کہ وہ سب لوگ کیا کہہ رہے ہیں....؟ وہ تو بس سن رہا تھا۔ سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی اس میں...!

اسی لیے اسپتال میں بھی ساری بھاگ دوڑ گلاب خان نے اور ایس پی کامران مہدی نے ہی کی تھی، کیونکہ دل آور تو اس پوزیشن میں تھا ہی نہیں کہ وہ خود یہ ساری بھاگ دوڑ کر پاتا۔ اس لیے اسپتال کی ساری کاغذی کارروائی ایس پی کامران مہدی نے خود مکمل کروائی تھی اور باقی کا چھوٹا موٹا کام گلاب خان نے سنبھال لیا تھا۔

"علیزے بی بی...! میرا خیال ہے کہ آپ کا یہاں سب کے سامنے ٹھہرنا مناسب نہیں ہے، آپ فی الحال کمرے میں چلی جائیں، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" گلاب خان نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اسے جو مشورہ دیا تھا وہ اتنا برا بھی نہیں تھا، کیونکہ یہ تو علیزے نے بھی محسوس کیا تھا کہ کئی لوگ اسے بار بار دیکھ رہے تھے اور اسے اس چیز سے الجھن بھی ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے...! میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔" علیزے نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"گل...! جاؤ علیزے بی بی کو صاحب کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔" گلاب خان نے گل کو آواز دی تھی، لیکن اندر کی سمت پلٹتی علیزے کے قدم رک گئے تھے۔

"صاحب کے کمرے میں...؟" علیزے کو بیسمنٹ کی بجائے بیڈ روم کا سن کر حیرت ہوئی تھی اور کچھ عجیب بھی لگا تھا کیونکہ بیڈ روم جو "صاحب" کا تھا۔

"جی، بی بی جی۔۔۔! اب آپ اس گھر کی اور صاحب کے بیڈ روم کی مالکن ہیں اور میں اس گھر کی مالکن کو بیسمنٹ میں بھیجنے کی گستاخی تو نہیں کر سکتا نا؟ لہٰذا اب آپ کی جگہ صاحب کے بیڈ روم میں ہے' اس لیے اب آپ کو وہیں جانا ہو گا۔" گلاب خان نے اسے ذرا گہرائی میں جا کر سمجھانے کی کوشش کی تھی' مگر وہ پھر بھی تذبذب کا شکار تھی اس کا دل آور شاہ کے بیڈ روم میں جانے کو۔۔۔ نہیں چاہ رہا تھا اور نہ ہی حوصلہ پڑ رہا تھا۔

"لیکن پہلے تو۔۔۔؟" اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"دیکھیے بی بی جی۔۔۔! آپ خود سیانی ہیں۔ خود سمجھ سکتی ہیں۔۔۔ کہ پہلے کی بات اور تھی اور اب کی بات اور ہے پہلے وہ آپ کے لیے غیر بھی تھے اور نامحرم بھی' لیکن اب وہ آپ کے مالک بھی ہیں اور محرم بھی' اب آپ ان کی عزت ہیں اور ان کی عزت ہونے کے ناتے آپ کا وہی مقام ہے' جو میں آپ کو بتا رہا ہوں اور یقیناً" آپ سمجھ بھی گئی ہوں گی۔" گلاب خان نے اسے سمجھانے کی خاطر پھر ایک دلیل دی تھی اور وقت کچھ ایسا تھا کہ مجبوراً علیزے کو سمجھنا ہی پڑا تھا اور چپ چاپ گل کے ساتھ اندر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔ پھر یہ گلاب خان ہی تھا جس نے نبیل اور عبداللہ کو فون کر کے یہ ہولناک خبر سنائی تھی اور وہ دونوں گہری اور پر سکون نیند سے تڑپ کر اٹھے تھے بلکہ ان کے تو کانوں سے دھواں نکل گیا تھا وہ دونوں ششدر رہ گئے تھے' انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک دن میں اتنا کچھ ہو گیا ہے اور انہیں خبر بھی نہیں ہوئی۔۔۔؟

☼ ☼ ☼

بتول شاہ کی وفات کی خبر نبیل اور عبداللہ کی فیملی پہ بھی کسی بم کی طرح گری تھی۔

فائزہ بیگم' مدیحہ' مومنہ بی بی' نگارش اور زری کے ساتھ ساتھ انسپکٹر شہناز کی آنکھیں بھی بتول شاہ کی ناگہانی موت پہ اشکبار تھیں بلکہ یہاں تک کہ نبیل اور عبداللہ بھی خود پہ اختیار نہیں رکھ سکے تھے' ان کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلک آئے تھے اور دل آور کو مضبوط بازوؤں کے گھیرے میں لے کر دونوں ہی رو پڑے تھے۔

کیونکہ بتول شاہ کی اچانک موت کا دکھ انہیں دل آور سے بھی زیادہ محسوس ہو رہا تھا اور لحہ بہ لحہ دکھی کر رہا تھا۔

مگر دل آور تھا کہ ہنوز پتھر بنا بیٹھا تھا۔۔۔!

اس کی آنکھ سے تو ایک بھی اشک نہیں ٹپکا تھا۔۔۔!

وہ آخر پتھر ہو چکا تھا اور پتھر سے اشک کیسے ٹپکتا۔۔۔؟

اس کے سامنے سب ہی روئے تھے' مگر وہ خود کسی کے بھی سامنے نہیں رویا تھا۔۔۔! لیکن

اس کے آنسو کہاں گر رہے تھے یہ بات سبھی جانتے تھے۔

سب کو معلوم تھا کہ غم کی شدت نے اسے پتھرا کے رکھ دیا ہے۔ اسی لیے تو ان سب کو زیادہ دکھ ہو رہا تھا۔ مگر وہ سب اس کے اس دکھ کو کم بھی تو نہیں کر سکتے تھے نا۔۔۔؟

حالانکہ دل آور شاہ کے اس دکھ میں پورا شہر برابر کا شریک تھا' اس کے تمام کولیگز' سب جاننے والے اور تمام دوست احباب یہ خبر سنتے ہی اظہار تعزیت کے لیے پہنچ گئے تھے اور اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے واقعی پورا شہر وہاں جمع ہو گیا ہو۔۔۔ مگر دل آور کی نظر سے کوئی دیکھتا تو احساس ہوتا کہ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ بس اتنے سارے لوگوں میں وہ اکیلا ہے۔۔۔ تنہا ہے۔۔۔ کوئی اپنا نہیں ہے۔۔۔ سب پرائے ہیں۔۔۔ سب غیر ہیں۔۔۔ سب دعا سلام کے ساتھی ہیں۔۔۔!

اس دنیا میں اس کا صرف ایک خون کا رشتہ تھا اور آج وہ بھی ختم ہو گیا تھا اور اسی ایک رشتے کے ختم ہونے کے غم نے اسے بت بنا دیا تھا اور وہ حقیقتاً" کسی بت کی مانند جوں کا توں بس ایک ہی جگہ پہ بیٹھا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"لیکن پھوپھو۔۔۔! آپ کو ہوا کیا تھا؟ آپ اس طرح اچانک بے ہوش کیسے ہو گئیں؟" ان کے ہوش میں آتے ہی آذر نے انتہائی تشویش بھرے انداز میں سوال کیا تھا اور اس کے اس سوال پہ عائشہ آفندی کی آنکھوں کے سامنے پھر سے وہ منظر تازہ ہو گیا تھا اور وہ بے ساختہ سسک اٹھی تھیں۔

"کیا بات ہے پھوپھو۔۔۔؟ آپ بتا کیوں نہیں رہیں۔۔۔؟ کیا ہوا تھا آخر۔۔۔؟" آذر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"مم۔۔۔ میری زہرہ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اس وقت۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ میرے آگے آگے روتی ہوئی مجھ سے دور جا رہی تھی' لیکن۔۔۔ پیچھے سے آنے والی گاڑی نے اسے۔۔۔ بب۔۔۔ بری طرح کچل دیا تھا۔۔۔ اور وہ میری آنکھوں کے سامنے۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے خون میں نہا گئی تھی۔۔۔ اور۔۔۔ لوگوں کے ہجوم نے اسے گھیر لیا تھا۔۔۔ لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا۔۔۔؟ اور کیا نہیں۔۔۔؟ مجھے تو کچھ خبر نہیں ہوئی۔" عائشہ آفندی بتاتے ہوئے رو رہی تھیں جبکہ آذر اور دانیال ششدر سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

"زہرہ آنٹی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔۔۔؟ او مائی گاڈ۔۔۔ ہم لوگوں کو پتا بھی نہیں چلا۔۔۔؟" آذر نے پریشانی سے سر تھام لیا تھا اور کچھ ایسا ہی حال دانیال کا بھی ہوا تھا۔

"ہمیں کبھی بھی وقت پر کچھ بھی پتا نہیں چلتا۔ ہم ہمیشہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔" عائشہ آفندی کا لہجہ ایکدم جیسے تلخ سا ہو گیا تھا ان کے اندر شدید دکھ اور آنسوؤں کا ابال سا اٹھ رہا تھا اور وہ انتہائی اونچی اونچی آواز میں تڑپ تڑپ کر رونا چاہ رہی تھیں' مگر یہ اسپتال تھا اور یہاں وہ اپنی یہ بے بس سی خواہش پوری نہیں کر سکتی تھیں' انہیں ہمیشہ کی طرح آج بھی صبر و ضبط سے ہی کام لینا تھا۔

"پلیز۔۔۔! آپ۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں پھوپھو۔۔۔ میں ابھی پتا کرواتا ہوں کہ کل اس روڈ پہ جس خاتون کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے' وہ کہاں ہیں؟ اور کس اسپتال میں ہیں؟ میں کوشش کرتا ہوں کہ ساری انفارمیشن مل جائے۔۔۔ بس آپ تھوڑا انتظار کریں۔" آذر ان کا ہاتھ تھپکتے ہوئے فوراً" وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو۔۔۔؟" دانیال نے اسے اٹھتے دیکھ کر بے ساختہ پوچھا تھا۔

"مبارک خان کی طرف جا رہا ہوں۔ اسے بھیجتا ہوں آس پاس سے کچھ پتا کرنے کے لیے۔۔۔ تمہیں پتا ہے نا اسی روڈ پہ تین چار اور اسپتال بھی ہیں شاید انہیں وہاں ایڈمٹ کروا دیا گیا ہو۔۔۔؟" آذر اپنے قیاس کا گھوڑا دوڑاتے ہوئے واقعی زہرہ آنٹی کے ایکسیڈنٹ کے متعلق تمام معلومات لینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

"ہوں۔۔۔! ٹھیک ہے جاؤ۔۔۔ لیکن خود کہیں مت جانا۔۔۔ تمہیں پتا ہے نا ڈیڈ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے اور ادھر امی بھی بیمار ہیں۔۔۔؟" دانیال نے اسے تاکید کی تھی اور آذر جواباً" سر ہلا کر باہر نکل گیا تھا۔ اور دانیال گردن موڑتے ہوئے دوبارہ عائشہ آفندی کی سمت متوجہ ہو گیا تھا کیونکہ وہ ابھی تک رو رہی تھیں۔

"امی پلیز۔۔۔! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اور کتنا روئیں گی آپ؟ اس طرح تو آپ کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گی۔ پلیز۔۔۔ سنبھالیں اپنے آپ کو' ان شاء اللہ زہرہ آنٹی کے بارے میں ابھی پتا چل جائے گا۔" دانیال نے انہیں تسلی دی تھی' مگر عائشہ آفندی کو اک عمر ہو گئی تھی ان تسلیوں پہ جیتے ہوئے۔۔۔ آخر اور کتنا صبر کرتیں۔۔۔؟

"کب پتا چلے گا اور کس کس چیز کا پتا چلے گا؟ مجھے تو آج تک یہ پتا نہیں چلا کہ زہرہ مجھ سے دور کیوں ہو گئی تھی؟ اس نے پلٹ کر کبھی خبر کیوں نہیں لی؟ وہ اگر مجھ سے خفا ہے تو کیوں خفا ہے؟ وہ میری آواز کیوں نہیں سنتی؟ وہ مجھ سے دور کیوں بھاگتی ہے؟ ایسا کیا ہے اس کے دل میں' جس کا مجھے پتا نہیں ہے؟ آخر ایسا کیا ہے دانیال۔۔۔؟" وہ کہتے

کہتے یکدم ہچکیوں سے رو پڑی تھیں اور دانیال نے انہیں اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر ان کا کندھا سہلایا تھا وہ آج خاصی نڈھال ہو رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

نہ خلاؤں میں مجھے ڈھونڈ تو' نہ ہی مقبروں میں تلاش کر
جو سجے ہوئے ہیں صلیب پر مجھے ان سروں میں تلاش کر
یہ الگ کہ خواہش زر نہیں' میرا گھر نہیں' میرا در نہیں
یہ تونگری' یہ سکندری' میری ٹھوکروں میں تلاش کر
وہ جو ایک کانچ کا شخص تھا اسے موسموں نے بدل دیا
اسے آئینوں میں نہ ڈھونڈ تو' اسے پتھروں میں تلاش کر

ذرا سا جھک کر بتول شاہ کے جنازے کو کندھے پہ اٹھاتے ہوئے دل آور شاہ کے دل میں اک ہوک سی اٹھی تھی اور پھر اس نے قدم باہر کی سمت بڑھا دیے تھے اس کے ساتھ بتول شاہ کے جنازے کو کندھا دینے والوں میں نبیل حیات' ملک عبداللہ اور عدیل عمر نیازی سرفہرست تھے۔ بتول شاہ کی سرخ پھولوں سے سجی ڈولی کے چاروں پائے انہوں نے اپنے کندھوں پہ تھام رکھے تھے۔ اور آہستہ آہستہ باہر کی سمت بڑھ رہے تھے۔

شام گہری ہو چکی تھی اور مغرب کی نماز کے بعد تدفین کا وقت تھا۔ اس لیے مغرب کی نماز ادا کرتے ہی لوگ بتول شاہ کی نماز جنازہ کے لیے جمع ہوتے گئے تھے لہٰذا اب ذرا دیر کے لیے بھی ٹھہرنا بہت مشکل تھا حالانکہ دل آور کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ گھر سے باہر قدم بھی رکھے.... لیکن کیا کر سکتا تھا آخر....؟ انہیں روک بھی تو نہیں سکتا تھا نا....؟

"اماں....!" وہ بے ساختہ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں پکار بیٹھا تھا اور وہ سیڑھیاں اترتے اترتے ٹھہر گئی تھیں۔

"ہاں.... کہو؟" وہ یونہی ریلنگ پہ ہاتھ رکھے ہوئے اس کی سمت مڑی تھیں اور وہ اپنے بیڈ روم کے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑا تھا۔

"میں آجاؤں آپ کے ساتھ....؟" اچانک ہی اس کا دل ان کے ساتھ جانے کو چاہا تھا۔

"ارے نہیں میری جان! تم ابھی آفس جا کر اپنے کلائنٹ سے ملو پھر بعد میں آجانا۔"

"لیکن اماں....! میرا دل بہت اداس ہے' میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں' باتیں کرنا چاہتا ہوں' کلائنٹ سے پھر مل لوں گا۔" دل آور نے بچوں کی طرح ان کے ساتھ جانے کی ضد کی تھی۔

"بری بات بیٹا....! کام میں کوتاہی نہیں کرتے۔ کلائنٹ بھی آخر مجبور ہوتے ہیں اور تم تو وقت پہ کام کرنے کے عادی ہو.... یہ سستی تمہیں سوٹ نہیں کرتی۔ شاباش تم آفس جاؤ۔ پھر وہاں سے اسپتال آجانا۔" وہ کہہ کر اس کو نرمی سے دیکھتی ہوئی پلٹ کر سیڑھیاں اتر گئی تھیں اور دل آور ایک بار پھر لپک کر سیڑھیوں کی ریلنگ کے قریب آیا تھا۔

"آپ جا رہی ہیں؟" اس نے عجیب بے کل سے انداز میں بے تکا سا سوال کیا تھا۔ اور بتول شاہ راہداری کی سمت بڑھتے بڑھتے ایک بار پھر رک گئی تھیں اور سر اٹھا کر سیڑھیوں کی ریلنگ کے قریب کھڑے دل آور کو دیکھا تھا۔

"ہاں....! جا رہی ہوں.... کیوں؟ کوئی کام ہے کیا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"ہاں....! کام تو بہت سے ہیں' مگر فی الحال آپ سے یہی پوچھنا تھا کہ آپ نے ناشتا کیا ہے یا نہیں؟" اس نے

دھیمے، مگر سنجیدہ انداز میں پوچھا تھا اور بتول شاہ اس کی اس قدر فکرمندی پہ اسے دیکھ کے رہ گئی تھیں۔

"نہیں۔۔۔! میں نے ناشتا نہیں کیا۔ صرف ایک کپ چائے کا لیا ہے، لیکن ڈونٹ وری، لنچ ایک ساتھ ہی کریں گے۔ اوکے؟" انہوں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے بہلایا تھا۔

"ہوں۔۔۔! ٹھیک ہے میں بھی ناشتا نہیں کرتا، لیکن ڈونٹ وری، لنچ ایک ساتھ ہی کریں گے۔ اوکے؟" اس نے بھی جواباً انہی کے سے انداز میں جواب دیا تھا، جس پہ بتول شاہ نے اسے خفگی سے گھورا تھا۔

"شاہ۔۔۔ یہ کیا ضد لگا رکھی ہے تم نے؟ مجھے جانے دو گے یا نہیں؟" وہ کافی خفگی سے بولی تھیں اور دل آور کو ذرا دیر کے لیے سنبھلنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ اس پہ غصہ بھی ہو سکتی تھیں۔

"اوکے۔۔۔ اب کچھ نہیں کہتا جائیں آپ۔" اس نے ان کے جانے کے لیے رضامندی دے دی تھی۔

"نیچے آ کر ناشتا کرو اور آفس جاؤ، اللہ حافظ۔" وہ پھر اسے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی تھیں اور دل آور پھر سے مضطرب ہوا تھا۔ اس کا دل پھر سے ان کے پیچھے لپکنے کو چاہا تھا اور اس نے پھر سے اس چاہ کو پورا کیا تھا۔

"اماں۔۔۔" دل آور کے ہونٹ بے ساختہ ذرا سے کپکپائے تھے اور دل پہ جیسے کربلا کا عالم چھا گیا تھا۔ کیونکہ گھر کے گیٹ سے باہر قدم رکھتے ہی اس کا دل دھاڑیں مار مار کے رویا تھا اور ادھر علیزے کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی بہت تڑپی تھی۔ اس نے آخری بار بتول شاہ سے ملنے کی اور ان کا چہرہ دیکھنے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر اس کی اس کوشش کے آڑے گل آ گئی تھی۔ اس نے اسے باہر نکلنے سے روک دیا تھا۔

"نہیں بی بی جی! آپ کا اس طرح سب کے سامنے باہر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے ہی گھر پہ قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔ اب آپ سب کے سامنے جائیں گی تو سب طرح طرح کے سوال کریں گے اور صاحب تو پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ کس کس کو جواب دیں گے؟" گل نے خود بھی سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے اسے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"لیکن گل وہ۔۔۔ وہ جا رہی ہیں۔ میں۔۔۔ میں ان سے پھر کبھی نہیں مل سکوں گی۔ پلیز۔۔۔ مجھے ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار ان سے مل لینے دو۔ میں چادر اوڑھ لیتی ہوں۔ چہرہ ڈھانپ لیتی ہوں۔ مجھے کوئی نہیں دیکھے گا۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ پلیز گل۔۔۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔" علیزے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے ایک بار پھر تڑپی تھی۔ کیونکہ سب مرد حضرات جنازہ لے کر گیٹ سے باہر نکل چکے تھے۔ لیکن کچھ عورتیں، کچھ لڑکیاں تھیں جو گیٹ کے قریب کھڑی ابھی بھی رو رہی تھیں۔ علیزے کے لیے بے شک وہ سب انجان چہرے تھے۔ لیکن گل انہیں اچھی طرح جانتی تھی۔ اسی لیے وہ نارمل تھی۔

"بی بی جی۔۔۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ بس آپ کے سمجھنے کی ضرورت ہے اور ویسے بھی اب وہ لوگ جا چکے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو اس طرح ہلکان مت کریں۔ آپ آرام کریں میں باہر جا رہی ہوں۔ ابھی مہمانوں کو بھی دیکھنا ہے۔ آپ کے پاس بعد میں آؤں گی اللہ حافظ۔" گل اسے کندھوں سے تھام کے بیڈ پہ بٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور اس کمرے میں اکیلی رہ جانے والی علیزے بے ساختہ اپنی بے بسی پہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼
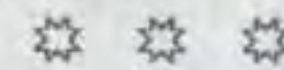
مبارک خان کافی جگہوں سے پتا کر کے آیا تھا۔ مگر زہرہ آنٹی کے بارے میں کہیں سے کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ جس پہ آذر کو بہت مایوسی اور خفگی ہوئی تھی اور ابھی وہ خود کہیں جا کر پتا کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹرز نے وقار آفندی کو ڈسچارج کرنے کے بعد گھر جانے کا مشورہ دے دیا تھا اور آسیہ آفندی فوراً گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ آخر وہ بھی اتنے دنوں سے اسپتال میں رت جگا منانے کے ساتھ ساتھ قید کاٹ رہی تھیں۔ اس لیے

ان کو دیکھتے ہوئے مجبوراً آذر کو بھی گھر جانے کے لیے تیار ہونا پڑا تھا۔

"مبارک خان تم گاڑی نکالو، ہم ڈیڈ کو لے کر آتے ہیں۔" آذر مبارک خان سے کہہ کر وقار آفندی کے روم کی طرف بڑھا تھا۔ لیکن دو قدم آگے بڑھنے کے بعد دوبارہ مبارک خان کی سمت پلٹا تھا۔

"رکو مبارک خان۔" اس نے واپس مڑتے مبارک خان کو آواز دی تھی۔

"کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟" آذر کی سرسری نظر نے بھی بڑا گہرا کام کیا تھا۔

"نہیں صاحب۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" مبارک خان نے آہستگی سے نفی میں گردن ہلائی تھی۔ مگر آذر سمجھ گیا تھا کہ وہ محض اسے ٹالنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔

"ایسی بات ہے مبارک خان۔۔۔ کیونکہ میں نے پہلے کبھی بھی تمہارے چہرے پہ ایسی پریشانی نہیں دیکھی۔ ہاں تم بتانا نہ چاہو تو یہ اور بات ہے۔" آذر واقعی مبارک خان کے چہرے کی پریشانی کو ٹھیک پہچانا تھا۔

"نہیں صاحب! اب آپ سے کیا پردہ بھلا، بس گھر میں بیوی اور بچے دونوں کی طبیعت خراب ہے۔ وہ مجھے ایک دو دن کے لیے گھر بلا رہے تھے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا ہے کہ جب تک صاحب ٹھیک نہیں ہو جاتے میں بھلا کیسے جا سکتا ہوں۔ اس لیے میں ان کی طرف سے تھوڑا پریشان تھا۔ ورنہ اور تو کوئی بات نہیں ہے۔" مبارک خان کو بالآخر بتانا ہی پڑا تھا اور آذر اس کی پریشانی سن کر چپ ہو گیا تھا۔

"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ ابھی تو گھر چلو۔۔۔ پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔" آذر آہستگی سے اور پرسوچ سے لہجہ میں کہتا ہوا دوبارہ پلٹ گیا تھا۔ حالانکہ آذر ابھی بھی اس کی بات پہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔

مگر اس وقت صورت حال ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ زیادہ پوچھ پڑتال یا پھر کرید نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے وقتی طور پہ اس بات کو نظرانداز کر دیا تھا اور پھر کچھ دیر بعد وقار آفندی اور عائشہ آفندی کو ساتھ لے کر واپس بڑی حویلی آ گئے تھے۔

"مما۔۔۔ پاپا۔۔۔ آپ آ گئے۔" عون اور عدید ان کو دیکھتے ہی لپک کر ان سے لپٹ گئے تھے۔

"ہاں میری جان! ہم آ گئے ہیں۔ ہم بہت مس کر رہے تھے تم دونوں کو۔"

آسیہ آفندی نے ان دونوں کو لپٹا کر باری باری ان کے ماتھے پہ پیار کیا تھا۔

"پاپا! وہ۔۔۔ وہ کیسے ہیں اب؟" عدید کا پوچھتے ہوئے لہجہ بھی گلوگیر ہو گیا تھا۔

"اپنے پاپا سے خود پوچھ لو نا وہ کیسے ہیں؟" آسیہ آفندی نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اسے اشارہ کیا تھا اور عدید ان کے اشارے پہ سر ہلا کر فوراً وقار آفندی کے بیڈ کی طرف بڑھ گیا تھا اور بیڈ کی دوسری سائیڈ پہ عون جا کر کھڑا ہو گیا تھا، لیکن وقار آفندی کل سے نجانے کیوں اتنے ساکت و صامت سے ہو گئے تھے کہ انہیں اب اپنے آس پاس کا بھی احساس نہیں رہا تھا کہ ان کے پاس کون ہے اور کون نہیں ہے؟

کیا کہہ رہا ہے اور کیا نہیں کہہ رہا؟

وہ کہاں ہیں اور کہاں نہیں ہیں؟

ان کے تو دل و دماغ میں بس اپنی ادھوری معافی اور پوری زندگی کا سین گھوم رہا تھا۔

اور تو کچھ سنائی دے رہا تھا اور نہ دکھائی۔

بس صرف اور صرف زہرہ بتول شاہ کا چہرہ تھا جو ساری دنیا پہ نقش ہو گیا تھا اور اس چہرے کے سوا ساری دنیا مٹ گئی تھی۔ بیوی، بچے، بہن بھائی، سب رشتے بھول گئے تھے، سب رشتے پیچھے چلے گئے تھے۔

بس اب تو یا زہرہ بتول شاہ یاد تھی۔۔۔ یا پھر۔۔۔ خدا یاد تھا۔۔۔!

جن کی نظروں میں وہ گناہ گار تھے اور جن سے انہوں نے معافی مانگی تھی اور معافی نہیں ملے گی۔ یہ بھی انہیں

یقین تھا اور اسی یقین نے تو انہیں مزید جامد کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

مجھے جو بھی ملا فقط ذات خدا سے ملا۔۔۔

اے ماں خدا سے جو بھی ملا فقط تیری دعا سے ملا۔۔۔

بتول شاہ کی قبر پہ مٹی ڈالتے ہوئے اس کا دل رو رہا تھا اور ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ آج اس کے سب خون کے رشتے دفن ہو چکے تھے۔ مٹی میں مل گئے تھے۔ خاک کے ساتھ خاک ہو گئے تھے اور وہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ سب ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ تقدیر کے آگے ڈٹ نہیں سکا تھا اور تقدیر سب کچھ بہا کے اپنے ساتھ لے گئی تھی اور اسے تنہا کر گئی تھی۔

"دل آور۔" نبیل نے نیچے زمین پہ دو زانو بیٹھے دل آور کے کندھے پہ اپنا مضبوط ہاتھ جماتے ہوئے اسے متوجہ کیا تھا۔

"اٹھو! گھر چلو تمہیں پتا ہے نا تمہارے ایسے حال پہ آنٹی کو کتنی تکلیف ہو گی۔ کیا تم انہیں اور تکلیف دینا چاہتے ہو؟" نبیل نے اسے ذرا نرمی سے بہلانے کی کوشش کی تھی، مگر اس کا بہلنا آسان کب تھا بھلا۔

"تم گاڑی نکالو میں اسے لے کر آتا ہوں۔" عبداللہ نے نبیل کو اشارہ کیا تھا اور نبیل سر ہلا کر پلٹ گیا تھا۔

"دل آور! اٹھو میرے ساتھ گھر چلو تم جانتے ہو نا گھر پہ کتنے مہمان آئے ہوئے ہیں، کتنی دور دور سے مہمان آئے ہیں ان کو کھانا بھی تو کھلانا ہے یا پھر یونہی بھوکا بھیج دو گے سب کو؟" عبداللہ نے نرمی کی بجائے ذرا سنجیدگی سے پوچھا تھا اور یہ سنجیدگی دل آور کے دماغ پہ جا کے لگی تھی۔

وہ بھلا اپنی ماں کی موت کے افسوس کے لیے آئے مہمانوں کو بھوکا کیسے بھیج سکتا تھا؟ نبیل اور عبداللہ نے کراچی سے آتے ہی پہلا انتظام یہی کیا تھا مہمانوں کے لیے کھانا آرڈر کیا تھا اور اب سب مہمانوں کو کھانا کھلانے کا وقت تھا کیونکہ سب جنازہ پڑھ چکے تھے۔ اس لیے ان لوگوں کا ذرا جلدی گھر پہنچنا ضروری تھا۔ اور یہی بات سوچتے ہوئے بالآخر دل آور کو اٹھنا ہی پڑا تھا اور چپ چاپ ان کے ساتھ چل پڑا تھا۔

"دل آور صاحب! اب ہمیں بھی اجازت دیجیے ہم بھی چلتے ہیں ٹائم بھی کافی ہو گیا ہے حالانکہ آپ کو اس دکھ کے وقت میں چھوڑ کر جانے کو دل تو نہیں چاہ رہا لیکن مجبوری ہے کسی خاص جگہ پر ریڈ کا پلان ہے اس لیے پہنچنا ضروری ہے۔" ایس پی کامران مہدی قبرستان کے باہر ہی اپنی گاڑی کے قریب کھڑا انتظار کر رہا تھا اور دل آور کو عبداللہ کے ساتھ قبرستان سے باہر نکلتے دیکھ کر فوراً اس کے قریب آیا۔

"لیکن ایس پی صاحب! آپ کھانا کھائے بغیر کیسے جا سکتے ہیں؟ صبح سے آپ ہمارے ساتھ ایسے ہی گھوم رہے ہیں۔" عبداللہ نے ایس پی کامران مہدی کو روکنا چاہا تھا، لیکن ایس پی کامران مہدی کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ دل آور اور عبداللہ سے ہاتھ ملا کر وہاں سے رخصت ہو گیا تھا اور وہ لوگ وہاں سے گھر آ گئے تھے۔

گھر میں اور بھی بہت سے مہمان تھے، عبداللہ اور نبیل کے ساتھ ساتھ عدیل اور شہریار بھی مہمانوں کی خاطر تواضع میں لگ گئے تھے اور دل آور بس سب کو چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔

"بھائی!" مدحیہ دل آور کو یوں چپ اور نڈھال سے انداز میں بیٹھے دیکھ کر اس کے قریب آ گئی تھی اور دل آور نے محض اسے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور پھر دوبارہ سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا، جس پہ مدحیہ کے دل میں عجیب سا ابال اٹھا تھا اور وہ بے ساختہ صوفے پہ اس کے برابر بیٹھ گئی تھی۔

"آپ۔۔۔ آپ کچھ بول کیوں نہیں رہے؟ آپ کیوں اتنے چپ ہو گئے ہیں؟ کیا صرف آپ کو مما کا غم ہے؟ کیا ہمیں ان کا کوئی غم نہیں ہے؟ کیا وہ میری مما نہیں ہیں؟ آپ تو ان کے آخری وقت میں بھی ان کے ساتھ تھے ان کے پاس تھے لیکن مجھے۔۔۔ مجھے تو ان سے بات کرنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ آپ سے زیادہ دکھ تو مجھے ہو رہا ہے، میں کیا کروں آخر آپ کی طرح چپ اوڑھ کے بیٹھ جاؤں؟ نہ بولوں، نہ روؤں، نہ دیکھوں، نہ سنوں کیا کروں آخر؟ آپ بتائیے۔۔۔ کیا کرنا چاہیے مجھے؟"

مدحیہ نے روہانسے لہجے میں کہتے ہوئے دل آور کا کندھا ہلایا تھا اور دل آور نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا اور یونہی سر جھکائے بیٹھا آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ تھپکنے لگا تھا جیسے اسے تسلی دے رہا ہو، لیکن زبان سے پھر بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ابھی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے گا تو اس کے سارے ضبط ٹوٹ جائیں گے اور سارے حوصلے بکھر جائیں گے اور پھر وہ سب کی لاکھ کوششوں سے بھی سمٹ نہیں سکے گا۔ اس لیے بہتری اسی میں تھی کہ وہ اپنے صبر و ضبط پہ قائم رہتا اور اپنے حوصلے بکھرنے نہ دیتا اور سب اس سوچ پہ دنگ تھے کہ وہ بکھرا کیوں نہیں؟ اور وہ ٹوٹا کیوں نہیں؟ آخر یہ غم کی انتہا تھی یا پھر غم کے بعد صبر کی انتہا تھی کہ اس نے اپنی زبان کے لفظ اور آنکھوں کے آنسو پتھر کر دیے تھے اس کی زبان سے نہ لفظ نکلے تھے اور نہ آنکھ سے آنسو۔۔۔!

بس سب کچھ بے حس اور جامد ہو چکا تھا سب کی کوشش تھی کہ اس کی چپ کو توڑا جائے۔

"بھائی۔۔۔! کیا آپ نے اب بھی نہیں بولنا، کیا اب بھی کچھ نہیں کہنا؟ کیا میری خاطر بھی نہیں؟" مدحیہ کے کہتے کہتے آنسو بہہ نکلے تھے اور دل آور نے گردن موڑ کر ایک بار پھر اپنے بائیں پہلو میں بیٹھی سسکیوں سے روتی مدحیہ کی طرف دیکھا تھا وہ صبح سے مسلسل رو رو کر نڈھال ہو چکی تھی اور چہرہ بھی کافی مرجھایا ہوا سا لگ رہا تھا جسے دیکھ کر دل آور کا دل بھی پگھل گیا تھا وہ واقعی اس وقت اس کے دکھ میں برابر کی شریک لگ رہی تھی۔ اسی لیے دل آور نے اس کے کندھوں کے گرد اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے کندھے سے لگا لیا تھا اور مدحیہ ہچکیوں سے رو پڑی تھی۔

"بس کرو مدحو! چپ ہو جاؤ اور کتنا روؤ گی؟ پلیز مجھے تکلیف مت دو میں سہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" دل آور نے مدحیہ کا کندھا سہلاتے ہوئے اسے چپ کروانے کی کوشش کی تھی اور لاؤنج سے نکل کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی زری کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے اس نے صبح سے لے کر اب تک دل آور کو کچھ بولتے یا کچھ کہتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، لیکن اب وہ کچھ کہہ رہا تھا تو صرف مدحیہ سے اور مدحیہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

"مدحو پلیز! چپ ہو جاؤ ورنہ۔۔۔ ورنہ میں ایسا بکھر جاؤں گا کہ کوئی سمیٹ بھی نہیں سکے گا۔۔۔ پلیز مجھے میرے اختیار میں رہنے دو۔" دل آور کا لہجہ بہت کمزور ہو رہا تھا اور زری اس کے کمزور لہجے پہ خود بکھرنے لگی تھی، اس کی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو گئی تھیں۔ شاید یہ حقیقت تھی یا فسانہ تھا، لیکن جو بھی تھا آج واقعی دل آور شاہ کے دکھ پر ہر آنکھ پرنم تھی، ہر آنکھ میں آنسو تھے، ہر دل میں دکھ تھا۔ کیونکہ اس کا درد سب نے گہرائی میں جا کر محسوس کیا تھا۔

"سر۔۔۔! ہمیں بھی اب اجازت۔۔۔" عدیل اور شہریار اچانک ہی زلفی کے ساتھ اندر آ گئے تھے، لیکن اندر کا رونا بلکنا منظر دیکھ کر قدم وہیں کے وہیں رک گئے تھے اور انہیں شرمندگی ہوئی تھی کہ وہ غلط وقت پہ آ گئے ہیں۔

"اندر آ جاؤ عدیل! باہر کیوں رک گئے ہو؟" دل آور ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اسی لیے انہیں اندر آنے کا کہا تھا اور مجبوراً عدیل اور شہریار کو اندر آنا ہی پڑا تھا۔

"سر۔۔۔! کافی ٹائم ہو چکا ہے، ہمیں اب اجازت دیں آپ سے ان شاء اللہ صبح ملاقات ہو گی۔" عدیل نے دل آور کے کندھے سے لگ کے روتی ہوئی مدحیہ کو اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اور پھر نظریں جھکا لی تھیں۔ آخر وہ

دل آور شاہ کے سامنے اس کو نظر بھر کے دیکھنے کی جرات کیسے کر سکتا تھا؟

"کھانا وغیرہ کھایا؟" دل آور نے مختصر سے انداز میں پوچھا تھا۔

"نہیں سر۔۔۔! نبیل صاحب اور عبداللہ صاحب نے تو بہت اصرار کیا ہے، مگر ہمیں فی الحال بھوک نہیں ہے اس لیے کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔" عدیل نے نفی میں سر ہلایا تھا اور خود دل آور بھی اس حالت میں نہیں تھا کہ وہ مزید اصرار کرتا اور کھانا کھانے کے لیے روک لیتا۔ اس لیے اس کی حالت کے پیش نظر ہی عدیل وغیرہ نے اس سے جلدی اجازت چاہی تھی اور وہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔

اسی طرح رفتہ رفتہ سبھی مہمان باری باری رخصت ہوتے گئے تھے، البتہ نبیل اور عبداللہ نے آج رات اس کے پاس ہی ٹھہرنے کی کوشش کی تھی، لیکن دل آور نے انہیں منع کر دیا تھا۔

کیونکہ وہ دونوں بے حد تھکے ہوئے تھے، پہلے نبیل کے گھر دعوت، پھر صبح اٹھ کر کراچی جانا، پھر پورے دن کی بھاگ دوڑ، پھر ہوٹل میں رات گزارنے کے بعد افراتفری میں دوبارہ لاہور واپسی اور پھر یہاں آکر بھی ان دونوں نے ہی سب کچھ سنبھالا تھا اس لیے اب ضروری تھا کہ وہ دونوں اپنے گھر جاتے اور سکون سے آرام کرتے کیونکہ بے سکونی اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے کسی کی بھی طبیعت خراب ہو سکتی تھی اسی لیے دل آور نے انہیں یہاں رکنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ یہاں رہ کر وہ بھی اس کی وجہ سے سکون کی نیند نہیں سو سکتے تھے لہٰذا یہی بہتر تھا کہ وہ گھر چلے جاتے۔

"عبداللہ چلا جاتا ہے، لیکن میں رک جاتا ہوں، ڈونٹ وری۔ مام اور مدیحہ آسانی سے رہ لیں گی اور ویسے بھی اب تو مومنہ بی بی بھی ہے ان کے ساتھ۔" نبیل اسے تنہا چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"عبداللہ پلیز یار! سمجھاؤ اسے کتنی دیر اور کتنے دن رکو گے میرے ساتھ۔۔۔؟ آج۔۔۔؟ کل۔۔۔؟ پرسوں۔۔۔؟ ہفتہ۔۔۔؟ دو ہفتے۔۔۔؟ مہینہ۔۔۔؟ دو مہینے۔۔۔؟ سال۔۔۔؟ دو سال۔۔۔؟ آخر کب تک رکو گے۔۔۔؟ یہ میرا گھر ہے اور یہاں میں نے تنہا ہی رہنا ہے کوئی بھلا کب تک ساتھ دے سکتا ہے؟ اور جب کوئی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساتھ نہیں دے سکتا تو پھر صرف ایک دن کے لیے یا پھر ایک رات کے لیے بھی کیوں؟ یہ رات بھی بس چند گھنٹوں کی رہ گئی ہے ابھی تھوڑی دیر میں ختم ہو جائے گی اور بس۔۔۔!" دل آور نبیل کی ضد پہ نجانے کیوں اتنا تلخ ہو گیا تھا کہ نبیل نے دوبارہ کچھ بھی نہیں کہا تھا اور اس سے ہاتھ ملا کر عبداللہ وغیرہ کے ساتھ ہی وہاں سے چلا گیا تھا، لیکن نبیل کا اس طرح جانا بھی دل آور کے دل پہ بوجھ چھوڑ گیا تھا اور اس کا ذہن اور زیادہ اپ سیٹ ہو گیا تھا اور وہ وہیں کا وہیں گیٹ کے پاس ہی کھڑا رہ گیا تھا جسے کافی دیر بعد گلاب خان نے آکر متوجہ کیا تھا۔

"صاحب! باہر کافی ٹھنڈ ہو رہی ہے آپ یہ چادر اوڑھ لیں موسم اچھا نہیں ہے آپ بیمار پڑ جائیں گے۔" گلاب خان اس کی کالے رنگ کی گرم چادر لے کر اس کے قریب آگیا تھا اور چادر کی تہ کھول کر اس کے کندھوں کے گرد پھیلا دی تھی اور دل آور نے اک گہری سانس کھینچتے ہوئے قدم اندر کی سمت موڑ لیے تھے اور گلاب خان نے گیٹ بند کر دیا تھا۔

"صاحب! آپ کے لیے چائے لے کر آؤں؟" وہ اندر آکر ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ کھڑا خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جب گل اس کے پاس آکھڑی ہوئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس نے کل سے کھانے کا ایک ذرہ بھی زبان پہ نہیں رکھا وہ اتنے گھنٹوں سے مسلسل بھوکا بھی ہے اور پیاسا بھی اور اس کے سب دوست وغیرہ بھی جا چکے ہیں۔ ایسے میں اسے کھانے کے لیے بھلا کون کہے گا؟ اور کون پوچھے گا اس سے؟ اس لیے یہ ہمت گل نے خود ہی کرلی تھی۔

لیکن دل آور کو آج بھلا کسی چیز کی کب طلب تھی آج تو جیسے اس کی پوری ہستی اور پوری ذات ہی مر چکی تھی۔

وہ تو بس خالی، کھوکھلا اور خواہشوں سے عاری وجود لیے ہی کھڑا تھا اور تو کچھ بھی باقی نہیں تھا۔

"آپ کہتے ہیں تو کافی بنا لیتی ہوں۔" گل نے پھر سوال بدل کر دہرایا تھا۔

"نہیں! کسی چیز کی بھی طلب نہیں ہے۔ تم جاؤ آرام کرو جا کر تم بھی تھک گئی ہو گی۔"

دل آور نے آہستگی سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر تھپکتے ہوئے اسے جانے کا کہا تھا اور خود بتول شاہ کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا تھا جبکہ گل کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے، دل آور کو یوں تھکے تھکے اور خالی خالی سے انداز میں تنہا بتول شاہ کے بیڈ روم میں جاتے دیکھ کر اس کا دل مٹھی میں آگیا تھا اور وہ اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی تھی اور دل آور بتول شاہ کے بیڈ روم میں آگیا تھا جہاں سب کچھ ابھی بھی تازہ تھا جیسے وہ بیڈ روم سے ابھی ابھی تیار ہو کر باہر نکلی ہوں اور ان کے لیڈی پرفیوم کی دلفریب سی مہک بیڈ روم کی فضا میں ابھی بھی رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"شاہ۔۔۔! کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟" اک سرگوشی نما سرسراہٹ دل آور کی سماعتوں کو چھو کے گزر گئی تھی اور اس نے بے ساختہ پورے بیڈ روم میں ادھر ادھر دیکھا تھا اور بیڈ روم کو خالی پا کر پھر سے دل بھر آیا تھا۔

"صاحب۔۔۔! اب آپ بھی آرام کر لیں نا دیکھیں، بہت ٹائم ہو گیا ہے۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔" گلاب خان بھی اس کی خاطر ابھی تک جاگ رہا تھا کیونکہ جب تک وہ نہ سو جاتا، ان لوگوں کو بھی بھلا کب سکون تھا؟ اور دل آور نے بڑے حوصلے اور بڑے ضبط کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اپنے پیچھے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے گلاب خان کو دیکھا تھا۔

"صاحب۔۔۔! ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کا دکھ، آپ کا غم بہت بڑا ہے اور اس دکھ کا اور اس غم کا کوئی مداوا بھی نہیں ہے، لیکن یہ دکھ اور یہ غم ایسا ہے کہ ہر کوئی اپنے سینے میں لیے پھر رہا ہے، زندگی میں ہر کسی کو یہ چوٹ لگتی ہے، ہر کسی کو یہ درد سہنا پڑتا ہے۔ ماں باپ ہمیشہ ساتھ نہیں رہتے اور ماں باپ کے مر جانے سے اولاد مر نہیں جاتی یہ زندگی ہے اور زندگی چلتی ہی رہتی ہے کسی کے چلے جانے سے زندگی رک نہیں جاتی، ہاں دل میں دکھ ضرور رہ جاتا ہے اور دکھ تو ہمیشہ انسان کی زندگی کا حصہ بنے رہتے ہیں۔ بس انسان کو حوصلہ رکھنا چاہیے اور مجھے پتا ہے کہ آپ کا حوصلہ اور آپ کا صبر بہت بلند ہے۔ آپ بہت مضبوط ہیں، اس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن آپ کو اپنا بھی خیال رکھنا چاہیے کیونکہ آپ اپنا خیال نہیں رکھیں گے تو اور کون رکھے گا؟" گلاب خان نے بڑے مدبرانہ اور دوستانہ سے انداز میں دل آور کو سمجھانے کی اور ہمت بندھانے کی کوشش کی تھی، جس پہ دل آور محض سر ہلا کر چپ ہو کے رہ گیا تھا۔

"صاحب۔۔۔! آپ اس وقت اپنے کمرے میں جائیے، آرام کیجیے، یہ دکھ تو اب ہمیشہ ساتھ ہی رہے گا۔" گلاب خان آگے بڑھ کے اسے کندھے سے تھام کے باہر لے آیا تھا اور بتول شاہ کے بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

"رہنے دو گلاب خان! میں خود چلا جاؤں گا۔" اس نے سیڑھیوں کے قریب آکر گلاب خان کے سہارے کی بجائے سیڑھیوں کی ریلنگ تھام لی تھی۔

"ٹھیک ہے! آپ جائیں آرام کریں۔" گلاب خان آہستگی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اور دل آور بمشکل قدم اٹھاتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔

"صاحب جی۔۔۔! وہ۔۔۔ وہ آپ سے کچھ کہنا تھا۔" گلاب خان کو اچانک کچھ یاد آیا تھا اور دل آور کے قدم رک گئے تھے اس نے پلٹ کر گلاب خان کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"صاحب جی۔۔۔! مجھے نہیں پتا کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟ اور آپ کے دماغ میں کیا ہے؟ لیکن جو میرے دل میں تھا اور جو میرے دماغ میں تھا میں نے وہی کیا ہے اگر آپ کو ناگوار گزرے تو معافی چاہتا ہوں، لیکن میں نے

علیزے بی بی کا اور آپ کا رشتہ دیکھتے ہوئے انہیں بیس منٹ میں بھیجنے کے بجائے صبح آپ کے بیڈ روم میں بھیج دیا تھا کیونکہ میرے خیال اور میری عقل کے حساب سے دیکھا جائے تو اب وہی ان کی اصل جگہ ہے۔ اور اصل مقام ہے جس میں آپ کی بھی عزت ہے اور ان کی بھی عزت ہے۔۔۔! اس لیے اس میں علیزے بی بی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ نے اگر کچھ کہنا ہے تو مجھے کہہ لیں۔۔۔ میں آپ کی ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔" گلاب خان نے دل آور کے بیڈ روم میں جانے سے پہلے علیزے کی وہاں موجودگی کا مسئلہ کلیئر کر دینا بہتر سمجھا تھا۔

"سزا۔۔۔؟" دل آور نے زیر لب دہرایا تھا۔

"جی ہاں صاحب جی سزا۔۔۔! کیونکہ آپ مالک ہیں اور میں ملازم ہوں اور میں نے ایک ملازم ہو کر آپ کی ذاتی زندگی میں مداخلت کی ہے۔ آپ کی اجازت کے بغیر یہ قدم اٹھایا ہے حالانکہ میری اتنی اوقات نہیں ہے کہ میں ایسا کچھ کروں۔ اس لیے آپ کو پورا پورا حق ہے کہ آپ مجھے سزا دیں یا مجھ پہ غصہ کریں۔۔۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا میں حاضر ہوں۔" گلاب خان اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا جبکہ دل آور کے دل و دماغ پہ کچھ اور ہی چل رہا تھا۔

"اماں۔۔۔! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ تکلیف کم ہوئی یا نہیں؟" وہ لپک کے پاس آیا تھا۔

"تکلیف۔۔۔ کم۔۔۔ ہو سکتی ہے۔۔۔ اگر۔۔۔ اگر۔۔۔ تم۔۔۔ کرو۔۔۔ تو۔۔۔" بتول شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اس کے چہرے کو چھونے کی کوشش کی تھی مگر ڈرپ لگی ہوئی تھی اس لیے ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔! میں کروں گا۔۔۔ ضرور کروں گا۔۔۔ آپ کہیں کیا بات ہے۔۔۔؟" اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ نے۔۔۔ آج۔۔۔ و۔۔۔ وقار۔۔۔ آفندی۔۔۔ کی حالت۔۔۔ دیکھی ہے۔۔۔ و۔۔۔ وہ۔۔۔ اپنی۔۔۔ سزا۔۔۔ اسی۔۔۔ دنیا۔۔۔ میں۔۔۔ بھ۔۔۔ بھگت۔۔۔ چکا۔۔۔ ہے۔۔۔ تت۔۔۔ تم۔۔۔ اب۔۔۔ علیز۔۔۔ ے۔۔۔ کو۔۔۔ سزا۔۔۔ مت۔۔۔ دو۔۔۔ میرا۔۔۔ خدا۔۔۔ گواہ۔۔۔ ہے۔۔۔ میں نے۔۔۔ آج۔۔۔ وقار۔۔۔ آفندی۔۔۔ کو معاف کیا۔۔۔ معاف کیا میں نے۔۔۔"

بتول شاہ کے الفاظ سے عرش فرش کانپ گئے تھے اور دل آور شاہ تو جیسے کھڑے قدسے ڈھے گیا تھا۔ اور کھڑے قد سے ڈھے جانے والے دل آور شاہ کے دل و دماغ پہ اب یہی آواز بار بار بازگشت کر رہی تھی۔

"میرا۔۔۔ خدا۔۔۔ گواہ۔۔۔ ہے۔۔۔ میں نے۔۔۔ آج۔۔۔ وقار۔۔۔ آفندی۔۔۔ کو معاف کیا۔۔۔ معاف کیا میں نے۔۔۔!"

"معاف کیا میں نے۔۔۔!"

"معاف کیا میں نے۔۔۔!"

وہ گلاب خان سے کچھ بھی کہے بغیر سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا، لیکن ذہن میں وہی الفاظ مسلسل تکرار کر رہے تھے۔

اس کے قدم من من بھر کے ہو چکے تھے اور ایک ایک سیڑھی ایک ایک صدی کی مسافت پہ محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یونہی سیڑھیاں چڑھتے نیچے گر جائے گا کیونکہ اس کے قدموں میں ذرا بھی توازن نہیں تھا وہ کسی بھی وقت اپنا توازن کھو سکتا تھا اور اس کے قدم کسی بھی وقت لڑکھڑا سکتے تھے اسی لیے تو اس نے سیڑھیوں کی ریلنگ تھام رکھی تھی اور اسی لیے تو گلاب خان بھی پیچھے کھڑا اسے چڑھتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

کل کا پورا دن گزر گیا تھا اور کل کی پوری رات گزر گئی تھی۔

آج کا پورا دن گزر گیا تھا اور آج کی آدھی رات گزر گئی تھی اور وہ دل آور کی طرح مسلسل بھوکی اور پیاسی بیٹھی

ہنوز جاگ رہی تھی اور جل رہی تھی بچین ایک پل نہیں تھا۔
وہ بیڈ سے کھڑکی تک اور کھڑکی سے بیڈ تک نجانے کتنے ہی چکر کاٹ چکی تھی جن سے یوں لگ رہا تھا جیسے پاؤں کے تلوے بھی شل ہوگئے ہوں اور آخر کار یہ شل ہوئے تلوے بھی جواب دے گئے تھے اور وہ تھک ہار کے نڈھال سی ایک بار پھر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی اور ابھی اسے بیڈ پہ بیٹھے دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اچانک دروازے پہ آہٹ سی سنائی دی اور اگلے چند سیکنڈ میں دروازے کا ہینڈل گھما کر وہ اندر داخل ہوا تھا اور علیزے اسے دیکھ کر جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی تھی۔
بے شک جو بھی تھا۔ دن جیسے بھی گزر گیا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اسے اپنے سامنے اور اپنے ساتھ ایک ہی بیڈ روم میں دیکھ کر "خاک" ہوگئی تھی۔ اس کے دل و دماغ برف کی مانند سرد پڑ گئے تھے اور وہ بوجھل اور مضمحل سے دل آور کو اپنی سمت قدم بڑھاتے ہوئے بڑی بے تاثر اور سپاٹ سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
وہ لڑکھڑاتے ہوئے غیر متوازن اور ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتا ہوا عین اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا اور علیزے نے آہستگی سے اس سے نظریں چراتے ہوئے سر جھکا لیا تھا جبکہ اس کے سامنے کھڑا مضبوط پہاڑ نما دل آور شاہ اپنے اندر کے دکھ کی وجہ سے بھربھری ریت کی طرح بکھر گیا تھا۔
"علیزے...!" وہ ہارے ہوئے انداز میں علیزے کے سامنے قالین پہ دو زانو بیٹھتے ہوئے اس کی گود میں منہ چھپا کر رو پڑا تھا اور علیزے جو پہلے ہی خاک ہوئی بیٹھی تھی اس کے اس طرح بکھرنے پہ خود بھی بکھر گئی تھی۔
وہ ساکت و صامت سی اپنی گود میں منہ چھپائے انتہائی شدت سے روتے ہوئے دل آور شاہ کو دیکھ رہی تھی' کیونکہ اس نے دل آور شاہ کو اتنے ہارے ہوئے اور اتنے شکستہ روپ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
مگر آج اس کا دکھ واقعی اتنا بڑا تھا کہ وہ ٹوٹ گیا تھا... بکھر گیا تھا...!
اور وہ ٹوٹ کے بکھرا بھی تھا تو کس کے پاس...؟
علیزے دل آور شاہ کے پاس... جو اسے سمیٹ بھی نہیں سکتی تھی۔ جو اسے سنبھال بھی نہیں سکتی تھی۔
"علیزے...! آج دل آور شاہ مر گیا... مر گیا آج دل آور شاہ... آج میں زہرہ بتول شاہ کو نہیں' دل آور شاہ کو دفن کر کے آیا ہوں۔ آج میں دل آور شاہ کو قبر میں اتار آیا ہوں۔ مٹی ڈال آیا ہوں دل آور شاہ پہ... آج مٹ گیا دل آور شاہ آج سچ مچ مٹ گیا...!"
وہ بہت بری طرح رو رہا تھا۔ اور علیزے اتنے مضبوط اور اونچے پورے مرد کو اپنی گود میں منہ چھپا کے روتے ہوئے دیکھ کر عجیب بے بس سی ہونے لگی تھی۔ اس کا دل بھی رونے لگا تھا۔ کچھ اس کے دکھ پہ... کچھ اپنے دکھ پہ...
"میری تیس سالہ زندگی میں مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ ماں کیا ہوتی ہے اور باپ کیا ہوتا ہے...؟ بس مجھے اتنا پتا ہے کہ زہرہ بتول شاہ کیا ہوتی ہے...؟"
"علیزے...! وہ صرف میری ماں ہی نہیں تھیں... بلکہ... وہ... وہ تو میرے لیے باپ بھی تھیں... وہ میری زندگی... اور میری کل کائنات تھیں... میرا سب کچھ وہی تو تھیں... میں جو کچھ بھی تھا صرف انہی کے دم سے تھا... اب وہ نہیں ہیں تو میں بھی اب کچھ نہیں ہوں... مگر دکھ اس بات کا ہے کہ انہوں نے پوری زندگی کوئی سکھ نہیں دیکھا... کوئی خوشی نہیں پائی... پہلے زندگی کانٹوں پہ بسر کردی... اور اب قبر کو گھر بنا لیا ہے... اور میں... ہمیشہ کا بد نصیب... ان کے لیے کچھ بھی تو نہیں کرسکا... کچھ بھی تو نہیں...؟"
ہمیشہ سب کے سامنے آن بان اور شان سے رہنے والا آج علیزے کے سامنے یوں بکھر رہا تھا' یوں ٹوٹ رہا تھا جیسے وہ اس کی ذات کا آئینہ تھی' اس کی ذات کا عکس تھی' اس کی ذات کا حصہ تھی... جس کے سامنے ٹوٹ کر

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

بکھرتے ہوئے اسے کوئی شرم نہیں تھی اور اسے کوئی عار نہیں تھا۔ پورا دن کسی کے بھی سامنے اس کی آنکھ سے آنسو تک نہیں ٹپکا تھا اور یہاں وہ یوں لگ رہا تھا جیسے پوری زندگی کی کسر پوری کردے گا۔
"ڈرائیور...!" علیزے اس کی ایسی حالت اور ایسی کیفیت برداشت نہیں کرپا رہی تھی اس نے بے حد آہستگی سے اور رندھی ہوئی آواز سے اسے پکارا تھا۔ اس کے اپنے آنسو بھی بہہ رہے تھے اور کچھ نہ سہی' لیکن بتول شاہ کا دکھ تو اسے بھی تھا وہ بھی کل رات سے ان کے لیے بہت زیادہ روئی تھی۔ اس کا دل بھی موم کی طرح پگھل رہا تھا۔
"علیزے...! وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی ہیں مجھے۔ اکیلا کر گئی ہیں مجھے' میں تنہا ہوگیا ہوں آج' بالکل تنہا اتنی بڑی دنیا میں اور اتنے سارے دوستوں میں بھی تنہا ہوگیا ہوں۔ آج میرے سارے رشتے ختم ہوگئے ہیں... سارے رشتے۔ دل آور کی آواز حد سے زیادہ بھاری — ہو رہی تھی۔
علیزے کو تو یہ سمجھ بھی نہیں آرہی تھی کہ وہ اسے کوئی حرف تسلی کہے بھی تو کیسے...؟ وہ سدا کی معصوم... اور سدا کی نادان... اسے تو سلیقہ ہی نہیں تھا کہ ایسی رنجیدہ اور دلخراش صورت حال میں کیا کہنا چاہیے؟ اور کیسے پیش آنا چاہیے؟ بس اس پگھلتے ہوئے وقت اور احساس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے اتنا کیا تھا کہ اپنا لرزتا کپکپاتا ہوا ہاتھ اٹھا کر بڑے حوصلے اور بڑے صبر کے ساتھ دل آور کے بالوں پہ رکھ دیا تھا۔
"ڈرائیور...! پلیز مت رو' بس کرو اس روز میں رو رہی تھی اور تمہیں مجھ پہ رشک آرہا تھا' لیکن آج نجانے کیا بات ہے کہ تم رو رہے ہو اور مجھے تم پہ رشک نہیں آرہا بلکہ رونا آرہا ہے کیونکہ میں جانتی ہوں تم اس وقت تنہا ہو' واقعی تنہا ہو اور تنہائی انسان کے لیے زہر ثابت ہوتی ہے۔ ایک نہ ایک دن مار دیتی ہے۔ جیسے مجھے مار دیا ہے اس تنہائی نے۔" علیزے خاصے بھرائے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی اور اس کے آنسو دل آور کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔ انہی بالوں میں جن میں علیزے کے ہاتھ کی دودھیا نازک مخروطی انگلیاں دل آور کے لیے ایک تسلی بن کے سرک رہی تھیں اور دل آور اس تسلی کے باوجود بھی خود کو سنبھال نہیں پا رہا تھا اس کے ذہن میں بتول شاہ کا ہی خیال بھٹک رہا تھا۔ اس کی سوچ وہیں پہ اٹکی ہوئی تھی۔ وہ وہیں پر منجمد ہوا لگ رہا تھا۔
"علیزے...! اگر تنہائی کا یہ زہر تمہیں یا مجھے مار سکتا ہے تو پھر سوچو کیا یہ زہر انہیں نہیں مار سکتا تھا؟ انہوں نے بھی تو پوری زندگی تنہا گزاری ہے' اک عمر تنہائی کاٹی ہے انہوں نے... اور آج بھی وہ تنہا ہی چلی گئیں اور... اور مجھے بھی تنہا کر گئی ہیں۔ علیزے...! تمہیں... تمہیں نہیں پتا کہ میں کتنا تنہا ہوں؟ کتنا تنہا...!"
دل آور نے علیزے کے ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے پہ رکھ لیے تھے اور اس کے رخساروں پہ آنسوؤں کی نمی اور شیو کی چبھن علیزے کو اپنی ہتھیلیوں میں محسوس ہوئی تھی اور اس نے کسمسا کر اپنے ہاتھ پیچھے ہٹانے چاہے تھے مگر دل آور کی گرفت اب اتنی بھی کمزور نہیں تھی کہ وہ ہاتھ چھڑاتی اور اس سے ہاتھ چھوٹ جاتے...!
"م... میں تمہارے لیے چائے بناؤں ڈرائیور؟" علیزے کو اس کے سامنے سے اٹھنے کا اور کوئی بہانا نہیں سوجھا تھا۔

عائشہ نصیر احمد

بلا عنوان

"نہیں۔۔۔! مجھے کسی چیز کی بھی طلب نہیں ہے۔۔۔ نہ بھوک ہے، نہ پیاس ہے، کچھ بھی نہیں ہے۔"
اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے علیزے کے ہاتھ اپنے چہرے سے نیچے کرلیے تھے اور پھر اس کے دونوں ہاتھوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے انہیں یوں جوڑ دیا تھا جیسے وہ دعا مانگ رہی ہو اور اس دعا کے انداز میں جوڑے ہاتھوں کو دیکھ کر وہ عجیب تلخی سے مسکرا دیا تھا۔

"کاش۔۔۔! تم نے میرے مرنے کی دعا دل سے کی ہوتی علیزے۔۔۔ تو آج شاید میں مر ہی چکا ہوتا؟" اس نے علیزے کے ہاتھ آہستگی سے جھٹک دیے تھے اور علیزے کا چہرہ اونچا کرکے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"لیکن۔۔۔! بگڑا اب بھی کچھ نہیں۔ دعا تو تم اب بھی کرسکتی ہو۔ میرے پاس بھی اب کچھ نہیں رہا جینے کے لیے۔۔۔ ہاں البتہ میرے مرنے سے اب یہ فرق پڑے گا کہ تم بیوہ کہلانے لگوگی۔۔۔ "دل آور شاہ کی بیوہ" اور مجھے پتا ہے تمہیں اس لفظ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا بلکہ خوشی محسوس ہوگی اور میں تمہیں خوش ہی تو کرنا چاہتا ہوں؟"
وہ عجیب بہکی بہکی باتیں کررہا تھا اور علیزے اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اس کے حواس واقعی اڑے ہوئے لگ رہے تھے اس کی باتوں میں بے ربطگی آگئی تھی۔
"ڈرائیور۔۔۔! یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ تم کیا کہہ رہے ہو؟" علیزے کو حیرت ہوئی تھی۔
"ہونہہ۔۔۔! کچھ نہیں۔۔۔" وہ سر جھٹک کر اس کے سامنے سے اٹھ گیا تھا اور علیزے اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے اپنے ہاتھوں کو اور اپنے دامن کو دیکھتی رہ گئی تھی۔
وہ وہاں سے اٹھ کر راکنگ چیئر پہ جا بیٹھا تھا اور پلکیں موند کر پھر سے بتول شاہ کے لیے پگھلنے لگا تھا اور علیزے راکنگ چیئر پہ جھولتے دل آور کو چند سیکنڈ یونہی دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر وہاں سے باہر آگئی۔ اس گھر میں تھوڑا بہت چلنے پھرنے سے یہ تو اسے اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ کچن کہاں ہے وہ سیدھی کچن میں جا پہنچی۔
اس کا ارادہ چائے بنانے کا تھا حالانکہ اس نے آج تک کبھی بھی چائے نہیں بنائی تھی، لیکن آج دل آور کی حالت اور صورت حال دیکھ کر بے ساختہ ہی اس نے چائے بنانے کا سوچا تھا اور وہ اس سوچ پہ عمل پیرا بھی ہوگئی تھی۔

اس نے چند روز پہلے گل کو چائے بناتے ہوئے دیکھا تھا وہ دیکھنا ہی اس کے کام آگیا تھا اور اس نے سب کچھ ڈھونڈ ڈھانڈ کے آخر کار چائے بنالی تھی اور پھر واپس کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ جس طرح ہوا کے جھونکے کی طرح گئی تھی۔ اسی طرح واپس بھی آگئی تھی۔
"ڈرائیور۔۔۔!" اس نے قریب آکر آہستگی سے پکارا تھا، لیکن وہ یونہی آنکھیں بند کیے پڑا رہا تھا۔
"ڈرائیور۔۔۔!" اس نے دوبارہ اسے پکارا۔
"ہوں۔۔۔؟" اس نے بمشکل "ہوں" میں جواب دیا تھا۔
"چائے۔۔۔!" علیزے کی آواز دھیمی پڑگئی تھی جبکہ دل آور نے یکدم آنکھیں کھول دی تھیں وہ اس کے سامنے چھوٹی سی ٹرے میں چائے کا کپ لیے کھڑی تھی۔ اور اس کو اس روپ میں دیکھ کر دل آور اپنی پوری ہستی سے ششدر سا رہ گیا تھا اور اس کے ہونٹ آہستگی سے کپکپائے تھے۔
"بیوی۔۔۔؟" اس کے اعصاب یکدم جھنجھنا اٹھے تھے۔

(باقی آئندہ)

"ارے کچھ خدا کا خوف کرو تم لوگ اور کتنی تصویریں کھنچواؤ گے۔"

انیقہ سر جھکائے بیٹھی تھی جب اس کے پہلو میں بیٹھے شاہ میر کی بے زار سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"دو گھنٹے تو پہلے ہی ان اوٹ پٹانگ رسموں میں نکل گئے اور اس سے پہلے دو گھنٹوں کا فوٹو سیشن آپ لوگوں کا جی نہیں بھرا۔ اتنی تصویروں کا کرنا کیا ہے۔"

وہ شاید ناک تک بھر چکا تھا۔ شادی کی وہ روایتی تھکن تو ایک جانب اب جو بہنوں اور کزنز نے گھیر رکھا تھا اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

"اُفوہ شاہ میر بھائی، آپ بھی نا۔" چھوٹی بہن صفا کو اس کی بات بری لگی۔

"شادی زندگی میں صرف ایک ہی بار ہوتی ہے بار بار تھوڑی ہم نے آپ کو یوں بٹھا کے وی آئی پی پروٹوکول دینا ہے۔ اس لیے خود بھی انجوائے کریں اور ہمیں بھی اپنے دل کے ارمان نکالنے دیں۔"

"اپنے دل کے کچھ ارمان ازمیر کی شادی کے لیے بھی بچا رکھو اور شاہ میر بھیا کو بخش دو۔ اس سے پہلے کہ وہ تنگ آ کر خود ہی اپنی دلہنیا اٹھا کر لے جائیں۔" اطہر بیچ میں کود پڑا تھا۔ صفا نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔

"توبہ ہے کیسی بکواس کرتا ہے وہ بھی اس طرح سب کے سامنے۔" اس کا دل چاہا اپنی اونچی ہیل کی سینڈل اتار کر اسے دے مارے۔

"ہاں لڑکو! ختم کرو اب سب کچھ۔۔۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو چکی ہے۔ بچی بے چاری بھی تھک گئی ہوگی۔" پھپھو نے بھی فوراً ہی شاہ میر کے واویلے پر کان دھرتے ہوئے انہیں اپنی محفل برخاست کرنے کا حکم دیا۔ لڑکیاں کافی جز بز ہوئیں۔

"تم نوشی۔۔۔! بھابھی کو کمرے میں لے جاؤ۔۔۔ میں دودھ وغیرہ بھجوا دیتی ہوں۔" نوشی سے کہتے وہ خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"اور پھپھو۔۔۔ ہمارے لیے چائے بھی۔" ان کے کچن کے جانے کا سنتے ہی ملی جلی آوازیں ابھریں جن میں زیادہ تر لڑکوں کی ہی تھیں جن کا شاید سونے کا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔

"آئیے بھابھی!" اس کی دونوں نندوں نوشی اور صفا نے اس کا بھاری بھرکم لہنگا سنبھالتے ہوئے اسے اٹھنے میں مدد دی۔

انیقہ بے اختیار ہی دل میں خدا کی شکر گزار ہوئی تھی۔ مسلسل بیٹھے رہنے سے اس کی کمر اکڑ گئی تھی۔ سر بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں بھی جل رہی تھیں۔ اس وقت اس کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ اب اس کے سامنے صرف ایک آرام دہ بستر آئے اور وہ اس پر گر کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائے۔

"یہ ازمیر کہاں ہے جب سے ہم آئے ہیں نظر ہی نہیں آیا۔" کچن کی طرف جاتے ہوئے پھپھو کو اچانک ہی خیال آیا تو پلٹ کر پوچھنے لگیں۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی کچھ وہ ہال ہی میں کہہ رہا تھا کہ اسے گھر جا کر فوراً سونا ہے۔" فاخر نے جواب دیا تو سبھی چونک گئے۔

"لو ازمیر کی طبیعت خراب ہے اور تم نے ہمیں بتایا تک نہیں۔" تائی لہجے میں غصہ لیے بیٹے سے پوچھنے لگیں۔

"اب اتنی بھی خراب نہیں تھی صرف سر درد کی شکایت کر رہا تھا اور شادی کے ہنگامے میں وہ تو ہونی ہی تھی خود میرے سر میں بھی تو درد ہے۔" فاخر نے ان کی تشویش دیکھ کر انہیں مطمئن کرنا چاہا۔

"لیکن تم تو اس کی طرح جا کر کمرے میں نہیں پڑ گئے ہو۔" مہک نے فوراً ہی جتایا۔

"چلو اب تو وہ سو ہی چکا ہوگا کیا اس کی نیند خراب کرنا۔" پھپھو نے بات سمیٹی تھی۔

"تھینک گاڈ! ورنہ میں تو بتا کر پچھتا رہا تھا کہ آپ لوگ کہیں اسے جگا کر ڈاکٹر کے پاس ہی نہ بھجوانے پر تل جائیں۔" فاخر نے ہنس کر کہا تھا۔

انیقہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی کیونکہ نوشی اور صفا، بھائی کی خراب طبیعت کا سن کر فکرمندی سے فاخر کی بات سننے رک گئی تھیں۔ اب جو اس نے تسلی کرائی تو انہوں نے بھی قدم بڑھا دیے تھے اور اسے سیکنڈ فلور پر بنے اس خوبصورت ڈیکوریٹڈ روم تک پہنچایا تھا۔

جہازی سائز کے اس سرخ اور سفید پھولوں سے سجے بیڈ پر تکیوں سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے بے اختیار ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔ پورے دن میں یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنے آرام دہ انداز میں بیٹھی تھی۔ شاہ میر کا کوئی پتا نہیں تھا اسی لیے اس نے آنکھیں موند کر اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے دیگر دلہنوں کے برعکس اسے کوئی گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ شاہ میر کے مزاج کے حوالے سے، اسے فیس کرنے کی فکر سے وہ بالکل آزاد تھی اور ایسا اس لیے تھا کہ وہ شاہ میر کو بہت اچھی طرح جانتی تھی گو کہ ان کی شادی کسی افیئر کا نتیجہ نہیں تھی پھر بھی منگنی کے بعد کے عرصے میں وہ دونوں بہت اچھی طرح ایک دوسرے کا مزاج سمجھ گئے تھے۔

شاہ میر اس کے بابا کے دوست کا بیٹا تھا۔ دونوں گھروں کے درمیان کافی خوشگوار تعلقات تھے۔ شاہ میر کی تین بہنیں تھیں جو سبھی شادی شدہ تھیں اور ایک چھوٹا بھائی ازمیر جو ایم بی اے کر رہا تھا۔ اس کی ماں کی ڈیتھ ہو چکی تھی لیکن شاہ میر کے لیے انیقہ کو انہوں نے ہی پسند کیا تھا۔ طے شدہ وقت کے مطابق تو ان کی شادی ایک سال بعد ہونی تھی مگر ماں جی کی وفات کے بعد جب گھر بالکل ہی عورت ذات کے وجود سے خالی ہو گیا تب کافی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بابا، شاہ میر اور ازمیر کے لیے، بہنیں بھی اپنے اپنے گھروں میں آباد تھیں ہر وقت اپنا گھر بار چھوڑ کر آ نہیں سکتی تھیں۔ ایسے میں بابا کو اس مسئلے کا واحد حل یہی نظر آیا کہ شاہ میر کی شادی کر دی جائے۔ تب انیقہ کے گھر والوں سے بات کی گئی انہیں بھی اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آئی اور اس طرح ایک مہینے کے اندر اندر ہی انیقہ، مسز شاہ میر بن کر یہ گھر سنبھالنے آ گئی تھی۔

شادی کے ابتدائی دن تو خاندان کی دعوتوں میں نکل گئے۔ ہنی مون پر وہ جا نہیں پائے تھے کیونکہ شاہ میر کو آفس سے چھٹیاں نہیں مل پائی تھیں۔ یہ جان کر انیقہ کو دھچکا تو لگا تھا کہ کسی پرفضا مقام پر چند دن اپنے من پسند ساتھی کی سنگت کو انجوائے کرتے ہوئے گزارنا اس کے لیے ایک خوبصورت تجربہ ہوتا لیکن اس خبر نے اس کے ارمانوں پر اوس سی گرا دی تھی۔ کمی تو اپنی طرف سے شاہ میر نے اب بھی کوئی نہیں رکھی تھی وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اس کا اظہار اس نے پہلی رات ہی کر دیا تھا حالانکہ شادی سے پہلے انیقہ کو یہی لگتا تھا کہ شاہ میر نے اسے اپنی ہونے والی لائف پارٹنر کے طور پر قبول تو کر لیا ہے لیکن ان کے درمیان محبت کہیں نہیں ہے۔

اور اب شادی کے بعد شاہ میر نے جس طرح اپنے سنبھال سنبھال کے رکھے گئے جذبے اس پر وارنے شروع کیے تھے وہ خوش بھی ہوئی تھی اور حیران بھی اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ شاہ میر اتنا رومانٹک بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال اب وہ اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن تھی پھر روٹین لائف بھی شروع ہو گئی۔

آج اس کا کچن میں پہلا دن تھا۔ کھیر پکوائی کی رسم پھپھو اپنی موجودگی میں کروا گئی تھیں اس لیے آج کچن میں آتے ہوئے اسے جھجک کے بجائے ایک استحقاق اور خوشی محسوس ہو رہی تھی اس کے نظریے کے مطابق ایک عورت کی سب سے بڑی اچیومنٹ تو یہی تھی۔ ساس، نندوں، دیورانیوں اور جٹھانیوں کے جھنجھٹ سے آزاد، ہر قسم کے مداخلت کے ڈر سے بے نیاز ایک خوبصورت اور مکمل گھر۔ آج اسے صحیح معنوں میں اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔

بابا کو ناشتا دینے کے بعد وہ شاہ میر کو جگا کر اس کے لیے ناشتا بنانے لگی تھی۔ ویسے تو بابا اور شاہ میر ایک ہی وقت میں آفس کے لیے نکلتے تھے لیکن بابا جلدی اٹھنے اور جلدی ناشتا کرنے کے عادی تھے اور انیقہ ان چند دنوں میں ان کی روٹین سمجھ چکی تھی۔ اس لیے ان کے لیے پہلے ناشتا تیار کر لیا تھا۔

"آپ کے لیے ناشتا یہیں لے آؤں یا باہر آ کر کریں گے۔" وہ دروازے میں ہی کھڑی اس سے پوچھنے لگی۔ شاہ میر جو آئینے کے سامنے کھڑا بال برش کر رہا تھا ایک خفگی بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں مجھے جگانے کے لیے الارم کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔" اس کے لہجے میں کچھ برہمی تھی انیقہ پریشان سی ہو گئی۔

"تمہیں پتا ہے صبح ہی صبح تمہاری میٹھی آواز سننے کے بجائے اس کی کرخت آواز سے میرے اعصاب کس قدر جھنجھنا اٹھے تھے، میں تو سوچ رہا تھا کہ صبح اگر میری آنکھ تم سے پہلے بھی کھل گئی تو میں جان بوجھ کر سوتا بن جاؤں گا تاکہ تم جب بہت پیار سے آکر مجھے جگاؤ تو۔۔۔"

"اوہو!" انیقہ اس کی بات سمجھتے ہی ہنس پڑی اور وہ بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"آئم سوری! میں نے آپ کا پلان فیل کر دیا۔" وہ ہنستے ہوئے اس کے قریب آئی۔ شاہ میر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے مزید قریب کر لیا۔

"دراصل میں، میں چولہے پر دودھ چڑھا آئی تھی اور جانتی تھی، آپ اتنی آسانی سے جاگیں گے بھی نہیں اسی لیے میں نے الارم سیٹ کر دیا۔" اس نے وضاحت دی تھی۔

"لیکن کل سے میں ایسا کچھ نہیں چاہتا۔" وہ اس کے چہرے پر جھولتی لٹوں سے کھیلنے لگا۔

"پھر کیا چاہتے ہیں؟" اس نے شرارت سے پوچھا تو جواباً" اس نے بھی معنی خیزی سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"بتادوں۔"

"اونہوں۔" نفی میں سرہلاتے ہوئے اس کی پلکیں جھلک گئیں

"چلیے۔۔۔ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے۔" شاہ میر کو اس موڈ سے نکالنے کی خاطر اس نے بات بدلی وہ ہنس پڑا تھا۔

جب وہ شاہ میر کو رخصت کر کے اندر آئی تو ازمیر جاگ چکا تھا اور کچن میں فریج سے اپنے لیے کچھ نکال رہا تھا وہ ٹھٹک گئی۔

"آپ جاگ گئے۔" یہ جملہ غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکلا تھا۔ ازمیر نے چونک کر اسے دیکھا اور دوسرے ہی پل دوبارہ سے گلاس میں جوس انڈیلنے لگا اس کی موجودگی یکسر نظرانداز کر کے، بلیو جینز اور بلیک شکنوں سے پر شرٹ میں اس کا حلیہ کافی بے ترتیب تھا۔ بکھرے بال، سرخ آنکھیں اس پر مستزاد اس کا رویہ جو انیقہ کو بہت عجیب لگا۔ وہ پھر کچھ سنبھل کر گویا ہوئی۔

"مجھے نہیں پتا تھا آپ اتنی جلدی اٹھتے ہیں ورنہ میں آپ کے لیے ناشتا تیار کر لیتی۔ آپ بتائیں آپ کیا کھائیں گے، میں ابھی بنا دیتی ہوں۔"

"نو تھینک یو۔۔۔ جوس میں لے چکا ہوں۔ ناشتا کرنے کا میرا موڈ نہیں ہے۔" سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے اس پر ایک بھی نظر ڈالے بغیر وہ اس کے پاس سے گزرتا چلا گیا۔

"عجیب انسان ہے۔" انیقہ ہونق سی کھڑی رہ گئی تھی اس کی اس درجہ بے نیازی پر شادی کے بعد کے ان دنوں میں، اس کی ایک بھی بار ازمیر سے بات نہیں ہوئی تھی تفصیلی نہ رسمی وہ گھر میں ٹکتا بھی کم تھا اس لیے ان کا سامنا بھی بہت کم کم ہوتا تھا۔ انیقہ کو لگتا تھا ازمیر بہت سنجیدہ اور ریزرو انسان ہے وہ ان کے گھر کبھی نہیں آیا تھا پھر بحیثیت بھابھی انیقہ سے کوئی دیور والی چھیڑ چھاڑ یا گپ شپ تو بہت دور کی بات تھی اس سے زیادہ تو اس کے کزنز اطہر، سمیر وغیرہ سے انیقہ کی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ شادی سے پہلے انیقہ کو ازمیر کے مزاج کے بارے میں سوچنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی اور بعد کے دنوں میں اسے اتنا وقت اور موقع ہی نہیں ملا تھا ازمیر کو آبزرو کرنے کا، مگر آج اس کے طرز عمل نے انیقہ کو عجیب سی حیرانی میں ڈال دیا تھا۔ بات سنجیدگی یا لیے دیے رہنے کی نہیں تھی۔ ازمیر کے رویے میں کچھ اور تھا جو اسے بری طرح سے چبھ رہا تھا۔ اس نے کس طرح اس سے نظر ملائے بغیر بات کی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے اسے انیقہ کی موجودگی ناگوار گزری ہو یا پھر وہ انیقہ کو پسند ہی نہ کرتا ہو۔

دن مخصوص رفتار سے گزر رہے تھے دن بھر مختلف کاموں سے وہ اپنا جی بہلائے رکھتی اور شام میں اچھی طرح سج سنور کر شاہ میر کا استقبال کرتی جس کی محبت ہر گزرتے دن کے ساتھ شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ پھر یہ لوگ کبھی آؤٹنگ پر نکل جاتے، کبھی لانگ ڈرائیو پر اور اکثر ڈنر بھی باہر ہو جاتا وہ زندگی کے ایک ایک پل سے لطف اندوز ہوتی بہت مسرور و مطمئن تھی۔

لیکن اگر ازمیر سے سامنا ہوتا جو کہ اکثر ہوتا رہتا تھا تو اس کے سمجھ میں نہ آنے والے رویے کو سوچ کر وہ پہروں الجھتی رہتی۔ کبھی سوچتی اسے شاہ میر سے بات کرنی چاہیے پھر خیال آتا کہ وہ اس سے کیا بات کرے گی یہی کہ ازمیر اس سے بات نہیں کرتا اس سے نظر نہیں ملاتا جہاں وہ بیٹھی ہو وہاں سے دور بھاگتا ہے اسے دیکھ کر راستہ بدل لیتا ہے۔ پھر کیا خبر کہ شاہ میر اس کی بات سنجیدگی سے سنے بھی یا نہیں مذاق میں اڑا دے لیکن اس دن اس کی برداشت کی حد ہو ہی گئی۔

شاہ میر کی چھٹی تھی مگر وہ بیڈ روم میں فائلز بکھرائے آفس ورک میں منہمک تھا اسے امی سے بات کرنی تھی اس لیے شاہ میر کی ڈسٹربنس کے خیال سے وہ لاؤنج میں آکر ان سے بات کرنے لگی تھی تبھی ازمیر نیچے آیا وہ آج کافی دیر تک سوتا رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں وہ اس کی طرف دیکھے بنا ہی کچن کی سائیڈ بڑھ گیا اور جب انیقہ فون رکھ کر کچن میں آئی تو وہ اپنے لیے آملیٹ تل رہا تھا اس کا دل یکایک ہی غبار سے بھر سا گیا۔

"ازمیر! آپ کو ناشتا کرنا تھا تو مجھ سے کہہ دیتے میں لاؤنج میں ہی تھی نا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں ناراضی آگئی تھی۔ اگر کبھی وہ اپنے روم میں ہوتی تو ازمیر کو اسے بلانے میں پرابلم ہو سکتی تھی مگر اب جب وہ لاؤنج میں تھی تب اسے کیا مسئلہ تھا۔

"ڈیئر از نو نیڈ ٹو بی وری۔۔۔ میں اپنے کام خود کر لیتا ہوں۔" انداز ایسا تھا گویا کہہ رہا تمہیں میری فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں، میں اپنا کام خود کر سکتا ہوں۔ اتنا بے گانگی اور قطعیت بھرا لہجہ سن کے انیقہ کو عجیب سی ہتک کا احساس ہوا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کرتا تھا۔ اس کی کسی بات کے جواب میں بھی صرف ایک آدھ جملہ بول دیتا تھا۔ نہ اس کے الفاظ سخت ہوتے تھے نہ لہجہ پھر بھی انیقہ کو اتنا محسوس ہوتا تھا کہ وہ پورا دن اس ایک جملے کی لپیٹ میں سلگتی رہتی تھی۔

"میں کیوں ازمیر کے رویے کو سر پر سوار کر رہی ہوں۔ اگر وہ مجھے اگنور کرتا ہے۔ مجھ سے لاتعلق رہتا ہے تو مجھے اس کی کیا پروا۔ میں اس گھر میں اس کے لیے نہیں آئی ہوں۔ پھر مجھے اس کی بے نیازی اتنا محسوس کیوں ہوتی ہے۔" اب وہ خود پر غصہ ہوتی خود ہی سے لڑ رہی تھی۔

"میری بلا سے بھاڑ میں جائے۔۔۔ اب میں اس سے بات ہی نہیں کروں گی۔" اس نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کر لیا۔

"کیا بات ہے بھئی۔۔۔ یہ چہرہ اتنا اترا ہوا کیوں ہے؟" شاہ میر نے اس کی کیفیت محسوس کر لی تھی فائل بند کرتے ہوئے اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر اسے دیکھا۔

"نہیں کچھ خاص نہیں۔" گلے میں پڑی چین سے کھیلتے ہوئے وہ کسی کشمکش میں گھری اس کی پاس آکر بیٹھ گئی۔

"آپ سنیں تو شاید مذاق اڑائیں۔"

"اچھا۔۔۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔" وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

"تمہیں اتنی بے چینی ہے اور میرے لیے ہنسنے والی بات ہو گی۔"

"نہیں۔۔۔ ہنسنے والی بات تو نہیں ہے مگر۔۔۔ اصل میں۔۔۔ کیا کہوں۔۔۔" وہ بے بسی سے انگلیاں چٹخانے لگی۔

"حد ہو گئی انیقہ۔۔۔ اب مجھ سے اپنے دل کی بات شیئر کرنے کے لیے بھی اتنا سوچنا پڑے گا تمہیں۔۔۔ بتاؤ کیا بات ہے۔" نرم لہجے میں کہتے ہوئے شاہ میر نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"دراصل۔۔۔ شاہ میر۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے لگتا ہے جیسے ازمیر مجھے پسند نہیں کرتا۔"

"اوہ!" شاہ میر کے منہ سے بے اختیار ایک گہری سانس نکل گئی۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟"

"مجھے ایسا اس لیے لگتا ہے کیونکہ واقعی ایسا ہی ہے۔" اس نے اپنی بات پر زور دیا۔

"وہ مجھ سے بات نہیں کرتا شاہ میر وہ کبھی مجھ سے خود مخاطب نہیں ہوتا۔ میں اس سے بات کرنے کی کوشش کروں تو مجھے ایک آدھ جملے میں ایسا جواب دیتا ہے کہ مزید کچھ کہنے کی میری ہمت ہی نہیں ہوتی اس نے کبھی بھی میرے بھابھی ہونے کے ناتے مجھ سے نارملی بی ہیو نہیں کیا۔ میرے مقابلے وہ کام کے لیے آنے والی ساجدہ سے زیادہ بات کرلیتا ہے کہ اسے اپنے کمرے کی صفائی کس طرح چاہیے یا اس کی کس چیز کو نہیں چھیڑنا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ اور مجھ سے تو وہ کسی کام کا بھی نہیں کہتا۔ میں اس کی بھابھی ہوں نا اسے مجھ سے کہنا چاہیے لیکن وہ خود ہی اپنا ہر کام کرتا ہے۔ ناشتا' کھانا تو دور کی بات اس نے آج تک مجھ سے اپنے لیے چائے تک نہیں بنوائی' میرے ہاتھ سے پانی تک نہیں پیا۔"

اس نے سوچا تھا وہ اس بارے میں شاہ میر سے کوئی بات نہیں کرے گی۔ مگر آج اس نے خود ہی یہ قسم توڑ ڈالی ایک بار بولنے پر آئی تو ساری بھڑاس نکالتی چلی گئی۔ شاہ میر پیشانی مسلتے کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"آپ ہی بتائیے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے مجھ سے کوئی پرابلم ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ فوراً" ہی اس کی بات رد کرتے ہوئے قطعی لہجے میں بولا تھا۔ انیقہ چپ سی رہ گئی۔ چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ ٹھہر ٹھہر کر گویا ہوا۔

"دیکھو انیقہ۔۔۔ تم نے ابھی جو کچھ بھی کہا وہ باتیں اپنی جگہ صحیح ہوں گی لیکن ازمیر کی تمہیں ناپسند کرنے کی بات' یہ سراسر تمہاری ذہنی اختراع ہے۔ تم نے کہا وہ تم سے بات نہیں کرتا تو میں تمہیں بتاؤں کہ بنا ضرورت کے تو وہ مجھ سے بھی بات نہیں کرتا۔ وہ بچپن سے ہی بہت کم گو واقع ہوا ہے انیقہ' بہت الگ تھلگ سا مزاج ہے اس کا اسے بھیڑ بھاڑ سے الجھن ہوتی ہے وہ محفلوں میں جانا پسند نہیں کرتا وہ لوگوں سے دور بھاگتا ہے۔ اگر اس کی ریزرو رہنے کی عادت کو تم بددماغی اور بدمزاجی سمجھتی ہو تو تمہیں اپنی سوچ بدلنی ہوگی تم اس گھر میں نئی نئی آئی ہو تو ہوسکتا ہے کہ اسے تم سے مانوس ہونے میں کچھ وقت لگے وہ بہت Shy ہے اتنی جلدی لوگوں سے فرینک بھی نہیں ہوپاتا۔ تم اسے کچھ وقت دو تو یقیناً" تمہاری یہ شکایت دور ہوجائے گی۔"

"آپ نہیں سمجھیں گے شاہ میر۔۔۔ میرے ساتھ اس کا طرز عمل اس کے مزاج کا حصہ نہیں اس کی شعوری کوشش ہوتی ہے۔ وہ جان بوجھ کر مجھے اگنور کرتا ہے۔" وہ بے بسی سے سوچ رہی تھی۔

"تو مائی ڈیئر وائف۔۔۔ امید ہے تم میری بات سمجھ گئی ہوگی۔" شاہ میر نے اس کا ہاتھ دبایا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"پتا ہے کیا شاہ میر۔۔۔ میں اپنے امیج کی بہت زیادہ پروا کرنے والی لڑکی ہوں۔ مجھے ہر وقت یہی فکر ہوتی ہے کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں' جن کے ساتھ میں رہ رہی ہوں وہ مجھے کس طرح سے دیکھتے ہیں اگر کوئی مجھے پسند نہیں کرتا اگر کسی کو مجھ سے کوئی پرابلم ہے تو آف کورس مجھے ہی پریشانی ہوتی ہے اور اس لیے میں' بہت ٹچی ہوکر سوچنے لگی تھی بٹ ناؤ اٹس فائن۔" اس نے شاہ میر کے سامنے خود کو مطمئن ظاہر کیا حالانکہ نہ تو وہ مطمئن تھی اور نہ ہی اس کی باتوں سے انیقہ کی کوئی تسلی ہوئی تھی۔

"چلو شکر ہے یار ورنہ تمہارے اس خوبصورت چہرے پر یہ پریشانی اور بلاوجہ کا اضطراب بالکل اچھا نہیں لگتا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرادی۔

"اور ایک بات۔۔۔" اسے اچانک ہی کچھ خیال آیا تو بول اٹھا۔

"تم کہتی ہو وہ تم سے کسی کام کا نہیں کہتا کیا

ضروری ہے کہ وہ خود اپنے منہ سے یہ کہے گا تب ہی تم اس کا کام کروگی۔ تم اس کی بھابھی ہو کیا تمہارا یہ فرض نہیں بنتا کہ تم اس کے بن کہے ہر وہ کام کردیا کرو جو تم کرسکتی ہو اسے تم سے جھجک محسوس ہوتی ہوگی شاید اسی لیے وہ کچھ نہ کہہ پاتا ہو۔ تم خود ہی آگے بڑھ کر اس کی جھجک ختم کردو اگر تم بھی اسی طرح بی ہیو یئر اپنائے رکھو گی تو شاید یہ مسئلہ کبھی نہ حل ہوپائے۔"

"ہاں مجھے واقعی اس بات کا خیال نہیں رہا تھا کہ مجھے خود سے اس کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیے آپ نے کہا ہے تو اب سے میں ایسا ہی کروں گی۔" انیقہ نے اسے یقین دلایا۔ شاہ میر کی اس بات نے اسے چونکا دیا تھا۔ اب اسے حیرت ہورہی تھی کہ اس کے ذہن میں پہلے یہ سوچ کیوں نہیں آئی ٹھیک ہے اگر اس طرح ازمیر کے رویے میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو وہ یہ بھی کرنے کے لیے تیار ہے اس نے کچھ پرامید ہوکے سوچا تھا۔

رات کو کھانے پر جب اتفاق سے ازمیر بھی موجود تھا شاہ میر نے وہ بات چھیڑ دی۔

"ہاں بھئی ازمیر۔۔۔ تمہاری بھابھی کو تم سے شکایت ہے کہ تم ان سے بات نہیں کرتے۔" چمچہ منہ تک لے جاتے ہوئے ازمیر کا ہاتھ وہیں رک گیا تھا۔ بہت چونک کر ازمیر ایک نظر اس پر ڈالتے شاہ میر کی جانب متوجہ ہوا۔ انیقہ نے بے اختیار اس وقت کو کوسا تھا جب اس نے شاہ میر سے یہ بات کہی تھی۔

"تم انیقہ کے اکلوتے دیور ہو ازمیر اور دیور بھابھی میں تو بڑی گپ شپ ہوتی ہے۔ انیقہ تم سے یہ توقع نہ رکھتی اگر اسے کمپنی دینے کے لیے اس کی کوئی نند موجود ہوتی۔"

انیقہ کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ شاہ میر اس طرح ازمیر اور بابا کے سامنے کچہری لگا کر بیٹھ جائے گا ورنہ وہ اس سے یہ بات شیئر کرتے ہوئے سو بار سوچ لیتی۔

"انیقہ بیٹی بھرے پرے گھر سے یہاں آئی ہے اس لیے اسے بہت تنہائی کا احساس ہوتا ہوگا۔ تم تو یونیورسٹی سے آنے کے بعد شام تک گھر ہی میں رہتے ہو اپنے کمرے میں گھسے رہنے کے بجائے اسے کمپنی دیا کرو۔ بھئی میں بالکل یہ نہیں چاہ سکتا کہ میری بیٹی کو یہاں کوئی بوریت ہو۔" اب تو بابا نے بھی مسکراتے ہوئے شاہ میر کی تائید کی تھی اور ازمیر کھانا بھولے چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا تھا انیقہ کو عجیب سی شرمندگی محسوس ہورہی تھی۔ اس لیے چائے کا بہانہ کرکے وہ وہاں سے اٹھ آئی تھی۔

"شاہ میر! آپ نے ایسا کیوں کیا۔۔۔؟" کچھ دیر بعد شاہ میر کے کمرے میں آتے ہی وہ جو اس کے انتظار میں بیٹھی تھی پھٹ پڑی۔

"کیا کیا ہے میں نے؟" وہ اس کی اس قدر برہمی پر حیران تھا۔

"آپ نے ازمیر کے سامنے وہ بات کیوں چھیڑی۔ میں نے تو آپ سے اپنے دل کی بات کہی تھی صرف اپنی تسلی کے لیے اور آپ نے مجھے ازمیر کے سامنے شرمندہ کروادیا۔ کیا سوچتا ہوگا وہ میرے بارے میں کہ میں آپ سے اس کی شکایتیں لگاتی ہوں۔" خفت کے مارے اسے رونا آنے لگا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا انیقہ کہ تم کیوں خود سے ایسے الٹے سیدھے گمان کرلیتی ہو۔" چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ازمیر کے بارے میں تمہاری سوچ اتنی نیگیٹو کیوں ہے' وہ میرا بھائی ہے اور کم از کم اتنا تو میں اسے ضرور ہی جانتا ہوں کہ وہ کب' کس بات کو کس انداز میں لیتا ہے۔ پتا ہے مجھے کہ تمہیں اپنے امیج کی بہت فکر رہتی ہے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم اتنی چھوٹی بات کا ایشو بنالو۔"

"چھوٹی بات ہوگی آپ کے لیے' میرے لیے یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔ پہلے تو صرف میرا خیال تھا کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتا لیکن اب تو پکا یقین ہوچکا ہے کہ میں اسے زہر لگنے لگی ہوں گی آپ کی اس چھوٹی سی بات کی بدولت۔" بے حد تلخ لہجے میں کہتے وہ بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

"تمہیں سمجھانا میرے بس کا کام نہیں ہے۔" شاہ

میر اسے اس کے حال پر چھوڑ کے واش روم میں گھس گیا تھا۔ سر تھامے بیٹھے جب اس کے جوش کا ابال ذرا بیٹھا تو اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔

"یہ کیا کیا میں نے اس فضول شخص کے لیے میں شاہ میر سے لڑ رہی ہوں کیوں یہ شخص میرے اعصاب پر مسلط ہو گیا ہے اس کی وجہ سے کہیں میں شاہ میر کو ناراض نہ کر دوں۔" اس خدشے کے ذہن میں آتے ہی اس کا دل یکایک بے چین ہو گیا کچھ دیر پہلے شاہ میر نے اس سے بات بھی کافی سخت لہجے میں کی تھی۔ اب اسے سمجھ آ رہا تھا کہ شاہ میر کو بھی اس کی باتیں بہت بری لگی ہوں گی۔

"آئم سوری شاہ میر!" تھوڑی دیر بعد ہی وہ اس کے روبرو بیٹھی نگاہیں جھکائے کہہ رہی تھی۔

"کس بات کے لیے۔" وہ سمجھ گیا تھا پھر بھی انجان بن گیا۔

"کچھ دیر پہلے میں بہت روڈ ہو گئی تھی میں نے... بہت غلط کیا نا۔" اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہاں، بہت غلط" شاہ میر نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا وہ مزید شرمندہ ہو گئی۔ اپنے رخساروں پر جمے اس کے مضبوط ہاتھوں کو گرفت میں لیتے ہوئے گویا ہوئی۔

"پلیز شاہ میر! مجھے معاف کر دیں پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا مجھے اب خود پر غصہ آ رہا ہے رئیلی۔"

"میں تمہاری ان باتوں کو بھول گیا۔ اب جب تم میرے پاس آئیں ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ مجھے ہی اپنی ناراض بیوی کو منانا پڑے گا۔" وہ ہلکی سی مسکراہٹ لیے بولا۔

"اگر تم مجھ سے میری کسی بات پر لڑتیں تو مجھے اتنا برا نہ لگتا لیکن شادی کے بعد پہلی بار تم مجھ سے ناراض بھی ہوئیں تو کسی تیسرے فرد کی وجہ سے۔ سچ کہوں تو یہ بات واقعی مجھے بہت بری لگی تھی۔ لیکن اب جب تم میرے پاس ہو تو سب ٹھیک ہے۔"

"آپ بہت اچھے ہیں شاہ میر آئی لو یو۔" جذبات سے مغلوب وہ بے ساختگی میں اقرار کر گئی۔

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا انیقہ، میں تمہیں پریشان اور الجھا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔" اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے وہ نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"اسی لیے میں نے ایک چھوٹی سی کوشش کی تھی تمہاری اس الجھن کو دور کرنے کی ازمیر بہت سمجھدار اور سلجھا ہوا لڑکا ہے وہ کبھی بھی اس انداز میں نہیں سوچ سکتا جس کا اندیشہ تمہیں ستا رہا ہے اور تم انیقہ...." وہ رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"تم ہر بات دل سے لگا لیتی ہو۔ انسان کو اس درجہ حساس بھی نہیں ہونا چاہیے ہر اچھے برے رویے کو سہنے کا مادہ ہونا ضروری ہے یہ نہیں کہ کسی نے تلخ لہجے میں بات کی تو رونے بیٹھ گئے کسی نے اگنور کر دیا تو سوچ سوچ کر پریشان ہو کر نیندیں اڑا لیں۔"

"یعنی آپ مانتے ہیں نا! ازمیر کا رویہ میرے ساتھ اچھا نہیں۔" اس نے اس ساری بات میں اپنے مطلب کی بات پکڑی تو اس کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ آ گئی۔

"نہیں میں نے یہ تو نہیں کہا خیر اب تو وعدہ کر لیا ہے اس نے اور یقین دلایا ہے کہ اس کی طرف سے تمہیں کوئی شکایت نہیں ہو گی۔" شاہ میر نے بتایا تو وہ حیران ہو گئی شاید ازمیر نے یہ بات اس کے اٹھ آنے کے بعد کہی تھی۔

"کیا فائدہ ایسے وعدے کا جو اس بے چارے سے زبردستی لیا گیا ہو۔" انیقہ صرف یہ سوچ کر رہ گئی تھی۔

دوسرے دن دوپہر میں جب وہ شاہ میر کے کپڑے پریس کر رہی تھی تب ہی اسے اچانک ازمیر کے کپڑے پریس کرنے کا خیال آیا حالانکہ ازمیر نے اسے آج تک اس کام کے لیے نہیں کہا تھا اور اسی لیے انیقہ نے فوراً ہی شاہ میر کے کپڑے ہینگ کر کے ازمیر کے کمرے کا رخ کیا تھا۔ کچھ بھی تھا اب وہ ازمیر کا ہر کام اس کے کہے بغیر ہی کر دینا چاہتی تھی۔

ازمیر کتنی نفیس طبیعت کا انسان تھا اس کا اندازہ اس کے کمرے کو دیکھ کر ہی ہو جاتا تھا بہت ہی صاف ستھرا، ہر چیز اپنی جگہ پر ترتیب اور قرینے سے رکھی ہوئی

اکثر اوقات صبح میں ساجدہ جب صفائی کرنے یہاں آتی تو انیقہ بھی آجاتی اور اسے دیکھ کر بے حد حیرت ہوتی تھی کہ لڑکے تو بہت بے ترتیبی پھیلانے کے عادی ہوتے ہیں خود اس کے اپنے بھائی بھی ایسے ہی تھے وہ ان کی چیزیں سمیٹ سمیٹ کر ہلکان ہوتی رہتی تھی لیکن ازمیر کے کمرے کو دیکھ کر تو لگتا ہی نہیں تھا کہ یہاں کوئی لڑکا بلکہ یہاں کوئی انسان بھی رہتا ہے۔

وارڈروب سے اس کے ہفتے بھر کے کپڑے نکال کر انیقہ وہیں پر پریس کرنے لگی تھی کچھ دیر بعد اسے دروازے پر آہٹ سی محسوس ہوئی تو اس کی نظریں بے اختیار اس طرف اٹھ گئیں۔ وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا سینے پر ہاتھ باندھے" آنکھوں میں حیرت لیے انیقہ اپنی جگہ چور سی بن گئی اسے نہیں پتا تھا ازمیر اتنی جلدی گھر آجائے گا۔

"میں شاہ میر کے کپڑے استری کر رہی تھی تو سوچا آپ کے بھی کر دوں۔" اس نے خود ہی پہل کی بات کرنے میں ورنہ اسے دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ شام تک یہیں کھڑا اپنے کمرے میں اس کی موجودگی پر ہی حیران ہوتا رہے گا۔

"اور میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ جو کام میں خود کر سکتا ہوں اس کے لیے کسی اور کو زحمت دینا مجھے بالکل پسند نہیں۔" اس کا انداز کافی برہمی اور ناگواری لیے ہوئے تھا۔ انیقہ نظر انداز کر گئی۔

"ایسا آپ کو لگتا ہے ورنہ اتنے سے کام سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔" اسے قطعی جواب دے کر وہ پھر سے استری کرنے میں مشغول ہو گئی۔ اب وہ ازمیر کی کسی بھی بات پر کان نہیں دھرنا چاہتی تھی۔ وہ ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا پھر نہایت تیزی سے کمرے سے نکل گیا تھا۔ انیقہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی تھی۔

ازمیر لندن جا رہا تھا" انیقہ یہ سن کر ایک لمحے کے لیے ساکت سی رہ گئی اور شاہ میر جس نے اسے یہ خبر سنائی تھی وہ بھی کافی الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ "لیکن شاہ میر۔۔۔ ازمیر کو اس طرح اچانک لندن جانے کی کیا سوجھی۔" وہ حیرت سے استفسار کرتی اس کے پاس آبیٹھی۔

"اس نے کہا ہے کہ ہائر اسٹڈیز کے لیے باہر جانے کی اس کی کافی عرصے سے خواہش تھی اور کچھ عرصہ پہلے اس نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کے لیے اپلائی بھی کر رکھا تھا اس کا ہیڈ آفس لندن میں ہے اور وہ اسے چند آفیشل کورسز کرنے کے لیے وہیں بھیجنا چاہ رہے ہیں۔ ازمیر کا کہنا ہے کہ وہ یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا۔" شاہ میر نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ انیقہ چند لمحے تو چپ رہی پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو اچھا نہیں لگا۔"

"مجھے اچھا کیوں نہیں لگے گا انیقہ۔۔۔ یہ اس کے مستقبل کا سوال ہے' میں تو بس اس کے اس اچانک اور فوری فیصلے پر حیران ہوں اور ایک میں ہی کیا بابا بھی۔" اس نے اپنی پریشانی بیان کی۔

"اچانک تو نہیں۔۔۔ اس نے پہلے سے سوچا ہو گا اور ویسے بھی آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ وہ کبھی اپنے دل کی بات زبان پر نہیں لاتا تو کیا اچنبھا کہ اس نے یہ ذکر کرنا بھی ضروری نہ سمجھا ہو۔"

انیقہ کو شاہ میر کی الجھن کھٹکنے لگی تھی۔ اس کے لیے تو اچھا ہی تھا کہ ازمیر چلا جاتا ایک فضول کی ٹینشن سے تو جان چھوٹتی۔

"بابا نے کافی اثر لیا ہے۔ وہ اسے جانے سے منع بھی کر دیتے مگر ازمیر کا یہ کہنا بھی ٹھیک کہ ایسے موقع بار بار نہیں ملتے اور اس لیے بابا بھی خاموش ہو گئے ہیں۔"

"ہاں تو صحیح ہے نا ایسا گولڈن چانس مس کرے گا تو زندگی بھر پچھتائے گا' میں تو کہتی ہوں وہ بالکل ٹھیک کر رہا ہے۔ آپ ان بے کار سوچوں کو ذہن سے نکال دیں اگر ازمیر اسی میں خوش ہے تو ہمیں اس کا ساتھ دینا چاہیے۔"

انیقہ نے جتنے پرزور انداز میں تائید کی تھی شاہ میر کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی پھر اس نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔

بہت دنوں سے وہ امی کی طرف جا نہیں پائی تھی۔ شاہ میر سے کہتی تو اسے روز ہی کوئی نہ کوئی ضروری کام آپڑتا۔ کبھی وہ آفس کے لیے لیٹ ہو رہا ہوتا' کبھی آفس سے آتے ہوئے لیٹ ہو جاتا مگر اس دن فون پر امی کی طبیعت کی خرابی کا پتا چلا تو وہ اس وقت شاہ میر کے سر ہو گئی۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اس دن وہ لنچ کے لیے گھر آیا تھا۔ سو انیقہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ساتھ ہی میکے چلی آئی تھی۔

امی کی طبیعت تو اسے دیکھتے ہی ہشاش بشاش ہو گئی بڑی بھابھی نے بھی دو تین دن رکنے کے لیے اصرار کیا مگر انیقہ اچھی طرح جانتی تھی کہ دو دن تو کیا اس کی ایک دن کی غیر موجودگی بھی کافی مسئلہ کھڑا کر سکتی تھی۔ اس کا سسرال کوئی بھرا پرا نہیں تھا کہ وہ آرام سے سارے جھمیلے بھول بھال کر میکے میں پیر پسار کر بیٹھی رہتی اور یہی وجہ تھی کہ امی نے بھی مزید رکنے کے لیے اس پر کوئی زور نہیں دیا تھا۔ اس نے شاہ میر کو آنے کے لیے کہہ تو دیا تھا مگر شام میں جب وہ بھابھی کے نہ نہ کرنے کے باوجود ڈنر کی تیاری میں ان کی مدد کر رہی تھی شاہ میر کا فون آگیا۔

"سنو انیقہ۔۔۔ مجھے آتے ہوئے دیر ہو جائے گی اور میں ڈنر بھی نہیں کر پاؤں گا۔" اس نے بتایا تھا اور اسے اچھا خاصا دھچکا لگا۔

"کیا۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ نے پہلے نہیں بتایا۔" وہ اسے کیا بتاتی امی نے داماد کے آنے کا سن کر کتنا اہتمام کر ڈالا تھا۔

"ہم سو سوری یار۔۔۔ بس ارجنٹ میٹنگ آگئی ہے اور ہمارے بہت پرانے کلائنٹس ہیں۔ میں ایسے چھوڑ کر بھی نہیں آسکتا ڈنر تو میرا انہی کے ساتھ ہو جائے گا اگر۔۔۔ تمہارا دل چاہ رہا ہے تو۔۔۔ تم آج وہیں رک جاؤ۔" شاہ میر نے اس کے لہجے کی مایوسی محسوس کرلی تھی اسی لیے اس کی بددلی دور کرنے کی خاطر بولا۔

"نہیں شاہ میر۔۔۔ ٹھیک ہے میں چلی جاؤں گی' مجھے رکنا نہیں ہے۔" اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"اگر تم کہو تو میں ازمیر کو فون کر دوں' وہ تمہیں لینے آجائے۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اسے زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا تھا۔

"یہاں سیف ہے نا میں اس کے ساتھ چلی جاؤں گی آپ فکر مت کریں۔" انیقہ نے اس کی تسلی کرائی۔

"او کے ایز یو وش۔" شاہ میر نے زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔

اس کا موڈ تو خراب ہو ہی گیا تھا۔ کھانا بھی اس نے کافی بجھے دل سے کھایا اور کھانا کھاتے ہی وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے انیقہ۔۔۔ رک جاؤ نا ایک دو دن اب تو شاہ میر نے بھی کہہ دیا ہے۔" بھابھی کو اس کی عجلت پر حیرانی ہو رہی تھی۔ امی بھی خاموش رہیں۔ شاید وہ بھی ان کی ہمنوا تھیں۔

"نہیں بھابھی۔۔۔ انہوں نے کہا ضرور ہے مگر وہ میری سہولت کی وجہ سے کہہ رہے تھے اور ویسے بھی میں انہیں اپنے آنے کا کہہ چکی ہوں۔ اس لیے رہنے دیں پھر کبھی سہی۔" اس نے مسکراتے ہوئے انہیں ٹالا تھا۔ سیف گاڑی میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی جو اس کی زبان چلنا شروع ہوئی تو گھر تک پہنچتے پہنچتے اس کی ہلکی پھلکی باتوں نے انیقہ کا موڈ ایکدم بحال کر دیا تھا۔ مگر خود وہ اندر آنے کے بجائے اپنے کسی کام کا کہہ کر باہر سے ہی واپس ہو لیا تھا۔

گھر کی سب ہی لائٹس آن تھیں جس کا مطلب تھا کہ بابا یا ازمیر میں سے کوئی گھر آچکا تھا۔ اپنے پاس موجود اضافی چابی سے لاک کھولتی انیقہ اندر چلی آئی تھی۔ پورے گھر پر ایک عجیب پر ہول سی خاموشی چھائی تھی۔ اسے معاً" اپنے گھر کا خیال آیا وہاں اس وقت کتنی رونق تھی۔ ابھی بھی اس کے آتے سب باہر لان میں ہی خوش گپیاں کر رہے تھے اسے لحہ بھر کو اپنے آنے پر افسوس سا ہونے لگا۔ لاؤنج خالی تھا اور بابا بھی اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ اس نے کچن میں آکر لائٹ آن کی تو سب کچھ ویسے ہی صاف ستھرا اور سمٹا

ہوا تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔
"کیا کروں۔۔۔ نو بج رہے ہیں۔ لگتا تو نہیں کہ ازمیر کچن میں آیا ہو گا۔ کیا اس سے کھانے کا پوچھوں۔" وہ وہیں کھڑے کھڑے الجھنے لگی۔
"پوچھ ہی لیتی ہوں پھر اس کی مرضی۔۔۔ کھائے یا منع کر دے۔" یہ فیصلہ کر کے وہ مطمئن ہوتی اوپر چلی آئی۔

ویسے بھی کچھ دنوں سے وہ ازمیر کا ہر کام خود ہی کرنے لگی تھی۔ اس کے جاگتے ہی اس کا ناشتا جلدی سے بنا کر اس کے کمرے تک پہنچا دیتی۔ اس کے گھر آنے کے بعد اس کے نیچے آنے سے پہلے ہی کھانا ٹیبل پر لگا دیتی اور جب سے اسے پتا چلا تھا کہ اس کی طرح وہ بھی چائے کا کتنا شوقین ہے تب سے اگر وہ گھر پر ہوتا تو جتنی بار اپنے لیے چائے بناتی۔ اتنی ہی بار اس کے لیے بھی لے کر جاتی۔۔۔ دو ایک بار وہ اچھی خاصی ڈھٹائی کا مظاہرہ کر کے کافی دیر اس کے سامنے بیٹھی اس سے باتیں بھی کرتی رہی تھی یہ الگ بات کہ اس دوران ازمیر کے بے زار کن تاثرات دیکھ کر اسے اس پر ترس بھی آیا تھا اور ہنسی بھی۔
اس کے کمرے کے قریب آ کر اس نے ناک کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ اچانک اسے رک جانا پڑا۔ ایسا غیر ارادی طور پر ہوا تھا۔ اندر سے ابھرتی ازمیر کی بھاری آواز اس کے ہاتھ کو ساکت کر گئی تھی۔
"میں جانتا ہوں یہ حالات سے فرار کی ایک فضول کوشش ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔ میں کیا کروں باسط۔۔۔ میں۔۔۔ یہاں رہوں گا تو۔۔۔ پاگل ہو جاؤں گا۔"
وہ یقیناً "فون پر کسی سے محو گفتگو تھا۔ اور یہاں انیقہ کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے وہ چاہ کر بھی وہاں سے نہ ہل پائی۔
"میں کبھی بھی اتنا مضبوط نہیں رہا کہ۔۔۔ اتنا۔۔۔ کچھ خود پر سہنے کے بعد بھی۔۔۔ میں نارمل بی ہیو کرتا رہوں میرے اعصاب جواب دینے لگے ہیں باسط۔۔۔ مم۔۔۔ میرا من۔۔۔ کسی طور نہیں سنبھل رہا۔" ازمیر کا کپکپاتا لہجہ۔۔۔ اس کے ٹوٹتے ہوئے فقرے اور لفظوں سے چھلکتا کرب محسوس کر کے انیقہ بھی ایک لمحے کے لیے لرز سی گئی تھی۔ وہ نجانے کسے؟ اپنے دل کے زخم دکھا رہا تھا۔ انیقہ کا ذہن سن ہونے لگا۔
اتنا تو اسے بہت پہلے احساس ہو گیا تھا کہ ازمیر کا رویہ کسی نارمل ذہن و دل والے بندے کا نہیں ہو سکتا اور اس لمحے اس پر یقین کی مہر بھی ثبت ہو گئی مگر کیوں۔۔۔ ایسی کیا وجہ تھی جو ازمیر کو یہاں سے جانے کے لیے اس قدر مجبور کر رہی تھی۔
"نہیں۔۔۔ اب میں شاید کبھی واپس نہ آؤں۔" اس کے مخاطب نے اسے نجانے کیا کہا تھا کہ وہ تیزی سے بول اٹھا۔
"تم نہیں جانتے۔۔۔ میں نے خود پر کتنے پہرے بٹھائے ہیں۔۔۔ ہر وقت۔۔۔ ہر لمحہ۔۔۔ میں ان کا سامنا نہیں کرتا بلکہ پل صراط پر سے گزرتا ہوں۔ بے اختیاری میں بھی احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا کہ کہیں۔۔۔ کہیں کسی کمزور سے لمحے میں ان کی طرف اٹھنے والی میری نظر۔۔۔ مجھے عمر بھر کے لیے۔۔۔ خود سے نظریں ملانے کے لائق نہ چھوڑے۔۔۔ کہ۔۔۔ یہ رشتہ ہی اتنے احترام اور احتیاط کا متقاضی ہے۔" اس کی آواز دھیمی ہوئی تھی۔ انیقہ کا دل گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔ اس کا من چاہا اب وہ مزید کچھ نہ سنے۔ یہیں سے پلٹ جائے۔۔۔ مگر اب یہ ممکن کہاں رہا تھا۔
"نہیں۔۔۔ انہیں لگتا ہے۔۔۔ مجھے ان سے پرابلم ہے۔ میں انہیں اپنا پرابلم کیسے سمجھا سکتا ہوں۔ میں ان سے کیسے کہہ سکتا ہوں کہ جو رشتہ ہمارے بیچ اب بنا ہے اس سے کہیں گہرا رشتہ میرے دل نے ان سے بہت پہلے جوڑ لیا تھا۔ تب جب مجھے یہ خبر بھی نہیں تھی کہ انہیں ہمارے گھر آنا تو ہے مگر کسی اور حیثیت میں۔" اس کے لہجے کی دہک انیقہ کے جامد جسم میں چنگاریاں بھر گئی تھی۔ اس نے دیوار کا سہارا لے کر بمشکل خود کو سنبھالا۔
"اور اب جب وہ کسی اور سے منسوب ہو کر۔۔۔ ایک مقدس رشتے میں بندھ کر ہمارے بیچ کے فاصلے سمیٹنا چاہ رہی ہیں تو میں۔۔۔ خود کو مجرم محسوس کرنے لگا ہوں۔ مجھے ڈر لگنے لگا ہے خود سے اس سے پہلے کہ میرا جنون سب کچھ بہا لے جائے۔۔۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔۔۔ میری احتیاطیں۔۔۔ میری حد بندیاں میری شدتوں کے سامنے بے معنی ہونے لگی ہیں۔ میں نے بہت ضبط کیا ہے باسط۔۔۔ مگر اب میں تھک گیا ہوں۔۔۔ بس۔۔۔ اور نہیں۔۔۔ اب اور نہیں۔۔۔" اس کے لہجے میں صدیوں کی تھکن سمٹ آئی تھی شاید اب اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا یا شاید اب وہ مزید کچھ بولنے کی کیفیت میں ہی نہیں رہا تھا اسی لیے ایک گہری چپ چھا گئی تھی اور ایسی ہی گہری جامد خاموشی انیقہ کے اندر بھی اتر آئی تھی۔ تو یہ تھا ازمیر کی بھید بھری شخصیت کا اسرار جس نے اتنا عرصہ انیقہ کو الجھائے رکھا تھا۔ وہ اس کا اندر کھوج نہیں پا رہی تھی جبکہ ازمیر کی گنبد نما شخصیت کے ہر اسرار، ہر راز کے پیچھے تو خود انیقہ کی ذات تھی۔
یہ محض اتفاق تھا یا پھر کوئی الہامی ساعت کہ وہ ازمیر کی محبت کا نوحہ سننے اس کے کمرے تک چلی آئی تھی اور اب اس کے پاس سوچنے کے لیے بھی کوئی خیال نہیں رہا تھا صرف بے یقینی تھی مگر اس کے زائل ہونے کے بعد بھی اس نے ہمیشہ حیرانی اور بے اطمینانی کی کیفیت میں ہی رہنا تھا۔ یہ انکشاف نہیں تھا ایک تند و تیز طوفان تھا جو اس کی ذات کے بنیادوں کو ہلا کر رکھ گیا تھا۔
فیصلہ کرنے میں اسے بس اک پل لگا تھا اور اس ایک پل میں ہی وہیں کھڑے کھڑے اس نے اپنے وجود میں برپا اس طوفان کو دل کے ایک کونے میں دفن کر دیا وہ اسے اپنی پوری زندگی پر حاوی ہونے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ یہی اس کی اور اس کی ازدواجی زندگی کے لیے بہتر تھا۔
ایک نظر اس بھڑے ہوئے دروازے پر ڈال کر وہ اس نامراد اور دل کے تہی دست شخص کو سوچتی ہونٹوں پر ہمیشہ کے لیے چپ کا قفل ڈال کے وہ اپنے بوجھل قدم گھسیٹتی نیچے چلی آئی تھی۔

☼ ☼

فاخرہ گل

میرے ہمنوا کو خبر کرو

دوسری قسط — 2

یہ فزا تھی جو ٹیچرز پر ایک پیروڈی سونگ میں پرفام کرنے والی تھی۔

"ہاں بولو۔" چاروں کا دھیان اب فزا کی طرف تھا۔

"وہ یار سوری میں کل پیروڈی نہیں کر پاؤں گی۔"

"نہیں کر پاؤں گی سے کیا مطلب؟" زبیر کا لہجہ سخت گیر تھا۔

"دراصل میں بہت شرمندہ ہوں لیکن رات کے وقت مجھے گھر سے اجازت نہیں ملے گی آنے کی۔" تینوں نے باری باری شاہ زین کی طرف دیکھا تھا۔

"دوپہر ہوتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن۔۔۔"

"اچھا اچھا جاؤ، ندی تم خود کر لینا ہلکا پھلکا سا ڈانس ہی تو ہے اور سکھایا بھی تم نے ہی تھا۔" صبا نے فوری حل پیش کیا تو فزا مشکور نظروں سے دیکھتی واپس چلی گئی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے میں کر لوں گی۔ کسی اور کو سکھانے کا اب ٹائم بھی تو نہیں بچا۔" بات کرتے کرتے اسے شاہ زین کی نظروں کا ارتکاز ٹوٹتا محسوس ہوا تھا۔ گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا تو قریب بیٹھا شاہ زین بہت دور محسوس ہونے لگا۔

بولتی آنکھیں اب مکمل سکوت کی لپیٹ میں تھیں۔ بنا لفظوں کے وہ اسے کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن کیا۔۔۔؟

ندرت نے ابرو چڑھاتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے پوچھا۔

"کیا اس پیروڈی کے بغیر پارٹی نہیں ہو سکتی؟" شاہ زین نے براہ راست لفظوں کا سہارا لیا تھا۔

"ہو سکتی ہے، کیوں؟"

"تو پھر اس کے بغیر ہی ہو گی، تم کوئی ڈانس وانس نہیں کرو گی سب کے سامنے۔"

نا صرف لہجہ اٹل تھا بلکہ انداز بھی۔

اس سے پہلے کہ ان تینوں میں سے کوئی بھی اسے کنوینس کرنے کے لیے کچھ بھی کہتا، شاہ زین فوراً وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

آج صبح جاگتے ہی ندرت کے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ یہی تھا کہ آج کل یونیورسٹی میں بہت زیادہ مصروف ہو جانے کی وجہ سے کتنے دن ہوئے اس نے امی اور بابا کے ساتھ وہ پہلے جیسا وقت نہیں گزارا۔

کافی دن ہوئے اس نے بابا کے ساتھ ملکی و غیر ملکی سیاسی اور معاشی صورت حال پر بے لاگ تبصرہ کیا، نہ ہی امی سے جان بوجھ کر ان کے ماضی کی خوش گوار یادوں کو کریدا، نہ اپنے بارے میں بہت کچھ ان سے شیئر کر پائی اور نہ ہی ناصر بھائی کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلا اور تو اور ثروت آپا کے ننھے منے بیٹے کی غوں غاں سننے کے لیے ایک فون تک نہیں کر سکی۔

وہ تو ویسے اپنے شوہر کے ساتھ ہر دوسرے روز چکر لگا لیا کرتیں لیکن تب ندرت یونیورسٹی میں ہوتی اس لیے ملاقات نہ ہو پاتی۔

اور یہ ساری مصروفیت اس پروگرام کی وجہ سے تھیں جو بڑھتے بڑھتے اب ڈنر تک جا پہنچا تھا۔

ورنہ عام دنوں میں وہ کوشش کرتی کہ عائشہ کی گھر کے کاموں میں ضرور ہیلپ کروا دیا کرے۔ باوجود اس کے کہ ناصر بھائی کو اس کا یوں گھر میں کام کرنا پسند نہیں تھا کہ ان کے خیال میں یونیورسٹی سے اتنا تھک ہار کر آنے کے بعد گھر میں کام کاج کرنے کا کہنا ندرت کے ساتھ زیادتی تھی وہ بھی اس صورت میں

مکمل ناول

جب عائشہ سارا دن گھر میں موجود بھی ہو۔

مگر ان سب کے باوجود وہ عائشہ کی ہیلپ ضرور کرواتی اور وہ بھی اس طرح کہ ناصر بھائی کو قطعاً علم نہ ہوا کرتا۔

لیکن حیرت تھی کہ پھر بھی جانے کیوں ندرت کو سامنے دیکھتے ہوئے عائشہ کے دل میں اکثر اوقات جلن ہی کا جذبہ سر اٹھاتا۔ اس کے برعکس ثروت آپا سے ان کی بہت اچھی بنتی تھی۔ ندرت سے شاید انہیں ایک مقابلہ کا سا احساس رہتا تھا۔ آخر کو وہ خوش شکل، خوش اندام اور خوش ادا بھی تھی۔ اس پر پہننے اوڑھنے کا شوق بھی تھا اور سلیقہ بھی۔ زندگی کو زندہ دلی سے گزارنے کی قائل تھی۔ اس نے بھی عائشہ کے کسی بھی معاملے میں بے جا مداخلت کی تھی اور نہ کسی بھی معاملے میں عائشہ کی اہمیت کم ہونے دی تھی۔

اور انہی باتوں کا احساس آج اسے آنکھ کھلتے ہی ہوا تو حسب معمول سب سے پہلے سائیڈ ٹیبل پر رکھے اپنے موبائل کو اٹھایا جہاں ہمیشہ کی طرح شاہ زین کا میسج اس کا انتظار کر رہا تھا۔

تمہیں کوئی اور دیکھے جلتا ہے دل
بڑی مشکلوں سے پھر، سنبھلتا ہے دل
کیا کیا جتن کرتے ہیں تمہیں کیا پتا
یہ دل بے قرار کتنا یہ ہم نہیں جانتے
مگر جی نہیں سکتے تمہارے بنا
ہمیں تم سے پیار کتنا۔۔۔

گزشتہ روز کے اپنے رویے کو شاہ زین نے بڑی خوب صورتی سے کشور کمار کے گیت کا سہارا لیتے ہوئے واضح کیا تو وہ بے اختیار مسکرا دی۔ اور جواب لکھتے ہوئے چند لمحے سوچتے ہوئے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا جہاں صبح کی اوائل ٹھنڈی ٹھنڈی اور نرم ہوا کا ہلکا ہلکا لمس پھول پتوں کو گدگدائے دے رہا تھا۔

تجھے محسوس کر کے سوچتی ہوں
میں زندہ تھی کہ اب زندہ ہوئی ہوں

مسکراتے لبوں کے ساتھ نازک انگلیاں حرکت میں آئیں جواب سینڈ کرنے کے بعد بجلی کی سی برق رفتاری سے وہ واش روم گئی اور اسی رفتار سے باہر آ[illegible] میں جا پہنچی۔ جہاں بابا کے آسٹریلوی توتوں بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا کچھ دیر وا[illegible] کرنے کے بعد وہ ان کے پاس جا پہنچی۔ بابا [illegible] ہمیشہ کی طرح پنجرہ بے حد صاف کر رکھا تھا۔ سو کچھ [illegible] توتوں کے لاڈ اٹھانے کے بعد امی کے پاس آ[illegible] جنہوں نے قرآن پاک بند کرتے ہوئے اس [illegible] پھونک ماری اور بس۔

برق رفتاری سے گھر کی صفائی ستھرائی جو شروع کی تو جالے تک اتار دیے۔ اپنے اور امی کے کمرے کی بیڈ شیٹس تبدیل کیں۔ اور بڑے مزے سے چہکتے ہوئے ان کی دوائیوں والی دراز بھی سیٹ کر دی۔

یوں بھی وہ اکثر اوقات صبح سویرے ہی اٹھنے کی عادی تھی کہ شروع سے امی، بابا نے اس کے ذہن میں یہ بات ڈال رکھی تھی کہ صبح جلدی اٹھنے والے کے کام اس کے پیچھے یعنی اختیار میں رہتے ہیں اور اسے کاموں کے پیچھے نہیں بھاگنا پڑتا، جبکہ اس کے برعکس دیر سے اٹھنے والا کاموں کے پیچھے پیچھے بھاگتا ہے اور کام پھر بھی اس کے بس میں نہیں ہوتے اسی لیے بچپن سے اب تک صبح سویرے جاگ جانے کی اس کی عادت بے حد پختہ تھی۔

عائشہ ابھی اپنے کمرے میں ہی تھی جبھی ندرت کچن میں جا کر امی، بابا کے لیے گرما گرم چائے بنا لائی تھی۔ ساتھ ہلکے سینکے ہوئے چند توسٹ بھی تھے۔ خو[illegible] اس کے لیے تو چائے شجر ممنوعہ تھی اس لیے اپنے لیے ناشتا لینے کے لیے اسے پہلے چند لمحے تو فریج [illegible] دروازہ کھول کر کھڑا رہنا پڑا تھا۔ ایک طرف مختلف [illegible] کے جام، مارملیٹ اور مایونیز کی مختلف شیشیوں کے ساتھ اس کا من پسند پائن ایپل اور کوکونٹ کا مکس جو[illegible] رکھا تھا۔ سوا اپنے لیے اس نے ٹرے میں مایونیز بوائل ایگ اور جوس رکھا اور حسب عادت گنگناتے ہوئے امی کے کمرے تک جا پہنچی۔ ٹی ٹیبل پر ٹرے رکھنے کے بعد شاہی کنیزوں سا انداز اپناتے ہوئے بولی۔

"ملکہ عالیہ! اور جہاں پناہ!، اہتمام طعام آپ [illegible] منتظر ہے۔"

اس معصومانہ انداز پر بابا کو بے اختیار اس پر پیار آیا تھا۔ سو فوراً اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔

"خدا میری شہزادی کو ہمیشہ خوش رکھے۔" بابا کے دل سے بے ساختہ دعا نکلی تھی۔

خود امی بھی اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتیں اور آج جس طرح وہ یہاں سے وہاں مسکراتی، گنگناتی، چہکتی پھر رہی تھی تو وہ بھی اس کے لیے ہر قسم کی نظر بد سے بچنے کی دعا کر رہی تھیں، کہ خدا اسے حاسدوں کے حسد، شیطان کے شر، دشمن کے وار، نظر بد اور نیت بد سے بچا کر اپنی پناہ میں رکھے۔

"یارب اس کی آنکھ کی رونق
ہونٹ کی شوخی
تن کا جوبن
یارب اس کی آنکھ کا کاجل
گال کی سرخی
دل کی دھڑکن
یارب اس کے من کی خوشیاں
دل کی چاہت
روح کی راحت
اس کے سارے رشتے ناتے
سنگی ساتھی دوست وہ سارے
اس کے گھر کے پیڑ کے پتے
قدموں سے مس ہوتے ذرے
اس سے جڑی ہر شے ہر رشتہ
ہر لحہ ہر گیت ہر نغمہ
اس کے سکھ کا ہر اک موسم
یارب سدا سلامت رکھنا۔"

امی بابا کو اپنے ہاتھوں سے چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے خود ندرت نے بھی یہ وقت امر ہو جانے کی دعا کی تھی لیکن۔۔۔ وقت بھی کبھی ٹھہرا ہے بھلا!

☆☆☆

آج خلاف توقع ناصر بھائی گھر پر تھے سب شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ناصر کیوں کہ اتوار کے علاوہ شاذ و نادر ہی اس وقت گھر پر ہوتے سو آج عائشہ نے چائے کے ساتھ کافی اہتمام کر ڈالا تھا۔ نا صرف یہ بلکہ سب کا موڈ خوش گوار جان کر ندرت کی شادی کی بات بھی چھیڑ ڈالی۔ جس نے امی اور بابا دونوں کو حیران کر ڈالا۔ البتہ ناصر کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ بات ان دونوں کے درمیان پہلے بھی ڈسکس ہو چکی ہے۔

"بیٹا! ابھی تو اس کی پڑھائی بھی مکمل نہیں ہوئی اور عمر بھی ابھی اتنی نہیں ہے۔" بابا کی نظروں نے بھی امی کی بات کی تائید کی تھی۔

"پڑھائی کا کیا ہے دو نہیں تو چار مہینوں میں ختم ہو جائے گی اور شادی کون سا کل کر رہے ہیں۔"

"کہتی تو عائشہ ٹھیک ہے اور جہاں تک عمر کی بات ہے تو ثروت اور خود عائشہ کی بھی تقریباً اسی ایج میں شادی ہوئی تھی۔"

عائشہ یقیناً ناصر کے سامنے رستہ ہموار کر چکی تھی جبھی اس کی مکمل حمایت بھی حاصل تھی۔

"چلو دیکھتے ہیں، سوچتے ہیں کچھ اس بارے میں بھی۔" بابا نے بات بدلنا چاہی۔

"سوچنا بھی کیا بابا، رشتہ تو گھر میں ہی موجود ہے آپ جب کہیں گے امی لوگ آ جائیں گے۔" عائشہ کی بات پر امی اور بابا دونوں چونکے تھے۔ جو شاید ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا ارادہ کیے بیٹھی تھی۔

"ماشاء اللہ اکمل کی ٹریننگ ختم ہونے والی ہے اس لیے ہم سوچ رہے تھے کہ۔۔۔" بات کرتے کرتے سامنے گیٹ سے ندرت اندر آتی دکھائی دی تو عائشہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

☆☆☆

عشا کی نماز کی ادائیگی کچھ تاخیر سے کرنا عرصہ دراز سے امی کا معمول رہا تھا۔ جس کی بنیادی وجہ رات کے کھانے کے بعد سب کا امی بابا کے کمرے

میں اکٹھا ہو کر گپ شپ کرنا تھی۔ یوں بھی رات کے کھانے کا کوئی مقررہ وقت تو تھا نہیں کہ یہ سب ناصر بھائی کے آفس سے واپس آنے پر منحصر ہوا کرتا۔

دوپہر کے کھانے کے اوقات میں ندرت اکثر و بیشتر یونیورسٹی میں ہوتی اور ناصر بھائی آفس۔ اس لیے رات کے کھانے میں سب کی موجودگی یقینی بنانے کے لیے اس وقت تک انتظار کیا جاتا جب تک ناصر بھائی آفس سے واپس نہ آ جاتے اور ان کی جاب تھی بھی کچھ ایسی کہ گھر واپسی کا وقت مخصوص نہ تھا۔ جلدی آنے کا تو خیر تصور محال ہی تھا مگر کئی دفعہ دیر ہونا معمول بنتا جا رہا تھا۔ ویسے بھی پرائیویٹ اداروں کے لیے تو مثل مشہور ہے کہ لیموں کی طرح ورکرز کو نچوڑ کر کام لیا جاتا ہے۔ بس اسی لیے ان کا دیر سے آنا بھی معمولات میں سے تھا۔ اور پھر جب وہ گھر پر آتے گرما گرم پھلکے نما روٹیاں اسی وقت تازہ تازہ توے سے اترا کرتیں کہ ہاٹ پاٹ کی رکھی روٹیاں نہ تو ناصر بھائی کو پسند تھیں اور نہ ہی ندرت کے حلق سے اترتیں جبھی گھر سے دس پندرہ منٹ کی دوری پر ناصر بھائی ہمیشہ سے ایک مِس کال کر کے اپنی آمد کے بارے میں مطلع کر دیا کرتے۔ نتیجتاً ان کے آنے تک گرما گرم روٹیاں بھی تیار ہوتیں اور سب ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی کھا لیتے۔

چائے کا دور البتہ امی، بابا کے کمرے میں چلتا۔۔۔

ابھی کچھ دیر پہلے عائشہ، ناصر بھائی اور ندرت کمرے سے اٹھ کر گئے تو امی نے باتھ روم جا کر وضو کا اہتمام کیا اور ادائیگی نماز کے لیے جائے نماز سنبھالے کمرے کی بائیں سمت دیوار کے ساتھ قبلہ رخ کیے خالقِ حقیقی کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سر کو جھکا دیا۔

بابا چوں کہ نماز باجماعت پڑھا کرتے تھے اس لیے بیڈ کی کراؤن سے ٹیک لگا کر سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھی کتاب نکال کر اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔

"کیا بات ہے؟ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

نماز سے فراغت کے بعد جائے نماز لپیٹتے ہوئے امی نے بابا کو کتاب کے سرورق پر نظریں جمائے گم سوچ میں گم پایا تو پوچھا۔

"اوں۔۔۔ ہوں۔" بابا نے چونک کر امی کو دیکھا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کتاب کے عنوان پر انگشتِ شہادت پھیرنے لگے۔

امی نے ہاتھ میں پکڑی جائے نماز الماری کے اندر رکھی اور سب سے اوپری شیلف میں قرآن پاک کے قریب رکھے سلور رنگ کے چمک دار ڈبے سے سبز موتیوں کی تسبیح ہاتھ میں لے کر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"ندرت کے بارے میں سوچ رہے ہیں نا؟"

آخر تیس سالہ بے مثال رفاقت تھی، جبھی اُن کے بغیر بتائے سمجھ گئی تھیں کہ اُن کی خاموشی کی وجہ کیا ہے۔

"ہاں۔۔۔" بابا نے کتاب سائیڈ پر رکھی اور چشمہ اتار کر کتاب کے اوپر رکھ دیا۔

"سوچ رہا تھا کہ آج عائشہ نے ندرت اور اکمل کے بارے میں بات تو پہلی مرتبہ کی ہے لیکن۔۔۔ ناصر اور اُس کی باتوں سے کیا تمہیں ایسا نہیں لگا جیسے۔۔۔ جیسے اپنے تئیں وہ یہ سب طے کیے بیٹھے ہیں۔" لفظوں کے بھیس میں خدشات بول رہے تھے۔

"لہجوں اور رویوں کو بھلا آپ سے بڑھ کر کون پرکھ سکتا ہے۔" امی مسکرائیں مگر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید گویا ہوئیں۔

"محسوس تو مجھے بھی یہی ہوا تھا جیسے عائشہ محض ہمیں اطلاع دینا چاہ رہی ہے، لیکن آپ خود سوچیں، فرض کیا کہ ندی اور اکمل کی شادی ہو بھی جاتی ہے تو اس میں بُرا کیا ہے؟" بابا نے اپنی سوچتی نظریں امی کے چہرے پر مرکوز کیں۔

"آخر کہیں تو ندرت کی شادی کرنی ہے نا۔۔۔ اور پھر اکمل میں مجھے تو ایسی کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ ہاں عمر میں ہماری ندی سے چھوٹا ضرور ہے، لیکن یہ بات وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔" امی نے بھی گویا اکمل کے حق میں اپنا ووٹ دیا تھا۔

"اور ندرت۔۔۔؟" بابا ابھی تک مطمئن دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"ہاں اگر ندرت کی مرضی نہ ہو تو میں ضرور اس رشتے کی مخالفت کروں گی کیوں کہ ندرت کی مرضی بہرحال ہمارے لیے زیادہ اہم ہے۔"

"ہوں۔۔۔" انگوٹھے اور انگشتِ شہادت سے آنکھوں کو دباتے ہوئے بابا نے گردن کو اثبات میں ہلکی سی جنبش دی اور پھر آنکھیں کھول دیں۔

"مانا کہ اللہ نے مجھے تین دفعہ اولاد کی نعمت سے نوازا ہے۔ ثروت، ناصر اور ندرت، لیکن یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے لیے ندرت سے بڑھ کر اس دنیا میں اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میری جان، میرا مان۔۔۔ ندرت میری سب سے چھوٹی بیٹی سہی مگر۔۔۔ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ تم اس کی ماں ہو، ہمیشہ اس کے لیے بہترین ہی سوچو گی نا۔۔۔ لیکن پھر بھی خیال رکھنا جس طرح کبھی جادوگر کی جان توتے میں بتائی جاتی تھی اسی طرح میری جان ندرت کی خوشی میں ہے اور اگر کبھی کسی بھی وجہ سے اس کے شاداب چہرے پر اُداسی اتری یا اس کی چمکدار آنکھیں آنسوؤں سے بھریں تو۔۔۔ تو میں جی نہیں پاؤں گا۔"

بابا نے کوشش تو کی تھی کہ گلوگیر لہجے میں ہی سہی اپنی بات مکمل کر پاتیں مگر ایسا ہو نہیں سکا تھا اور بالآخر ان کا گلا رندھ گیا۔

اور مرد ہونے کے باوجود ضبط کی کوشش میں ناکامی کے بعد آخر وہ رو دیے۔

باپ اور بیٹی کا رشتہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ بے مثال اور بھرپور محبت کی چاشنی سے گندھا۔۔۔

جب سے شام کو عائشہ نے ندرت کی شادی کی بات کی تھی اس کی رخصتی کے خیال سے ہی بابا کا دل بھر آیا تھا۔

کہ یہ مرحلہ والدین کی زندگی کا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ جب اتنے سالوں لاڈ پیار سے پالنے اور کانچ کی طرح سینت سینت کر رکھنے کے بعد اپنے جسم کا سب سے نازک اور حساس حصہ حالات اور نصیب کے حوالے کر کے خود حالات خوش گوار اور نصیب اچھا ہونے کی دعاؤں میں لگ جاتے ہیں۔

جب کہ دوسری طرف ایک مناسب عمر میں اولاد زندگی کے نئے سفر میں قدم رکھ دے تو بلاشبہ اسے بھی والدین کی خوش قسمتی ہی تصور کیا جاتا ہے۔

امی نے اٹھ کر انہیں پانی دیا تو جیسے ان کے آنسوؤں میں ٹھہراؤ سا آ گیا۔

خود اُن کا اپنا دل بھر آیا تھا، لیکن وہ بھی رو کر انہیں مزید کمزور نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ یوں بھی شادی تو ثروت کی بھی ہوئی تھی مگر بابا کی یہ کیفیت تب بھی نہیں تھی مگر آج۔۔۔ اپنی ازدواجی زندگی کے تیس سالوں میں امی نے آج دوسری مرتبہ انہیں یوں بچوں کی طرح روتے دیکھا تھا۔

پہلی مرتبہ وہ اپنی والدہ کی وفات پہ یوں روئے تھے اور یا پھر اب۔۔۔

"اتنا سارا ابھی رو لیں گے تو ندی کی رخصتی پر کیا کریں گے؟"

امی نے کمرے کی فضا میں آہستگی سے پھیلنے والے بوجھل پن کو کم کرنا چاہا۔

"رخصتی پر میرے حصے کا بھی تم رو لینا، یوں بھی میرے ہر کام میں تو ففٹی پرسنٹ کا حصہ ڈالتی ہی ہو نا۔"

اُن کی بات پر امی مسکرا دی تھیں۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ طے پا گیا کہ ندی کی رخصتی پر آپ کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں گرے گا۔۔۔۔ یہ ذمہ داری میری۔۔۔"

امی کی بات پر بابا بھی سر ہلا کر مسکرا دیے تھے۔

☆☆☆

آج ندرت بہت تھک گئی تھی اسی لیے کھانا کھانے کے بعد فوراً بیڈ پر لیٹ گئی کہ اس کا ارادہ آج

جلدی سونے کا تھا مگر ہُوا اس کے برعکس، وہ اس لیے کہ ہمیشہ کی طرح لیٹتے ہی دو سرمئی آنکھیں بڑے والہانہ انداز میں دیکھتی ذہن کے پردے میں آنمودار ہوئیں۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد اُن ساحر آنکھوں کا والہانہ پن سکوت میں بدلنے لگا۔ ندرت نے آنکھیں کھول دیں۔

ایک ایک کر کے بہت سی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔

جب بھی آتی ہے تیری یاد مجھے سوتے میں
اک چنبیلی سی بکھر جاتی ہے چاروں جانب

موبائل کی ہلکی سبز اسکرین کے ذریعے اسے شاہ زین کا میسج ملا تھا۔ یعنی اتنی رات گئے وہ بھی جاگ رہا تھا۔ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ ندرت نے اس کا میسج پڑھا اور سپید مخروطی انگلیاں اس کا جواب ٹائپ کرنے لگیں۔

چاروں جانب ہے میرے سرمئی آنکھوں کا حصار
سونا چاہوں بھی تو نظریں نہیں سونے دیتیں

میسج بھیجنے کے بعد اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتی بجتے موبائل نے ایک بار پھر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"ہاں شاہ جی کیا حال ہیں؟" رات کے پچھلے پہر نرم ہوا کا جھونکا کھلی کھڑکی سے اُسے مہکا گیا تھا۔

"ارے یار میں تو ایک عام سا بندہ ہوں شاہ نہ کہا کرو۔" دوسری جانب شاہ زین تھا۔

"میرے لیے تو ساری دنیا سے بڑھ کر خاص ہو تا تو میں جو بھی کہوں۔"

"ہاں کچھ بھی کہہ لیا کرو لیکن شاہ نہیں، یہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا۔"

"تم صرف میرے ہو نا شاہو؟"

"بالکل سو فیصد۔" لفظوں سے کہیں بڑھ کر اس کے لہجے نے تجدید کی تھی۔

"تو بس پھر میں تمہیں کچھ بھی کہہ کر مخاطب کروں منع مت کیا کرو۔"

"اوئے پاگل منع صرف اس لیے کرتا ہوں کہ یہ طرزِ تخاطب تم سید لوگوں کے لیے ہی بجتا ہے۔"

"لیکن تم بھی تو شاہ کی آن ہو۔" وہ بھی ہارنے والی نہیں تھی۔

"اچھا بابا جو مرضی ہے کہو لیکن یہ بتاؤ ابھی تک جاگ رہی تھیں، کیوں؟"

"تم سونے جو نہیں دیتے۔" دوسری طرف سے بڑا اِٹھلا کر جواب آیا تھا۔ جس پر شاہ زین ہنس دیا تھا۔ جان بوجھ کر بات کو دوسری طرف موڑنا چاہا۔

"یار میں کوئی مچھر ہوں جو تمہیں سونے نہیں دیتا۔"

"تو اور کیا، یونیورسٹی میں بھی مجھ پر غصہ کرتے رہتے ہو اور گھر میں بھی خیالوں میں آ آ کر رعب جھاڑتے ہو۔"

"آج تمہیں برا لگا نا؟"

"بُرا تو نہیں لگا لیکن ہاں کچھ عجیب ضرور محسوس ہوا تھا۔"

"پتا ہے ندی۔۔۔!" چند لمحے دونوں کے بیچ خاموشی رہی۔ یقیناً وہ لفظوں کا چناؤ کر رہا تھا۔

"شاید تم مجھے تنگ نظر یا Narrow minded سمجھو لیکن صاف بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ تم ڈیپارٹمنٹ کے تمام لڑکوں کے سامنے معمولی سا ہی سہی لیکن ڈانس کرو۔ وہ تمہیں سراہیں یا ہوٹنگ کریں، کسی بھی صورت یہ بات میرے لیے قابلِ برداشت نہیں ہو سکتی۔۔۔ تمہیں نہیں پتا ندی یہ لڑکے اور خصوصاً میران جیسے لڑکے، لڑکیوں کے لیے کیسے کیسے کمنٹس پاس کرتے ہیں۔۔۔ بس میں تمہیں سب کی نظروں سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں اور بس۔"

شاہ زین کی اِن باتوں سے ندرت کے دل میں اس کی قدر و منزلت کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔

"اُس دن میں نے تمہیں جھاڑو لگانے سے بھی منع کیا کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی تم پر کوئی جملہ پھینکے اور ویسے۔۔۔" شاہ زین ایک بار پھر رُک کر شاید کچھ سوچ رہا تھا۔

"تم نے کبھی چینی کے سفید سفید برتن دیکھے ہیں؟"

"ہاں بہت دفعہ، لیکن یہاں اُن کا ذکر کہاں آ گیا۔"

"اس لیے کہ تمہارے ہاتھ چینی کے اُن برتنوں سے کہیں بڑھ کر سفید اور بے داغ ہیں اور یہ جھاڑو پکڑنے کے لیے نہیں بلکہ صرف اور صرف میرا ہاتھ پکڑ کر بہت دور تک چلنے کے لیے بنائے گئے ہیں، سمجھیں؟"

"بہت اچھی طرح سرکار۔۔۔ بلکہ سرتاج!" شاہ زین کے سامنے اُس نے کبھی بھی زبان پر فلٹر استعمال نہیں کیا تھا، جو من میں آتا بول دیتی۔

"میرا خیال ہے ابھی کار ہی رہنے دو، جب سر کو تاج نصیب ہوا تو پھر یہ کہنا۔"

"شاہو۔۔۔! کیوں رہتے ہو اتنے محتاط؟" لہجے میں ایک دم ٹھہراؤ آیا تھا۔

"تمہارے جذبوں کی شدت سے ڈر جاتا ہوں نا، اس لیے۔"

"تم کیا ڈرو گے، ڈر تو اب مجھے لگ رہا ہے۔"

"خیریت؟ کیا ہوا؟" وہ اس کی آواز کے تاثرات محسوس کر کے گھبرا گیا تھا۔

"کھڑکی سے باہر دیکھو، فجر ہونے والی ہے اور بھابھی شاید کچن میں پانی پینے آئی ہیں۔"

"تو تم کچن میں ہو؟" شاہ زین نے جان بوجھ کر ایسا سوال کیا کہ وہ ریلیکس ہو جائے۔

"یار میں تو کچن میں نہیں ہوں لیکن بھابھی لائٹ آن دیکھ کر چند ہی لمحوں بعد میرے روم میں ہوں گی۔" اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ پھر شام کو ملاقات ہو گی۔"

"سنو۔۔۔!"

"ہاں بولو۔"

"تمہارا مجھ پر مکمل اختیار ہے۔ جس چیز سے چاہو، رعب جما کر منع کر دیا کرو، تمہارا جتانا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"اچھا؟ تو پھر دیکھو یاد رکھنا اپنے الفاظ۔۔۔ مکر نہ جانا۔۔۔"

"اِک واری کہہ جو دِتا رے سوہنیا۔۔۔"

ندی کے انداز پر وہ بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

"اور جناب صرف یہی نہیں بلکہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ آج مجھے شام کو بلیک کلر پہننا ہے کیوں کہ تمہارا فیورٹ ہے، ہے نا؟"

"واہ بھئی! تمہاری یادداشت کی تو داد دینی پڑے گی۔"

"داد کو چھوڑو اور میری فریاد سنو کہ اس سے پہلے کہ بھابھی کمرے میں آ کر لائٹ بند کریں تم فون بند کر دو۔"

"او کے او کے، ٹیک کیئر، ہاں، اللہ حافظ۔"

"یو ٹو اینڈ لو یو۔۔۔ اللہ حافظ۔"

آخری جملہ سرگوشی نما انداز میں کہتے ہوئے ندرت نے فون بند کیا تو دونوں جانب لبوں پر ایک مسحور کن مسکراہٹ کھل رہی تھی۔

انہی خیالوں میں ندرت نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی، فجر کا وقت تھا اس لیے سونا بے معنی تھا کیونکہ اب سے کچھ دیر کے بعد یونہی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی کہ یہ وقت وہ اکثر اوقات اپنے چھوٹے مگر خوش نما پھول، پودوں سے سجے لان میں گزارا کرتی۔ جہاں آسٹریلین توتے یہاں سے وہاں پھدک کر اُس کا استقبال کرتے تو وہ بھی courtesy میں اُن کا پنجرہ وغیرہ صاف کر کے ننھی ننھی کٹوریوں میں تازہ پانی ڈالتی اور ساتھ رکھی گول مٹول ڈبیوں میں خوراک ڈال کر وہیں چہل قدمی کرنے لگتی۔

جبھی اس وقت دوبارہ لیٹنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اُس نے کھڑکی سے ذرا سا باہر کے ہوئے گلابی پردوں کو مکمل طور پر ہٹا کر کھڑکی کھول ڈالی۔

تازہ، نرم اور ٹھنڈی سبک خرام ہوا نے اُسے بے اختیار اپنے گرد بازو لپیٹنے پر مجبور کیا تھا۔ باوجود اس کے کہ ابھی سورج کی پہلی کرن کے زمین کو چھونے میں وقت تھا مگر مین گیٹ پر لگی ٹیوب لائٹ کی دودھیا

روشنی سے سارا لان گویا نور میں نہاتا محسوس ہو رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے عموماً چاندنی راتوں میں ہوا کرتا ہے۔

کھلی کھڑکی پر کہنیاں ٹکائے پنک ٹراؤزر، شرٹ میں ملبوس باربی ڈول سی ندرت اس بات سے قطعی بے خبر تھی کہ لائٹ آن دیکھ کر عائشہ کچن میں جانے سے پہلے اُس کے کمرے کی طرف سے گزرتے ہوئے اندر سے آتی آوازوں پر ٹھٹک کر باہر ہی رک گئی تھی اور ندرت کی طرف سے ادا کردہ آخری جملہ تو جیسے عائشہ کو جھنجھوڑ کر رکھ گیا تھا۔

یعنی پہلے دو تین مرتبہ جس چیز کو اس نے اپنا وہم سمجھ کر ناصر کے سامنے انتہائی نرم اور مناسب لفظوں سے بیان کرنے کے باوجود اُن سے برہمی کا ہی اظہار سنا تھا وہ وہم نہیں حقیقت تھی۔

مگر اب تو وہم سمجھنے کی کوئی گنجائش باقی تھی ہی نہیں۔ تو ناصر کو کیسے بتایا جائے یہ بات اب عائشہ کے لیے بے حد اہم تھی۔

ایک تو امل کی جگہ کسی اور سے ندرت کا اس طرح بات کرنا اور پھر وہ ندرت جس کی وجہ سے اُسے کبھی بھی سسرال میں خود مختاری میسر نہیں آئی تھی کہ عائشہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو سسرال میں تن تنہا حکومت کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔ ساس، سسر، نندیں، دیور سب اُن کی بات کو حکم کا درجہ دیتے ہوئے مانیں اور خود انہیں مشورہ تک دینے کی زحمت گوارا نہ کریں۔

یہ تھا ایک آئیڈیل سسرال کا بنیادی خاکہ جو عائشہ کے ذہن میں تھا۔

مگر یہاں حالات قدرے مختلف تھے کہ ساس سسر کی عزت بھی ماں باپ کی طرح کرنی "پڑتی" اور چھوٹی نند یعنی ندرت کو بھی بہنوں سا پیار دینے کی واضح ہدایات ملتیں۔ اس سب کے باوجود عائشہ کا بڑی بہو کا رتبہ اپنی جگہ معتبر تھا۔

کہ امی اور بابا یا ناصر ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو ایک رشتے میں مٹھاس برقرار رکھنے کی خاطر دوسرے رشتوں میں آہستہ آہستہ گھلتی کڑواہٹ کی پروا نہ کرتے۔ عائشہ کو ہر جگہ، ہر موقع پر اہمیت دی جاتی لیکن ہاں تن تنہا حکومت کا خواب ابھی اس کا پورا نہ ہوا تھا۔

اور پھر پتھر پر بھی پانی پڑتا رہے تو سیانے کہتے ہیں اس میں سوراخ ہو جاتا ہے تو پھر کہاں ایک انسانی دل۔

جبھی عائشہ نے ایک بار پھر کچھ سنی اور کچھ بُنی ناصر تک پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اب کی بار وہ الفاظوں کو پُر اثر اور قابلِ یقین بنانے کے لیے ذہن میں کہانی کا پلاٹ تیار کرتی کچن کی طرف بڑھ گئی کہ آج ناصر کو بھی جلدی جو جگانا تھا۔

☆☆☆

"جاگ بھی جائیں، صبح ہو گئی ہے۔۔۔ ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

کروٹ کے بل لیٹے شاہ زین نے ایک چیخ نما آواز اپنے قریب سے ہی آتی محسوس کی تو پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

ثمینہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اس کے کان پر جھکی ننھے سے منہ سے بھونپو نما آواز نکال رہی تھی۔ جبھی کہنیوں پر وزن ڈالتے ہوئے لمحہ بھر کی تاخیر کیے بنا اسے اٹھتے ہی بنی۔

"تم ٹھیک تو ہو۔ اگر میرے کان کا پردہ پھٹ جاتا تو۔۔۔"

"تو کیا، اماں سلائی مشین رکھے بیٹھی ہیں، چٹ پھٹا، پٹ سلتا۔۔۔"

"تمہیں تو میں ابھی پوچھتا ہوں۔"

یونہی اسے ڈرانے کے لیے شاہ زین اُس کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ وہ حقیقتاً ڈر کر کمرے سے بھاگ گئی۔

کچھ عرصے پہلے اس گھر کے در و دیوار اس طرح کی شرارتوں اور قہقہوں سے قطعی ناواقف تھے مگر اب بات کچھ اور تھی۔ چھوٹی موٹی شرارتیں، شاہ زین اور ثمینہ کی پیار بھری نوک جھوک اور اُن دونوں کی خوشیوں میں خوش اماں کا شفقت بھرا مسکراتا چہرہ۔۔۔

سب کچھ کتنا مکمل لگنے لگا تھا اب!

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے شاہ زین نے ایک بار پھر آنکھیں موند لی تھیں۔

مگر یہ کیا۔۔۔ پاؤں پر کسی کیڑے کے رینگنے کا سا احساس ہونے پر اُس نے فوراً دائیں ٹانگ کھینچتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو ثمینہ کو کمرے سے باہر بھاگتے دیکھ کر سمجھ گیا کہ اب وہ اسے مزید سونا تو ناممکن لیٹنے بھی نہیں دے گی۔ جبھی ایک بھرپور انگڑائی لے کر اٹھتے ہوئے سلیپرز پہنے اور کمرے سے نکل کر برآمدے جا پہنچا جہاں اماں تخت پر سلائی مشین رکھے بیٹھی تھی۔

"اماں آج آپ پھر سلائی مشین رکھے بیٹھی ہیں اور آپ کو پتا بھی ہے کہ ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے۔" موڑھا اٹھا کر اماں کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

"کچھ زیادہ کام نہیں تھا بیٹا! بس یہ ثمینہ کی قمیص ٹھیک کرنی تھی ذرا سی۔"

"مجھے دیتیں نا میں ٹیوشن کے لیے جاتے ہوئے ٹیلر کو پکڑا جاتا۔"

"ٹیوشن کیوں بھائی؟ آج یونی نہیں جانا کیا؟" ثمینہ نے برآمدے کے آخر میں بنے کچن سے سر باہر نکالتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں آج صبح کی ٹیوشن بھی نہیں تھی کہ قاسم وغیرہ گھر پر نہیں ہیں اور یونی بھی نہیں جانا کیوں کہ شام کو پارٹی ہے۔"

"او مائی گاڈ۔۔۔ سوری بھائی! میں تو پھر خوامخواہ آپ کو جگاتی رہی۔"

اُس کی شرمندگی پر شاہ زین مسکرانے لگا۔

"مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ آج آپ شام میں جائیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں تو ویسے بھی ابھی اٹھنے ہی والا تھا لیکن تم آج گھر پر کیوں ہو؟ کالج نہیں جانا کیا؟"

"نہیں بھائی آج ٹیچرز کی اسٹرائیک ہے اس لیے کالج بند ہے۔"

"اوہ اچھا۔۔۔"

"ثمینہ وہ دیکھو اوپر کونے میں۔"

اماں کی نظر اچانک ہی برآمدے کی چھت کے عین کونے میں لگے جالے پر پڑی تو کچن میں مصروف ثمینہ کو اُسی وقت آواز دے کر بلا لیا۔

یوں بھی یہ وہ واحد چیز تھی جس پر وہ کوئی کمپرومائز نہ کرتی تھیں۔ جس وقت جہاں نظر آئے سارے کام چھوڑ کر اُسے ہٹا دینا ہی ان کے نزدیک بہتر تھا۔

"ضرور کوئی جالا ہوگا ہے نا۔" کچن میں ہی کھڑے کھڑے اُس نے خیال کی تصدیق چاہی۔ شاہ زین نے اس کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں یہ کچن صاف کر لوں اماں! پھر آتی ہوں۔"

"نہیں بیٹا! مکڑی جالا بُنے تو فوراً صاف کر دو یہ گھر میں نحوست ہوتے ہیں۔ اپنے بسنے اور آباد رہنے کے لیے گھروں کا ویرانہ مانگتے ہیں اور۔۔۔ اور میں اس گھر کو سدا آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔"

اماں کی بات پر ثمینہ فوراً ہاتھ دھو کر جالے کو صاف کرنے کی نیت سے بڑھی۔ پہلے تو وہ محض صفائی کی نیت سے ہی جالے صاف کیا کرتی تھی لیکن آج اس نظریہ سے واقف ہونے کے بعد تو اب وہ کبھی بھی جالے تو کیا مکڑی کو بھی گھر میں داخلے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

☆☆☆

اپنے حصے کے خواب لکھتا ہوں
آگہی کے عذاب لکھتا ہوں
میرے اطراف ہے تماشا سا
اور میں اس کو سراب لکھتا ہوں
کھینچتا ہوں ملال در بدری
ہجرتوں کے عذاب لکھتا ہوں

مہر بانو! بابا سائیں اور ملکانی کے ہمراہ کھانے کی

وسیع میز پر موجود تھی۔ کنیزاں کے ساتھ مل کر آج اس نے چکن گرلڈ شاشلک بنایا تھا۔ یوں تو اب تک کنیزاں کو بھی دیسی کھانوں سے ہٹ کر کافی دوسری چیزیں بنانا آگئی تھیں مگر مہربانو خود سے کچھ بنا کر دراصل بابا سائیں سے کچھ داد وصول کرنا چاہتی تھی مگر ناکام رہی کہ وہ آج میڈیا اور اخبار والوں پر اپنے غصے کا اظہار زیادہ کر رہے تھے اور کھانا کم کھا رہے تھے۔

"آج سے چند سال پہلے کا زمانہ ہی اچھا تھا جب صرف مصور ہی پنسل سے ہم سیاست دانوں کے اسکیچ بنایا کرتے تھے مگر آج۔۔۔ ہونہہ، یہ میڈیا والے لفظوں سے اپنی مرضی کا اسکیچ بنا کر عوام کو الو بنا رہے ہیں۔ بھاری رقوم کے بند لفافے حاصل کر کے بدکردار، نکمے اور جاہل لوگوں کے سر پر اونچے شملے والی پگڑیاں سجاتے ہیں اور کسی کی معمولی سی بات پسند نہ آنے پر عزتیں برباد کرنے میں بھی لمحہ بھر کا وقت نہیں لگاتے۔"

"کی ہویا۔۔۔ کج بتاؤ وی تے سہی نا۔"

ملکانی نے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی سونی کی پلیٹ میں بوائل چکن کے کچھ پیسز ڈالتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا۔

سونی کے لیے یہ کرسی خصوصاً الگ سے بنوائی گئی تھی اور اس کی اونچائی ٹیبل کی سطح کے نا صرف برابر تھی بلکہ دونوں اطراف سیڑھی کی مانند اوپر چڑھنے کے لیے سپورٹ بھی موجود تھی۔ اسی لیے جب بھی کھانے کا وقت ہوتا سب کے ساتھ وہ بھی خراماں خراماں چلتی اپنی کرسی پر جا بیٹھتی۔ بلکہ کبھی کبھار دوسروں سے پہلے ہی حاضر پائی جاتی۔

مہربانو کے چہرے پر البتہ بوریت بھی تھی اور بے زاریت بھی۔

وہ ملکانی کو مخالف پارٹی کی طرف سے لگائے گئے غلط الزامات اور چند صحافیوں کو اپنے خلاف استعمال ہونے کے بارے میں کچھ تفصیلات بتا رہے تھے۔ مہربانو کو ان سب باتوں کو جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ یہ سب تو یوں بھی اخبارات اور دوسرے ذرائع سے سامنے آ ہی جاتا۔ لیکن وہ چاہتی تھی کہ اس وقت کم از کم تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی مگر اس کی اس محنت کو سراہا جائے جو اس نے کچن میں خصوصاً شاہ سائیں کے لیے چکن گرلڈ شاشلک بناتے ہوئے کی تھی۔

لیکن۔۔۔ ایسا نہ تو کبھی پہلے ہوا تھا نہ آج ہوا۔

مہربانو کی خواہش آج پھر حسرت میں بدل کر دل ہی میں رہ گئی تھی۔

اس بلند و بالا حویلی کی یہی ریت رہی تھی۔ بڑی بڑی خواہشات تو منٹوں میں پوری کر دی جاتیں لیکن چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشات پوری کرنے میں کسی کو بھی دلچسپی نہیں تھی۔

شاہ سائیں نے گھر میں ہونے کے دوران بھی کبھی گھر یا گھر والوں کی بات نہیں کی تھی۔

میران کی تو یوں بھی دنیا ہی الگ اور مہربانو کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

اور رہی بات ملکانی کی تو انہوں نے اپنی تنہائی کا علاج سونی کی صورت میں دریافت کر رکھا تھا اور پھر وہ شاہ سائیں کی "بیرونی ایکٹیوٹیز" کی کن سوئیاں لیتی رہتیں۔ یہی وجہ تھی کہ مہربانو کو یہ عمارت گھر کے بجائے صرف ایک خوب صورت طرز تعمیر کی حامل حویلی ہی لگا کرتی۔ جس کے در و دیوار سے ٹپکتی اکتاہٹ میں اس کے ہاسٹل شفٹ ہونے کے بعد کمی ہونے کے بجائے مزید بڑھاوا ہی ہوا تھا۔ جس کی بڑی وجہ اس کی وہ روم میٹس تھیں جن کے گھرانے مالی حیثیت میں اس سے کم ہی سہی لیکن رشتوں میں اپنائیت، خلوص اور پیار میں وہ اس سے کہیں زیادہ آسودہ حال تھیں۔

ہاسٹل سے ملنے والی چھٹیاں گھر گزار کر آنے کے بعد کتنے ہی دن وہ ان چند دنوں کی باتیں اور قصے دہراتی رہتیں جو وقت انہوں نے گھر میں اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ کے ساتھ گزارا ہوتا۔ مل کر کھانے کھائے بھی جاتے اور پکائے بھی۔ کچن میں بیٹھ کر جو محفلیں سجتیں، بہن یا امی کے ساتھ شاپنگ بھائیوں کے ساتھ گپ بازی، چھیڑ چھاڑ، شرارتیں

شرطیں، ابو کے ساتھ اپنی اسٹڈیز اور پھر فیوچر کی ڈسکشن۔۔۔ کتنا کچھ ایسا تھا جو اسے اپنی لائف میں مسنگ لگتا یا پھر کبھی کبھار اسے خود اپنا آپ ہی اس ماحول میں مس فٹ لگتا۔

کبھی سوچتی کہ وہ پیدا ہی غلط گھر میں ہو گئی ہے اور اگر ہو ہی گئی تھی تو کاش ایک بہن اور بھی ہو جاتی تو کم از کم اتنا غبار یوں سینے کے اندر ہی جمانہ ہوتا رہتا یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے گھڑی پر نظر ڈالی جہاں دو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔

یعنی سائیڈ ٹیبل کی دراز کے اندھیرے میں موجود اس کے موبائل کی اسکرین پانچ منٹ بعد سائیلنٹ ہونے کے باوجود روشن ہو کر ان کمنگ (Incoming) کال کی اطلاع دینے والی تھی۔

کھانے کا موڈ تو ویسے ہی ختم ہو چکا تھا۔ جبھی اس نے بے دلی سے پلیٹ پرے کھسکاتے ہوئے شاہ سائیں اور ملکانی کو دیکھا جو مل کر اخبارات کے متعلق بھڑاس نکال رہے تھے۔ سامنے رکھی ڈش میں خوب صورتی سے سجایا گیا چکن گرلڈ شاشلک اب تک ٹھنڈا ہو کر اپنی بے قدری کا رونا رو رہا تھا۔

نہایت افسردگی سے اس نے دونوں ہونٹ بھینچتے ہوئے کرسی پیچھے سرکائی اور چادر لپیٹتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

شاہ سائیں اور ملکانی گفتگو میں اس قدر مصروف تھے کہ مہربانو کا اٹھنا تو دور سونی کی میاؤں بھی محسوس نہیں کر سکے تھے۔

☆☆☆

"واؤ امی! کتنا سکون ملتا ہے آپ سے آئل مساج کرواتے ہوئے، سچی دل تو چاہتا ہے کہ میں یونہی آنکھیں بند کیے بیٹھی رہوں اور آپ کی انگلیوں کی پوریں اسی طرح اپنا پیار مجھ تک منتقل کرتی رہیں۔"

سر کو پیچھے کی جانب کیے وہ امی کی طرف پشت کیے بیٹھی تھی جبکہ وہ بائیں ہتھیلی کو کٹوری بنائے اس میں آئل ڈال کر دائیں ہاتھ کی مدد سے اس کے سر میں لگا رہی تھیں اور یہ آئل یوں بھی خصوصاً انہوں نے ندی کے لیے مکس کر رکھا تھا جس میں آملہ، زیتون، ناریل، سرسوں اور بادام کا تیل ہم وزن لے کر ایک بوتل میں محفوظ کر رکھا تھا۔ ندرت تو خیر ان چیزوں کی پروا کم ہی کرتی تھی مگر وہ خود بڑی باقاعدگی سے اس کے سر میں ہفتے میں دو دفعہ ضرور مساج کرتیں۔ یوں بھی ہر قسم کی خشکی یا بالوں کے گرنے سے لے کر سست روی سے بڑھنے تک بالوں کے ہر مسئلے کا حل تیل کے اس مجموعے میں تھا اور ندرت تو اس بات کا اکثر اعتراف بھی کرتی کہ اس کے بال اگر ریشم سے نرم اور چمک دار ہیں تو اس میں تمام محنت صرف اور صرف امی کی ہے۔

"ماں ہو تو آپ جیسی۔" آنکھیں بند کیے ایک سرور کی سی کیفیت میں اس نے کہا تھا۔

"ارے بیٹا! مائیں سب کی ایک ہی جیسی ہوتی ہیں مگر۔۔۔"

"اپنی اولاد کے لیے۔۔۔"

کمرے میں دستک دے کر داخل ہوتے ہوئے عائشہ نے گو کہ مسکراتے لبوں کے ساتھ جملہ مکمل کیا تھا مگر لفظوں کی کاٹ ان دونوں کو ضرور محسوس ہوئی تھی۔ جبھی ندی نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔

امی بھی استفہامیہ انداز میں عائشہ کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

"میری بات کو سیریس مت لیجیے گا پلیز۔۔۔ میں نے بس یونہی ذرا ماحول بدلنے کے لیے بات کی تھی۔"

وہ جو دل میں آیا کہہ تو چکی تھی اب تو محض رسمی کارروائی کر رہی تھی۔

"ماحول تو ہم یوں بدلنے کو تیار ہیں بھابھی۔" ندی نے اٹھتے ہوئے چٹکی بجائی۔ "لیکن بس دل نہیں بدلنے چاہئیں۔ کیوں امی؟"

وارڈ روب سے کپڑے نکالتے ہوئے اس نے امی کی طرف دیکھا جو باتھ روم میں ہاتھ دھونے کے بعد اب تولیے سے خشک کر رہی تھیں سو تائید میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا دیں۔

"اچھا یہ سب چھوڑو تم جا کر نہالو میں استری کر دیتی ہوں۔"

عائشہ نے ندرت کے ہاتھ سے مغلئی طرز کی سیاہ فراک لیتے ہوئے دوستانہ پیش کش کی کہ وارڈ روب میں ہینگ ہوئی فراک استری شدہ تھی ہی بس چند جگہوں پر سلوٹیں تھیں جنہیں دور کرنا باقی تھا۔

"ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آئل لگوانے کے بعد تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد سر دھوتیں تاکہ کچھ اثر ہوتا۔"

"ہاں بھابھی! امی صحیح کہہ رہی ہیں اور پھر آپ کو بھی زحمت ہو گی میں خود کر لوں گی۔"

"اے زحمت کیسی۔ ویسے بھی میں ابھی کپڑے ہی پریس کر رہی تھی اسی لیے تو تم سے بھی پوچھنے آ گئی۔"

عائشہ نے اس کی مزاحمت رد کی تو اسے فراک دیتے ہی بنی۔

"ویسے ایک بات پوچھوں ندی؟"

"نہیں بھابھی رہنے دیں۔" ندرت نے سپاٹ لہجے میں کہا تو عائشہ سمیت ایک دم امی بھی چونک گئیں کہ یہ انداز بیاں تو اس کا کبھی بھی نہیں رہا تھا۔

"ن۔۔۔ نہیں نہیں، میرا مطلب تھا دو پوچھیں تین پوچھیں بھلا صرف ایک کیوں؟"

دونوں کو یوں حیران ہوتے دیکھ کر وہ شرارت کو مزید برقرار رکھنے کا ارادہ بدل کر فوراً بولی تھی۔

"ندرت۔۔۔!" امی نے اسے تنبیہی انداز میں آنکھیں دکھانا ضروری سمجھا تھا۔

عائشہ کے تاثرات البتہ معمول کے تھے۔

"کہاں تو تم نے کبھی بلیک کلر کے کپڑے خریدے بھی نہیں اور کہاں اب پارٹی کے لیے اپنی اس اکلوتی فراک کا انتخاب کر لیا۔ پوچھ سکتی ہوں کیوں؟"

ندرت نے اس غیر متوقع سوال پر چونک کر عائشہ کو دیکھا تو ضرور مگر اس کے چہرے کے ذو معنی تاثرات سمجھنے سے البتہ قاصر رہی تھی۔

"ارے بھابھی! اس کیوں کا جواب دینے بیٹھی تو آپ کا گھنٹہ ڈیڑھ ضائع ہو جائے گا۔ اس لیے پھر سہی۔"

تیل لگے بالوں کو سمیٹ کر وہ باتھ روم میں جا گھسی تو عائشہ خوب صورت سیاہ فراک پر سفید رنگ کے نفیس انداز میں کیے گئے مکیش کے کام کو دل ہی دل میں الوداعی کلمات کہتے ہوئے اس پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

☆☆☆

ملکانی سائیں ٹھنڈی ہوتی شام میں شہتوت کے درخت تلے بچھے تخت پر بیٹھی منشی جی کو حساب کتاب کے کھاتوں سے متعلق اہم ہدایات دینے میں مصروف تھیں۔ سونی ان کی خوب صورت سی کڑھائی والی چادر کے ایک کونے پر بیٹھی اس پر جا بجا لگے ہوئے ننھے ننھے شیشوں میں سے شاید اپنا عکس ڈھونڈ رہی تھی۔ گردن میں جھولتے عمدہ اور اعلا قسم کے چمڑے کا انتہائی نفیس پھول نما لاکٹ اس کے سفید بالوں سے بھرے نرم نرم وجود پر بلاشبہ انتہا کا خوب صورت لگتا۔

یہ لاکٹ شاہ سائیں خصوصاً دبئی سے سونی کے لیے لائے تھے۔

"کنیزاں۔۔۔ نی کنیزاں۔۔"

سونی کو ہلکا سا کھجاتے دیکھ کر ملکانی نے کنیزاں کو بلایا تو وہ آن کی آن میں ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی کہ وہ ہمیشہ ان کے آس پاس ہی موجود رہا کرتی تھی۔

"جا اندر جا کر سونی کی الماری سے اس کا اسپرے اٹھا لا۔ دیکھ تے سئی کتنے مچھر کاٹ رہے ہیں اسے۔"

ملکانی سائیں اب سونی کو گود میں لے کر بڑے پیار اور شفقت سے اس پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

"ابھی لائی۔"

کنیزاں کے حویلی کی اندرونی سائیڈ رخ کرتے ہی اندر سے میران باہر کی طرف آتا دکھائی دیا۔ پہلے سے کہیں زیادہ خوش اور ہمیشہ کے برعکس

نہایت پر جوش!

ملکانی نے دیکھا تو پکار لیا۔

"جی۔۔۔آپ نے بلایا مجھے؟"

"صدقے جاواں۔۔۔۔اج میرا پتر بڑا ای خوش لگ رہا ہے۔ خیر تے ہے نا؟" اُن کی بات پر میران قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔

ملکانی سائیں نے کھاتوں کا رجسٹر کھولے ان دونوں کی طرف متوجہ منشی صاحب کو دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کا کہہ دیا۔

"ویسے عجیب بات نہیں ہے۔ پریشان نظر آؤں یا خوش آپ کا "خیر تے ہے نا" وہیں موجود رہتا ہے۔"

"ہاں تے فیر اور کیا کہوں؟ چل چھوڑ یہ بتا خیر تے ہے نا؟" لاشعوری طور پر ایک دفعہ پھر ملکانی کے منہ سے وہی الفاظ نکلے تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گئے۔

"دراصل آج یونیورسٹی میں پارٹی ہے نا تو بس اسی لیے ذرا پر جوش ہو رہا ہوں کہ کافی انتظار کے بعد انتا انجوائے کرنے کا موقع ملے گا آج۔"

سونی پر نظریں جماتے ہوئے اب وہ مکمل سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"اچھا پتر ایسا کریں۔۔۔دیر ہو جائے تو گھر نا آئیں، اُدھر ہی شہر والے فلیٹ میں سو جائیں۔۔۔ اچھا؟"

"جی اچھا۔ اب جاؤں؟"

"ہاں جا پتر، تیرا اللہ رکھا اے۔"

ملکانی سائیں سے اجازت ملنے پر انگلی پر چابی گھماتا وہ گیٹ کی طرف بڑھتا آج شام کو ہونے والے ڈنر کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔

موم کی سیڑھی پر چڑھ کے چھو رہے تھے آفتاب
پھول سے چہروں کو یہ کوشش بہت مہنگی پڑی

☆☆☆

اور وہی ہوا اور ویسا ہی ہوا جیسا عائشہ نے سوچا اور پھر چاہا۔ ندرت کی سیاہ فراک استری زیادہ گرم ہو جانے کی وجہ سے "اتفاقاً" جل گئی تھی۔ اور وہ اب منہ بسورے چپ چاپ تھی کہ نہیں چاہتی تھی عائشہ کو کچھ بھی کہے۔

"امی مجھے آج ہر قیمت پر بلیک کپڑے ہی پہننے ہیں۔"

وہ گود میں استری سے جلی ہوئی فراک لیے بھنی بیٹھی تھی۔ جب کہ امی جلتی پر پانی ڈالنے کا فریضہ سر انجام دینا چاہتی تھیں۔

"بیٹا عائشہ نے کوئی جان بوجھ کر تو نہیں جلائی تمہاری فراک، اتفاقاً تم سے بھی جل سکتی تھی۔"

"امی بات فراک کی نہیں اس کلر کی ہے۔ کیوں کہ میرے پاس بلیک کلر میں کوئی پارٹی ڈریس نہیں ہے۔"

"تو کیا آج بلیک کلر کے علاوہ یونیورسٹی گیٹ سے اندر جانے نہیں دیں گے؟"

امی اب خائف نظر آنے لگی تھیں۔

"دیکھو یہ ہلکا انگوری رنگ تم پر کتنا سوٹ کرے گا۔ اُس پر یہ چھوٹے چھوٹے میچنگ ٹاپس بھی عائشہ ساتھ ہی رکھ گئی ہے۔"

"مگر امی۔۔۔"

"دیکھو ندرت! تمہیں معلوم ہے نا کہ ناصر کو تمہارا رات کے وقت یونیورسٹی جانا پسند نہیں تھا۔ تمہارے ابا بھی ناصر کے ساتھ بحث سے گریز کرتے ہیں۔ اُس پر عائشہ ہی نے ناصر سے بات کر کے اُسے سمجھایا تھا۔" امی نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔

"اور اب اگر تم کپڑوں کی وجہ سے شور مچاؤ گی تو یقیناً اُسے برا محسوس ہو گا۔"

"امی دراصل۔۔۔"

"میں نے کہا نا آج یہ پہن جاؤ پھر بازار سے سیاہ رنگ کے اور کپڑے لے آنا، خوش؟"

بڑی بڑی آنکھوں میں ہچکولے کھاتی ناراضی کی لہر پر صلح کا بادباں لہراتے ہوئے اس نے کپڑے اٹھا تو لیے مگر دل کا اضطراب اپنی جگہ جوں کا توں قائم تھا۔

☆☆☆

چاہے سارے شہر میں اس وقت شام ہو چکی تھی مگر یونیورسٹی کے اندر تو شاید دن ابھی ہی چڑھا تھا۔ چاروں طرف بکھرتے رنگ، اُڑتے پھرتے قوس قزح سے آنچل، خوشبوؤں سے معطر نفوس اور اُس پر ڈیک پر بجتا میوزک۔ چھوٹی سی فیرویل اچھی خاصی پارٹی کا روپ دھار چکی تھی۔ ناصر بھائی ندرت کو چھوڑ کر گئے تھے اور لینے بھی اُنہی کو آنا تھا۔

عائشہ کے منتخب کردہ ہلکے انگوری رنگ کے کپڑوں میں ملبوس جب وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے نزدیک پہنچی تو بلا مبالغہ سب پلکیں جھپکانا بھول گئے۔ سرخ و سپید رنگت کو یہ لائٹ سا کلر مزید ابھار رہا تھا۔ اس پر اُس کی خوب صورتی، جسے کسی بھی قسم کے میک اپ کی بھی ضرورت نہ رہی تھی اور سب سے بڑھ کر اُس کا وہ انداز جسے دیکھ کر لگتا کہ شاید وہ اپنی خوب صورتی سے واقف ہی نہیں ہے۔ نہ تو غرور اور نہ نک چڑھا سر دسا رویہ۔

"تم تو واقعی فارز لگتی ہو یار!" صبا نے ملتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

"ہاں تو تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں فار مادہ ہوں۔۔۔ یار! ہر لڑکی کی طرح میں بھی فار، نر ہی ہوں کیوں کہ ہر مادہ، نر اور نر، مادہ کے لیے ہے۔"

اس کی کی گئی وضاحت پر صبا سمیت وہاں موجود دوسری لڑکیاں بھی ہنسنے لگی تھیں۔ جب کہ وہ شاہ زین کے نظر نہ آنے پر اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو یہاں وہاں گھما رہی تھی۔

"شاہو نہیں آیا ابھی تک؟"

"کب سے آیا ہوا ہے لیکن تم ذرا لیٹ ہو۔"

"اچھا؟ پھر تو وہیں اسٹیج کے ریڈی روم میں ہو گا؟"

اور اس سے پہلے کہ وہ اسٹیج کی طرف قدم بڑھاتی، ریڈی روم کے دروازے پر کھڑے شاہ زین نے بڑے پر جوش انداز میں ہاتھ ہلایا۔

آف وہائٹ کرتا شلوار میں ملبوس شاہ زین آج واقعی بڑا شاہانہ تاثر دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ ہلانے پر ندرت مقناطیسی انداز میں جیسے اُس کی طرف کھنچتی ہی چلی گئی۔ انداز میں اتنی بے خودی تھی کہ وہ محسوس ہی نہ کر پائی کہ سب لوگوں کی مرکزِ نگاہ ہونے کی وجہ سے اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کی جا رہی ہے۔

میران جو اس کے ایک ایک انداز کو اپنے موبائل میں قید کر رہا تھا۔ شاہ زین کی طرف یوں اس کے بڑھتے قدم اور بے تابی دیکھ کر بھڑک ہی تو اُٹھا تھا۔ آج سے پہلے شاہ زین اور ندرت کے درمیان موجود تعلق کو سبھی کلاس فیلوز نے محض وقتی ساتھ سمجھا تھا مگر آج۔۔۔ جبھی میران نے اپنے دوستوں کو یہ تاثر عام کرنے کا کہا تھا کہ ندرت اور شاہ زین اکثر یونیورسٹی اوقات میں باہر ایک ساتھ دیکھے گئے ہیں۔

اوائل سماعتوں سے ٹکرایا گیا محض ایک جملہ چند زبانوں سے ہوتا خود بخود ایک کہانی کی شکل اختیار کر جائے گا۔ یہ بات میران بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

"تم تو آج بلیک کلر پہننے والی تھیں نا۔"

شاہ زین نے اُسے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی چہرے پر اُبھرتے شرمندگی کے تاثرات نے شاہ زین کو بات بدلنے پر اُکسا دیا۔

"اچھا ہی ہوا نہیں پہنا، کیوں کہ اس رنگ میں تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔"

ندرت اس کی بات پر ہنس دی۔

اونچا لمبا شاہ زین جسے آج سے پہلے اُس نے کبھی کرتا شلوار میں نہیں دیکھا تھا۔ آج دیکھا تو چاہنے کے باوجود اس کی تعریف کرنے پر جھجک سی گئی۔

وہ ندرت جو کبھی منہ میں آئی بات کو روکنے کی زحمت نہ کرتی آج دل میں ہوتی اُتھل پتھل نے اس کی زبان کی برق رفتاری اور طبیعت کی بولڈنیس کو جھجک کی چادر میں چھپا دیا تھا۔ دراز قد، بانکا سجیلا شاہ زین آج ایک کبرو جوان کے روپ میں اس کے دل کو بڑے عجیب انداز میں دھڑکائے دے رہا تھا۔ اُس پر

نفاست سے کٹے بال، گھنی مونچھیں اور سب سے بڑھ کر سرمئی آنکھیں، جن میں دیکھنے سے آج ندرت یقینی طور پر کترا رہی تھی۔

کمپیئرنگ کرتے وقت شاہ زین کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کے وجود سے اٹھتی ارمانی کی بھینی بھینی اور مسحور کن خوشبو اپنے اندر سموتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کیا تھا۔ یہی نہیں ریڈی روم میں میوزک ٹونز سیٹ کرواتے شاہ زین پر اس نے کتنا ہی کچھ پڑھ کر پھونک ڈالا۔

"یار! میں تو ویسے ہی تمہارا ہوں۔ دَم وغیرہ کر کے کیا محبوب کو حقیقتاً قدموں میں گرانے کا ارادہ ہے۔"

"تمہاری جگہ تو میرے دل میں ہے لیکن۔۔۔"

"لیکن۔۔۔؟"

"آج تمہاری محبت کے سامنے مجھے اپنا دل چھوٹا پڑتا محسوس ہو رہا ہے۔ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں یہ میں نہیں جانتی لیکن ہاں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اب تمہارے بغیر زندگی کے کوئی معنی نہیں ہیں۔"

شاہ زین نے بڑی گہری نظروں سے سامنے بیٹھی ندرت کو دیکھا جس کے جذبے اس کے چہرے کی طرح ہی نہایت شفاف تھے۔ خوب صورت بالوں کے ہالے میں اس کے چہرے کی چھب دیکھنے کے لائق تھی اس پر وہ فطری معصومیت۔۔۔

شاہ زین کا دل ڈولنے لگا تھا۔

"شاہو کیا تم بھی میرے لیے اپنے دل میں کچھ انوکھا محسوس کرتے ہو؟"

ندرت اب محبت کی اُس منزل پر تھی جہاں جذبے اپنے ہونے کا اظہار مانگتے ہیں۔ جہاں انداز کا والہانہ پن اور آنکھوں سے جھلکتی وارفتگی لفظوں کو گواہ بنانا چاہتے ہیں۔ سو اُسی لمحے شاہ زین کے دل میں جانے کیا آیا کہ اس کا سرخ و سپید روئی کے گالوں جیسا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد بڑے گمبھیر لہجے میں بولا۔

"میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں یہ بتانے کے لیے مجھے آج تک ایسے الفاظ ہی سمجھ نہیں آئے جو تم سے میرے جذبوں کی شدت کی تصدیق کروا پاتے۔ ہر لفظ ہر جملہ مجھے بہت چھوٹا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن یہ میرا دل جانتا ہے کہ میں تم سے بے تحاشا محبت کرتا ہوں۔"

ندرت اس کے لہجے کی گمبھیرتا میں مبہوت ہوئے بیٹھی تھی کہ اس نے ہاتھ میں پکڑے پین سے اس کے ہاتھ پر لکھنا شروع کر دیا۔

"ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے
مرنے والا کوئی
زندگی چاہتا ہو جیسے

اس سے بڑھ کر کوئی مثال میری سمجھ میں نہیں آتی۔" شاہ زین کے لکھے گئے خوب صورت الفاظ نے ندرت کی زندگی کو نیا مفہوم حقیقتاً اسی لمحے بخشا تھا۔

"کچھ اللہ کا خوف کرو۔" صبا جیسے بولائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"اور یہ لو۔۔۔" صبا نے ہاتھ میں پکڑی کاجل کی چھوٹی سی ڈبیا سے انگلی پر کاجل لگا کر دونوں کے کان کے نیچے لگاتے ہوئے کہا۔

"اوہو لیکن یہ سب کیا ہے؟" ندرت ناسمجھی سے بولی۔

"سچی تم لوگ اسٹیج پر ایک ساتھ اتنے خوب صورت لگ رہے ہو کہ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کوئی تم دونوں کو نظر ہی نہ لگا دے۔"

صبا نے پردہ ہلکا سا ہٹا کر اسٹیج پر دیکھا۔ ٹیچرز کی عادت پر مشتمل تنقیدی مشاعرہ مزاح کا پیرہن لیے سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیرے ہوئے تھا۔

"ارے واہ! ایسے ہی کوئی نظر لگا دے گا۔ یہ دیکھو۔"

شاہ زین نے جیب سے سیاہ ڈوری کا بنا بریسلیٹ نکالا جس میں جابجا سفید موتی لگے تھے۔

"یہ میں خاص طور پر آج کے دن کے لیے لایا ہوں کیوں کہ کسی کی نظروں کا اعتبار مجھے بھی نہیں ہے۔"

ندرت کی دائیں کلائی میں بریسلیٹ پہناتے ہوئے شاہ زین نے کہا تو صبا کی نظر ہتھیلی پر لکھے لفظوں پر پڑی اور وہ لمحہ اس کے موبائل میں ہمیشہ کے لیے قید ہو گیا۔

اسی لمحے میران لڑکی کے گیٹ اپ میں اپنے دوست کے ساتھ ریڈی روم میں داخل ہوا تھا کہ نیکسٹ سرپرائز آئٹم اُس کا تھا اور اب اُسے یہاں بیٹھ کر سابقہ آئٹم کے ختم ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ اس کے چیلے البتہ کھڑکی سے باہر کیمرہ لیے پوری طرح چوکس تھے۔

تینوں نے میران کی آنکھوں سے جھلکتی غزاہٹ کو فوراً محسوس کیا تھا۔ جبھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے یوں بھی شاہ زین، زبیر اور صبا کے علاوہ کسی کے بھی سامنے ندرت سے بہت زیادہ فرینک ہو کر بات نہیں کرتا تھا اور خصوصاً میران کے سامنے اُس کا رویہ بہت ہی محتاط ہوا کرتا کیوں کہ وہ کسی بھی معاملے میں ندرت کا نام زبان زدِ عام ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

☆☆☆

گھر کا ماحول کچھ عجیب سا لگنے لگا تھا۔ عائشہ تھی تو اکمل کی بہن مگر پہلے کی نسبت اب اتنی بدل گئی تھی کہ اکثر وہ بھی ہنس کر اسے اپنی بہن ماننے سے انکار کرتے ہوئے صرف ناصر بھائی کی مسز یا ندی کی بھابھی کہا کرتا۔ سسرال سے آنے کے بعد جس طرح وہ اپنی والدہ کے ساتھ بیٹھی اپنی "حق تلفی" اور سسرال میں "جائز حقوق" کے نہ ملنے کا رونا رویا کرتی وہ وقت اکمل کو بھی کبھار پریشان کرنے لگتا۔

کیوں کہ شادی سے پہلے تک عائشہ کے خیالات قدرے مختلف تھے اور تب وہ سوچتا کہ کیا واقعی لڑکیاں شادی کے بعد اس قدر بدل جاتی ہیں۔ کیوں کہ باوجود اس کے کہ عائشہ کا سسرال ایک مثالی گھرانہ تھا، جہاں رشتوں کا تقدس بھی برقرار تھا اور قدریں بھی پائی تھیں۔ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہونے لگی تھی تو وہ فیملیز جہاں حقیقتاً بہوؤں کو ناکوں چنے چبوائے جاتے تھے وہاں صبر کا مظاہرہ کرنے کو کہتے۔ جس سے عائشہ کو اُن کے سامنے اپنی ہار تسلیم کرنا ہی پڑتی۔ اسی لیے آج کل جب گھر میں اکمل کے رشتے کی بات گردش کرنے لگی تو وہ گھبرا سا گیا تھا۔ کیوں کہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی لڑکی اس گھر میں آئے جو ذہنی طور پر میچور نہ ہو۔ اشارتاً خاندان کی ایک دو لڑکیوں کے بارے میں گھر میں بات ہوئی بھی مگر وہ صاف کنی کترا گیا۔

یوں بھی اپنے لیے شریکِ سفر کا انتخاب تو وہ کر ہی چکا تھا مگر اس کی اجازت ملنے کا پابند تھا اور جب تک اس کی طرف سے کوئی گرین سگنل نہ ملتا یقیناً وہ گھر میں کسی بھی طرح کی بات کرنے کا مجاز نہ تھا۔ البتہ اتنا وہ ضرور کہہ چکا تھا کہ لڑکی کا انتخاب وہ کر چکا ہے اس لیے وہ سب خوامخواہ تگ و دو نہ کریں۔ مگر عائشہ کے ذہن میں جو کیڑا رینگ رہا تھا وہ اسے چین لینے دیتا تو چپ رہتی نا۔

جب سے اُس کا شک، حقیقت کا انکشاف بن کر ظاہر ہوا تھا جلے پیر کی بلی بنے کسی طرح بھی چین نہیں مل رہا تھا۔

اکمل کو رَد کیے جانا اُس نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا اور اب بس اُس کے ذہن میں یہ بات ایک ضد کی طرح موجود تھی کہ وہ ندی کو کسی اور کا نہیں ہونے دے گی۔ اکمل کے سامنے بھی ڈھکے چھپے الفاظوں میں اس نے کچھ باتیں کر کے اُس کا ردِعمل جاننے کی کوشش کی اور نتیجتاً اس کے چہرے پر جھلکتی پریشانی نے اسے باور کروا دیا کہ ندی کے متعلق یہ چند ہی باتیں سن کر اس کے وجیہہ چہرے پر سنجیدگی چھا گئی تھی۔

اکمل کے انہی تاثرات نے گویا عائشہ کے ذہن میں پنپتے ارادوں پر ایک مہر ثبت کر دی تھی۔ عائشہ کی اسی طرح کی باتوں کی وجہ سے اکمل ذہنی طور پر اپنی بہن سے بہت دور ہو گیا تھا کیوں کہ اب اس کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز بدل چکا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی شادی کے معاملے پر بھی عائشہ سے کچھ ڈسکس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تاوقت یہ کہ کچھ فائنل نہ ہوا اور اب ندی کے متعلق یہ سب کچھ سننے کے بعد وہ حقیقتاً عائشہ کے لفظوں سے نہیں بلکہ اس کے لہجے پر چونک گیا تھا۔ جس انداز میں وہ یہ سب اس سے شیئر کر رہی تھی وہ انداز نہ تو اُسے اچھا لگا تھا اور نہ ہی مثبت اور ویسے بھی اکمل کی ندرت کے ساتھ اس حد تک بے تکلفی تھی کہ آپس میں ہر طرح کی بات کی جاسکتی تھی۔

یہ درست تھا کہ اس کی ٹریننگ کے پیریڈ میں اتنی زیادہ بات چیت نہ ہونے کی وجہ سے کچھ تکلف ضرور بیچ میں آگیا تھا، مگر یہ بھی اکمل کی طرف سے ہی تھا۔ ورنہ ندرت تو اس دن بھی اُسی بے تکلفی اور خوش مزاجی سے ملی تھی جیسے پہلے وہ لوگ ملا کرتے تھے۔ ناصر بھائی کی موجودگی میں بھی کھانا کھانے کے بعد وہ صوفے پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی بلکہ یہی نہیں باتوں باتوں میں ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر تالی مارنے کا شغل بھی جاری تھا۔ لیکن کوئی بھی معترض نہ ہوا کیوں کہ ایک تو ان کے گھر کا ماحول کچھ آزاد تھا دوسرا سبھی اس کی معصومیت اور سادہ دلی سے واقف تھے۔

ہاں سب نے اسے مصنوعی خفگی سے دیکھا ضرور اور وہ بھی تب جب بچپن کی طرح اکمل شرارتاً اپنا پیا ہوا جوس کا گلاس اس کے گلاس سے بدلتے ہوئے پکڑا گیا اور ندی نے اردگرد موجود لوگوں کی شرکت کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے اس کا کان مروڑ ڈالا اور بڑے فخر سے "انکشاف" کیا کہ جناب اب میں بڑی ہوگئی ہوں اور کوئی مجھے پاگل نہیں بنا سکتا۔

یہ الگ بات تھی کہ سب کے متوجہ ہوجانے پر کھسیا کر بیٹھتے ہوئے وہ اکمل ہی کا جوس اٹھا کر پی گئی تھی۔

ندی کی یہی معصومیت سب کے دل میں گھر بنائے ہوئے تھی اور اب عائشہ کے منہ سے اس طرح کی باتیں سن کر وہ حقیقتاً پریشان ہوگیا تھا اور جلد از جلد ندی سے بات کر کے نہ صرف اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں کچھ لائحہ عمل طے کرنا چاہتا تھا بلکہ اُسے بھی خود اپنی بہن سے ہوشیار رہنے کی تاکید کرنا چاہتا تھا کیوں کہ وہ اس کی شفاف آنکھوں کو گدلا ہوتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جبھی اس معصوم پری کے لیے دعا کرتے ہوئے گاڑی نکالی اور فون کا سہارا لینے کے بجائے خود اس کے سامنے بات کرنے کا سوچا۔

دعا ہے میری
کہ زندگی کی بھی بہاریں
محبتوں سے یہ نم ہوائیں
تمہارے دامن سے کھیلیں ہر دم
کہ زندگی کے ہر ایک پل سے
ہزاروں خوشیاں کشید کر کے
تم اپنے اندر سمیٹ لو سب
کسک کوئی بھی رہے نہ باقی
تمہارے دل میں
دعا ہے میری

☆☆☆

عائشہ، امی اور بابا کو ان کے کمرے میں کھانا دے کر بابا کی میڈیسن ڈھونڈ رہی تھی۔ یوں تو ان کی ادویات ان کے بیڈ کے ساتھ ہی موجود سائیڈ ٹیبل میں وہ خود بڑی ہی ذمہ داری سے رکھا کرتے تھے مگر چند روز سے بخار میں مبتلا ہونے کی وجہ سے خود ندی ہی انہیں بڑی باقاعدگی سے وقتِ مقررہ پر دوائی دے کر جانے کہاں رکھتی تھی۔ اسی لیے عائشہ اب ہر ممکن جگہ پر وہ دوائی کا شاپر دیکھ رہی تھی۔ ناصر بھائی آج آفس میں کام کی زیادتی کی وجہ سے دیر سے گھر آنے کا کہہ گئے تھے۔ جبھی عائشہ نے امی اور بابا کو ان کے کمرے میں ہی کھانا دے دیا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ حقیقتاً مسئلہ کام کی زیادتی کا نہیں بلکہ اس ذہنی توڑ پھوڑ کا تھا جو عائشہ کی کچھ سنی اور کچھ بنی کہانی سننے کے بعد سے جاری تھی اور یہی وجہ تھی کہ چند روز سے وہ رات کو دیر سے ہی آرہے تھے کیوں کہ چاہنے کے باوجود وہ اپنی اس لاڈلی بہن کا سامنا نہیں کر پارہے تھے جس کے ساتھ بیٹھ کر امی بابا کے سامنے گپیں مارنے اور دن بھر کی روداد ڈسکس کیے بنا انہیں نیند نہیں آتی تھی۔

امی بابا تو دوا لینے کی خاطر چند نوالے لے ہی لیا کرتے تھے مگر وہ اس بات سے قطعی طور پر لاعلم تھے کہ ان کی غیر موجودگی کے باعث ندی اب رات کا کھانا کھائے بغیر سونے لگی ہے۔

چند دن تو یوں گزر ہی گئے تھے مگر آج ندی بھی باقاعدہ طور پر لڑائی کرنے کا ارادہ کر چکی تھی اور آج رات تو اسے دیر سے آنا ہی تھا مگر کل میدانِ جنگ سجنے والا ہے اس بات کا تہیہ وہ اپنے طور کیے بیٹھی تھی اور صبح اُس کے ارادے سے آگاہ ہونے کے بعد بابا بھی مسکرا دیے تھے۔

"امی۔۔۔! آپ دونوں نے کھانا کھایا؟"

بابا کو دلیہ کھلانے کے بعد امی نے ٹرے رکھی ہی تھی کہ کمرے میں موجود لینڈ لائن پر ندی کی متفکر سی آواز سنائی دی۔

"ہاں بیٹا! میں بھی کھا چکی ہوں اور تمہارے بابا بھی۔"

اس کے اس قدر خیال رکھنے پر ان کے دل میں ندی کے لیے جیسے محبتوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔ اور صرف آج نہیں، اکثر دوپہر کے کھانے کے وقت جب وہ یونیورسٹی ہوتی تب بھی ہمیشہ فون پر اُن کے کھانا کھانے اور دوا لینے کے متعلق ضرور پوچھا کرتی۔

"اچھا چلیں ٹھیک ہے مجھے ذرا دیر ہوجائے گی۔ ناصر بھائی آئیں گے نا لینے؟"

"ہاں ان شاء اللہ ٹائم پر پہنچ جائے گا۔"

"اوکے امی! لیکن ہاں میرے آنے تک تو بابا سو جائیں گے، آپ پلیز ان کا ٹمپریچر ضرور چیک کر کے لکھ دیجیے گا۔"

"ہاں اچھا بیٹا! خوش رہو۔"

امی نے فون بند کرنے کے بعد

بابا کو دیکھا جو کئی دن سے ہلکا ہلکا بخار رہنے کے باعث نقاہت کے مارے آنکھیں بند کر کے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

عائشہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں پر لوشن کا مساج بھی جاری رکھے ہوئے تھی جب گیٹ کے باہر گاڑی کے رکنے کی آواز اور پھر بیل سن کر چونک گئی۔ کیوں کہ ناصر کے آنے میں تو ابھی وقت باقی تھا اور یوں بھی آج انہیں ندرت کو لینے یونیورسٹی جانا تھا اور وہ عائشہ کو بتا کر گئے تھے کہ آج وہ ندرت سے ان تمام معاملات کے بارے میں پوچھیں گے جن کے بارے میں وقتاً فوقتاً عائشہ انہیں بتاتی رہی تھی۔ دل میں بال تو ضرور آگیا تھا مگر یقین کرنا اب تک انہیں مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ اسی ذہنی کشمکش میں چند دن گزارنے کے بعد بالآخر آج انہوں نے ندی سے دوستانہ انداز میں تمام بات چیت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"ارے تم؟"

مین گیٹ کھولتے ہی اکمل پر نظر پڑی تو اس کی اچانک اور بنا بتائے آمد پر عائشہ کا حیران ہونا لازمی تھا۔

"ہاں آپی۔۔۔ دراصل ندی سے کچھ باتیں کرنا تھیں اسی لیے سوچا کہ فون کے بجائے گھر ہی آجاؤں۔ آپ کے ہاتھوں کی مزے دار سی چائے بھی مل جائے گی اور بات بھی ہوجائے گی۔"

دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے اندر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے وہ بولا تو عائشہ کو اپنے دل پر جیسے بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"میرا بھائی جس لڑکی کے لیے وقت کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے اپنے دل کی بات کہنے آیا ہے وہ تو اسے کسی قابل ہی نہیں سمجھتی۔۔۔ سمجھتی تو یوں کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہ ہوتی۔

لیکن نہیں۔۔۔ اگر میرے بھائی نے اس سے محبت کی ہے تو پھر حق بھی اسی کا ہے اور میں اس کا حق کسی اور کو چھیننے نہیں دوں گی۔"

"کیا ہوا آپی؟ چائے کے لیے دودھ نہیں ہے

کیا ہے جو یوں پریشان ہو رہی ہو۔"

اکمل نے اس کی بے خیالی بھانپ لی تھی جبھی لان کے درمیان بنی روش پر ہی رک گیا۔

"ارے نہیں پاگل، یہ بات نہیں ہے، دراصل ندی گھر پر نہیں ہے۔"

"گھر پر نہیں ہے؟" وہ چونکا مگر دوسرے ہی لمحے جیسے کچھ یاد سا آیا۔

"اوہ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا، آج تو کوئی فنکشن ہے نا یونی میں؟"

"ہاں دیر سے ہی آئے گی۔۔۔ آؤ تم اندر آؤ۔"

"نہیں آپی، کل آؤں گا آنٹی، انکل کو سلام کہیے گا۔" اُس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔

"اچھا سنو! ایسا کیوں نہیں کرتے۔ تم ندی کو یونیورسٹی سے گھر چھوڑ دو، رستے میں بات بھی کرلینا۔"

"ارے ہاں، آئیڈیا تو اچھا ہے، چلیں ٹھیک ہے میں اُسے پک کرلیتا ہوں۔"

عائشہ نے مسکراتے ہوئے اُسے اللہ حافظ کہہ کر گیٹ بند کیا۔ ایک لحاظ سے تو وہ مطمئن تھی کہ اچھا ہے آج ناصر بھائی اور ندی کے درمیان بات نہیں ہو پائے گی اور چند روز مزید اسی طرح گزر جائیں گے مگر دوسری طرف خوشی یہ بھی تھی کہ بروقت ایک اچھی بات دماغ میں آئی اور اکمل ندی کے ساتھ کچھ وقت گزار کر وہ سب کہہ سکے گا جس کے لیے وہ گھر تک آیا تھا۔

اور عائشہ نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اکمل کو ندی کی یونی جانے کا کہا تو گویا اسے تو ایک انجانی خوشی نے آ گھیرا تھا۔ کیوں کہ وہ اُس سے عائشہ کے بدلتے رویے کے متعلق یقیناً گھر میں یوں کھل کر بات نہ کر پاتا اور پھر آج وہ ندی سے اپنی شادی کے بارے میں بھی بات کرنا چاہتا تھا۔

ندرت نے واپسی کا ٹائم دس بجے کا دے رکھا تھا اور وقتِ مقررہ پر پہنچنے کی کوشش میں وہ گاڑی کو تقریباً اڑاتا ہوا یونیورسٹی گیٹ تک پہنچا تھا۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد جو ٹائم دیکھا تو وقت ساڑھے دس بجے سے بھی اوپر ہو چلا تھا۔ اکثر لڑکیاں جا چکی تھیں اور کچھ ابھی تک تمبل کے اردگرد بیٹھی ڈنر کے ساتھ تبصروں کا بھی تبادلہ کیے جا رہی تھیں۔

یوں بھی اکمل کوئی پہلی دفعہ اس ڈیپارٹمنٹ میں نہیں آیا تھا جو انجان ہوتا۔ ایک دو مرتبہ پہلے بھی وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ یہاں آچکا تھا۔ اس لیے ناواقف بہرحال نہیں تھا۔ لیکن ہاں یہ ضرور تھا کہ اس وقت اسے ایسا کوئی چہرہ نظر نہیں آرہا تھا جو کہ شناسا ہو۔ یہی سوچ کر کہ کہیں ندی کسی دوسری جگہ کھڑی انتظار نہ کررہی ہو اس نے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ یقیناً فون سائیلنٹ پر تھا یا پھر وہ بہت رش والی جگہ پر تھی، جبھی کئی دفعہ مسلسل بیل ہونے کے باوجود نہ تو فون بند کیا گیا اور نہ ہی ریسیو ہوا۔

اسی تلاش بسیار کے دوران اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ قدموں سے وہ آگے کی طرف چلا جہاں ہر کوئی آپس میں یوں چہ میگوئیاں، تبصرے اور گفتگو کر رہا تھا جیسے یہاں آج کوئی فنکشن نہیں دنگل ہوا ہو اور اب سب ہی ریفری کے فیصلوں اور کھلاڑیوں کے داؤ پیچ پر اپنی اپنی عقل کے مطابق تبصرے کر رہے تھے۔ اس نے ایک گروپ کو بیل سے ڈھکے ستون کے ساتھ کھڑے دیکھا تو وہیں چلا آیا۔

"ارے اکمل تم۔۔۔ یہاں؟" زبیر اور صبا دونوں ہی اُسے جانتے تھے مگر یوں اچانک اسے اپنے درمیان دیکھ کر حیران ہو گئے تھے۔

"میں ندرت کو لینے آیا تھا، لیکن کہیں نظر نہیں آرہی۔"

اکمل کے پوچھنے پر دونوں نے ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں کچھ پوچھا۔

"آج تو پارٹی تھی نا، مگر آپ لوگ تو ایسا لگ رہا ہے الیکشن ہار کر کھڑے ہیں۔"

"پتا نہیں تم سے یہ بات کرنی بھی چاہیے یا نہیں۔"

زبیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو اکمل کی تمام حسیات لمحہ بھر میں بیدار ہو گئیں۔

"آپ لوگوں کے لیے میں نیا نہیں ہوں، بچپن سے آپ دونوں میری نیچر سے واقف ہیں پھر آج۔۔۔ آپ کا اس طرح کہنا۔۔۔ ندرت کہاں ہیں؟"

کچھ کہتے کہتے اسے ایک دم معاملے کی حساسیت کا اندازہ ہونے لگا تھا۔

"ارے یار ایسا کچھ نہیں ہے وہ دراصل۔۔۔"

زبیر نے میران اور ندرت کے درمیان ہونے والی تلخی کی روداد شروع سے بیان کی۔

"ہاں وہ سب تو سمجھ میں آگیا، لیکن آج بھی کچھ ہوا ہے کیا؟" وہ بے صبرا ہوا جا رہا تھا۔

"آج میران نے ندرت کا گیٹ اپ کر کے انتہائی گھٹیا اِسکٹ پیش کیا تھا۔ جس میں اپنے ایک دوست کو شاہ زین کا روپ دے کر اسے ندرت کے پیچھے آنے والے دم ہلاتے کتے سے تشبیہ دے ڈالی۔"

"کیا۔۔۔؟" اکمل اس قدر گھٹیا حرکت پر حیران ہوا تھا۔

"صرف یہی نہیں بلکہ اشارتاً یہ سب کہنے کے بجائے اس نے براہِ راست خود کو ندرت اور دوست کو شاہ زین کہہ کر متعارف کروایا۔"

"How Dere him" اکمل کی آنکھیں سرخ ہونے کو تھیں۔ مگر ٹریننگ کے دوران سکھائے گئے قوانین وضبط کے باعث اس نے خود کو بہرحال کمپوز کیے رکھا۔

"سبھی نے اس کے اس فعل کو بہت تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس پر ندرت کا یہ کہنا کہ تیسری جنس کے افراد کیوں کہ میوزک کی بیٹ پر خود کو ظاہر ہونے سے نہیں روک پاتے اسی لیے آج میران کی اصلیت بھی سب کے سامنے آگئی ہے، اسے آگ ہی لگ گیا۔ اسی معاملے پر بات بڑھ گئی اور وہ چاروں ڈین کے آفس میں ہیں۔"

صبا نے تھکے تھکے انداز میں بات مکمل کی۔

"اچھا ہوا آج ناصر بھائی نہیں آئے، ہم دونوں کو یہ ٹینشن بھی تھی۔" زبیر نے کہا تو اکمل نے گہری سانس لی۔

"ڈونٹ وری، میں ندرت کے کہے بغیر گھر جا کر کچھ نہیں کہوں گا۔"

زبیر اور صبا نے مشکور انداز میں اسے دیکھا۔ کیوں کہ ناصر بھائی کے غصے سے وہ دونوں ہی واقف تھے۔

اسی دوران ندرت اور شاہ زین سامنے سے آتے نظر آئے تو وہ تینوں ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اکو؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

نزدیک آکر ندرت نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"ناصر بھائی ذرا بزی تھے تو عائشہ آپی نے مجھے آپ کو لینے کے لیے بھیج دیا۔"

اکمل کے جواب پر ندرت نے ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے اُن تینوں کو دیکھا جو یقینی طور پر آفس میں ہونے والی کارروائی جاننے کو بے تاب تھے۔

"میران کا ایڈمیشن کینسل کر دیا گیا ہے۔"

"کیا؟" صبا اور زبیر کو حیرت ہوئی تھی جبکہ اکمل کے تاثرات خاصے کمپوز تھے۔

"ہاں۔۔۔ اُسے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا ہے۔"

شاہ زین نے ندرت کی بات کی تصدیق کر دی تھی۔

"یہ سب اچھا نہیں ہوا ندی۔۔۔!" صبا شاید آنے والے خطرے کی چاپ محسوس کر رہی تھی۔

"جانتی ہوں۔" وہ پانچوں آہستہ روی اور تھکے تھکے قدموں سے داخلی گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"لیکن میں نے تو کبھی بھی ایسا نہیں چاہا تھا مگر۔۔۔ تم خود سوچو کتنے واہیات طریقے سے اس نے میرا مذاق اڑایا، شاہو کو دُم ہلاتے کتے جیسا متعارف کروایا اور میں نے تو پھر بھی اسے کچھ نہیں کہا،

یہی سوچا تھا کہ ڈین سے جا کر بات کروں، مگر بیک اینج دیے جانے والے میرے کمنٹس کو خود اس نے اچھالا نا۔"

"ڈونٹ وری ندری! پی ریلیکس، ہم سب جانتے ہیں کہ اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔" شاہ زین نے بھی ندرت کو تسلی دی۔

"وہ اس وقت زخمی سانپ کی طرح ری ایکٹ کرے گا، اس لیے ہر بات کے لیے تم ذہنی طور پر تیار رہو، سمجھیں؟" زبیر بولا۔

"وہ جو کچھ کرنا چاہے کرتا پھرے، میرے لیے یہی بات کافی ہے کہ میرے گھر والے مجھ پر بے حد اعتماد کرتے ہیں، جانتے ہیں کہ میں کیا ہوں، اس لیے دنیا کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے جب میرے امی، بابا اور بھائی میرے ساتھ ہیں۔"

"اور ہم بھی ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہیں۔" شاہ زین کے کہنے پر ندرت ہلکا سا مسکرائی۔ اکمل اب تک خاموشی سے تمام صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ جانتا تھا کہ خود کو ریلیکس ظاہر کرنے والی ندرت اندرونی طور پر کس قدر ڈپریس ہوگی کہ یہی اس کی بچپن سے عادت بھی تھی۔ اس کی وجہ سے کسی کو ڈانٹ پڑتی تو خود بھی اپ سیٹ رہتی اور سوچتی کہ کاش! وہ معاف کر دیتی تو دوسرا بچہ ڈانٹ کھا کر منہ بسورے نہ بیٹھا ہوتا اور پھر اس کا موڈ ٹھیک کرنے کو اپنے کھلونے اٹھا کر اسے دیتی۔ لیکن اب بات قطعی مختلف تھی۔ کئی بار نظر انداز کرنے کے باوجود میران کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور یوں بھی صرف ندرت ہی وہ پہلی لڑکی نہیں تھی جسے میران نے تنگ کیا ہو، اکثر لڑکیاں ڈین کے پاس جا کر اس کی شکایتیں کرتیں اور وہ محض وارننگ پا کر مزید سینہ تان کر چلنے لگتا۔ مگر تابوت میں آخری کیل اس وقت ٹھونکی گئی جب ڈین نے اس کے لمبے چوڑے حسب و نسب کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے کالج سے بے دخل کر دیا۔ اس ضمن میں پروفیسر خورشید کی گواہی نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ جن کی موجودگی میں بھی میران کلاس میں جملہ کسنے سے باز نہیں آیا تھا۔

اور اُس رات جب سب اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے تو سبھی کے دل بوجھل تھے مگر ظاہری طور پر وہ سبھی اپنی اس کیفیت کو دوسروں سے چھپائے ہوئے تھے۔

☆☆☆

"ہو سکتا ہے اماں بھائی پارٹی کے بعد ٹیوشن دینے چلے گئے ہوں۔"

ثمینہ نے صحن میں بچھی چارپائی پر بے چینی سے پہلو بدلتی ماں کو دیکھ کر تسلی دینا چاہی تھی۔

"اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور پہلے سے بتا دیتا۔۔۔ بس اللہ خیر کرے، فون بھی نہیں کیا اُس نے۔"

"اماں فون تو تب کرتے اگر چارجنگ ہو پاتی، رات بھر لائٹ ہی نہیں تھی اس لیے یقیناً اُن کا فون بند ہے۔"

اماں نے اس کی بات پر خاموشی سے گردن ہلائی۔ نظر تھی کہ بار بار بھٹک کر مین گیٹ تک جا پہنچتی۔ ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گرنے کی رفتار میں بھی تیزی آ گئی تھی۔

سر پر تاروں بھری چادر کی طرف نظر کرتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر شاہ زین کی خیریت کی دعا کی تھی اور پھر جس طرح کے حالات تھے اس وجہ سے پریشانی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اسی اثناء میں بیل ہوئی تو اپنے اپنے خیالات میں گم ثمینہ اور اماں ہڑبڑا سی گئیں۔

"بھائی آ گئے۔" ثمینہ نے برق رفتاری سے جا کر گیٹ کھولا تو شاہ زین رات کے اس وقت اماں کو صحن میں موجود پا کر شرمندہ ہو گیا۔

"معاف کیجیے گا اماں، دیر ہو گئی۔"

اندر جانے کے بجائے وہ بھی وہیں اُن کے گھٹنوں پر سر رکھے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

"معافی تلافی بعد میں۔۔۔ لیکن یہ تو بتائیں اتنی دیر کیسے ہو گئی اور پارٹی کیسی رہی؟"

"ثمینہ۔۔۔!" اماں نے اُسے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

"بیٹا! کتنی دفعہ سمجھایا ہے، باہر سے آنے پر فوراً سوال جواب نہ شروع کر دیا کرو۔"

شاہ زین کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انہوں نے ثمینہ کو سمجھایا ضرور مگر اندر آتے شاہ زین کے تاثرات دیکھ کر وہ بھی چونک ضرور گئی تھیں۔

آتے جاتے ثمینہ سے چھیڑ چھاڑ، خوش گپیاں اور قہقہے جواب اس کی شخصیت کا حصہ معلوم ہونے لگے تھے آج پھر شاید اسے ادھورا چھوڑ رہے تھے۔ اماں نے یہ سب سوچا ضرور مگر شاہ زین سے کچھ بھی پوچھنے سے احتراز برتا۔

"اٹھو بیٹا، آؤ اندر چلتے ہیں۔۔۔ ثمینہ بھائی کے لیے روٹی بنا لو۔"

"نہیں امی، بھوک نہیں ہے مجھے۔"

"امی آپ بھی نا۔۔۔ بھئی بھائی آج ڈنر پارٹی میں گئے تھے، کھا پی کے آئے ہوں گے۔ ہے نا بھائی۔"

اندر جاتے جاتے ثمینہ نے تائید چاہی تھی۔ مگر جواب میں شاہ زین نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ میران کی نیچر اب تک اسے کافی حد تک سمجھ آ چکی تھی اسی لیے ہزار طرح کے وسوسے اور خدشات خود رو جھاڑیوں کی طرح ذہن کی پرسکون زمین کو گھیرنے لگے تھے۔ کچھ دیر تو دل ہی دل میں یہ ساری بات دبانے کی کوشش کی مگر آج تک اُس نے اپنی ہر پریشانی اماں کے سامنے کھول کر رکھ دی تھی کہ اُن کا ساتھ اس کے لیے بڑا مضبوط سہارا ثابت ہوتا۔ سو آج بھی وہ اٹھا اور سیدھا اماں کے کمرے تک جا پہنچا جہاں اماں اور ثمینہ سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ آہستہ قدموں سے چلتا شاہ زین خاموشی سے بیٹھ کر اُن کے پاؤں دبانے لگا تو اماں نے آنکھیں کھول دیں۔ ثمینہ بھی اٹھ بیٹھی تھی کہ شاہ زین کا یہ انداز ہی کچھ سمجھا دیتا تھا کہ وہ شدید پریشانی میں ہے اور سکون چاہتا ہے۔

"کیا بات ہے بیٹا؟ پریشان ہو؟"

"جی اماں!"

"کیا کوئی بدمزگی ہو گئی پارٹی میں؟"

اماں نے براہ راست سوال کیا تو اُس نے چونک کر سر اوپر اٹھایا اور گہرا سانس لے کر لفظوں کو ترتیب دینے لگا۔

"اماں وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔"

کچھ لمحے بعد شاہ زین نے بولنا شروع کیا تو اول روز ندرت سے نام پوچھنے سے لے کر آج تک کا احوال بنا کچھ بھی چھپائے کہہ ڈالا نہ صرف یہ بلکہ اُس نے اپنی اور ندرت کی دلی وابستگی کے متعلق بھی سب بتا دیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو کس حد تک چاہتے ہیں۔

کوئی اور وقت ہوتا تو ثمینہ خوشی سے اچھلنے کودنے لگتی کہ گھر آنے والی بھابھی، شاہ زین کے دل کو چھو چکی ہے لیکن اس وقت معاملہ ظاہر ہے مختلف تھا سو خاموش بیٹھا رہنا ہی مناسب خیال کیا۔

اماں نے حسب عادت شاہ زین کی مکمل بات سننے کے بعد دھیمے لہجے اور نرم لفظوں میں اُسے دلاسا دینا شروع کیا تو وہ جیسے ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگا۔

☆☆☆

یونیورسٹی کے احاطے میں طلوع ہونے والی نئی صبح چمکیلی ہونے کے باوجود گرد آلود محسوس ہو رہی تھی۔

میران یونیورسٹی سے نکالا جا چکا تھا مگر اس کے چیلے بہرحال موجود تھے۔ ندرت اور شاہ زین اتفاق سے اکٹھے ہی یونیورسٹی گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو کئی چبھتی نظروں نے ان کا استقبال کیا۔

زبیر اور صبا ہمیشہ کی طرح نت نئے پھولوں سے مزین مستطیل کیاریوں کے پاس ان کا انتظار کر رہے تھے اور یہی ان سب کی روٹین تھی جو بھی پہلے آتا وہ یہیں موجود رہ کر باقی سب کا انتظار کرتا اور پھر اکٹھے ہونے پر قدم آگے بڑھائے جاتے۔

"فون کیوں بند تھا رات کو؟" صبا نے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

"بس یار! ایک تو یہیں سے اتنا لیٹ گئے تھے پھر گھر جا کر میں ذرا اکیلا رہنا چاہتی تھی۔"

"مجھے معلوم تھا اسی لیے میں نے چاہنے کے باوجود رات کو کوئی میسج نہیں کیا۔"

شاہ زین اُس کے مزاج سے بخوبی واقف ہے، اس بات کا یقین ندرت کو بہت پہلے سے تھا۔

"تمہارے میسجز میں نے صبح پڑھ لیے تھے۔"

"آنٹی کو کچھ بتایا؟"

"نہیں۔"

"بتا دینا چاہیے تھا، انکل اور آنٹی کو ہر بات کا علم ہونا چاہیے۔"

زبیر نے بڑا مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔ شروع سے ہی وہ ندرت کو یہی کہتا کہ ناصر بھائی یا ثروت آپا کو کچھ بتاؤ یا نہ بتاؤ مگر گھر سے باہر ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی امی، بابا سے ضرور شیئر کرلیا کرو۔ اس طرح انسان کئی چھوٹی بڑی پرابلمز سے بچ جاتا ہے۔

اور زبیر کی یہی بات اُس نے گویا گرہ سے باندھ لی تھی اور روزانہ گھر جا کر جب تک "الف" سے لے کر "ے" تک امی بابا کو بتا نہ لیتی اسے سکون نہ ملتا۔

"میرے جانے تک وہ دونوں سو چکے تھے، تمہیں پتا ہے نا امی زیادہ دیر جاگ نہیں پاتیں اور بابا کو ویسے ہی کئی دنوں سے بخار ہو رہا ہے، بس اسی لیے میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا، آج بتا دوں گی۔"

ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی چاروں کے قدم گویا باندھ دیئے گئے تھے۔ ناسمجھی سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے نظریں نوٹس بورڈ پر جا رکیں جہاں ایک اخبار کا تراشا بیچوں بیچ لگا آنے جانے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ جس میں ندرت کو سیاہ بریسلیٹ پہناتا شاہ زین اپنی والہانہ مسکراہٹ سے ندرت کو دیکھتا تصویر میں قید تھا، ہتھیلی پر دونوں کے جذبوں کی عکاسی کرتا شعر بھی اس اخباری تصویر کا نمایاں حصہ تھا۔

"دو پیار کے پروانوں کا راہ میں آنے والا ہر پتھر ہٹا دینے کا عزم۔"

سفید پڑتے چہروں اور ساکت آنکھوں کے ساتھ تفصیل پڑھنے پر معلوم ہوا کہ میران کی طرف سے ان دونوں کی وجہ سے یونیورسٹی اور خصوصاً ڈیپارٹمنٹ کا ماحول خراب ہونے کی شکایت پر بجائے اس کے کہ ان دونوں کے خلاف کارروائی کی جاتی، شکایت کرنے والے میران کو ہی یونیورسٹی سے نکال باہر کیا گیا۔ جس پر میران نے اعلا حکام سے انصاف کی اپیل کرتے ہوئے اپنا تعلیمی سال بچانے کی بھی درخواست کی ہے۔

وہ سب جانتے تھے کہ میران جیسے انسان کے لیے یہ ڈگری وغیرہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ سب کرنے کا مقصد انصاف مانگنا نہیں بلکہ ان دونوں کو بدنام کرنا تھا جس میں وہ مکمل کامیاب ہوگیا تھا کہ جس جگہ یہ نوٹس بورڈ موجود تھا اُسے اسٹوڈنٹس کی زبان میں یونیورسٹی چوک کہا جاتا تھا جہاں سے چار مختلف ڈیپارٹمنٹس کی طرف رستہ نکلتا اور چاروں ڈیپارٹمنٹس کے نوٹس بورڈز ایک دوسرے کی متضاد اطراف ہونے کی وجہ سے اکثر اسٹوڈنٹس کا رش رہتا۔ اسی لیے میران کے چیلوں نے صرف ایک نوٹس بورڈ کے بجائے وہی تراشا چاروں طرف آویزاں کر دیا تھا۔ تاکہ جنگل کی آگ کی طرح یہ بات سب تک پہنچنے میں تاخیر نہ ہو۔

"یہ۔۔۔ یہ سب۔۔۔ کیا تماشا ہے یہ؟"

زبیر یہ سب دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گیا تھا اور یہی حال یقیناً ان تینوں کا تھا، لیکن ایک بار پھر شاہ زین کا ضبط اُن سے جیت گیا تھا۔

"کول ڈاؤن یار! یہاں پر کسی بھی قسم کا ردعمل ظاہر کرنے سے مزید تماشا بنے گا، بہتر ہے کہ ہم ڈیپارٹمنٹ ہیڈ سے بات کریں۔"

"ہاں زبیر! شاہ زین ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہے۔ بات مزید بگڑ سکتی ہے۔"

"مزید؟" ایک تو وہ پہلے ہی تپا ہوا تھا اُس پر صبا کی بات پر مزید گرمی کھا گیا۔

"یعنی ابھی کسی بھی "مزید" کی گنجائش باقی ہے؟ تمہارے خیال میں؟"

"زبیر کام ڈاؤن۔"

ندرت کے کہنے پر اس نے اپنا تمام تر غصہ بند مٹھیوں اور جبڑوں پر منتقل کیا تھا۔

"ندی تم پریشان تو نہیں ہو نا۔"

"بالکل بھی نہیں۔ بلکہ میں تم سب سے بھی کہوں گی کہ اتنا مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" ڈیپارٹمنٹ ہیڈ کے آفس جانے سے پہلے سارے تراشے اتار لیے گئے تھے اور اب وہ چاروں راہداری سے گزر رہے تھے جب صبا نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی مطلب یہ کہ ڈین کے آفس تو ہم جا ہی رہے ہیں اس کے علاوہ مجھے اور کسی کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہے کیوں کہ میرے گھر والے مجھ پر بے حد اعتماد کرتے ہیں، جانتے ہیں کہ میں ایسا کوئی بھی قدم نہیں اٹھا سکتی جس سے ان کی عزت پر حرف آئے۔"

کندھے اچکا کر بڑے لاپروا انداز میں جواب دے کر وہ اُسی اعتماد سے آگے بڑھ رہی تھی جو اس کا خاصہ تھا۔ چہ میگوئیاں، سرگوشیاں اور اشارے شاید اُسے نظر ہی نہیں آرہے تھے۔

"لیکن یار دنیا کی نظریں۔۔۔"

"دنیا کی نظریں چاہے برچھی ہوں یا تلوار، میرے پاس اپنوں کی ڈھال ہے جو مجھ پر ہونے والا ہر وار پہلے خود پر سہہ جانے کی خواہش بھی رکھتے ہیں اور طاقت بھی۔ کیوں شاہو؟" ننھی سی ناک میں چمکنے والی زرقون کی لونگ آج ندرت کی آنکھوں کی چمک کو مات دینے میں واضح طریقے سے کامیاب ہوئی تھی کہ اس کا لہجہ چاہے کتنا ہی مضبوط اور پرعزم ضرور تھا مگر جھیل جیسی آنکھوں میں وہ چمک مفقود تھی جو شاہ زین سے بات کرتے ہوئے ایک دم ہی اُن میں کوند آتی۔

"بے شک ندی! میں بڑی بڑی باتیں تو نہیں کر سکتا، نہ ہی میں تم سے تارے توڑ لانے کا وعدہ کروں گا لیکن ہاں تمہارے اپنوں کی یہ ڈھال کبھی ٹوٹنے نہیں دوں گا۔ یہ وعدہ رہا۔"

"تم بھی تو میرے اپنے ہو نا؟" آج پھر ندرت کو تائید تازہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔

"جی نہیں کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔" انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہہ کر شاہ زین نے اُن کے بڑھتے قدموں کو رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میرا مطلب تھا میں تو بہت اپنا ہوں، ہے نا؟" اپنی ازلی دھیمی سی ہنسی کے ساتھ اُن سب کی غصیلی نظروں کے جواب میں شاہ زین کو فوری وضاحت دینا پڑی تھی۔

☆☆☆

یہ کہنا کہ ندرت پر اس واقعے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا بالکل غلط ہوگا۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ ان سب باتوں سے بڑھ کر وہ اس لیے پریشان تھی کہ وہ ان سب کی پریشانی کا سبب بن گئی تھی اور وہ بھی ان دنوں میں جب کہ فائنل ایئر کے امتحانات سر پر تھے۔ اسی لیے اُن کے سامنے سارا دن خود کو کمپوز کرنے کی کوشش میں جب تھکنے لگی تو گھر کا رخ کیا کہ اُس کے آنے تک اخبار نہیں آیا تھا اور اب اُسے جا کر اُن سب کے سامنے یہ سارا معاملہ رکھنا تھا۔

جون جولائی کا حبس زدہ موسم، اُس پر لڑکیوں سے کھچا کھچ بھری بس میں بیٹھنا جہاں رش کی وجہ سے ہوا کا ایک جھونکا بھی اندر داخل ہونے کی جرأت نہ کرتا۔ اکثر اوقات تو دروازے کے بالکل قریب کھڑی لڑکیاں باہر بھی جا گرتیں مگر اس کے باوجود وہ خود کو چیلنجر ثابت کرنے کی کوشش میں وہیں کھڑی بھی ضرور ہوا کرتیں۔

اللہ اللہ کر کے ندرت کا اسٹاپ آیا تو وہ صبا کو اللہ حافظ کہہ کر لڑکیوں کی طعنے دیتی آنکھوں کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے تیزی سے گھر کی طرف قدم بڑھانے لگی۔

آج یونیورسٹی میں گزارا گیا دن ندی کو اپنی اب تک کی زندگی کا مشکل ترین دن معلوم ہوا تھا۔ اپنے اندر ہوتی جنگ کو دوسروں کے سامنے صرف اس لیے

ظاہر نہ کرتا کہ وہ اس کی وجہ سے پریشان نہ ہوں۔ آج انتہائی دشوار معلوم ہوا تھا۔

بس سے اتر کر گھر تک جاتے جاتے اس کے ذہن کے پردے پر ایک بار پھر میران سے جڑے تمام واقعات ایک ایک کر کے نمودار ہوتے جا رہے تھے۔ خس کم جہاں پاک کے مصداق اس کا ایڈمیشن کینسل ہونے پر اس نے جو سکھ کا سانس لیا تھا وہ محض پانی کا جھاگ ثابت ہوا اور بس۔

اس کا خیال تھا کہ گھر جا کر وہ ناصر بھائی اور بابا کے ساتھ مل کر میران کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرتے ہوئے ہتک عزت کا کیس فائل کرے گی کیوں کہ ایک ہی رات میں اور صرف اخبار کی خبر کے نتیجے میں جس طرح آج یونیورسٹی میں اُسے اپنے اور شاہ زین کے ــــ ہوٹلوں میں جانے اور ایک ساتھ وقت گزارنے کی باتیں، تصدیق کرنے کی غرض سے سننے کو ملی تھیں وہ ــــــ نہ صرف اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھیں بلکہ یقینی طور پر گھر والے بھی ایسے شخص کو سزا دینے کو بے تاب ہوں گے جن کی وجہ سے اُس کا نام اور تصویر یوں بک اسٹالز پر رکھے اخباروں کی زینت بنا۔

اور مسئلہ صرف اس کا نہیں تھا بلکہ اسے یہ بھی فکر لاحق تھی کہ شاہ زین کے گھر کا دارومدار جن ٹیوشنز پر ہے ان میں سے کئی ٹیوشنز فی میل اسٹوڈنٹس کی بھی تھیں اور اگر ہونے والے اس غیر متوقع فعل پر اُن اسٹوڈنٹس کے والدین اُسے اُن کے گھر آنے اور ٹیوشن پڑھانے سے منع کر دیں تو یقیناً یہ شاہ زین اور اس کی فیملی کے لیے معاشی طور پر ایک دھچکا ثابت ہوگا۔ اس بات پر دھیان جاتے ہی اسے شاہ زین سمیت اس کے تمام فیملی ممبرز کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ جن سے وہ آج تک ملی تو نہیں تھی لیکن شاہ زین کی نسبت سے اُسے ان سے ایک خاص لگاؤ ضرور محسوس ہوتا۔

یوں بھی سچی محبت کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ جس سے محبت کی جائے اس سے جڑی تمام خوبیوں، خامیوں حتیٰ کہ اس سے جڑے تمام رشتوں سے بھی محبت ہو جائے۔ اسے یاد تھا ایک دن یونیورسٹی میں اپنے لیپ ٹاپ پر اس نے شاہ زین سے اس کا گھر دیکھنے کی خواہش کی تھی اور گوگل (google) کی مہربانی سے نظر آنے والا اس کے گھر کا گیٹ بھی ندی کو اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے جانے کب تک اور کہاں تک چلتی رہتی کہ اپنے گھر کا گیٹ سامنے نظر آنے پر خیالوں کا تسلسل ٹوٹا اور گہری سانس کے ذریعے اندر کی تمام تھکن کو باہر نکال پھینکنے کے بعد دایاں پاؤں اندر رکھتے ہوئے اُس سلطنت میں داخل ہو گئی جہاں کی شہزادی تصور کی جاتی تھی۔

☆☆☆

سپنے بُننے والی لڑکیو!
ایسے انوکھے خواب نہ دیکھو
نازک سی اک گڑیا جیسے موم قدم
اور تپتی جھلستی ریت کا رستہ
جن کے عوض تعبیر ملے
سپنے بُننے والی لڑکیو!
خوابوں کی دنیا میں بے شک
کوئی باڈر، نگراں یا ناصح نہیں ہے
پنچھی، ندیا، پون کی مانند
بلاشبہ آزاد ہو تم
اتنا لیکن ذہن میں رکھنا
بیرن دھوپ میں خواب جلیں تو
موم پگھلنے لگتا ہے
اور یہ جھلسے پاؤں اگر
ننگے بھی ہوں۔۔۔
پاس کوئی مرہم بھی نہ ہو
پھر تپتی ریت پہ چلنا سوچو
کتنا مشکل ہوتا ہے
سپنے بُننے والی لڑکیو!
ایسے انوکھے خواب نہ دیکھو۔۔۔

دیکھا جائے تو مہربانو کی اداس آنکھوں نے کوئی ایسا ناممکن خواب نہیں بنا تھا جس کی تعبیر نہ مل سکتی ہو۔۔۔ "توجہ" صرف اور صرف توجہ، ہاں اسی چار لفظی احساس کا تو خواب آج کل اس کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ کیوں کہ گھر میں سب ہی اُس سے محبت کرتے ہیں۔ اس بات کا یقین تو اسے تھا ہی، وہ جانتی تھی کہ ماں باپ اور بھائی سبھی اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ لیکن شاید رویوں میں اس پیار کا اظہار کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ دکھ بس اسی کا تھا۔

یہی بات وہ محسوس تو شروع سے کرتی تھی لیکن اپنے "حسب نسب" کی وجہ سے "عام" لوگوں سے میل جول نہ ہونے کی وجہ سے اس احساس میں وہ شدت نہیں تھی جو اب ہاسٹل میں اپنی روم میٹس سے اُن کی باتیں سننے کے بعد خیالات میں در آئی تھی۔

اپنی زندگی بالکل روکھی پھیکی اور نمائشی لگنے لگی تھی اسے۔

گاؤں میں محض ملکانی ہونے کی وجہ سے سبھی اسے انتہا درجے کی عزت دیتے۔ نہ صرف یہ بلکہ سید ہونے کی وجہ سے اس عزت کے ساتھ عقیدت کا پھول جو جڑا تو پھر ہمیشہ اسے کوئی بلند شے ہی سمجھا گیا۔ بچپن میں تو خود اسے ان چیزوں کا شعور نہیں تھا بلکہ اپنے ماحول ہی کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو دیکھنے کے لیے ہمیشہ اس کی نظر رحم بھری ہی ہوا کرتی۔ اسے یاد تھا کہ ہاسٹل آنے سے پہلے تک وہ یہی سمجھتی رہی کہ تمام لوگوں کے مقابلے میں وہ واقعی بلند ہے۔ باقی تمام لوگ کسی بھی طرح اس کی برابری کے نہیں اور پھر ستم یہ کہ وہ بلندی کے جس مینار پر موجود تھی وہاں کسی کو بھی سر اٹھا کر دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

لیکن بڑے بزرگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ دوستی انسان کی ذات پر ضرور اثر ڈالتی ہے۔ اس لیے ہمیشہ اچھے دوست بنائے جائیں تا کہ ایک تو یہ کہ اگر آپ کا تعارف کروانے کے لیے دوستوں کا نام بھی استعمال کیا جائے تو باعثِ عزت وقار ہو اور دوسری بات یہ کہ اُن سے اور کوئی فائدہ ہو نہ ہو، اچھے اثرات ضرور بالواسطہ بلاواسطہ آپ کی زندگی پر اثر انگیز ہوں گے۔

اس بلندی پر بہت تنہا ہوں
کاش میں سب کے برابر ہوتی

زندگی کے اس موڑ پر جبکہ اس کے ــــــ ذہن و دل بدلتے نظریات کی کشمکش میں ہوتی اس کی ذات کی تربیت اور معاشرتی حقائق کی جنگ کے سامنے بے بس نظر آنے لگے تھے۔ اُسے کوئی ایسا ہمدرد درکار تھا جس سے وہ اپنی ذات کی آگہی کے متعلق بات کرے۔ اُسے بتائے کہ اب اُس کے اندر ایک واضح تبدیلی آ رہی ہے۔ اُسے اپنے لیے چھوٹی ملکانی کے بجائے محض مہربانو سننا اچھا لگتا ہے۔ وہ مزارعوں اور کمیوں کی بیٹیوں سے بھی اُسی طرح باتیں کرنا چاہتی ہے جیسے شہر میں سب سے کرتی ہے جہاں کوئی بھی اسے خاص سمجھ کر عزت و تکریم کے مینار پر بٹھا کر تنہا نہیں کرتا اور۔۔۔ اور جہاں اُسے اس بلند و بالا اور وسیع و عریض حویلی سے کہیں زیادہ سکون اپنے اس کمرے میں ملتا ہے جہاں وہ اپنی دوسری دو روم میٹس "میری" اور "کنول" کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ تینوں مکمل طور پر مختلف بیک گراؤنڈز سے آنے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر گھل مل گئی تھیں کہ لگتا بچپن کی سہیلیاں ہیں۔

یہ اور دوسری ڈھیر ساری باتیں وہ ملکانی سائیں سے کرنا چاہتی تھی مگر اُن کے پاس ہر وقت میران کی باتوں کے سوا اور کوئی موضوع نہ ہوتا۔ وہ کبھی ان کے پاس بیٹھتی تو میران کے شکار کے قصے، گاؤں والوں پر رعب کے واقعات یا پھر شاہ سائیں کی سیاست اور بعض اوقات ان کی ذات پر شکوک و شبہات کا اظہار دبے لفظوں میں کرنے کے علاوہ ان کے پاس مہربانو کی باتیں سننے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔

اور تب مہربانو کو ملکانی سائیں پر بھی ترس آتا۔ اسے احساس ہوتا کہ وہ بھی تو تنہا اور اکیلی ہیں اور وہ بھی اس مینار پر کھڑی ہیں جہاں سے وہ نیچے اترنے کی سعی میں مصروف ہے۔ اُن کا بھی تو دل چاہتا ہوگا کسی سے دکھ سکھ کرنے کا۔۔۔ سو وہ چپ چاپ خاموشی سے گردن ہلاتی ان کی باتیں سنتی جاتی۔

یوں بھی شاہ سائیں سے عمر میں بڑی ہونے کی وجہ سے بھی ایک عدم تحفظ کا احساس تھا جو وہ مہربانو کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی تھیں۔

ہم انسان چاہتے نہ چاہتے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ پانی کی لہروں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ جس طرح اکیلی لہر کا وجود کوئی حیثیت، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بلکہ اپنی ذات کے اظہار اور اپنے ہونے کا احساس دلانے کے لیے دوسری لہروں کا ساتھ بہرحال ضروری ہوتا ہی ہے۔ بالکل اسی طرح انسان کا بھی اکیلا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، اسے خوشی، غمی یا کسی بھی کیفیت میں دوسرے انسان کی ضرورت محسوس ہوتی ہی ہے۔ اپنا دکھ سکھ شیئر کرنے کے لیے اکثر اوقات انسان متلاشی نظروں سے کسی ہمدرد اور مخلص کی تلاش میں رہتا ہی ہے اور ذرا سی محبت پاکر خلوص کا احساس ہوتے ہی اندر کا تمام غبار نکال باہر کرتا ہے۔

یہی حال ملکانی سائیں کا تھا۔ وہ مہربانو سے ساری باتیں کہہ کر خود کو ہلکا کر لیتیں یہ جانے بغیر کہ اس کا دل کا بوجھ ابھی تک وہیں کا وہیں ہے۔

انہی سب باتوں کی وجہ سے مہربانو نے طے شدہ پروگرام سے چند روز پہلے ہی واپس شہر جانے کا ارادہ کرلیا۔

چل بلھیا، چل اوتھے چلیے جتھے سارے ہوون انّے
نہ کوئی ساڈی ذات پچھانے، تے نہ کوئی سانوں منّے

☆☆☆

''ارے واہ۔۔۔ آج تو کمال ہوگیا ناصر بھائی! شام سے پہلے ہی چاند نظر آرہا ہے۔'' لان عبور کرکے ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھتے ہی آج خود سے پہلے ناصر بھائی کو گھر میں موجود دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم گئی تھی۔ اور خوشی کے اسی احساس کے زیر اثر وہ یہ نوٹ کرنا قطعاً بھول ہی گئی تھی کہ آج صرف اور صرف ان کا اس وقت گھر میں ہونا اچنبھے کی بات نہیں تھی بلکہ امی عائشہ اور سب سے بڑھ کر بابا جو بخار سے پھنکنے کے باوجود سب کے ساتھ وہاں یوں خاموشی سے موجود تھے جیسے کسی کے گھر جوان اور حادثاتی موت کا پرسہ دینے کی نیت سے آئے ہوں۔ اسی دوران اس کی آواز سن کر کچن سے برآمد ہوتی ثروت آپا نے تو جیسے اس کی چیخیں نکال دیں۔ ننھے رضا کو گود میں لیے اس سے پہلے کہ وہ اس کے پاس آتیں، شولڈر بیگ صوفے پر اچھال کر وہ خود ان کی طرف لپکی اور رضا کو گود میں لے کر اس کے پھولے پھولے سے گالوں پر پیارے چٹکی لے کر اُن کی طرف متوجہ ہوئی۔ صبح سے حواسوں پر چھائی پریشانی تو اسے یاد ہی نہیں رہی تھی۔

''مجھ سے تو ایک چاند کی خوشی سنبھالے نہیں جارہی تھی کہاں یہ تین تین چاند۔۔۔''

رضا کی ننھی منی گلابی انگلیوں سے اپنے ریشمی بالوں کو چھڑواتے ہوئے اس نے ناصر کی طرف دیکھا۔

''اتنی ہی بھولی سمجھتے تھے ہم تمہیں، لیکن لعنت ہے ہماری سوچ پر۔''

ناصر نے انتہائی درشت آواز میں ندرت کی توقع کے برعکس جواب دیا تو وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں بات کے پس منظر تک جاپہنچی۔

''بھائی وہ۔۔۔''

''بھائی؟ نام لے کر بلاؤ مجھے نام لے کر۔۔۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو امی، بابا کے ساتھ وہ بھی سہم گئی۔

''بھائی سمجھتیں تو عزت کو یوں اخباروں میں اچھلنے نہ دیتیں۔ اس گھٹیا اور سڑک چھاپ لڑکے کے ساتھ ہوٹلوں میں نہ گھومتیں۔۔۔''

''بھائی یقین کریں جھوٹ ہے یہ سب۔'' تمام تر ہمت جمع کرکے وہ بولی تو ضرور مگر ناصر آج اس کی کوئی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''بکواس بند کرو اپنی۔''

''ناصر۔۔۔ بیٹا! ذرا دھیمے لہجے میں بات کرو تو بہتر ہوگا۔ آخر بہن ہے تمہاری۔'' بابا نے نقاہت بھرے انداز سے بڑے بکھرے اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں التجا کی۔

''دھیما کیا اور سخت کیا، میں تو اس سے بات کرنا ہی نہیں چاہتا، اس جیسی بہنوں کو تو پیدا ہوتے ہی مرجانا چاہیے۔''

ندرت جسے کسی نے سخت لہجے میں کبھی مخاطب نہیں کیا تھا آج اس نفرت آمیز لفظوں کی تاب نہ لاکر لڑکھڑاتے ہوئے بابا کے پاؤں پر گر پڑی۔

بے لوث اور سچے رشتوں سے مزین اپنوں کی ڈھال ٹوٹنے لگی تھی۔۔۔

بابا نے اسے اپنے ساتھ بٹھانا چاہا مگر وہ وہیں کارپٹ پر بیٹھی اُن کے گھٹنوں پر سر رکھے ماں کے چہرے پر موجود بے بسی کو دیکھے گئی۔

یقینی طور پر وہ سب کافی دیر سے بیٹھے یہی بات کر رہے تھے۔ اس بات کا اندازہ ندرت نے امی کے ستے ہوئے سرخ چہرے اور آنکھوں کے پپوٹوں کے بوجھل پن سے لگایا تھا۔

''ندرت بتاؤ کیا ہے یہ سارا معاملہ، میرے سسرال والے بھی آج صبح سے مجھ سے سب کچھ پوچھ رہے ہیں۔۔۔ تم کم از کم میرا تو سوچتیں نا، کس طرح فیس کروں گی دنیا والوں کو کیا بتاؤں گی سب کو کہ وہ لڑکا کون ہے اور تم کیوں اس کے ساتھ ہر روز ہوٹلوں میں نظر آتی تھیں؟''

ثروت آپا کو اس سے زیادہ اپنی ازدواجی زندگی کی فکر لاحق تھی۔

''تم کسی کو کیا بتاؤ گی؟ عائشہ سے پوچھو جس نے اکثر اسے رات رات بھر فون پر باتیں کرتے سنا ہے۔۔۔ میرا تو خون کھول رہا ہے دل چاہتا ہے ابھی اسی وقت اس کا بھی خون کردوں اور اس کے عاشق کا بھی۔''

ندرت اپنے بالوں پر بابا کے آنسو محسوس کرتے ہوئے کرب وضبط کی آخری منزل پر تھی۔ یوں بھی ابھی اس کی آنکھوں کی جھیل ویران اور خشک تھی۔ سکتے کے عالم میں رنگ بدلتے رشتوں کو بس دیکھے ہی جارہی تھی۔

''ناصر!'' امی جو آج ایک ہی دن میں بوڑھی لگنے لگی تھیں اپنی نحیف آواز میں اعتماد سموتے ہوئے بولیں۔

''مجھے اور تمہارے بابا کو ندرت پر آج بھی اتنا ہی اعتماد ہے جتنا کل تھا۔ نہ ہم اس سے کوئی تفتیش کریں گے نہ پوچھ گچھ۔''

''تمہاری ماں ٹھیک کہتی ہے کیوں کہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھ کر کوئی بھی فیصلہ سنا دینا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔'' بخار کی شدت کی وجہ سے ابا نے بمشکل بات پوری کی۔

''ہاں بابا آپ دونوں بھی ٹھیک کہتے ہیں اور آپ کی بیٹی بھی، لیکن یاد رکھیے گا دنیا والوں کے پاس تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کا وقت کبھی نہیں ہوتا۔''

ناصر نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا اور کارپٹ پر رکھے رضا کے کھلونے کو ٹھوکر مار کر باہر نکل گیا۔ عائشہ بھی رکی نہیں اور اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ ثروت آپا نے چند لمحے ساکت وجامد ندرت کو دیکھا اور پھر اس کے قریب ہی کارپٹ پر بیٹھ گئیں رضا فوراً اپنے کھلونے کی طرف لپکا تھا۔

''کتنا اعتماد کیا تھا تم پر۔۔۔ اور کیا صلہ دیا تم نے۔''

اُن کے لہجے میں طنز نہیں تھا لیکن تاسف ضرور تھا، کچھ کھو دینے کا دکھ اُن کے چہرے پر صاف نظر آرہا تھا اور یہی انداز ندرت کو اندر تک گھائل کرتا گیا۔

''اور دکھ تو اس بات کا ہے کہ تمہیں ان سب باتوں کا کچھ ملال کوئی دکھ بھی نہیں ہے، ندامت کا ایک آنسو تمہاری آنکھ سے نہیں ٹپکا۔۔۔ یہ محبت ہے تمہیں ہم سے کہ ہماری عزت کے جنازے پر تمہاری آنکھ تک نہیں بھیگی۔''

ندرت نے اُن کی بات پر بابا کے گھٹنے سے سر اٹھایا تو محسوس ہوا کہ بخار کی شدت اس قدر تیز تھی کہ خود ندرت کا دایاں گال سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً بابا کی طرف متوجہ ہونا چاہا مگر ثروت آپا یقیناً اس کی خاموشی پر زچ ہو رہی تھیں جبھی اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ

ڈالا۔
"میں تم سے پوچھتی ہوں کیوں پرزہ پرزہ کر دیا ہمارے اعتماد کو۔۔۔؟ بولو۔۔۔ میں کہتی ہوں بتاؤ مجھے۔۔۔"
"ہاں ہاں میں مانتی ہوں کہ پرزہ پرزہ کیا ہے اعتماد، لیکن میں نے نہیں آپ لوگوں نے دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں میرے اُس اعتماد کی جو مجھے آپ سب پر تھا۔۔۔ بھی اخبار میں یونیورسٹی میں دیکھ کر آئی ہوں۔ لیکن میرے قدم مضبوط تھے، کسی کے سامنے نظر جھکا کر نہیں چلی، کیوں؟ کیوں کہ مجھے اعتماد تھا آپ پر، بھائی پر کہ دنیا والے چاہے مجھے کچھ بھی کہیں لیکن ہر مشکل وقت میں میرے اپنے میرے دفاع کے لیے موجود رہیں گے مگر یہاں۔۔۔ ہونہہ! ارے قتل کے مجرم کو بھی صفائی کا موقع دیے بغیر پھانسی کی سزا نہیں سنائی جاتی لیکن آپ لوگوں نے تو مجھے لفظوں سے سنگسار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"
بات کرتے کرتے ندرت کا گلا ضرور رندھ گیا تھا مگر آنسو پھر بھی اس کی اجازت کے منتظر تھے اور یوں بھی وہ بچپن سے ہی امی بابا کے علاوہ اور کسی کے سامنے رو کر خود کو کمزور دکھانا نہیں چاہتی تھی۔
"ندرت تم اعتماد۔۔۔" ثروت آپا ابھی تک اپنے موقف پر قائم تھیں۔
"اعتماد، اعتماد، اعتماد۔۔۔ پتا بھی ہے آپ کو اس لفظ کا مفہوم؟ کو ایجوکیشن میں تعلیم دلوانا اعتماد نہیں ہوتا ثروت آپا۔۔۔! اعتماد وہ ہوتا ہے جو میرے امی بابا نے مجھ پر کیا، کہ جب دنیا والوں کے ساتھ میرے اپنے بہن بھائی مجھ پر بہتان باندھ رہے ہیں تو ان دونوں نے مجھ سے کوئی بھی صفائی مانگے بنا صرف میری خاموشی پر بھی اعتماد کیا۔ اس بات پر یقین رکھا کہ یہ سب ایک من گھڑت کہانی ہے اور بس۔"
ثروت آپا نے رضا کو اٹھایا اور اُٹھ کھڑی ہوئیں۔
"امی بابا کبھی اس چار دیواری سے باہر نکلیں، لوگوں کی باتیں سنیں تو پھر میں دیکھوں کہ کیسے قائم رکھتے ہیں اپنا اعتماد۔۔۔ ہمیں تو کہیں منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا۔۔۔ پہلے خوب صورتی میں پورے خاندان سے الگ تھیں اب کردار کی رنگینیوں میں بھی منفرد ہو گئی ہو، چرچے پہلے بھی ہر طرف تھے اور آئندہ بھی رہیں گے۔"
ثروت آپا بڑبڑاتی ہوئی آگ اگلتی گیسٹ روم کی طرف چل دیں جو شادی سے پہلے اُن ہی کا کمرہ ہوا کرتا تھا۔
سسرال والوں کے سوالات کی بوچھاڑ نے اُن کے سامنے بہن کی محبت اور جذبات سب دھندلا دیے تھے۔ یاد تھا تو بس اتنا کہ سسرالیوں کے سامنے عزت کیسے بچائی جائے اور ظاہری طور پر کوئی بھی راہ سجھائی نہ دینے پر وہ اس قدر جھنجھلائی ہوئی تھیں کہ کمرے میں آتے ہی رضا کو بیڈ پر پٹخ کر اس کے رونے کی پروا کیے بغیر جلے پاؤں کی بلی کی طرح کمرے کے چکر کاٹنے لگیں۔

☆☆☆

ملکانی سائیں کے کہنے کے عین مطابق اس رات دیر ہو جانے کی وجہ سے میران نے گھر جانے کے بجائے شہر والے فلیٹ پر ہی رکنے کا جو فیصلہ کیا تو اب تک وہیں موجود تھا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ ملکانی سائیں کا بہت فرماں بردار بیٹا تھا بلکہ بات تو دراصل یہ تھی کہ وہ فرماں برداری بھی اپنی مرضی سے ہی کیا کرتا تھا۔ جو بات اسے اچھی اور قابل عمل لگتی اسے مان لیا کرتا جبکہ جو بات اچھی نہ لگتی وہ ملکانی سائیں کو اس کی ماننی پڑتی۔
سو اس دفعہ بھی اگر وہ رات شہر ہی میں رک گیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ ملکانی سائیں کی طرح راستے کی ویرانی سے اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے ڈر گیا تھا بلکہ اسے دوسرے روز اخبار میں تفصیلی خبر چھپوانے کا انتظام کرنا تھا۔
یوں بھی اخبار مالکان کے مقرر کردہ عہدیدار عموماً اس قسم کی خبریں چھاپنے کے لیے کسی بھی قسم کی تحقیق یا چھان بین کر کے حقائق کی بنیاد پر کام کرنے کا تردد نہیں کیا کرتے بلکہ انہیں تو محض فرسٹ پیج، لاسٹ پیج پر مقام اور سطروں کے تعداد کے مطابق اپنے چارجز سے غرض ہوتی ہے اور بس۔ ہاں البتہ بعد میں اگر کوئی باقاعدہ ثبوت کے ساتھ ان کی خبر کو جھوٹا قرار دے کر اخباری دفتر جا پہنچے تو کہیں کسی کونے میں چھوٹی سی تردید لگا کر خود کو بری الذمہ سمجھتے ہوئے یہ امر یکسر فراموش کر جاتے ہیں کہ اس خبر سے ملحقہ افراد کی زندگی پر کیسے تاثرات مرتب ہوئے۔
دوستوں کا وہی ٹولہ جو یونیورسٹی میں اس کے چیلوں کا کام کیا کرتا، فلیٹ میں بھی شاہ جی، شاہ جی کہتے ہوئے ہر طرح کی آسائشوں سے مکمل طور پر لطف اندوز ہو رہا تھا۔
نہ صرف یہ بلکہ میران کی خواہش کے عین مطابق ندی اور اس کے گروپ کے تمام تاثرات بمعہ اپنے ایڈیشن بتا کر وہ یہ بھی ثابت کر رہے تھے کہ ان کا تیر عین نشانے پر لگا ہے۔ اور یہی بات میران کے لیے یقینی طور پر باعث تسکین بھی تھی کیونکہ ندی نے جس طرح اسے تیسری جنس کہا تھا وہ اس کی غیرت پر کھلا طمانچہ تھا۔ اور انہی لفظوں کا انتقام لینے کے لیے وہ چاہتا تھا کہ جس طرح یونیورسٹی میں ندی کے کمنٹس سن کر سب نے سرگوشیاں اور چہ میگوئیاں کی تھیں اس سے کہیں بڑھ کر اب ندی کو لوگوں کے طعنے اور بھانت بھانت کی باتیں سننے کو ملیں تب اسے سکون آئے، قرار آئے اور بھٹکتی سوچوں کو منزل ملے۔ کیوں کہ اس رات ایڈمیشن کینسل ہونے کا وقت گویا اس نے کانٹوں پر گزارا تھا۔ اور اب وہ چاہتا تھا کہ ہر لمحہ چبھنے والی کانٹوں کی چبھن بمعہ سود ندی کو لوٹا کر حساب چکتا کر دے۔

☆☆☆

"بہت برا ہوا ہے یہ سب۔"
شاہ زین کی زبانی میران کے ردعمل کے بارے میں جان کر اماں بہت پریشان ہو گئی تھیں۔ ثمینہ بھی کل کے لیے کپڑے پریس کرنا چھوڑ کر اُس کے پاس آ بیٹھی تھی۔
"کسی لڑکی کے ساتھ اس طرح اخباروں میں نام اچھلنا تو شریف اور باکردار لڑکوں کے لیے بھی گالی تصور کیا جاتا ہے، گُجا اُس معصوم بچی کی تصویر تک چھپوا دی۔"
ندرت کے لیے اماں ثمینہ جیسا درد اور پیار محسوس کر رہی تھیں۔
"بھائی اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔"
"تمہاری بات کا بھی برا مان سکتا ہوں کیا؟"
"نہیں وہ۔۔۔" لفظوں کے آگے ہچکچاہٹ کی باڑھ در آئی تھی۔
"ہاں بولو کیا بات ہے؟"
"وہ بھائی میں سوچ رہی تھی کہ اگر یونیورسٹی میں اس طرح کی پرابلمز تھیں اور چاہے نہ بھی ہوتیں مگر آپی کو آپ کے ساتھ ذرا احتیاط۔۔۔ میرا مطلب ہے ریزرو رہنا چاہیے تھا۔ تاکہ کسی کو کچھ بھی کہنے کا موقع ہی نہ ملتا۔"
شاہ زین نے چونکہ ندرت سے متعلق ہر بات اس کے بی ہیویر سے لے کر فرینڈلنس تک اماں سے ڈسکس کی تھی اسی لیے ثمینہ نے جھجکتے ہوئے اپنی سوچ کا بڑی ایمان داری سے اظہار کر دیا تھا۔
"میں تمہاری بات سے ضرور انگری (agree) کرتا اگر وہ صرف میرے ساتھ فرینک ہوتی لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ میں تو مرد ہونے کے باوجود ہمیشہ اس کے ساتھ محتاط رویہ اختیار کیے رہتا تا کہ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے لیکن اماں۔۔۔!"
اس نے اماں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے تھے۔
"اُن کے گھر میں یہ سب باتیں قابل اعتراض نہیں ہیں ورنہ وہ اکمل یا زبیر کے ساتھ بھی ریزرو رہتی، بلکہ اپنے گھر والوں کے سامنے بھی اُن کے ساتھ اوٹ پٹانگ شرارتیں کرتی رہتی ہے۔"
"لیکن اب ہوگا کیا؟" ثمینہ پریشانی میں ہاتھ مسلتی ہوئی بولی۔
"شیرانی صاحب نے آج سے اپنی دونوں

بیٹیوں کی ٹیوشن سے بھی منع کر دیا ہے۔۔۔ یقیناً دوسرے ٹیوشنز پر بھی یہ بات اثر انداز ہوگی۔"

شاہ زین نے گہری سانس لی تھی۔

بہت سارے دکھ ایک ساتھ کنڈلی مارے سانپ کی طرح ذہن میں براجمان ہو رہے تھے۔ کئی خواب چکنا چور ہونے کو تھے۔۔۔

سوچا تو اس نے یہ تھا کہ فائنل ایگزیم کے بعد ڈگری ملنے پر اچھی نوکری مل جائے گی تو ندرت کے گھر والوں سے بات کرے گا۔ لیکن اب تو فائنل ایگزیم دینا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔ کیوں کہ وہی ٹیوشنز جن سے وہ نہ صرف گھر کے اخراجات چلا رہا تھا بلکہ اپنے تعلیمی خرچ بھی پورے کر رہا تھا اب وہی آسرا ساتھ چھوڑنے کو تھا۔

اور سب سے بڑھ کر ندرت کی ذات پر اڑائے گئے کیچڑ کا دکھ اسے مارے ڈال رہا تھا جو اپنی طرح سب کو صاف دل کا سمجھتی تھی۔ آج جانے اس پر کیا بیت رہی ہوگی۔

ویسے بھی وہ آج یونیورسٹی میں پریشان اور مضطرب تھی۔ یہ بات ندرت باوجود اپنی شان دار اداکاری کے شاہ زین سے چھپا نہیں پائی تھی۔ یوں بھی اس کی رسائی ندرت کی آنکھوں سے لے کر اس کے ذہن اور دل تک تھی۔ جبھی تو وہ اکثر بن کہے اس کے احساسات سمجھ لیا کرتا اور چوری پکڑے جانے پر ندی کے ہاتھوں "کتابوں" کے وار سہتا۔

اُس کے بارے میں سوچتے ہوئے بے اختیار شاہ زین کا دل اس سے بات کرنے کو چاہا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ خود کو اکیلا ہرگز نہ سمجھے ہر طرح کے اچھے برے وقت میں وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہے۔

یہی خیال آتے ہی اُس نے موبائل لیا اور برآمدے میں آ گیا۔ فون کر کے وہ ندی کو اپنے ساتھ کی یقین دہانی تو کروانا چاہتا تھا مگر یہ احساس بھی باعثِ تقویت تھا کہ اس کے گھر والے کسی بھی موڑ پر ندرت کا سب سے بڑا سہارا اور دنیا کی چبھتی نظروں یا طنزیہ جملوں کے آگے ایک ایسی مضبوط دیوار ہیں جس کی اینٹ اینٹ میں گارے اور مٹی کی جگہ اعتبار، محبت، یقین کا استعمال کیا گیا ہے۔

☆☆☆

تہمتیں تو لگتی ہیں
روشنی کی خواہش میں
گھر سے باہر آنے کی کچھ سزا تو ملتی ہے
لوگ، لوگ ہوتے ہیں
ان کو کیا خبر جاناں
آپ کے ارادوں کی خوب صورت آنکھوں میں
بننے والے خوابوں کے رنگ کیسے ہوتے ہیں
دل کی گود آنگن میں پلنے والی باتوں کے
زخم کیسے ہوتے ہیں
کتنے گہرے ہوتے ہیں
کب یہ سوچ سکتے ہیں
ایسی بے گناہ آنکھیں
گھر کے کونوں کھدروں میں چھپ کے کتنا روتی ہیں
پھر بھی ہر کہانی سے
اپنی کج بیانی سے
اس قدر روانی سے
داستاں سناتے ہیں
اور یقین کی آنکھیں
سچ کے غم زدہ دل سے لگ کے رونے لگتی ہیں
تہمتیں تو لگتی ہیں
روشنی کی خواہش میں
تہمتوں کے لگنے سے
دل سے دوست کو جاناں
اب نڈھال کیا کرنا
تہمتوں سے کیا ڈرنا
تہمتیں تو لگتی ہیں

شیکسپیئر کہتا ہے کہ انسان برف کی مانند صاف شفاف اور بے داغ ہو پھر بھی تہمت سے نہیں ن[illegible] سکتا۔ اور یہی کچھ ندی کے ساتھ ہوا تھا۔ خیر باہر [illegible] کچھ ہوا سو ہوا مگر گھر میں امی، بابا کے علاوہ باقی سب [illegible] رویہ اب تک اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب وہ ان کے سامنے بیٹھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھی۔

ویسے بھی بلاشبہ والدین کی مثال اس شجر سایہ دار کی سی ہوتی ہے جہاں تھکے ہارے، بھٹکتے تپتی جھلسی دھوپ اور گرم ہواؤں کے تھپیڑوں سے بچ کر ٹیک لگا کر جب بھی بیٹھیں ساری تھکان دور ہو جاتی ہے۔

حالیہ انٹرنیشنل سائیکولوجیکل سروے میں یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ڈپریشن کے وہ مریض جنہیں دن کا کچھ حصہ اپنے والدین کے ساتھ گزارنے دیا گیا دوسرے مریضوں کی نسبت جلدی روبہ صحت ہوئے۔

میران سے اول روز الجھنے کے واقعے سے لے کر آج تک ہونے والی ہر بات اس نے بنا آنسوؤں کی شدت کو روکے امی اور بابا کے گوش گزار کی، گو کہ وہ روزانہ انہیں ہر بات تفصیل سے بتایا کرتی تھی مگر اس معاملے میں ندی کا خیال تھا کہ دونوں خوامخواہ پریشان ہو جائیں گے۔ اسی لیے پہلے روز بتائی گئی مختصر سی بات پر ان کا ردِ عمل دیکھ کر اس نے آئندہ کے لیے اس ذکر کو گول کرنے کا سوچا۔ البتہ شاہ زین کے متعلق وہ امی کو آگاہ کر چکی تھی۔ روز ہونے والے چھوٹے موٹے واقعات اور نئے نئے چٹکلے بھی وہ پولیس کے روزنامچے کی طرح روزانہ کی بنیاد پر اُن کے سامنے ڈسکس کرتی تھی مگر شاہ زین کے ساتھ اس کے تعلق کو غلط رنگ دے کر دنیا بھر کے سامنے اچھالے جانا ان کے لیے یقیناً اذیت کا باعث بن رہا تھا اور اپنی شہزادیوں سی بیٹی کا یوں رونا بابا کے دل کو دہلائے دے رہا تھا۔

"میں۔۔۔ شاید تمہارا گناہ گار ہوں۔"

آنسوؤں کو بمشکل آنکھوں کے بجائے حلق کی جانب منتقل کرتے ہوئے بابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ نا سمجھی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ گردن دائیں سے بائیں حرکت کرتے ہوئے ان کے الفاظ کی نفی کر رہی تھی۔

"ہاں بیٹا۔۔۔! شاید میں تمہارا مقدمہ ناصر کے سامنے صحیح طریقے سے لڑ نہیں سکا، ورنہ اس کی اتنی ہمت نہ ہوتی کہ۔۔۔ میرے سامنے۔۔۔ میرے ہوتے ہوئے۔۔۔ وہ تمہیں یوں۔۔۔" مزید ان سے بولا نہیں گیا تھا کہ گلا رندھ گیا، لگتا تھا جیسے گلے میں کوئی پھانس تھی۔۔۔ جیسے کوئی چیز گلے میں اٹک گئی ہو اور اس کا نگلنا مشکل ہو رہا ہو۔ تیز دھار آلہ انہیں شاید اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا۔

بعض اوقات زندگی میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب غیر حاضر، ان دیکھی اشیاء، اچانک پیدا ہونے والی غیر یقینی صورت حال اچھے خاصے مضبوط اعصاب کے مالک کو بھی اتنا بے بس اور لاچار بنا دیتی ہے کہ انسان خود اپنی ذات کے اڑتے بکھرتے پرزوں کو بھی یکجا کرنے کی کوشش میں ہانپنے لگتا ہے۔

بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے بابا کی سانسوں کی غیر معمولی آمد و رفت، نتھنوں کی ہلکی سی پھڑپھڑاہٹ اور لاشعوری طور پر آنکھیں میچنے کی کوشش اُن کے اندر ہوتی تباہی کے آثار سے بخوبی آگاہ کر رہی تھی۔

"نہیں بابا! ایسا نہ کہیں۔۔۔ اور اپنے دل سے حالیہ واقعات سے متعلق ہر وہم نکال دیں۔۔۔ کیا قسمت سے بھی کوئی لڑ سکا ہے؟ یہ سب میرا نصیب تھا اور مجھے مل کر ہی رہنا تھا۔" چند ہی گھنٹوں میں وہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ سنجیدہ اور مدبر لگی تھی بابا کو۔ جس کے چہرے پر خزاں کا کوئی موسم ٹھہر سا گیا تھا۔ بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں دکھ ہی تھا اور اتنا دکھ تھا کہ ان کی شفافیت ماند پڑ گئی تھی اور پھر بابا کے لیے اس سے بڑھ کر تکلیف دہ لمحہ بھلا اور کون سا ہوتا جب ان کی لاڈوں پلی بیٹی کی آنکھیں رونے کی شدت سے سوجن کا شکار ہو چکی تھیں۔ سرخی مائل گالوں پر آنسو آبشار کی طرح پھسل پھسل کر اس کی گود تک بھگو رہے تھے۔ لمحہ بھر اس کو یوں دیکھا تو لاکھ ضبط کے باوجود گرم گرم آنسو جو رخسار پر گرے تو پھر گرتے ہی چلے گئے۔

بخار کی شدت میں بھی لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔

بابا کی یہ حالت دیکھ کر چند لمحے تو امی حسرت و یاس کی تصویر بنے انہیں دیکھتی رہیں۔ ذہن کچھ بھی

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری، مفلوج ہوا محض دل کے سہارے پر تھا اور دل وہ جو شاید آنکھ بنا آنسو بہا رہا تھا۔

"اور پھر۔۔۔۔"

ندی نے کچھ کہنے کے لیے گھٹنوں پر رکھی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر بابا کو دیکھا تو ان کا سرخ چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس کے لیے بابا کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا زندگی کا پہلا موقع تھا۔ ریت کی عمارت کی مانند شکستہ نظر آنے والے بابا اس کے ہیں یہ حقیقت تسلیم کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ اُسی لمحے بابا نے آنکھیں کھولیں اور اُسے یوں اپنی طرف دیکھتا پا کر فوراً آنسو پونچھ کر امی سے پانی کے لیے کہا تو وہ سوالیہ نظریں لیے انہیں ہی دیکھتی رہی۔

"اپنے بابا کو کمزور نہ سمجھنا، اپنی بیٹی کے لیے دنیا کی ہر طاقت سے لڑنے کا حوصلہ ہے مجھ میں، اور تم دیکھنا۔۔۔" امی سے گلاس لے کر چند گھونٹ پانی کے حلق میں اتارنے کے بعد وہ دوبارہ بولے۔ "ناصر نے تمہارے بجائے دنیا والوں کی جھوٹی باتوں کا اعتبار کیا ہے نا۔۔۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔۔۔ بلکہ۔۔۔ بلکہ شکل نہیں دیکھوں گا کبھی اس کی۔"

"اسی بات کا تو دکھ ہے۔۔۔ کہ وہ مجھ سے ایک بار کچھ پوچھتے تو سہی، میری بات تو سنتے، مگر۔۔۔" بابا کی خشک آنکھیں دیکھ کر ایک بار پھر وہ بولی مگر اب خود اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ اعتبار کا ماتم کرتے کرتے اب اس کی آنکھوں میں محض ویرانیت تھی اور بس۔۔۔ مگر جیسے ہی وہ ناصر بھائی کا نام لینے لگی بنجر آنکھیں ایک بار پھر بھیگنے لگی ہی تھیں کہ امی نے اسے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔

یوں بھی جب کسی بھی گھر پر مشکل کی گھڑی آئے تو فیملی ممبرز میں سے کوئی ایک ایسا ضرور ہوتا ہے جو اپنا دکھ اور کرب دل میں دبا کر دوسروں کو تسلی دیتا ہے اور انہیں سہارا دینے کے لیے آگے بڑھ کر سر پر ہاتھ رکھتا اور گلے لگاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ایک ہی بیڈ پر موجود ان تینوں کے ہی دل و ذہن آندھیوں کی زد میں تھے پھر بھی امی نے ہمت کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑیں اور آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں بے آواز روتی اور اپنے گلابی ہونٹوں کو بڑی بے رحمی سے دانتوں سے کچلتی ندی کو گلے لگا کر اس کے سر پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے لگیں۔ ندی، جسے اپنے ساتھ یہ سب ہونے کا دکھ تو تھا ہی مگر اس سے کہیں زیادہ دکھ اسے بابا کو یوں دیکھ کر ہو رہا تھا۔ جن کے چہرے پر سنجیدگی، کرب اور ضبط کا ملاپ اس کے لیے انتہائی دردناک تھا۔ ناصر بھائی کے سامنے یوں سر جھکائے، کمزور سے لہجے میں اس کے دفاع کرتے بابا اور غضب ناک ہوتے ناصر بھائی کا جارحانہ اور اتنا غیر متوقع رویہ اسے اندر ہی اندر گویا کاٹ رہا تھا۔

ماں کی گود کی گرمی محسوس ہوئی تو ایک بار پھر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ندی۔۔۔! میری جان، اگر تمہارے رونے سے مسئلہ حل ہو سکتا تو ہم بھی تمہارے ساتھ مل کر رو لیتے نا۔"

"امی آج۔۔۔ میں اکیلی ہو گئی ہوں۔۔۔ بالکل اکیلی۔"

اس کی بات پر بابا نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"یعنی ہم بڈھا بڈھی تمہارے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے؟"

بابا نے حتی الامکان لہجے کو مضبوط اور خوش گوار بناتے ہوئے کہا تو وہ فوراً اُن کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر ہچکیاں لے کر رونے لگی، شہزادیوں سی آن بان اور مزاج والی ان کی لاڈوں پلی بیٹی آج کس قدر آنسو بہا رہی تھی۔۔۔ یہ بات گویا ان کا سینہ چیرنے کو کافی تھی۔

"نہیں بابا۔۔۔! آپ دونوں ہی تو میرا سب کچھ ہیں، میری دنیا تو آپ دونوں کے دم سے ہی آباد ہے نا، آپ کے بغیر۔۔۔ میرا کوئی نہیں ہے۔۔۔ کوئی بھی نہیں۔"

ضبط کا آتش فشاں پھٹ چکا تھا اور لاوا آنسوؤں کی صورت رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"تو بس پھر اب چپ کرو۔۔۔ مزید مت رونا اب۔"

"جی بابا! اب نہیں روؤں۔۔۔" جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

"یا ایسا کرو، اگر ضرور رونا ہی ہے تو کل رو لینا، لیکن۔۔۔" چند لمحے رک کر بابا نے اپنی سانس بحال کی تھی۔

"ادھر دیکھو۔۔۔"

ندرت کے ساتھ امی نے بھی ان کے زرد چہرے کی طرف دیکھا۔

"صرف آخری دفعہ۔۔۔ سمجھیں؟"

ہتھیلی کی پشت سے ندرت نے لمحہ بھر میں آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"نہیں بابا! نہ ابھی نہ کل، بہت رو لیا میں نے اب اور نہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" بابا نے دھیمی آواز میں اسے سراہا۔

"اور ویسے بھی امی جنہیں ہمارے رونے کی کوئی پروا ہی نہیں ہے اُن کے لیے رو رو کر خود کو اور اپنے پیاروں کو ہلکان کرنے کا کیا فائدہ۔۔۔ ہمارے آنسو جن کے دل پر گرتے ہیں انہیں تکلیف نہیں دینی چاہیے۔ ہے نا بابا؟"

بابا نے اس کی بات کے جواب میں محض گردن ہلانے پر اکتفا کیا تو ندرت ان کے پاؤں دبانے لگی۔ اپنے اعتبار کا ماتم کرتے کرتے اسے اچانک ہی یہ خیال آیا تھا کہ اس واقعے کی وجہ سے وہ دونوں اُس سے کہیں زیادہ پریشان ہوں گے اور بجائے اس کے کہ وہ ان دونوں کو تسلی دے یا ہمت دلائے خود انہیں اسے سنبھالنا پڑ رہا ہے۔ بس یہ سوچتے ہی اُس نے اُن دونوں کے سامنے خود کو مضبوط ظاہر کرنا چاہا تھا۔

☆☆☆

میرے ساتھ چلنے والے تیری جستجو کے صدقے
بڑی سخت منزلیں ہیں کہیں تھک کے رک نہ جانا

عائشہ کے باآواز بلند شعر پڑھنے پر ناصر بھائی نے چونک کر دیکھا۔ انداز نا سمجھنے والا اور سوالیہ تھا۔

"میسج سینڈنگ فیل۔۔۔ ہونہہ!"

عائشہ نے موبائل ناصر کی طرف بڑھاتے ہوئے نخوت کا اظہار کیا تھا مگر ناصر نے موبائل تھامنے کے بجائے بے رخی سے رخ موڑ لیا کہ جب سے وہ لاؤنج میں صوفے پر رکھے ندرت کے شولڈر بیگ میں سے آئی میسج بیپ سن کر موبائل نکال کر لائی تھی تب سے اس کا ایک ایک حصہ کھنگال رہی تھی۔ پہلے تو صبا کا میسج تھا اور اس کے بعد اب اس میسج کی ڈلیوری رپورٹ تھی جو اس نے پوائنٹ میں بیٹھے بیٹھے شاہ زین کو کیا تھا مگر نیٹ ورک پرابلم کی وجہ سے اُس تک پہنچ نہیں پایا۔ اور اب اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر موبائل اپنی الماری میں رکھتی اس کی وائبریشن پر فوراً متوجہ ہوئی کہ بیل تو وہ پہلے ہی آف کر چکی تھی۔ سامنے شاہ زین کا نام نظر آتے ہوئے اس نے ابرو چڑھاتے ہوئے پہلے ناصر کو بتایا اور پھر اس کی ہدایت کے عین مطابق فون ریسیو کیا۔

"ہیلو"

"جی کون؟" برآمدے میں موجود اماں کے مخصوص تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے شاہ زین اس غیر مانوس آواز پر چونک کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"ندرت!"

"ندرت۔۔۔؟" اُسے حیرت ہوئی تھی کیوں کہ ندرت ہمیشہ فون ریسیو کرنے پر السلام علیکم کہا کرتی اور پھر اس کی آواز کو تو وہ لاکھوں میں بھی پہچان لیتا۔ اسی لیے رابطہ منقطع کر کے دوبارہ نمبر ملانے کا سوچا۔

"سوری شاید غلط نمبر مل گیا ہے۔"

"تم شاہ زین ہی ہو نا؟" اپنے بھائی کے مقابل اس انسان سے وہ جلد از جلد ملنا بھی چاہتی تھی۔

"جی ہاں۔"

"تو یہی تو میں کہہ رہی تھی کہ ندرت سے بات کرنی ہے؟"

شاہ زین اُن کی بات کے گھماؤ پھراؤ سے الجھنے لگا تھا۔

"میں عائشہ ہوں، ندرت کی بھابھی۔"

"اوہ اچھا، السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔۔۔! ایسا ہے کہ ندرت تو ابھی کچھ مہمانوں کے ساتھ بزی ہے لیکن ہم تم سے ملنا چاہتے ہیں اگر تمہارے پاس ٹائم ہو تو۔۔۔" لہجے کا تیکھا پن بلاشبہ اپنے عروج پر تھا۔

"جی۔۔۔ مجھ سے؟"

"ہاں ہم تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں اگر ابھی آجاؤ تو اچھا ہے۔"

"لیکن اتفاق سے مجھے آپ کے گھر کا نمبر وغیرہ معلوم نہیں ہے۔"

"تو ایسا ہے نا کہ تم شوبی ریسٹورنٹ پر آجاؤ، گھر پر ویسے بھی امی، بابا کے پاس مہمان بیٹھے ہیں، ہم بھی وہیں آجاتے ہیں۔"

"چلیں ٹھیک ہے میں آتا ہوں۔"

وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ گفتگو اور اس کے بعد ملاقات کس تناظر میں ہے۔ آج صبح کے بعد وہ یہ سب اس طرح ہونے کی توقع نہیں کر پا رہا تھا۔ طرح طرح کی مختلف سوچیں، واہمے اور خدشات اسے چاروں طرف سے گھیرنے لگے تھے، اور یوں بھی جب بہت ساری سوچیں انسان کو گارے مٹی کی طرح اوڑھنے لگتی ہیں تو وہ روزن مانگتی ہیں۔ جبھی اٹھنے سے پہلے اُس نے ایک بار پھر ندرت کو فون کرنے کا سوچا مگر پھر اس کے مصروف ہونے کا خیال دل میں آتے ہی ارادہ بدل دیا۔ اور اماں کو ساری بات سے آگاہ کرنے کے بعد صحن کی دیوار کے ساتھ کھڑی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور شوبی ریسٹورنٹ کی جانب بڑھنے لگا۔

☆☆☆

"دیکھیں آپ ذرا دھیمے لہجے میں بات کریں تو بہتر ہوگا۔ یوں بھی میرے خیال میں آپ کافی ... ہوئی نیچر کے ہیں۔"

اپنی آواز اور لہجے کو حتی المقدور نرم رکھتے ہو... شاہ زین نے ناصر بھائی کو بھی ٹھنڈا کرنا چاہا تھا جو... مبالغہ لاوا اُگل رہے تھے۔ نہ صرف وہ بلکہ ثروت ... کے الفاظ بھی زہر میں بجھے نشتروں سے کم نہ تھے۔

"تمہاری بہن کی تصویریں یوں اخباروں میں ... معلوم ہو کہ اچھے اچھوں کی سلجھی ہوئی نیچر کیسے الجھ ... جاتی ہے۔"

ندرت کی باتوں سے اُس کے گھر والوں کا ... گیا خیالی ہیولا شاہ زین کے دماغ میں بکھرنے ... تھا۔

"اب تو جو ہوا سو ہوا، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ... سے نہیں وہ پچھلے دو ڈھائی سالوں سے میرے ... سے منسوب ہے اور اب بس چند ہی دنوں میں وہ ا... کے ساتھ بیاہی جائے گی، فائنل ایگزیم بھی مشکل ... ہے کہ دے۔"

"اکمل۔۔۔!" اس نام سے شاہ زین کے ذ... میں ایک زوردار جھماکا ہوا تھا۔

اُس رات دیر تک فون بزی رہنے کی وجہ ... ندرت نے اکمل ہی بتائی تھی اور ابھی دو دن پہلے رات کو وہی اس کو لینے بھی آیا تھا۔

کسرتی بدن کا حامل لانبا چوڑا اکمل جسے دیکھ... ہی اس کے فوجی ہونے کا پتا چلتا تھا اور پھر ا... اوقات ندرت اپنی اور اس کی شرارتوں کے احوال ... بڑے مزے سے اُس کے ساتھ شیئر کرتی۔

"تمہیں یہاں بلانے کا مقصد صرف یہی سمجھا... تھا کہ جو کچھ گل تم کھلا چکے ہو وہ کافی ہیں۔ اب ا... پودے کو مزید پانی دینے کی جرأت نہ کرنا۔" نا... بھائی نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھ... ہوئے گویا دھمکی دی تھی۔

"دیکھیے آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں ایسا..." منتشر ہوتے خیالات کے ہجوم سے حواسوں کو بڑ... مشکل سے بحال رکھنے کے بعد اس نے معاملہ کلیئر کرنا چاہا تھا۔

"غلط اور صحیح کا فرق سکھنے نہیں آئے ہیں یہاں، بس تمہیں جو سمجھانا تھا سمجھا لیا آگے کے نتائج کے ذمہ دار تم خود ہی ہوگے۔" ثروت آپا نے ہاتھ اور منہ کے تاثرات سے اسے جانے کو کہا تھا۔

"وہ تو میرا بھائی ہی ہے جو اسے اپنا لے گا ورنہ تو لوگ داغ لگے پھل کی طرف بھی نہیں دیکھتے، کجا تمام عمر کا ساتھی۔"

عائشہ کی بات سننے کے بعد وہ رکا نہیں تھا۔ دھواں دھواں ہوتے چہرے پر ساری کہانی لکھی صاف نظر آرہی تھی، سو یوں ہی بلا مقصد ویران سڑکوں پر بائیک لیے گھومتا رہا۔

"کیا یہ سب درست تھا جو ان تینوں نے کہا؟"

ذہن اور دل دونوں کسی صورت اُن کی باتوں کی تائید کرنے پر راضی نہ تھے کہ ندرت کے معصوم چہرے پر لکھی ہر تحریر کا نقش اس کی آنکھوں میں ابھی تک قائم تھا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ اعتبار ابھی موجود تھا جو اُسے ندرت کی ذات پر تھا۔ جبھی کچھ سوچ کر موٹر سائیکل ایک ٹی اسٹال کے سامنے روکی جو شاید کچھ دیر پہلے تک نوجوانوں کے لیے دیسی بیٹھک کا کام دیتا ہو مگر اب لکڑی کے دروازے پر لگا تالا قرب و جوار میں موجود درختوں کی طرح اسے بھی پراسرار بنا رہا تھا۔

آمنے سامنے رکھی لکڑی کی مقفل بینچوں میں سے ایک پر بیٹھ کر اس نے جیب سے موبائل نکالا اور ندرت کے پہلے میسج سے لے کر اب تک کے تمام میسجز پڑھتے ہوئے ایک بار پھر میسج ٹائپ کرنے لگا۔

☆☆☆

بچھڑنے کا ارادہ ہو تو مجھ سے مشورہ کرنا
محبت میں کوئی بھی فیصلہ ذاتی نہیں ہوتا

مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دینے کے دوران میسج کی بیپ پر عائشہ نے فوراً شعر پڑھ کر اُن دونوں کو سنایا تو ناصر کی رگیں تن گئیں، ثروت آپا نے بھی گاڑی سے باہر دیکھنے کو ترجیح دی تھی۔ یوں بھی شاہ زین کا میسج کرنا حسبِ توقع تھا اسی لیے پہلے سے ٹائپ شدہ میسج کو send کرنے میں عائشہ نے لمحہ بھر دیر نہیں لگائی تھی کہ اُن دونوں کے درمیان ہونے والے میسجز کے تبادلے کے ساتھ ساتھ صبا اور زبیر کے میسجز سے ساری کہانی اُن کے سامنے آگئی تھی کہ دونوں میں دوستی کی ابتدا کس طرح ہوئی اور یہی بات عائشہ کو مزید تیار رہی تھی کیوں کہ اکمل کو چھوڑ کر ندرت کا کسی اور کی طرف متوجہ ہونا جبکہ گھر والوں کا بھی اس طرف نمایاں جھکاؤ ہو، عائشہ کے لیے ہرگز قابلِ معافی فعل نہیں تھا۔ جبھی اُن تینوں کا خیال تھا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر ندرت کی شادی کر دی جائے اور ابھی یہی بات انہیں گھر جا کر امی بابا کو بھی بتانی تھی۔

☆☆☆

رات گئے جب وہ تینوں گھر لوٹے تو مین گیٹ بند کرنے کے بعد لان عبور کر کے گھر کے اندر قدم رکھنے کی ہمت تینوں کی جواب دے گئی تھی۔ چند لمحے ناسمجھی کی کیفیت میں وہیں کھڑے منجمد اعصاب کے ساتھ ایک دوسرے کو بس دیکھے ہی گئے۔ لگتا تھا حواس جیسے سو گئے ہیں۔ ایک پل کے لیے ناصر کو لگا جیسے وہ غلطی سے کسی اور گھر کا دروازہ کھولے اندر آگئے ہیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے ندرت کی دل ہلا دینے والی رقت آمیز آواز نے انہیں جگا دیا۔

ذہن و دل میں آنے والے مختلف واہموں کو جھٹکتے ہوئے کوریڈور اور پھر لاؤنج عبور کرنے کے بعد وہ جیسے ہی امی بابا کے کمرے تک پہنچے، چوکھٹ پر ہی شیشہ بنے کھڑے رہ گئے۔

چہرے پر ازلی سکون لیے رات کے اس پہر بابا انہیں بڑی خاموشی سے چھوڑ کر چلے گئے۔ ندرت اُن سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی تو امی پر سکتہ طاری تھا۔

صبح اخبار گھر میں آنے سے اب تک وہ بہت براشت کر رہی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو آنے لگتے تو فوراً ہی بڑی بے دردی سے دوپٹے سے مسل دیتیں اور شاید اب شوہر کے جانے سے ان کا ضبط جواب دے

گیا تھا مگر پھر بھی آنسو نہ بہے بلکہ آنکھیں پتھرا گئیں۔
یک ٹک بابا کو دیکھتے ہوئے اُن کی حالت دیکھ کر ڈر لگنے لگا تھا۔ ندرت کبھی انہیں جھنجھوڑتی تو کبھی بابا سے چھوڑ کر نہ جانے کی فریاد کرنے لگتی۔
خود ثروت آپا اور ناصر بھائی کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ عائشہ فوراً امی کا سکتہ توڑنے کی کوشش کرنے لگی تو ناصر بھائی بابا کے پاؤں پکڑ کر بڑی شدت سے رو دیے۔ ثروت آپا کے بین گویا گھر کے درو بام ہلائے دے رہے تھے۔
کل تک جو گھر ہنستا بستا اور خوشیوں کا گہوارہ تھا آج کچھ الگ ہی منظر پیش کر رہا تھا۔ لگنے والی نظر لگ چکی تھی۔ کان کے نیچے لگائے کاجل یا سیدھا ہاتھوں پر پہنائی گئی کالی بریسلیٹ کچھ کام نہ آسکی تھی۔
امی، بابا کی برسوں پرانی پروئی گئی تسبیح کے دانے بس اب بکھرنے کو تھے۔

☆☆☆

شاہ زین رات دیر سے گھر لوٹا تو ثمینہ اور اماں بڑی بے تابی سے اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ انہیں کچھ بھی بتائے بغیر سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ثمینہ نے کچھ پوچھنا چاہا تو اماں نے اسے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ یوں بھی وہ کبھی بھی کسی بات کی کھوج نہیں لگاتی تھیں بلکہ شاہ زین یا ثمینہ کو پورا وقت دیتیں کہ ان کے کچھ بھی دریافت کرنے سے پہلے وہ خود ساری بات اُن کے گوش گزار کر دیتے۔
"بھائی یونیورسٹی نہیں جانا کیا؟ دیکھیں کیا ٹائم ہو رہا ہے، جلدی اٹھیں۔"
ثمینہ کے جگانے پر شاہ زین نے کروٹ موڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔
"بھائی آپ۔۔۔؟" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔
"تم چلو میں بس ہاتھ منہ دھو کر آتا ہوں۔" شاہ زین نے کسلمندی سے انگڑائی لیتے ہوئے کہا تو خاموشی سے کچن کی طرف چلی گئی۔

شاہ زین نے اس کے جاتے ہی ایک بار موبائل دیکھا، گمان غالب تھا کہ شاید ندرت کی طرف سے کوئی رابطہ ہوا ہو، لیکن گمان گمان ہی رہا۔۔۔
سیدھے لیٹتے ہوئے خالی نظروں سے اب چھت پر لگے پنکھے کی جانب دیکھے چلا جا رہا تھا۔ جس کے پر ایک دوسرے ہی کے لیے بنے ہیں۔ ایک دوجے کے بغیر جن کا نہ تو کوئی وجود ہے نہ ہی پہچان، مگر سچ تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کو پانے کی خواہش میں تمام تر توانائی خرچ کرنے کے باوجود دوری ہی اُن کا مقدر بنی رہتی ہے کہ ساتھ رہ کر بھی اُن کے درمیان قائم فاصلے کو ختم نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ لاحاصل سفر ان کے ناکارہ ہونے تک اسی جدوجہد اور امید کے ساتھ جاری و ساری رہتا ہے۔
"بھائی آجائیں نا ورنہ دیر ہو جائے گی۔"
ثمینہ نے کچن سے ہی آواز لگائی تو اس کے خیالوں کی تان ٹوٹی۔ گہری سانس لے کر نہ چاہتے ہوئے سلیپرز پاؤں میں اڑس کر فریش ہونے کے بعد وہ کچن میں پہنچا تو اماں اور ثمینہ اس کے انتظار میں تھیں۔ اسے دیکھ کر ثمینہ نے فوراً چائے چولہے پر رکھی اور دیوار کے ساتھ رکھے ٹیبل پر سے ہاٹ پاٹ اٹھا کر شیلف پر منتقل کرنے کے بعد ٹیبل موڑھے پر بیٹھے شاہ زین کے آگے لا رکھی جس کے ہاتھ میں خلافِ معمول آج موبائل بھی موجود تھا۔
آنکھیں رت جگے کا پتا دے رہی تھیں تو چہرے کی اداسی دل کے بوجھل پن کی خبر بنا پوچھے بتانے کو تیار معلوم ہو رہی تھیں۔
اماں نے نظر بھر کر شاہ زین کو دیکھا جو بچپن میں انتہائی خوش مزاج ہونے کے باوجود والد کی وفات کے بعد یوں سنجیدہ ہوا کہ پھر کسی نے اسے شرارت کرتے یا ہنستے نہ دیکھا۔ اب کئی سالوں بعد وہ خوش تھیں کہ اس کے اندر ایک بار پھر وہی زندہ دل شاہ زین بے دار ہونے لگا ہے مگر اب شاید ایسا نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر پہلے کی طرح قہقہے لگاتا اپنے ہم عمر لڑکوں کی طرح زندگی کی دل فریبیوں کو محسوس کرتا

جذبوں کی نرم اور چمکیلی دھوپ پر کھر جمنے لگا تھا۔
اب جب کہ اس کی مسکراہٹ نے پہلی اڑان بھری ہی تھی کہ حالات کی تیز دھار قینچی نے پھر سے اس کی پر کاٹ دیے۔
"بیٹا ناشتا کر لو۔" اسے یوں خاموش دیکھ کر اماں کا دل کٹنے لگا تھا۔
"نہیں اماں دل نہیں چاہ رہا۔۔۔ ویسے بھی آج یونیورسٹی جانے کے بجائے گھر پر ہی ہوں اس لیے بعد میں جب دل چاہا کھا لوں گا۔"
دھوپ دبے قدموں گیٹ سے ہوتی ہوئی اب آہستہ آہستہ پورے صحن میں پھیلنے لگی تھی۔ چائے تیار ہونے کے بعد ثمینہ نے چولہا بند کر کے چھت پر لگا پنکھا آن کیا تو چولہے کے حدت سے کچن میں ہو جانے والی معمولی سی گرمی کا اثر زائل ہونے لگا کہ ایگزاسٹ فین کا کام شیلف کی طرف موجود کھڑکی بخوبی نبھا دیا کرتی تھی۔
چائے میز پر رکھتے ہوئے ثمینہ نے شاہ زین کو دیکھا جو بغیر پلکیں جھپکائے موبائل اسکرین کو یوں دیکھ رہا تھا کہ جیسے میسج آنے پر اگر اُسی لمحے نہ دیکھا گیا تو وہ از خود ڈیلیٹ ہو جائے گا۔
یوں بھی اب اُس سے رہا نہیں جا رہا تھا اسی لیے شاہ زین سے رات ہونے والی ملاقات کے بارے میں پوچھنا تو چاہا مگر اس سے پہلے ہی شاہ زین نے اِن باکس کھول کر ندرت کا موصول ہونے والا آخری میسج ثمینہ کی طرف بڑھایا تو وہ نا سمجھی سے موبائل ہاتھ میں پکڑے اسے دیکھنے لگی۔
"یہ پڑھ لو اور اماں کو بھی سنا دو۔" لہجہ گویا برسوں کی تھکن کی بکل مارے ہوئے تھا۔
ثمینہ نے بے یقینی سے پہلے اسے اور پھر اماں کو دیکھ کر میسج پڑھنا شروع کیا۔
"شاہ زین۔۔۔ جانتی ہوں کہ آج تم پریشان ہو گے، میرے گھر والوں سے جس انداز اور ماحول میں تم نے ملنے کا سوچ رکھا تھا، آج اُس کے برعکس ہوا اور جو کچھ انہوں نے تمہیں کہا اصل میں سچ بھی وہی ہے، تم سے محبت کا ڈراما صرف زبیر اور صبا کے ساتھ لگائی گئی شرط جیتنے کے لیے تھا اور بس۔۔۔ اگر اخبار میں تصویر چھپنے کا واقعہ نہ بھی ہوتا تو اب ہم تینوں مل کر تم پر قہقہے لگا رہے ہوتے اور میں شرط جیتنے پر تمہاری ہی موجودگی میں اُنہیں ٹریٹ بھی دیتی، یہ میرا اُن سے وعدہ تھا۔
ثمینہ نے موبائل اسکرین سے نظریں ہٹا کر اماں کو اور پھر شاہ زین کو دیکھا جو فرش پر نظر گاڑے سپاٹ چہرہ لیے بیٹھا تھا۔
"اور اس شرط کے بارے میں وہ تمہیں میری اجازت کے بغیر نہیں بتائیں گے یہ اُن کا مجھ سے وعدہ تھا۔ شاید اب میں کبھی یونیورسٹی نہ آؤں کیوں کہ چند روز بعد میری اور اکمل کی شادی ہو رہی ہے۔ ہر زبان پر تمہارے ساتھ میرا نام آنے کے باوجود اکمل مجھے اُتنی ہی شدت سے چاہتا ہے جتنا کہ وہ پہلے مجھے پانے کو بے تاب تھا اور اس بات کے لیے میں اُس کی احسان مند ہوں، لیکن ہاں شاید تمہارا دل دکھانے کی سزا کے طور پر میری یوں پورے شہر میں رسوائی بھی ہوئی لیکن۔۔۔ خیر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا اور پلیز آئندہ کسی بھی طریقے سے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"
مرد ہونے کے باوجود شاہ زین کی سرمئی آنکھیں بھیگنے کو تھیں۔ اماں کے تسبیح کرتے ہاتھ تھم گئے تھے۔ چاہتے ہوئے بھی وہ شاہ زین سے تسلی کے دو بول نہیں بول پا رہی تھیں کہ خود ان کے دل کو بے حد ٹھیس پہنچی تھی کوئی یوں ان کے بیٹے کے جذبات سے کھیلے یہ بات انہیں سخت اذیت سے دوچار کر رہی تھی۔
"اماں۔۔۔!"
شاہ زین کے پکارنے پر انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔
"پریشان نہ ہوں پلیز یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔"
"کیا تم افسردہ نہیں ہو؟" اماں کے پوچھنے پر وہ مسکرانے لگا تو ان کا دل کٹ کے رہ گیا۔ کیوں کہ اس

کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپے دکھ سے وہ بخوبی واقف تھیں۔

"ہوں افسردہ، بلکہ بہت افسردہ ہوں۔" وہی صاف گوئی جو اُس کا خاصہ تھی۔

"لیکن اماں افسردہ تو انسان تب بھی ہو جاتا ہے جب کوئی بہت قیمتی اور سینت سینت کر رکھی جانے والی ہماری پسندیدہ چیز ٹوٹ جائے، وہ پودا جس کی خوشبو بہت عزیز ہو اور جس کا خیال رکھنے میں ہم کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں مگر وہ اچانک ہی دنوں دن مرجھانے لگے اور یا پھر۔۔۔" شاہ زین نے گہرا سانس خارج کیا۔

"ہمارا کوئی عزیز اس دنیا سے چلا جائے۔۔۔ افسردہ تو ہم ہوتے ہیں لیکن آخر کب تک۔۔۔ چند ہی دنوں میں ہم پھر اپنے آپ اور دنیا میں مگن ہونے لگتے ہیں۔"

"بھائی سچ کہا آپ نے، وہی لوگ جن کے نہ ہونے کا تصور بھی ہمارے لیے سوہان روح ہوتا ہے بعد میں بعض اوقات تو ان کی یاد تک دل سے محو ہو جاتی ہے۔"

"پس ثابت یہ ہوا میری پیاری اماں کہ دل کو اس تعلق کے ٹوٹنے پر رنج تو بہت ہے مگر دو تین دن سے زیادہ اس کا اثر نہیں رہے گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

ایک بار پھر وہ مسکرایا تھا۔

کیوں کہ اماں کی خاموشی سے ان کا دکھ صاف ظاہر تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کی وجہ سے بھی دکھی ہوں۔ حالاں کہ حقیقت تو یہ تھی کہ تعلق ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا۔ ہاں البتہ دل کی کرچیاں ضرور بکھر گئی تھیں۔ مگر یہ سب ہونے کے بعد بھی، اپنے جذبات شرط کی نذر ہونے کے باوجود وہ اب تک اُسی مقام پر کھڑا تھا جہاں آج سے دو روز پہلے تھا۔

ندرت کی طرف سے واضح اعتراف اور ساری حقیقت بیان کرنے کے بعد بھی اس کے دل میں ندرت کے خلاف نفرت یا کدورت کا شائبہ تک نہ تھا دماغ ندرت کے اس سارے رویے کو اس کی عزت نفس پر کھلا حملہ قرار دیتا تو دل نفس کر ٹال دیتا کہ ہو سکتا ہے یہ سب ندرت کے لیے دل لگی ہو مگر اس کے لیے یہ سب دل کی لگی تھا جسے نہ تو بھلایا جا سکتا تھا اور نہ ہی وہ بھولنا چاہتا تھا۔

دماغ کی طرف سے بیان کردہ مضبوط دلائل کے جواب میں دل طرح طرح کی تاویلیں پیش کرتے ہوئے ندرت کو خود سے دور نہ کرنے کی فریاد کرنے لگتا تو شاہ زین نے فیصلہ دل کے حق میں سناتے ہوئے ندرت کو وہیں قیام کی اجازت دے ڈالی۔ اب یہ الگ امر تھا کہ دل کی بکھری ہوئی کرچیاں سمیٹنے میں کتنا وقت درکار ہوتا۔

تیرے معاملے میں خود میرا دل
میرے مدِ مقابل ڈٹ گیا ہے

☆☆☆

"پتر! ابھی تو کچھ دن باقی ہیں نا چھٹیوں کے؟"

"ہیں تو۔۔۔ لیکن میں واپس جانا چاہتی ہوں۔"

"اوہ، کیوں؟ یہی تو میں بھی پوچھ رہی ہوں نا۔"

مہربانو نے جب سے ملکانی سائیں کو اپنے واپس جانے کے ارادے سے آگاہ کیا تھا وہ جھنجھلاہٹ کا شکار تھیں۔ وہ واپس ہاسٹل جا رہی ہے باوجود اس کے کہ ابھی اس کے طے شدہ پروگرام کے مطابق اُس کے جانے میں چند روز باقی تھے اور وہ پہلے ہی اپنا سامان باندھ رہی ہے۔ یہ بات ان کی سمجھ سے باہر تھی۔

"ماں جی! دراصل میری اور کنول بھی واپس آچکی ہیں، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ چلی جاؤں تاکہ مل کر اسٹڈیز بھی کر لی جائے۔"

"تا تو یہ بات آنے سے پہلے پتا کوئی نہیں تھی کہ انہوں نے کب واپس آنا ہے۔" اُن کا مطمئن ہونا ذرا مشکل تھا۔

"پتا ہوتا تو میں یقیناً آپ سے پہلے ہی کہہ دیتی کہ مجھے جلدی جانا ہے۔"

"ہوں۔۔۔" ملکانی سائیں نے پُر سوچ نظروں سے اسے دیکھا جو اپنے ساتھ لائے گئے اٹیچی میں موٹی موٹی کتابیں اچھی طرح سیٹ کرنے کے بعد اب اوپر کپڑوں کو ہینگرز کے سمیت رکھتی جا رہی تھی۔ یہ وہ کپڑے تھے جو اس نے اس دفعہ خریدے تھے ورنہ ہاسٹل سے وہ ہمیشہ صرف چند کتابیں ہی لایا کرتی تھی۔

"کونٹ (اکاؤنٹ) میں پیسے ہیں یا شاہ جی سے کہہ کر اور ڈلوا دوں؟"

"نہیں، ضرورت نہیں ہے ابھی۔" اٹیچی بند کرتے ہوئے سرسری سا جواب دے کر اس نے ہینڈ بیگ میں موبائل کا چارجر، پرفیوم اور ہینڈ لوشن ڈال کر اس کی زِپ بند کی اور صوفے پر ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

"مجھے صرف آپ سب کی ضرورت ہے ماں جی، روپوں پیسوں کی نہیں۔"

"روپے پیسے کی قدر پتر اُن سے پوچھ جن کے پاس نہیں ہے۔ تجھے کیا پتا چند ہزار روپوں کے لیے صرف اور صرف چند ہزار کے لیے لوگ اپنی بیٹیاں تک بیچ دیتے ہیں۔ اور انہیں کچھ پروا نہیں ہوتی، نہ اپنی بیٹی کی زندگی کی اور نہ اس کی آبرو کی، بس اپنی عیش کی زندگی بچانے کے لیے سودے پہ سودا کرتے چلے جاتے ہیں جھلیے۔"

"ہاں ماں جی! کچھ لوگ عزت بچانے کے لیے بیٹیوں کو قتل کر دیتے ہیں، کہیں عیش و آرام کی زندگی بچانے کی خاطر بیٹی کا سودا کرتے ہیں تو کہیں جائیداد بچانے کے لیے بیٹی کو زندہ۔۔۔"

"تیرا دماق (دماغ) تو خراب نہیں ہو گیا۔۔۔ او تو مری بیٹی ہو کر مجھے طعنے دے رہی ہے ابا سائیں کے۔۔۔"

جائیداد بچانے کی خاطر ہی ان کے ابا سائیں نے کئی برس صرف اس لیے ان کی شادی نہیں کی کہ اپنے خاندان میں ان کی عمر کا کوئی لڑکا موجود نہیں تھا۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ جائیداد ان کے گھرانے سے باہر نکلے۔ اسی وجہ سے شاہ سائیں کے جوان ہونے کا انتظار کیا گیا اور جب وہ شادی کی عمر کو پہنچے تو ڈھلتی عمر کی ملکانی کو ان کے ہمراہ رخصت کر دیا گیا۔

یوں بھی وہ ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور انہیں خاندان سے باہر بیاہنا ان کی روایات کے خلاف ہوتا جبھی تمام بچوں میں سے نسبتاً بڑے شاہ سائیں سے انہیں بیاہ دیا گیا۔

ان باتوں سے مہربانو اور میران بھی اچھی طرح واقف تھے جبھی ملکانی کا خیال تھا کہ وہ انہیں ہی طعنہ دے رہی ہے۔ حالاں کہ حقیقت اس سے کہیں برعکس تھی۔ مہربانو کو تو بس اپنی کہی گئی بات میں سے ان کا روپوں پیسوں والی بات کو نوٹ کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کا خیال اور خواہش تھی کہ ملکانی سائیں اس کی کہی ہوئی بات کے پہلے حصے کو نوٹ کر کے پیار کا اظہار کرتیں لیکن۔۔۔

خواہش خواہش ہی رہی اور خیال، خیال۔

جو وہ کہنا چاہتی تھی، شاید وہ سب باتیں ملکانی اور دوسرے لوگوں کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھیں، ان کے نزدیک انسانوں کا نعم البدل روپیہ ہی تھا۔ مگر مہربانو کے اس خیال سے وہ لوگ ہرگز اتفاق نہیں کرتے تھے اور یہیں سے ان کے ذہنوں میں اختلاف ہونے لگتا۔

"ماں جی میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آئی ایم سوری اگر آپ کو برا لگا تو۔۔۔"

"ماں جی نہ کہا کر مجھے، سیدھا اماں سائیں کہہ کر بلایا کر، اللہ جانے کتنے نویں نام میرے لیے ڈھونڈتی رہتی ہے ہر وقت۔"

وہ مسکرا دی تھی ان کی بات سن کر۔

"اور ہاں یہ انگریزی نا، شہر چھوڑ کر آیا کر سمجھی۔"

"جی اماں سائیں!"

مسکراتے ہوئے اس نے کہا تو وہ بھی مسکرا دیں اور اٹھ کر کمرے سے نکلنے سے پہلے کچھ یاد آتے ہوئے مڑیں۔

(باقی آئندہ)

حِنا یاسمین

بلکتی سوالیں

میری اور رمنا کی شادی اکٹھی ہوئی تھی۔ رمنا فیصل آباد سے بیاہ کر آئی تھی اور میں گوجرانوالہ سے۔۔۔ میری شادی واصف سے ہوئی تھی اور اس کی آصف بھائی یعنی میرے جیٹھ سے۔

شادی کے بعد نئی زندگی کی شروعات ہوجاتی ہے۔ دوسرے معنوں میں ماں باپ اپنی بیٹیوں کو ایک کمرہ امتحان میں بھیج دیتے ہیں۔ جہاں کامیابی کی سند سوچ، فکر، صبر اور تدبر سے حاصل ہوتی ہے۔۔۔ اور ماشاءاللہ ان سب سے اوپر تقدیر کا آشیرباد بھی رہتا ہے۔

میں خوب صورت تھی تو رمنا پڑھی لکھی۔۔۔ میرے تیکھے تیکھے نقوش کے آگے اس کے جاپانی گڑیا جیسے نقوش بس عام سے ہی لگتے۔

بس مسئلہ تھا تو صرف ایک۔۔۔ میں بارہ جماعتیں پاس تھی تو وہ ایک اچھی یونیورسٹی کی پڑھی لکھی پوری سولہ جماعتیں پاس لڑکی تھی۔ میرا ایک دیور رمیض اور دو نندیں تھیں مائرہ اور مریم۔۔۔

بات کہاں سے شروع ہوئی۔۔۔ سوچوں تو بڑی باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ مگر میں پھر بھی بتاتی ہوں کہ ہمارے درمیان رنجشیں کب شروع ہوئیں؟ شادی کو ابھی ایک ہفتہ گزرا تھا۔ اڑوس پڑوس سے اکثر خواتین بھی نئی نویلی دولہنوں سے ملنے آجاتیں۔

اس دن باجی روبی آئی ہوئی تھیں۔ ہماری ساس صاحبہ کا خاص حکم تھا کہ روزانہ تیار ہو کر رہنا ہے۔ میں نے ریڈ سوٹ کے ساتھ ریڈ کلر کی نیل پالش لگالی۔ ریڈ لپ اسٹک اور میچنگ ریڈ سینڈل۔

جب میں اپنے کمرے سے باہر آئی تو مریم مجھے دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھی۔

"واؤ! بھابھی! آپ پر کتنا کھل رہا ہے ریڈ کلر۔"

رمنا نے براؤن۔۔۔ پرانے زمانے کے بوڑھے لوگوں کی پھیکی بدرنگ دھوتی جیسا کلر زیب تن کر رکھا تھا۔۔۔ منہ بھی نسواری اوپر سے لپ اسٹک بھی ویسی۔۔۔

رمنا پر کسی کی تنقید تو نہ ہوئی مگر تعریف بھی نہ کوئی کرسکا۔۔۔ باجی روبی بھی ساس کے سامنے میری تعریفوں کے پل باندھ گئیں۔۔۔ رمنا کا منہ فیوز بلب کی طرح بجھ سا گیا۔۔۔ پھر جی میری ہر چیز۔۔۔ ہر لفظ۔۔۔ ہر بات۔۔۔ پر بلاوجہ کی تنقید شروع ہوگئی۔

"مریم آج کل پیور ییلو کلر کون پہنتا ہے۔ ہلکا پیلا رنگ تو پھر بھی ٹھیک لگتا ہے۔۔۔"

اس دن میں نے اپنے گورے رنگ پر گہرا پیلا رنگ پہنا ہوا تھا۔۔۔ رمنا کی بات پر مجھے بڑا غصہ آیا۔

"انسان کا رنگ صاف ہو تو کائنات کے سارے رنگ ہی اس پر اچھے لگتے ہیں۔۔۔"

میرا صاف گوئی سے دیا جانے والا جواب سن کر وہ خاموش سی ہوگئی۔

مائرہ کو بی۔ اے کی انگلش میں کچھ مسائل پیش آرہے تھے۔ رمنا نے جھٹ اپنی خدمات سرانجام دینی شروع کردیں۔ ساس نے دوپہر کا کھانا بنانا بھی میرے سپرد کردیا۔ مائرہ رمنا کی ذہانت کے گن گانے لگی اور میں پیچ و تاب۔

صبح ناشتے میں کھڑے ہو کر کمر اکڑ جاتی ہے اوپر سے دوپہر کا کھانا۔ میں واصف کے سامنے رو پڑی۔ واصف نے ساس سے بات کی۔۔۔ اور بات کا جھگڑا بن گیا۔

رمنا نے اماں، مائرہ کا پہلے ہی دل جیتا ہوا تھا، اوپر سے اور ٹسوے بہا کر کہہ دیا۔

"امی! مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں ناشتا بھی بنادوں گی اور دوپہر کا بھی کردوں گی۔ بس بیچاری مائرہ۔۔۔ کو پڑھانا ہوتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ بی۔ اے میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوجائے۔۔۔"

"رہنے دیں بھابھی! آپ ذہن بھی میرے ساتھ کھپائیں اوپر سے جسمانی مشقت الگ۔۔۔

اگر مہوش بھابھی سے کام نہیں ہوتا تو پھر انہوں نے اور کیا کرنا ہے۔۔۔" باری باری مائرہ اور پھر مریم نے اپنے بیان دیے۔ جبکہ میں ذہانت کے آگے مات کھا جانے پر حیران و پریشان رہ گئی۔۔۔

ساس صاحبہ کا منہ کافی دن تک سوجا رہا۔ میری اہمیت کم ہوگئی تھی۔

کرکٹ سیریز شروع ہوگئیں۔ ان دنوں سیاست

کے اتار چڑھاؤ بھی عروج پر تھے۔ سارا وقت لاؤنج میں محفلیں جمنی شروع ہو گئیں۔

رمنا کی ذہانت نے سسر، واصف اور آصف کو بھی اپنا گرویدہ کرلیا۔ جبکہ میں خاموش تماشائی کی طرح کھانا بنانے، سرو کرنے اور برتن اٹھانے تک ہی محدود رہ گئی۔

میں نے واصف سے شکایت کرنا چھوڑ دی۔

ان کی نظر میں بھی میں کم عقل عورت کا درجہ حاصل کرچکی تھی۔ جس نے آتے ہی ماں بہنوں کی شکایتیں لگانی شروع کردیں۔

مریم کی شادی کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ رمنا کی اٹھتے بیٹھتے نصیحتوں نے اسے شیر بنانے کی مکمل تیاری کرلی۔

"مریم! ابھی بھی اگلے گھر جاکر خاوند کے سامنے ماں بہنوں کی شکایتیں نہ کرنا۔ مرد کا دل وفاداری و خلوص سے جیتا جاتا ہے۔ لگائی بجھائی سے نہیں۔۔۔" اس وقت میری ساس مجھے یوں گھورتیں جیسے کہہ رہی ہوں دیکھو اور عقل سیکھو۔۔۔

"مریم! آؤ تمہیں میں ہنی کا ماسک بنا دیتی ہوں۔ چند روز لگایا کرو۔ اسکن تھوڑی ٹائٹ ہوجائے گی۔۔۔ پھر یہ دودھ کا گلاس پیو۔۔۔ روزانہ صبح اور شام روٹین بنالو۔۔۔ گالوں میں گلابیاں کھل جائیں گی۔۔۔" اس کی وقتاً"فوقتاً" کی ہدایات مجھے چڑا دیتیں۔

"جیسی گلابیاں اس کے اپنے گالوں میں کھلی ہوئی ہیں۔۔۔" میرے دبی زبان سے کہنے پر رمیض نے سن لیا جو نجانے کچن میں کیا ڈھونڈنے آیا تھا۔ وہ فلک شگاف قہقہہ مار کر ہنسا۔

"ارے بھابھی! آپ کا سینس آف ہیومر بھی کمال کا ہے۔" میرے ہونق بننے پر اس نے بتایا کہ آپ کا حس مزاح۔۔۔ گوکہ مجھے حس مزاح کی ہی سمجھ آئی تھی سینس آف ہیومر کا پتا نہ چل سکا۔ میری انگریزی ایف۔ اے میں، بس رٹا سسٹم سے ہی پاس ہو سکی تھی۔ ماں باپ کی گھر بھی بڑی بہن ہونے کے ناتے ذمہ داریوں کی لسٹ۔۔۔ اوپر سے سسرال میں بھی کم تعلیم یافتہ ہونے پر پوری ذمہ داریاں ڈال دی گئیں۔ حالانکہ میں چھوٹی بہو تھی۔۔۔ میں نے صبر کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا تھا۔۔۔

مائرہ کا رزلٹ شاندار آیا۔۔۔ رمنا کی ویلیو کا گراف بڑھ گیا۔

مریم کے لیے شاپنگ پر رمنا جارہی ہے۔ اور میں گھر میں۔۔۔ گھر سنبھال رہی ہوں۔

رمنا مریم کے لیے جو جوڑے لائی۔ میں نے ان میں سے ایک اسکن اور ایک مرجنڈا رنگ پسند کیا۔

"مریم! یہ دونوں رنگ کافی اچھے ہیں۔۔۔" میری رائے دینا ہی چنگاری کو ہوا دے گئی۔

"اوہوں، پینڈو کلر۔۔۔ اسکن اور مرجنڈا کا رواج نہیں۔۔۔ مریم آج کل قرمزی اور کاسنی بڑے ان ہیں۔۔۔" وہ مکمل مجھے ریجیکٹ اور نظرانداز کرکے مریم کے ساتھ شروع ہوگئی۔ وہ خاص طور پر انگلش کے لفظ فر فر استعمال کرتی جب میں بیٹھی ہوتی۔ میرے ساتھ گھر والوں کا تعلق صرف فرمائشیں کرنے کی حد تک رہ گیا۔

"بھابھی! کھانا، بھابھی چائے لادیں۔۔۔" وغیرہ وغیرہ۔ شادی کو سات ماہ ہوگئے۔ ہم دونوں کی ابھی خالی گود ہی تھی۔

میں نے گھر جاکر اماں اور روشی کے سامنے اپنا دکھڑا رویا۔

"تم صبر کا دامن کبھی نہ چھوڑنا، وقت خود ہی ثابت کردے گا۔ تمہارے پاس تعلیم نہیں مگر اچھی تربیت تو ہے نا۔۔۔ اماں نے کبھی بھی ہمیں غلط بات نہیں سکھائی۔۔۔ نہ چالاکی نہ مکاری۔۔۔ "تم خدمت سے دل جیتو۔۔۔"

روشی کے سمجھانے پر میں مزید دلگرفتہ ہوگئی۔

"آج کل وہ دور نہیں ہے کہ خدمت سے دل جیتا جائے۔۔۔"

"نہیں بیٹا! کبھی نہ کبھی تو دل ان کا یہ بات ضرور سمجھے گا۔۔۔" میں نے منہ بنالیا۔

"ہاں، تب تک بندے کا کام کرکے کچومر نکل جائے۔۔۔" میرے جل کر کہنے پر روشی ہنس پڑی اور اماں بے بسی سے میری شکل دیکھنے لگیں۔

قدرت کے کام بھی بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ ہماری توقعات کے برعکس۔۔۔ ہماری عقل کی حد سے دور۔۔۔ ہم دونوں نے اپنا چیک اپ کروایا تھا۔ ہم دونوں کو خوشخبری ملی تھی۔

میری ساس نے سارے ارمان پورے کیے۔ رمنا نے تو باقاعدہ بچوں کی پرورش اور نگہداشت پر نیٹ سرچنگ شروع کردی۔ دو چار کتابیں اردو میں لاکر مجھے بھی تھمادیں۔ پر مسئلہ یہ تھا وہ تو ویلی (فارغ) تھی اور میں کام دھندوں میں۔۔۔ مجھے ٹائم ہی نہیں مل پاتا۔ اب تو باقاعدہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر سیر حاصل تبصرہ شروع ہوجاتا تھا۔ سارا گھر ہی استفادہ کررہا تھا۔

"تم بھی رمنا بھابھی سے کچھ سیکھ لو۔۔۔" واصف کو پتا تھا کہ وہ میری چڑ تھیں، سو مجھے چڑایا۔

"میں کیا آپ، آصف بھائی۔۔۔ اور رمیض بھائی کچھ نہ کچھ ضرور سیکھیں۔۔۔" میرے چڑ کر کہنے پر وہ ہنس پڑے۔

"ہوسکے تو محلے میں سے بھی جن کے گھر بچہ ہونے والا ہے۔۔۔ ان بی بی کو بھی گھر بلا کر مفت کے لیکچر سنوا دیا کریں۔۔۔ ماشاءاللہ سے کوئی اور کام تو وہ کر نہیں سکتی۔ کم از کم بچوں کی پرورش پر محلے والوں کی کلاسیں ہی لے لے گی۔۔۔" واصف دیر تک ہنستے رہے۔

"آج تم زیادہ ہی کچھ دکھی ہوگئی ہو" میں بستر پر لیٹ کر چادر منہ تک تان کر لیٹ گئی۔ پھر سے رمنا نامہ شروع نہ ہوجائے۔۔۔ بلاوجہ ۔۔۔ رونے کو دل کرنے لگا۔

"کیا تھا اگر میں بھی اور پڑھ لیتی۔ پڑھا لکھا بندہ باتوں کی ہنڈیا بناتا ہے۔۔۔ باتوں کے تڑکے لگاتا ہے۔۔۔ باتوں کی صفائیاں کرتا ہے۔۔۔ اور کم پڑھا لکھا ہاتھوں سے۔۔۔" یہ میری خالصتاً "ذاتی قسم کی سوچ تھی۔

رمنا کو ہر وقت کمر درد رہنے لگا۔ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ کبھی کبھی بس تھکاوٹ سے ایڑیوں میں درد رہتا۔

ڈاکٹر نے رمنا کو مکمل ریسٹ لکھ دیا۔ اس کی روز ہی طبیعت خراب رہنے لگی۔ کبھی الٹی شروع ہوجاتی۔۔۔ کبھی بلڈ پریشر ہوجاتا۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ۔

میں اپنی ہی روٹین میں مگن ۔ میرے کاموں کی رفتار اتنی ہی تھی۔ بس جلنا کڑھنا میں نے کم کردیا تھا۔ میں اس حقیقت کو تسلیم کرچکی تھی کہ جب سارے کام میرے ہی حصے میں ہیں تو واویلا کرنے کا فائدہ؟

اور بقول رمنا کہ مثبت خیالات آپ کے ہونے والے بچے پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔

کچھ کچھ اس کی ذہانت کے گر کو میں عملی طور پر خود بھی آزما رہی تھی۔

اچھی بات تو پھر ہر ایک سے سیکھنی چاہیے۔ گوکہ خود کہنے والا اس پر عمل کرے نہ کرے۔

اماں یعنی میری ساس صاحبہ نے جب سنا کہ رمنا کے ہاں بیٹا ہے اور میری بیٹی۔ بس پھر تو سمجھو میری شامت آگئی۔ اللہ سمجھے الٹرا ساؤنڈ والوں کو فضول مشین، لوگ اب بیماریوں سے زیادہ اس بات کو جاننے کی خواہش رکھتے ہیں کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔۔۔

میری اماں تو کہتی ہیں کہ شرک ہے۔۔۔ اللہ بس مکمل صحت مند بچہ دے۔

مگر یہاں کام ہی دوسرا ہے۔۔۔ مجھے حیرت ہوتی رمنا جیسی ذہین لڑکی کو کیا اس بات کا علم نہیں۔۔۔ کبھی کبھی میں بھی ناشکرے پن کا اظہار کرجاتی۔۔۔ کیا کروں؟ بندہ بشر۔۔۔

رمنا ہائے بھی کرتی تو سارا گھر اس کے سرپر اکٹھا ہوجاتا۔

"بھابھی! آپ دودھ لیں۔" مائرہ کہتی۔۔۔

"بھابھی آپ نیند پوری کریں۔۔۔" مریم کا ارشاد ہوتا۔

"جاؤ مہوش! بہن کے لیے دیسی گھی میں سوجی بھون کر لاؤ۔۔۔" ساس صاحبہ انکشاف کرتیں کہ محترمہ کو کمزوری ہے۔۔۔

میں خود تھک جاتی۔۔۔ بس خاموشی ہی مقدر بن

گئی۔

"واصف میرے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے......" کبھی بے تحاشا تھکاوٹ کے ہاتھوں میں مجبور ہو کر کہہ دیتی۔

"تم بھی آرام کا وقت نکال لیا کرو......" وہ مفت مشورہ دیتے۔

"کیسے؟ آپ کی اماں یا بھابھی صاحبہ آرام کا موقع دیں تو کروں نا......" میں بے چارگی سے کہتی۔

"اچھا میں اماں سے بات کروں گا......"

"رہنے دیں وہ پھر میرے خلاف ہو جائیں گی......" میں منہ بنا کر بولی۔

"ایک تو تم شکایت بھی کرتی ہو اور پھر ماں کو بتانے سے بھی ڈرتی ہو۔ دیکھو! یہ تمہارا بھی حق ہے کہ تمہیں بھی آرام کا موقع ملے۔" وہ نرم لہجے میں کہتے ہوئے لیٹ گئے میں چپ سی ہو گئی۔

دوسرے دن واصف کے کہنے کی دیر تھی۔ سب نے گویا میرے وارنٹ جاری کر دیے۔

"بھابھی! آپ تو جاہل عورتوں کی طرح مقابلہ ہی کرتی رہتی ہیں......" پہلا گولہ مائرہ نے پھینکا۔ میرا ذہن تو جاہل پر ہی اٹک گیا۔

"بہو! کم از کم کچھ دن تو گھر کا ماحول ٹھیک رہنے دو...... بلاوجہ کی پریشانی نہ خود لو' نہ دوسروں کو لینے دو۔" میری ساس بولیں۔

میرا ضبط بھی جواب دے گیا۔

"جاہل میں نہیں آپ لوگ ہیں۔ انوکھا کا پیدا نہیں کر رہی وہ...... جو وہ آرام کرتی رہے اور میں سب کی نوکرانی بنوں......"

میری بات ایٹم بم سے کم نہ تھی۔ مجھے میسنی گھنی...... اور نجانے کیا کیا القابات سے نوازا گیا۔

"ہمیں نہیں پتا تھا کہ یہ رمنا کے لیے اتنا دل میں زہر رکھتی ہیں......" مریم نے تنفر سے کہا۔

رمنا نے بھی خوب ٹسوئے بہائے۔

"بھابھی! رہنے دیں میں بنا لوں گی......" میں کچن میں روٹیاں بنانے آئی تو مائرہ نے میرے ہاتھ سے آٹا کھینچتے ہوئے کہا۔ اگر میں کوئی بھی کام شروع کرنے لگتی۔ میری ساس' مائرہ اور مریم آکر میرے ہاتھ سے کھینچ لیتیں۔ گھر میں میرے ساتھ عجیب سا محاذ کھول کے سارے بیٹھ گئے۔ مجھے صرف کمرے تک محدود کر دیا گیا۔ واصف سے کہہ کر میں اماں کی طرف آگئی۔ میرے رونے پر اماں بھی آزردہ ہو گئیں۔

"دیکھو مہوش! میں نے کہا تھا کہ بیٹا صبر کرو۔ اللہ پر تو چھوڑ کر دیکھو۔ تم نے خود ہی شکوے شکایتیں کر کے اپنا آپ ہلکا کر لیا۔"

"ہلکی تو میں پہلے ہی تھی اماں! میں اتنی پڑھی لکھی جو نہیں......" میرے کہنے پر روشی تڑپ سی گئی۔

"آپی بس کریں...... تعلیم ڈگریوں سے نہیں آتی۔ اچھی اور نیک سوچ ہو تو ہی بندہ اچھا لگتا ہے...... آپ دل برا نہ کریں۔ یہ چائے پئیں اور یہ پکوڑے کھائیں۔ میں نے خاص آپ کے لیے بنائے ہیں۔"

اتنے عرصے بعد کسی نے اتنے پیار سے میرا خیال کیا تھا۔ میں بھی سب بھول بھال کر خوشگوار موڈ میں آگئی۔

واصف مجھے دوسرے دن ہی لینے آگئے۔ پر اماں نے مزید رہنے کی ان سے اجازت مانگ لی۔ یہ پہلی دفعہ تھا جو میں شادی کے بعد اپنے میکے ایک دن سے زیادہ رہی۔ ایک ہفتے بعد واصف مجھے لینے آگئے۔

گھر گئی تو ساروں نے مزید تیوریاں چڑھائی ہوئی تھیں۔ کچن میں اتنی گندگی پھیلی ہوئی تھی کہ پورے ہفتے کا گند جیسے میرے لیے ہی اکٹھا کیا ہو۔

مریم! کے سسرال والے آرہے تھے۔ وہ پارلر تیار ہونے گئی ہوئی تھی...... مائرہ اپنے ہاتھوں کی کلینزنگ کر رہی تھی۔ رمنا کی طبیعت ہمیشہ کی طرح سخت خراب ـــــــ تھی۔ اماں نے مجھے دیکھتے ہی کاموں کی لمبی لسٹ پکڑا دی۔ جن میں سرفہرست مریم کے سسرال کے لیے کھانے کی تیاری تھی۔

میں کاموں میں ایسا جتی کہ ساری رات میری ٹانگوں کی تکلیف نے میری چیخیں نکلوا دیں۔ واصف سخت پریشان ہوئے ان کی سنجیدگی حد سے زیادہ بڑھ گئی

ہوئی تھی۔

اگلے دن وہ مجھے کسی کی بھی سنے بغیر زبردستی اماں کی طرف چھوڑ آئے۔ میں بھی خوش تھی کہ چلو شوہر صاحب کو تو کچھ خیال ہے۔

اماں اور روشی نے حد سے زیادہ مجھے آرام و سکون پہنچایا۔

کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ رمنا کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ واصف نے بتایا کہ بچہ پری میچور ہے۔ میں اور اماں گھر آگئے۔ ڈاکٹر نے رمنا کو نارمل پیدائش بتائی تھی پھر آپریشن؟.... میں حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی تھی۔ مجھے اپنی فکر ہو گئی۔

ہوتا ہے نا کسی دوسرے کا سن کر بندہ خود بھی گھبرا جاتا ہے۔ میں دوسرے ہی دن واصف کو لے کر ڈاکٹر مہر بانو کے کلینک چلی آئی۔ میرے استفسار اور مکمل چیک اپ کے بعد وہ مسکرا کر بولیں۔

"ماشاء اللہ مسز واصف آپ بالکل فٹ ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ پہلے ماؤں کے ہاں نارمل ڈلیوری اس لیے ہوتی تھی کہ وہ چلتی پھرتی تھیں۔ اپنے اعضاء کو استعمال میں لاتی تھیں۔ وہ اس چیز کو سر پر سوار نہیں کرلیتی تھیں۔ آج کی لڑکیاں نازک مزاج ہیں۔ جس کو کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں بھی ہوتا۔ وہ بھی خود ہی مسائل کے انبار لگالیتی ہیں۔ آپ کی جیٹھانی نے غالباً "بیڈ سے اترنا ہی ممنوع سمجھ لیا تھا۔ بیٹھ بیٹھ کے ان کی ہڈیاں کھل نہیں سکیں۔ ان کا پہلے ہی پیچیدہ کیس تھا وہ پیچیدہ ترین ہو گیا۔ ہمیں مجبوراً" وقت سے پہلے ڈلیوری کرنی پڑ گئی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ بالکل فٹ ہیں۔ آپ کے ساتھ ایسا کوئی پرابلم نہیں پھر بھی میں آپ کو پرسکون رہنے کے لیے کچھ ادویات لکھ دیتی ہوں۔ آپ ان کا استعمال وقتاً"فوقتاً" کرتی رہیں۔"

ڈاکٹر اپنی پیشہ وارانہ مسکراہٹ سے بولی۔ جبکہ میں سوچ رہی تھی کہ میری کٹھن محنت اور چلنا پھرنا میرے کام آگیا تھا۔ اماں صحیح کہتی ہیں کہ کام تو عورت کا نصیب ہوتے ہیں۔ چڑیا بھی اپنا گھونسلا بنا کر ہی بیٹھتی ہے۔ اپنے گھر کے لیے دانا خود چگ کر لاتی ہے۔

ہم تو پھر اشرف المخلوقات ہیں۔ گھروں میں اسی فیصد لڑائیاں کاموں کی وجہ سے ہی ہوتی ہیں۔

جب میں نے اماں کو جا کر بتایا تو وہ خوش ہو کر مزید مجھے سمجھانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

اللہ نے مجھے صحت مند پیاری سی بچی سے نوازا تھا۔ اتنی موٹی تازی.... گوری چٹی جو بھی دیکھتا.... بے ساختہ اسے پیار آجاتا۔

رمنا کا بیٹا پری میچور ہونے کی وجہ سے جسمانی طور پر چھوٹا کمزور سا لگتا۔ بچے کی گردن ایک طرف ڈھلکی رہتی۔ ہر وقت رال منہ سے نکلتی رہتی۔ نہ ساس ہاتھ لگاتیں نہ نندیں.... میں اپنی بیٹی کو ہر وقت صاف ستھرا رکھتی۔ وہ دیکھنے میں بھی خوبصورت تھی۔ بغیر کسی کوشش کے ان چاہی بہو کی بیٹی سب کی من چاہی بن گئی۔

رمنا کی حالت بھی خراب تھی۔ شروع شروع میں تو ساس نندوں نے ذہین بھابھی کی کافی خدمتیں کیں۔ پھر سب ہی آہستہ آہستہ بے زار ہونے لگیں۔ رمنا کے لیے چلنا دوبھر ہو جاتا۔ اس کا بیٹا بھی نشوونما صحیح طرح سے نہیں پا رہا تھا۔ بچے کی بڑھوتری کا عمل رک سا گیا تھا۔ چھوٹا سا منہ اور ڈھلکی ہوئی گردن.... چھوٹے چھوٹے بازو.... بچے کو کوئی بھی ہاتھ نہ لگاتا۔ ساس کا سارا کروفر نکل گیا۔ پوتے کی خاطر بہو کو ہاتھ کا چھالا بنائے رکھنے والی اب اس سے کوسوں دور بھاگتیں۔

میں نے خود ہی رمنا کا خیال رکھنا شروع کر دیا۔ اس کے بیٹے کو اپنی بچی کے ساتھ ہی نہلا دھلا کر صاف کر دیتی۔ رمنا کو کھانے پینے کا پوچھ لیتی۔ اس کا بستر صاف کر دیتی۔ میری توجہ اور تیمارداری پر وہ خوش ہو جاتی تھی۔

"بات سنو! کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟...." ایک دن میں اس کے اور اس کے بچے کے کپڑے تہہ کر کے الماری میں رکھ رہی تھی۔ جب وہ اچانک مجھ سے مخاطب ہوئی۔ حالانکہ وہ اب زیادہ خاموش رہنے لگی تھی۔

"کس بات پر...." میں جانتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھی۔

"میرا تمہارے ساتھ مناسب رویہ نہیں تھا۔ ہو سکے تو مہوش! مجھے معاف کر دو...." گرم گرم سیال اس کی آنکھوں سے نکلا تھا۔ میں اسی لمحے سے ڈرتی تھی۔

"یقین کرو رمنا! اپنی اچھائیوں کا اشتہار لگانا مجھے منظور نہیں میں اپنی کچھ نیکیاں آخرت کے بینک میں ہی رکھنا چاہتی ہوں.... میرا اچھا سلوک دکھانے کا مطلب تمہیں پسپا کرنا یا کم ظرف بنانا نہیں تھا۔ میں بس اس رب کے آگے سرخرو ہونا چاہتی تھی...." میں اس کے ہاتھ تھام کر بولی۔

"پتا ہے تم مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو۔ تمہاری نیت اور عمل اس کی واضح مثالیں ہیں۔ میں بلاوجہ ہی ڈگریوں پر اکڑتی رہی۔ تمہیں نیچا دکھانے کا ہر گر آزماتی رہی...." میں جانتی تھی کہ وہ یہی سب کہے گی۔

"دراصل میں رمنا! سسرال وہ شہر ہے جہاں کی ہوائیں اپنی مرضی کے تابع ہوتی ہیں۔ شہر کا ماحول اچھا تو موسم بھی خوشگوار.... ماحول بدلا نہیں کہ موسم نے بھی تیور بدل لیے...."

"واہ' واہ آج تو ماشاء اللہ دونوں بہوؤں نے مشین لگائی ہوئی ہے...." باجی روبی کافی دنوں کے بعد آئی تھیں۔ میں نے اور رمنا نے آج گھر بھر کے کپڑے دھونے کا منصوبہ بنایا تھا۔

ہماری ساس صاحبہ کا موڈ آف تھا۔ ان کا دل کریلے گوشت کھانے کو چاہ رہا تھا۔ رمنا نے میرے ساتھ کپڑے دھونے شروع کر دیے۔

"اماں کپڑے زیادہ ہیں۔ میں اور مہوش مل کر دھوئیں گے تو رات تک ختم ہوں گے۔ آپ کریلے چھیل کر بنالیں اور مائرہ پکا دے گی.... مل کر کام کریں گے تو جلدی ہو گا...." پڑھی لکھی بہو کا پہلی دفعہ پڑھا لکھا جواب اماں کا حلق یوں کڑوا کر گیا جیسے ابھی کریلا منہ میں ڈال لیا ہو.... جبکہ باجی روبی میری اور رمنا کی تعریفوں کے پل باندھنے لگیں۔ بہوئیں ہوں تو ایسی میں شاہد آفریدی کی طرح خوشی سے باؤلی ہوئی جا رہی تھی جو اتنے عرصے بعد چوکے اور چھکے مارنے پر ہوتا تھا۔

☼ ☼

نادیہ امین

درد عشق

مکمل ناول

سخت آگ برساتا سورج اپنی تمام تر شدت زمین پر منتقل کرتا گویا خود پرسکون ہونے کی کوشش میں ادھر سے ادھر منڈلا رہا تھا۔ اس ــــ گرمی میں ماتھے پر آئے پسینے کو دوپٹے سے پونچھتی وہ تیز تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف جا رہی تھی۔ کالج زیادہ دور نہ تھا مگر اس چلچلاتی دھوپ میں یہ فاصلہ بہت طویل لگ رہا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی جو خوشگوار احساس ہوا تھا وہ ضوباریہ کے آنے کا تھا۔ ضوباریہ کو گلے لگائے وہ باقاعدہ چلائی تھی۔

"ارے کتنی بے وفا ہو شادی کے بعد بالکل بھول گئیں" اس کے چہرے سے خوشی ہویدا تھی۔ وہ شرمیلی سی مسکان ہونٹوں پر سجائے بولی۔

"آتو گئی نا۔"

"بھائی کے ساتھ آئی ہو؟" اس کے سوال پر ضوباریہ کے ہونٹوں پر سے مسکراہٹ یکدم غائب ہوئی تھی۔ پھر خفیف سی شرمندگی سے کہتی بولی۔

"امی کے ساتھ آئی ہوں ان کے پاس وقت کہاں ہوتا ہے کہ مجھے چھوڑنے آتے اتنے تو مصروف ہوتے ہیں۔" اس کے وضاحتی جواب پر وہ بہت سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

"تو پھر شادی نہ کرتے۔ جب اتنی مصروفیت تھی تو پھر ماں کو بتا دیتے کہ میں یہ ذمہ داری اٹھانے....."

اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرتی کہ راشدہ نے یکدم سے اس کی بات کاٹ کر قدرے تنبیہی انداز میں ڈانٹا۔

"تم پھر اول فول بکنے لگیں وہ صحیح کہہ رہی ہے سکندر کے پاس ٹائم کہاں ہوتا ہے اس قدر بھاری ذمہ داری ہے اس کی اور تم" وہ چپ ہو کر کچھ تامل کر کے بولی۔

"میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔" کپڑے بدلتے ہوئے بھی وہ سکندر کی بے اعتنائی پر کڑھتی رہی۔ جب سے اپیا کی شادی ہوئی تھی تب سے ایک بھی دن ایسا نہ تھا کہ وہ خود اسے لے کر سسرال آیا ہو۔ ضوباریہ کے وضاحتی بیان اور امی کے جارحانہ تیور ہمیشہ دل کی بات زبان پر آتے ہی گلا گھونٹ دیتے۔

"جلدی آؤ کھانا تیار ہے امی بلا رہی ہیں"۔ فاطمہ نے جھانک کر اطلاع دی تھی۔ دسترخوان پر کئی قسم کی ڈشز سج چکی تھیں۔ راشدہ ایسا ہی کرتی تھیں۔ جب اپیا آتیں تو وہ سارا دن کچن میں گزارتیں جبکہ وہ پانچوں بہنیں سر جوڑ کر باتوں میں مصروف رہتیں۔

سب سے بڑی ضوباریہ تھی پھر عجوہ اور زینب، عائشہ، فاطمہ سب سے آخر میں دو بھائی تھے جو جڑواں تھے اور کلاس فورتھ میں تھے۔ ان کے والد لقمان احمد سرکاری محکمہ میں ملازم تھے۔ اچھی پوسٹ تھی گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔ متوسط طبقے کے لوگوں کی طرح ان پر بھی بیٹیوں کی بھاری ذمہ داری تھی اس لیے ہاتھ ذرا دبا کر رکھنا پڑتا تھا۔ اولاد اللہ نے نیک، صالح دی تھی بیوی تابعدار تھی لقمان احمد بہت پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ اور ایسے میں سکندر جیسے داماد کا ملنا تو نعمت غیر مترقبہ تھا۔ وہ تو اس بات پر حیران تھے کہ سکندر کی ماں ان کے گھر رشتہ لائیں کیسے۔ سکندر نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا تھا اور آج کل پولیس سروس میں ایس پی کے عہدے پر فائز تھا۔ راشدہ الگ حیران پریشان تھیں کہ ایک اعلا عہدے کا حامل لڑکا جس کی عمر بھی زیادہ نہ تھی ان کا داماد کیسے بن سکتا ہے۔ کیونکہ ان کی بیٹی زیادہ پڑھی لکھی تھی نہ ہی بہت زیادہ حسین و جمیل۔ شاید یہ قدرت کا فیصلہ تھا جس پر وہ دل و جان سے راضی تھے۔

وہ تو ایسے رشتے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے اس لیے شادی والے دن سارے رشتہ دار جل بھن کر کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ناراض ہی رہے تھے اور جنھوں نے شرکت کی تھی وہ بھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں پیش پیش رہے تھے۔

ضوباریہ نے میٹرک کیا تھا اور انٹر کر رہی تھی جب اس کی شادی ہوئی۔ وہ بہت لیے دیے رہنے والی اور دبو قسم کی لڑکی تھی۔ شادی کے بعد شادی شدہ زندگی کا سارا چارم ختم ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس کی ساس انتہائی ــــ تیز ترین عورت تھی۔ ضوباریہ یہ بھی سمجھ گئی

تھی کہ آخر ضوباریہ کو پسند کرنے کی وجہ کیا تھی۔ ایک عام شکل و صورت اور کم تعلیم کی لڑکی سے اپنے اکلوتے بیٹے کو بیاہنے کا مطلب یہی تھا کہ بیٹا قابو میں رہے بیوی کی انگلیوں پر نہیں بلکہ ماں کے اشاروں پر ناچے۔

یہ قیامت خیز آگہی ایک دن خود اس پر آشکار ہوئی تھی جب اس نے الفت اور اپنی نند کو باتیں کرتے سنا تھا۔

"اس لیے تو لائی ہوں اسے زیادہ پڑھی لکھی اور حسین عورتیں مردوں کو قابو میں کر لیتی ہیں۔ یہ تو اپنے احساس کمتری کے مارے چپ کی زندگی جیے گی۔ میرے بیٹے کو لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے۔ ایک چھوڑ ہزار مل جائیں گی اس کے لیے۔" اور یہ بیان ضوباریہ کے آئندہ لائحہ عمل کے لیے کافی تھا۔ سکندر کا کترایا اور خاموش رویہ اور ساس نندوں کے منصوبوں نے اسے بالکل بے دست و پا کر دیا تھا۔ اور وہ وہی زندگی جینے لگی تھی جو انہوں نے اس کے مقدر میں سیاہی کی مانند گھول دی تھی۔

ایک دن کالج سے آف کر کے وہ ایبا کے پاس آئی تھی۔ وہ ابھی فرسٹ ایئر میں تھی۔ تعلیمی میدان میں وہ بہت تیز تھی۔ اس نے سائنس لے رکھی تھی۔ کالج میں بھی وہ سب میں نمایاں تھی وہ تھی ہی ایسی جہاں جاتی سب کو گرویدہ کر لیتی۔ اس قدر خود اعتمادی نے اسے خاصا بولڈ کر دیا تھا وہ غلط بات پر ٹوکتی اور غلط کہنے والے کی بات پر کبھی خاموش نہ بیٹھتی۔ ایبا اپنے دل کی ہر بات اس سے شیئر کرتیں اور وہ اس کے سسرال والوں پر کڑھتی جلتی بھنتی رہتی۔ ابھی بھی وہ دونوں اسی موضوع پر باتیں کیے جا رہی تھیں۔

"سب قصور تمہارے شوہر کا ہے اگر وہ ٹھیک ہوتے نا تو سب تمہارے ساتھ اپنا رویہ درست رکھتے۔ اللہ معاف کرے کتنا تو نخرہ ہے یہ عہدہ بھی نا کتنا نخریلا اور سڑا ہوا بنا دیتا ہے انسان کو اور سچی بات ہے کہ مجھے تو سکندر بھائی بہت برے لگتے ہیں تم نے تو انہیں اور سر چڑھا دیا ہے۔ تمہیں تابعداری پر ایوارڈ نہیں ملنے والا جواب دو ان کی غلط بات کا۔ کیا منہ کو تالا لگائے ساوتری بننے کی کوشش کرتی ہو گیا وہ اپنی ماں کو غلط بات پر نہیں ٹوک سکتے۔

"وہ مجبور ہیں نا اکلوتے جو ہیں پھر سب انہیں زن مریدی کے طعنے دیں گے۔" "انہوں نے کہا؟" اس نے استفہامی انداز میں پوچھتے ہوئے گویا جھوٹ پکڑ لیا تھا۔ خفت مٹاتی ضوباریہ بولی۔

"میں خود اندازے سے بتا رہی ہوں۔"

"اندازے مت لگاؤ۔" اس نے گویا صحیح اندازہ لگایا تھا تبھی قدرے سنجیدگی سے بولی۔

"اب تم جو بھی کہو مگر میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میں کوئی ایسا مسئلہ پیدا نہیں کر سکتی کہ جس سے میری اور تم سب کی زندگی برباد ہو۔ اب تو بس برداشت ہی کرنا ہے اور بس۔" قدرے متامل ہوتی بولی۔

"مجھے سکندر سے بہت محبت ہے۔ میں اس کے لیے سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔" اس کے لہجے میں چھپی محبت خود بخود آشکارہ ہو رہی تھی۔ وہ چند ثانیے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی جہاں اس شخص کے لیے محبت کا ایک جہاں آباد تھا جہاں لڑنے مرنے کی بات تو تھی پر محبت سے دستبرداری کی سوچ کا فقدان تھا۔ یعنی وہ "لا یعنی" ضوباریہ اس لاپروا شخص کی محبت میں دل لیے پوری جی جان سے فدا تھی اور اس کے عشق میں ہر گرم و سرد جھیلنے کو تیار۔

"تو پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

☼ ☼ ☼

عورت مرتی ہے اس وقت جب وہ اپنا دل ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیتی ہے جو اس کے وجود اس کے جذبات اس کے عشق سے بالکل نابلد ہو۔ یعنی وہ سب کچھ حق کے ساتھ وصول کرے اور اپنے فرائض کی ادائیگی بھی نہ کرے۔ اور مرد کی یہی خصلت عورت کی موت ہے۔ وہ ضوباریہ تھی مرنے کی پوری جی جان سے کوشش کرنے لگی تھی۔ وہ موم کی طرح قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ یہ محبت اسے اور زیادہ بزدل

بنا رہی تھی۔

شادی کے اولین دنوں میں جب اس نے لیٹ آنے کی وجہ پوچھی تو وہ بے ساختہ بولا تھا۔

"یہ آج تو پوچھ لیا مگر پھر کبھی تمہاری زبان پر ایسی کوئی بات نہ آئے۔ میرے معاملات میں دخل اندازی کی تو پھر اس کا نتیجہ بھگتو گی۔"

یہ ایک جملہ تو نہیں تھا صرف الفاظ نہیں تھے بلکہ یہ تو ایک سنگین دھمکی تھی محبت کو منہ پر مارنے کی۔ اور اس سنگین غلطی کا نتیجہ تو پھر اس عورت کے لیے موت ہی تھا سو چپ چاپ محبت کی مسند پہ بیٹھی دل و جان سے اس شخص کی محبت میں ڈوبتی رہی۔

آج جب موبائل پر عجوہ سے بات کر رہی تھی تو وہ اسے لتاڑنے لگی۔

"کیا ضرورت ہے۔ اس لاپروا اور بے مروت کے لیے خود کو رولنے کی۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ تم اس سے محبت کرو۔ بس صرف زندگی جیو۔ اور سمجھوتہ کرو بلکہ اگر بس میں ہو تو چھوڑ دو اسے۔ میں تو یہی مشورہ دوں گی۔" وہ سخت کبیدہ خاطر تھی اس کی بہن تو اس انسان کے لیے جوگ لیے بیٹھی تھی۔

"اچھا چھوڑ دوں۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"اور جو اس کا بچہ میرے پیٹ میں ہے۔" وہ گویا خود ہی مسرور تھی جیسے اس کا بچہ پیدا کر کے وہ دنیا کا سب سے نرالا انوکھا کام کر رہی تھی۔

"تو پھر دفع کرو۔ مجھے غصہ مت دلاؤ۔" وہ جھنجلا اٹھی۔

"چھوڑو یہ بتاؤ کہ باقی سب کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں اور تم کب آؤ گی۔" وہ برجستہ بولی۔

"جب وہ آنے کی اجازت دیں۔"

"وہ تو کبھی نہیں دیں گے بلکہ مجھے ایسے لگ رہا ہے کہ تم خود ہی آ جاتی ہو۔" وہ مشکوک ہوئی تو وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

اس کی تین نندیں تھیں تینوں سکندر سے بڑی تھیں۔ دو شادی شدہ تھیں جبکہ صائمہ گھر میں بن بیاہی تھی اس کا رشتہ اپنے چچازاد سے طے تھا جو عرصہ دراز سے اٹلی میں مقیم تھا وہ آنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا خیال کیا جاتا تھا کہ اس نے وہاں شادی کر لی تھی لیکن یقینی بات بہرحال نہیں تھی اس لیے صائمہ "وقار" کی امید لیے ماں کے گھر بیٹھی بھابھی پر اپنی بھڑاس نکالتی۔ سوختہ دل لیے وہ اس کی ہر کڑوی کسیلی بات سنتی۔

بیٹی کی پیدائش پر ساس نے برملا کہا تھا۔

"اپنی بہن کو بلوا لو۔ میں خود بیمار ہوں اور صائمہ کا تو تمہیں پتا ہے کہ اسے گھر کے ماحول کی عادت نہیں ہے۔" ناچار اسے عجوہ کو بلانا پڑا تھا۔ وہ آئی تو پہلے تو اس کی سسرالیوں کی شان میں قصیدے پڑھے پھر ان پر لعنت ملامت کی اور پھر اس کے کمرے کی جھاڑ پونچھ اور بچے کی چیزیں سمیٹتی بولی۔

"میں تمہارے لیے سوپ بناتی ہوں اور اپنے لیے چائے۔" وہ جانے لگی تو یکدم سے ضوباریہ کی آواز پر رکنا پڑا۔

"ان کے لیے بھی کچھ بنا لینا۔" اس کی آنکھوں میں التجا دیکھ کر سر اثبات میں ہلاتی چلی گئی۔ پھر سوپ بنا کر اس کو دے کر واپس کچن میں گئی۔ سب کے لیے کھانا بنایا۔

"ملازموں سے کچن کا کام مہارانی نہیں کراتیں تو پھر خود کریں نا۔" وہ اس کی ساس کو کوستی روٹیاں ڈال رہی تھی۔

سکندر کو لفٹ نہ عجوہ نے دی اور نہ ہی وہ اسے گھاس ڈال رہا تھا۔

"توبہ نخرہ کتنا ہے۔ اگر یہ عہدہ چلا جائے تو کیا حیثیت ہوتی اس کی 'کچھ سے بھی بدتر۔" کئی دفعہ آمنا سامنا ہوا بھی تو اس نے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ شام کو جب وہ بچی کے کپڑے بدل کر سلانے لگی ساتھ میں وہ ضوباریہ کے ساتھ باتوں میں بھی مصروف تھی۔ اتنے میں سکندر دروازہ کھول کر اندر آیا۔ یونیفارم میں ملبوس ایک سرسری عام سی نظر ان دونوں پر ڈال کر وہ الماری سے اپنے کپڑے لینے کے لیے آگے بڑھا تو آنکھوں سے اشارے کرتی ضوباریہ نے اسے کپڑے نکالنے کو کہا۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا پر ناچار اٹھنا پڑا۔

"میں نکالتی ہوں۔" الماری کھول کر اس نے کپڑے نکالے۔ اس کے ہاتھ سے کپڑے لے کر وہ باتھ روم چلا گیا۔

"کھانے وغیرہ کا پوچھ لیتا۔"

"حالانکہ کسی کے ساتھ لنچ کر کے آرہا ہو گا۔" وہ تلخ ہوئی۔

"پلیز میری خاطر۔" اس نے التجائیہ کہا۔

"تم پہ تو بندہ فاتحہ ہی پڑھ لے۔" وہ جی جان سے سلگ اٹھی تھی۔

ناراض سی وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ ضوباریہ مسکراتی رہی۔

"غصے میں تو بہت پیاری لگتی ہو۔ اس لیے تو ہر وقت غصہ میں رہتی ہو۔" وہ اسے ناراض نہیں دیکھ سکتی تھی۔

وہ ہنوز بیٹھی رہی۔ سکندر کے واش روم سے نکلتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"بھائی کھانا لگاؤں۔" اسے اپنا آپ انتہائی کمتر حقیر لگ رہا تھا اس وقت۔

"نہیں۔" لٹھ مار جواب دیتا وہ بیوی سے بات کیے اور بنا بچی کو دیکھے موبائل چیک کرنے لگا۔

"چائے لاؤں۔"

"ہاں لے آؤ۔" پھر اسی ـــ بے نیازی سے وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ ایک ملامتی نظر ضوباریہ پر ڈالتی وہ اسے بہت کچھ کہتی چلی گئی تھی۔

"اس قدر پستی میں جینے سے تو اچھا ہے کہ بندہ جیے ہی نہ۔" عجوہ کا جملہ بار بار اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

عجوہ گھر واپس چلی گئی تھی۔ وہ خود گھر کے کاموں میں حصہ لینے لگی۔ ملازموں سے صفائی کرواتی کھانا خود بناتی۔

"کب تک لیٹی رہے گی۔ سیزرین تو نہیں ہے نا۔" اس کی ساس نے خود اس کی ماں سے کہا تھا۔ جو مبارکباد دینے آئی تھیں۔

وہ کبھی خود شاپنگ کرنے نہیں گئی۔ اس کی ساس اس کے لیے جو لے آتیں وہ وہی پہنتی۔

"اپنی بیوی کی عادتیں بگاڑنا مت۔ ایک دفعہ بازار کی لت پڑ گئی تو پھر روکنا محال ہو گا۔" وہ کون سا ماں سے باز پرس کرتا۔ ماں اور بہنوں کی خوشنودی کے لیے کی جانے والی شادی دراصل ایک بہترین فیصلہ ہی تو تھا۔ ایک تو بیوی اللہ میاں کی گائے تھی دوسرا وہ بھی کون سا اس ایک پر اکتفا کرنے والا تھا۔ جو من چاہی عورت ہوتی وہ تو یونہی اس کی جھولی میں آگرتی۔ اس کے عہدے سے زیادہ خطرناک اس کا حسین سراپا تھا۔ اگرچہ یہ خالصتاً" زنانہ تعریف تھی مگر وہ نہایت ہینڈسم تھا۔ چھ فٹ قد ستواں ناک کشادہ پیشانی سفید رنگت گھنے بال ایک بھی نقش ایسا نہ تھا جہاں خامی ہو۔ اپنی خوبصورتی کا احساس اسے شادر رکھتا۔ اپنے عہدے اور دلکش سراپے سے وہ بہت مستفید ہو رہا تھا۔ لیکن یہ نعمتیں کب زحمتیں بن جائیں اللہ ہی جانتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہاری مسز تمہیں کچھ کہتی نہیں ویسے بڑی دریا دل عورت ہے۔ جو ہم جیسی عورتوں کی شراکت گوارا کر لیتی ہے۔" اس کے بستر پر دراز وہ اس کی قربت سے محفوظ ہوتا بڑے خمار آلود لہجہ میں بولا۔

"اس جیسی بیوی صرف گھر آباد کرنے والی ہوتی ہیں۔ دل آباد کرنے والی تم جیسی ہوتی ہیں نا۔" اس کی بات پر وہ بڑے دلیرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"کچھ کہتی نہیں تمہیں۔"

"نہیں اسے اجازت ہی نہیں دی میں نے۔" وہ بڑے فخر سے بولا تھا۔

"بے چاری تمہاری خادمہ۔" وہ کھلکھلائی تو وہ بھی مسکرایا تھا۔ رات کو جب علیشا روتی تو وہ اسے کمرے سے نکلنے کو کہتا۔

"یہ سونے نہیں دے رہی نکلوا سے باہر۔" تمہایت درشتی سے ڈانٹ دیتا وہ ہراساں سی بچی اٹھائے دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ وہ ہر بات سہتی ہر زیادتی برداشت کرتی۔ اس مرد کا ساتھ کیا ملا تھا گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی اسے' اسے اس کے عہدے اس کی دولت کسی بھی چیز سے سروکار نہ تھا وہ تو اس کے عشق میں پور پور ڈوبی غرق ہو چکی تھی۔ دن رات محبت کی آگ میں فنا ہو رہی تھی۔ وہ جتنی بے اعتنائی برتتا وہ اتنا ہی اسے عزیز ہوتا۔

تنخواہ کا ایک بڑا حصہ ماں کے حوالے ہی کرتا کہ گھر کا سارا خرچ وہی چلاتی تھیں اس کا باپ ریٹائرڈ ڈی ایس پی تھا۔ چند سال قبل ہی وفات پائی تھی۔ شوہر کی پنشن اور بیٹے کی تنخواہ وہ اپنے پاس رکھتیں۔

ادھر ضوباریہ کو ذرا ذرا سی چیز کے لیے ساس کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ وہ خود تو جیسے اسے بیاہ کر لانے کے بعد بری الذمہ تھا۔ سب کچھ ماں کی ذمہ داری تھی۔ ساس ہی اسے ماں کے گھر لے کر جاتی تھیں۔ شادی کے بعد سے وہ ایک بار بھی اسے لے کر نہیں گیا تھا۔ سسرالیوں سے اس کے تعلقات نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ بھی دل پر جبر کیے بیٹی کی وجہ سے خاموش تھے کہ بیٹی کو گھر بٹھانا بھی مقصود نہ تھا۔ اس کے سامنے وہ موبائل پر غیر عورتوں سے باتیں کرتا۔ وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتی پر عجوہ کے سامنے کہے بنا نہ رہ پاتی تھی۔

آج جب وہ ماں کے گھر آئی تو عجوہ کے سامنے اشک بہاتے اس کی بے وفائی کی باتیں کیے جا رہی تھی۔

"میں نے تو نہیں کہا تھا کہ ہمارے گھر رشتہ کرو۔ اگر رشتہ کیا ہے تو اپنی مرضی سے کیا ہے اس میں میرا قصور تو نہیں ہے نا وہ میرے سامنے دوسری عورتوں سے باتیں کرتا ہے ان کے پاس جاتا ہے ان کے لیے گفٹ لاتا ہے۔ میں روز خود کو جوڑتی ہوں اور روز خود کو ٹوٹا دیکھتی ہوں کیا ہماری زندگی ایسے گزرے گی۔" وہ جس کرب و اذیت سے گزر رہی تھی عجوہ کو اس کا اندازہ تھا۔ وہ تحمل سے بولی۔

"تبھی تو کہتی ہوں وہ کمینہ محبت کے لائق نہیں ہے اپنے خالص جذبے اس پر مت لٹاؤ وہ اس قابل ہے کہ تم اس کے لیے اپنے آنسو بہاؤ؟ یہ آنسو بہانے کے بجائے اگر تم اس کو دو چار سناتیں تو اس کی ہمت نہ ہوتی اس قدر کمینگی دکھانے کی۔" وہ اس کی بات کاٹتی یکدم بولی۔

"کیا میں ایسا کر سکتی ہوں؟ وہ تو کھڑے کھڑے مجھے اپنی زندگی سے نکال دے گا پھر میں اس کی بچی کو لے کر کہاں جاؤں گی اور پھر میں خود زندہ رہ بھی پاؤں گی یا نہیں۔" وہ ایک بار پھر بلکنے لگی۔

وہ اسے تسلی دلاسے دینے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ مرد کبھی سدھرنے والا نہیں۔ یہ عورت خوامخواہ اس بے درد انسان کے لیے اپنے قیمتی آنسو ضائع کر رہی تھی وہ اس کی محبت میں اندھی کسی بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہی تھی۔

باپ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

"لو آج ہماری بیٹی کیسے گھر کا راستہ بھول گئی۔" اسے ساتھ لگائے وہ ہاتھ میں تھامے پھلوں کے شاپرز راشدہ کو تھمانے لگے۔

"سکندر کیسا ہے؟" لقمان صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس کے سسرالیوں کے بارے میں رسماً" پوچھنے لگے تھے۔

"ٹھیک ہیں سب۔" پھر دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ بے کیف دن راتیں گزر رہی تھیں۔ جب اچانک سکندر کا ٹرانسفر کسی دوسرے شہر ہو گیا تھا۔

رات کو وہ اس کے بارے میں جب بات کرنے کے لیے اپنی ہمت مجتمع کرنے لگی تو اس کے قریب جاتے ہی جیسے اوسان خطا ہوئے تھے۔ قدرے ہچکچاتے وہ اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

"آپ صبح جائیں گے۔" بات شروع کرنی خاصی مشکل لگ رہی تھی۔

"نہیں پرسوں" وہ بستر پر دراز دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھے بولا۔

"کیا آپ ہمیں اپنے ساتھ لے کر جائیں گے؟"

اس کے سوال پر یکدم سے آنکھوں پر سے بازو ہٹاتا وہ قدرے اچنبھے سے بولا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں تمہیں لے کر جارہا ہوں۔" وہ اس کی آواز اس کے لہجے سے ہمیشہ ڈر جایا کرتی تھی۔ اس سے بھی وہ جیسے کانپ کر رہ گئی۔

"میری ماں جہاں ہوگی وہاں تم بھی ہوگی۔" اس کا ایک جملہ اس کی اوقات کا تعین کر گیا تھا وہ اٹھنے لگی تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پاس بٹھاتے بولا۔

"پاؤں دباؤ اور پھر ایک گلاس دودھ لے کر آنا۔" وہ اس کے حکم کی تکمیل میں جت گئی تھی۔ وہ چوری چوری اسے دیکھتی جتنا وہ اسے نظر انداز کرتا اتنا وہ اس کے اور قریب ہوتی جاتی۔

وہ اسے آکاش اور خود اپنا آپ ایک ذرے کی مانند دکھ رہا تھا۔ تو کبھی آکاش اور ذرہ مل پائیں گے؟ لا متناہی سوچ کا تسلسل اسے بہت آگے خیالوں کی دنیا میں نکال لے گیا تھا۔ اس مرد کی بے رخی دل پر قابض ہو رہی تھی اس بے رخی میں ہی تو جینے کا مزا تھا اس پگلی عورت کے لیے۔ خود ساختہ زندگی کے نشے میں چور وہ ابھی بھی اس مرد کو چوری چوری دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کے جانے کے کچھ دن بعد عجوہ ان کے ہاں آئی تھی۔ اس کی ساس اور نند بازار گئی تھیں اس وقت وہ دونوں گھر پر اکیلی تھیں۔ عجوہ بے پروا انداز میں کھل کر باتیں کیے جارہی تھی۔

"تم نے ہمیشہ کی طرح اب بھی نہیں کہا ہوگا کہ وہ اپنے ساتھ تمہیں لے کر جائے۔" عجوہ بے یقین تھی اس کی بات پر دھیمے سے مسکراتے بولی۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں نے نہیں کہا ہوگا" کچھ پل بعد وہ پھر سے کہنے لگی۔

"میں نے کہا تھا مگر وہ کہنے لگے کہ جہاں اماں ہوں گی وہاں تم رہو گی"

"تو کیا شادی اس کی اماں سے ہوئی ہے، تمہیں بے وقوف سمجھ رہا ہے وہ بلکہ سمجھ کیوں رہا ہے تم تو بنی بنائی بے وقوف ملی ہو اسے کس قدر خاموشی سے نکل گیا تمہیں یہاں چھوڑ کر" اس کو اشتعال میں آتا دیکھ کر وہ یکدم سے بولی۔

"چلو کچن میں جا کر چائے اور ساتھ میں کچھ کھانے کو بنا لیتے ہیں۔" خوش دلی سے کہتی وہ اٹھی تو علیشا کو گود میں اٹھا کر وہ بھی اٹھ گئی۔ کچن میں آکر چائے کا پانی چولہے پر چڑھا کر وہ کباب نکال کر تلنے لگی۔ وہ ضوباریہ پر ایک گہری نظر ڈال کر بولی۔

"علیشا کے کپڑے وہی خریدتی ہیں نا۔"

اس کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ بے ساختہ بولی۔

"اپنے لیے کس قدر مہنگے کپڑے لیتی ہیں اور تمہارے اور تمہاری بچی کے لیے سستے۔" وہ اس کو عقل دلانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

"اس لیے تو متوسط طبقے کی لڑکی بیاہ کر لائے جو مرضی کریں کوئی کچھ کہنے والا نہیں۔ اگر کسی بڑے گھرانے کی گستاخ سی بہو ہوتی تب انہیں پتا چل جاتا۔" وہ دانت چباتی بولی۔

کچن کی ٹیبل پر کباب کی پلیٹ اور چائے کے کپ رکھ کر وہ بیٹھ گئی اور ایک مجروح مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتی بولی۔

"تم اپنا دل کیوں جلاتی ہو یہ میری قسمت ہے یہ سب بھگتنا ہے مجھے" اس کے چہرے پر ایک مجروح سا تاثر ابھرا تھا جسے عجوہ نے بہت غور سے دیکھا پر اس وقت یہ نہیں جانتی تھی کہ قسمت اور تقدیر کے فیصلے بڑے عجیب ہوا کرتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"تم آج آؤ گی نا۔" وہ اس کی ملتجی آواز سن رہی تھی مگر اپنے دل کا کیا کرتی جو کسی طور جانے پر رضامند نہ تھا۔

"آج مشکل ہے نا کچھ دن بعد آجاؤں گی۔"

"سالگرہ آج ہے۔" وہ اڑی تھی۔

"میری مجبوری تمہیں سمجھو گی۔" وہ بھی شکوہ کناں ہوئی۔

"تو کوئی وجہ بھی ہو نہ آنے کی۔" وہ بھی بضد تھی۔

"وہ دراصل سکندر آج آنے والا ہے۔" اس کے

انکار کی وجہ اب سمجھ میں آئی تھی۔

"اوہ تو اس لیے مسلسل انکار ہو رہا ہے۔" وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔

"نہیں میرا مطلب ہے کہ میں کیسے۔"

"تو مت آؤ۔ اسی شخص پر قربان ہوتی رہو۔ جو سب سے قابل نفرت ہے شدید نفرت ہے مجھے اس سے۔" اس نے کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔

ریسیور کریڈل پر رکھے وہ نا سمجھی کی کیفیت میں گھری کھڑی رہی تھی۔ بوجھل دل لیے وہ دل سوختہ سی ٹیرس پر آئی آسمان پر گھنگھور گھٹائیں پھیلتی جارہی تھیں مستانی سی ہوا کے ساتھ اکا دکا قطرے بھی گر رہے تھے۔ کچھ منچلے پتنگ اڑا رہے تھے آسمان رنگا رنگ پتنگوں سے سجا تھا۔

وہ اپنے خیالات میں الجھی ہوئی تھی کہ۔

کچھ دیر میں گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور ادھر ضوباریہ کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا تھا۔ اسے ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے وقت رک گیا ہو۔ کائنات میں چلتی ہر چیز رک گئی ہو اور اگر کہیں کوئی آواز آبھی رہی ہے تو وہ صرف اور صرف اس کے دل کی دھڑکن کی ہے اور اس کے دل کی دھڑکن کو تہس نہس کرنے والا اس کے وجود کو عشق کی چنگاری لگانے والا آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ماں کے کمرے میں تھا۔ اس نے دل سے ڈنر تیار کیا تھا۔ ڈنر سے فراغت کے بعد جب چائے پی جارہی تھی۔ وہ سب لاؤنج میں ہی تھے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا انتظار کر رہی تھی مگر وہ ہنوز وہیں بیٹھا تھا تنگ آکر اس نے عجوہ کو کال کی۔ جو اس نے کافی دیر بعد وصول کی۔

"کیا ہے۔" وہ جیسے چیخی تھی۔ ضوباریہ بے ساختہ مسکرائی۔

"ابھی تک ناراض ہو۔"

"ہاں۔" اس نے قدرے ڈھٹائی سے کہا۔

"معاف نہیں کر سکتیں۔"

"نہیں۔"

"نہیں۔" اس نے کرب سے دہرایا۔

"بس ٹھیک ہے جاؤ اپنے شوہر صاحب کی خدمت کرو۔" اس نے فون کاٹ دیا ہلکا سا مسکراتی اس نے فون رکھ دیا۔

علیشا کو فیڈر دے کر پیمپر تبدیل کروا کر سلا دیا اور پھر عشا کی نماز پڑھ کر دعا مانگنے لگی۔ اس کی ساری دعا سکندر سے شروع ہو کر سکندر پر ختم ہوتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ جوتے اتارنے کے لیے وہ بیڈ کنارے بیٹھا تو یکدم سے آگے بڑھ کر اس نے اس کے جوتے اتارے پھر کچھ متامل سی بے اختیار اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ یہ ایک مہینہ اسے ایک صدی کے برابر لگا تھا۔ ایک دن بھی تو نہیں گزار سکتی تھی اس کے بغیر کجا کہ ایک مہینہ۔ وہ جو ہمدردی' محبت' کے دو بول سننے کی متمنی تھی اس کی زبان سے ایک لفظ محبت بھرا نہ سن پائی تھی۔ یہ بدنصیبی ہی تو تھی اس کی جس پر مرنے کو تیار تھی وہ دو حرف تک کہنے کا روادار نہ تھا۔ وہ عورت کو ایک ہی نظر سے دیکھتا تھا سمجھتا تھا اور وہی ایک نظر اس عورت کے لیے بھی تھی۔

"میں بہت اداس تھی۔" وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔

"میرا ایک دن بھی نہیں گزر رہا تھا آپ کے بنا۔"

وہ اب بھی خاموش تھا۔

"علیشا کیسی ہے؟" اس کی ذات اس قدر غیر اہم تھی وہ چونکی پھر سنبھلی اور کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس کے چہرے سے تکان ظاہر ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی شیو بے اختیار اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتی وہ اس کے ماتھے پر بوسہ دیتی بولی۔

"آپ کو میری یاد آئی؟"

"میں وہاں جاب کروں گا یا تمہیں یاد کروں گا۔" وہ تمسخر اڑاتا بولا۔

"پلیز ناراض نہ ہوں میرے منہ سے شاید کچھ غلط نکل گیا۔" وہ سراسیمہ سی بولی۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔" سرعت سے بیڈ سے اٹھتا وہ کپڑے چینج کرنے چلا گیا۔ پھر تین چھٹیاں کیسے گزریں پتا ہی نہ چلا۔ وہ پاگلوں کی طرح اس کے اردگرد منڈلاتی رہی۔ اس کے پاؤں کی دھول بنی رہی وہ خاک تھی اور خاک ہونے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ ایک بار پھر پریگنینٹ تھی۔ جب عجوہ کو پتا چلا تو خوب لڑی اس سے۔

"تمہیں ضرورت ہی کیا تھا اتنی جلدی' وہ کیسا شوہر ہے دیکھ رہی ہو پھر بھی۔" اسے سمجھ نہ آرہی تھی کہ کیا کر ڈالے۔

"علیشا پورے تین سال کی ہو چکی ہے۔ اب وہ چاہ رہا تھا تو پھر میں کیسے انکار کرسکتی تھی۔" اس نے وضاحت دی تھی۔

"نہیں میں یہ قطعی ماننے کو تیار نہیں کہ یہ اس کی خواہش پر ہے۔" وہ ابھی بھی ناقابل یقین نگاہوں سے دیکھے جارہی تھی۔

راشدہ بیگم جو سبزی کی ٹوکری لیے ادھر ہی آرہی تھیں عجوہ کو لتاڑنے لگیں۔

"یہ تم کیا اس کو گھر تباہ کرنے کے گر سکھاتی ہو۔" وہ تو انہیں زچ کیے دے رہی تھی۔ صبر نہ آیا تو جیسے پھٹ پڑیں۔

"یہ اس کا اور اس کے شوہر کا معاملہ ہے تم بیچ میں مت بولو۔"

"تو گھلتی رہے پھر۔" پیر پٹختی وہ اٹھ کر کمرے سے چلی گئی۔

"خبردار اس کی باتوں میں نہ آنا اگر تم نے اس کی ایک بھی بات سن لی تو بس گیا تمہارا گھر۔" راشدہ بیگم بہت نالاں تھیں اس سے۔

"یہ باقی دو کہاں غائب ہیں؟" وہ زینب اور فاطمہ کا پوچھنے لگی۔

"ٹی وی کے آگے بیٹھی کوئی ڈرامہ رٹ رہی ہیں۔" راشدہ طنز کرتی گویا سارا غصہ کریلوں پر نکالنے لگیں۔

"اماں یہ مجھے دیں میں چھیل دوں گی۔" راشدہ کے ہاتھ سے چھری لے کر وہ کریلے چھیلنے لگی۔

"میں گوشت چڑھا کے آتی ہوں۔" وہ کچن میں چلی گئیں تھوڑی ہی دیر میں عجوہ علیشا کو اٹھائے باہر آئی۔

"جاگ گئیں محترمہ' فیڈر پی کر بولی مما کے پاس جاؤں گی۔" علیشا کی نقل اتارتی اسے گود میں بٹھا کر اس کے ساتھ کھیلنے لگی۔ ضوباریہ مطمئن سی کریلے چھیلنے میں مصروف ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

کالج سے گھر آتے ہوئے وہ اپنی دھن میں مگن راستہ طے کررہی تھی کہ راستے میں سکندر کو گاڑی میں گزرتے دیکھا۔ اس کی گاڑی کے آگے پیچھے گاڑیاں پوری رفتار سے بھاگ رہی تھیں۔

"اوہو بھائی صاحب آج پہنچ گئے یہاں۔" وہ تیز تیز قدموں سے راستہ طے کرنے لگی۔ گھر پہنچی تو جیسے ایک قیامت اس کی منتظر تھی وہ ہوا تھا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا اور جو ہوا تھا وہ ہرگز بھلائے جانے والا نہ تھا۔

ہر آنکھ اشکبار تھی اس کی جواں موت پر ہر ایک لرز کر رہ گیا تھا۔ دوسرے بچے کی پیدائش پر جانے کیا پیچیدگی ہوئی کہ اس ناگہانی سانحہ سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ وہ تو جیسے صدمے سے نڈھال تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کا ہنستا۔ کھلکھلاتا وجود منوں مٹی تلے جاسویا تھا۔ ماں باپ الگ نڈھال پڑے تھے۔ علیشا تو بس روتے ہوئے ماں کے پاس جانے کی ضد کیے جارہی تھی۔ عجوہ نے آج تو اس شخص کی آنکھیں بھی نم دیکھی تھیں جس نے سب سے زیادہ ناقدری کی تھی اس عورت کی۔ اس وقت تو وہی اسے اس کا قاتل لگ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کا گریبان پکڑ کر اس کا محاسبہ کرے۔ وہ اسے اس بدروح کی مانند لگ رہا تھا جو اس کی زندہ بہن کو سالم نگل گیا ہو۔

زندگی جیسے جمود کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ کئی دن تک سکتے کی سی حالت میں رہی تھی۔ لیکن ماں باپ کی خاطر دل کو سنبھالنا پڑا تھا۔ پھر وہ ماں کو دلاسا دینے والی چٹان بن گئی۔ گزرتے دن رات خود ہی مرہم لگائے جارہے تھے۔ دکھ کی آمیزش بھرے دن اس وقت بہت بھاری لگ رہے تھے۔ اب ایک زندگی سے جڑی کہانی تو ٹوٹ گئی تھی مگر ایک اور زندگی سے جڑنے کی کہانی شروع ہونے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

"وہ تو سب کو اداس مغموم کرکے چلی گئی تھی پر اپنی دو نشانیاں ان سب کے لیے چھوڑ گئی تھی علیشا اور نومولود علینہ۔ ان کے گھر میں سناٹے بول رہے تھے۔ یہ سناٹے طویل ہوتے اگر الفت نہ آتیں اور ان کے اعصاب پر ایک اور بم نہ پھوڑتیں۔

"یہ سوچا بھی کیسے انہوں نے۔" جب اس نے سنا تو دنگ رہ گئی تھی۔

"لو اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ لوگوں نے تو مجھے کہا کہ اپنی بیٹی کی بات کرو بچوں کو خالہ ماں بن کر پالے گی۔"

"جنہوں نے مشورہ دیا ہے ان سے کہیں کہ وہ اپنی بیٹیاں دیں۔ میرا سوچیں بھی مت۔" دوٹوک انداز اختیار کرتی وہ اس موضوع پر کوئی بات سننے پر تیار نہ تھی۔

"مسئلہ کیا ہے پڑھائی تمہاری مکمل ہے پھر بچیوں پہ اگر کوئی غیر عورت آگئی تو ظلم کے پہاڑ توڑ دے گی ان پر۔"

"پر مجھے وہ شخص کسی بھی طور قبول نہیں ہے۔" وہ حتمی انداز میں بولی۔

"تو یہ انکار اپنے باپ کے سامنے کرنا۔"

"امی آپ ایک بیٹی اس پر قربان کرکے اب دوسری قربانی کے لیے پیش کریں گی۔" وہ ناقابل یقین نگاہوں سے تکے جارہی تھی۔

"دیکھو بیٹا اس کو تو ہزاروں لڑکیاں مل جائیں گی مگر ایسا رشتہ ہمیں نہیں مل سکے گا۔"

"کیا اچھائی ہے ان لوگوں میں۔"

"تو برائی بھی اتنی نہیں ہے۔"

"وہ ایک بدکردار مرد ہے۔" اس نے برملا کہا تھا۔

"ہر مرد ہوتا ہے۔"

"ہر مرد نہیں ہوتا۔"

"چھپا ہوتا ہے اس لیے قابل بھروسہ لگتا ہے۔" راشدہ اپنے موقف سے ہٹنے پر تیار نہ تھیں۔

"فلرٹ کرنے میں اور بدکرداری میں فرق ہوتا ہے۔" وہ بھی سنجیدگی سے بولی۔

"ٹھیک ہوجائے گا جب بچے بڑے ہوتے ہیں تو ماں باپ خود بخود سنبھل جاتے ہیں اور پھر وہ اعلا عہدے پر فائز ہے۔ قصور اس کا نہیں لڑکیوں کا ہے جو خود کو اس قدر ارزاں کرتی ہیں۔" ماں کسی صورت اس کا موقف ماننے پر تیار نہ تھی لیکن یہ معاملہ اس وقت شدت اختیار کرگیا جب الفت نے کہا۔

"اگر تم اپنی بیٹی دینے پر تیار نہیں تو اپنی نواسیاں یہاں اپنے گھر لے آؤ۔ غیر لڑکیاں تو انہیں نہیں رکھیں گی۔" ان کی اس قدر ڈھٹائی پر راشدہ بیگم تلملاتی ہوئی بولیں۔

"بہن کچھ وقت سوچنے کے لیے دیں ہم فیصلہ کر کے.....۔"

"فیصلہ ہمارے حق میں ہونا چاہیے۔ مجھ سے اب بچیاں نہیں سنبھلتیں۔ جلدی کرو' دیر نہ ہوجائے۔" جاتے جاتے بھی وہ دھمکا گئیں۔

"دیکھا آپ نے' کیسے دھمکا رہی ہیں۔ زبردستی کررہی ہیں وہ ـــــ۔" عجوہ طیش میں آکر بولی۔

"خدا کے لیے مجھے پاگل مت کرو۔" پھر روتے ہوئے بولیں۔

"نہ تو تمہیں میرا خیال ہے نہ ان پھول سی بچیوں کا اگر تمہیں اپنی بہنوں کا اور ماں باپ کا خیال ہوتا تو فوراً ہاں کردیتیں۔ پر تمہارے جیسی خودغرض اولاد تو اللہ دشمن کو بھی نہ دے۔" ماں کو سنے لگی تو وہ دل گرفتہ سی وہیں بیٹھتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"تم بھی اس شخص کی طرف داری کرو گی۔" رباب کی بات پر وہ حیرت سے دیکھنے لگی۔

"نہیں میں تو ایک سیدھی بات کر رہی ہوں۔ اگر کوئی بھی دوسری عورت آئی تو وہ تمہاری بھانجیوں کے ساتھ کیا کرے گی اس کا اندازہ تو تمہیں ہو گا اگر تمہارے ماں باپ ایسا کرنے کو کہہ رہے ہیں تو اس میں برائی بھی نہیں ہے۔ کبھی کبھار ہمیں کچھ فیصلے دوسروں کی خاطر بھی کرنے پڑتے ہیں باقی تم خود سمجھ دار ہو۔" رباب اس کی دوست کو اس کی ماں نے اسے سمجھانے کے لیے بلایا تھا لیکن فیصلہ اس وقت ہوا تھا جب اس کے باپ نے بنا اس سے پوچھے ہاں کر دی تھی۔

قسمت کی ستم ظریفی ایک بہن گھر سے نکلی تو دوسری ایک جوڑے میں وہاں آئی تھی۔ یہ شادی تو نہ تھی ایک سودا تھا جوان بچوں کی خاطر کیا گیا تھا شادی کی پہلی رات جیسا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہی کمرہ وہی لوگ بالکل عام سا دن عام سی رات شادی ایسی تو نہیں ہوتی۔ اس کمرے میں ضوبار یہ ہوتی تھی اور اب وہ اس کے بستر پر یکدم سے اس کے اندر کچھ ٹوٹا تھا دل رو رہا تھا پر آنکھیں خشک تھیں۔ اس مرد کی بے التفاتی نے تو مارا تھا اسے۔

"قسمت کی مار اب کی بار ہمارا مقدر نہیں بنے گی اب تمہاری باری ہے سکندر اب تم تیار ہو جاؤ۔"

وہ اندر ہی اندر زہر اتار رہی تھی۔ کھٹکے کی آواز پر بے ساختہ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہ بڑا کھلا کھلا لگ رہا تھا۔ کسی اداسی کا شائبہ تک نہ تھا اس کے چہرے پر۔ اس کے وجود پر ایک قہرانی نگاہ ڈال کر وہ ایک مہینے کی بچی کو اٹھا کر بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔ علیشا نوڈلز کی فرمائش کرنے لگی تھی وہ علینہ کو بیڈ پر لٹا کر علیشا سے بولی۔

"آؤ میں بنا دوں۔" وہ کافی دیر تک کمرے میں لیٹا ٹی وی دیکھتا رہا۔ کچھ ہی دیر میں علیشا اس کے ہمراہ آئی تو اسے دیکھ کر وہ بولا۔

"علیشا تم جاؤ دادی کے پاس سو جاؤ۔"

"نہیں میں خالہ کے پاس سوؤں گی۔"

"کہا نا دادی کے پاس۔" اس کا اصرار اس عورت کے جسم و جان میں آگ دہکا رہا تھا۔

"چلو علیشا دیر ہو رہی ہے ہم سوئیں گے ابھی۔" علیشا کو بیڈ پر لٹا کے وہ خود کنارے پر لیٹ گئی تھی۔ دوسرے کنارے پر لیٹا وہ جیسے کشمکش و پیچ میں جتلا کچھ پل حیرانی سے اسے دیکھتا رہا پھر بنا کچھ کہے ٹی وی پر نظریں جما کر پروگرام دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے دیکھا وہ تینوں گہری نیند سو رہی تھیں۔

صبح علیشا کو تیار کر کے اسکول دادی کے ساتھ بھیجا اور پھر کمرے میں واپس آ کر علینہ کو فیڈر پلانے لگی۔ نیند سے بے دار ہو کر اس نے کسلمندی سے آنکھیں کھولیں تو اسے دیکھتا بولا۔

"ناشتا تیار ہے کہ نہیں؟"

"نہیں۔"

"اور میرے کپڑے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس کا جواب تو تمہارے پاس ہو گا۔" پُرسکون سے انداز میں دیکھتی وہ بولی۔

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو مجھ سے۔"

"کیوں تمہارا ادھار لیا ہے میں نے۔" اب کے وہ بھی ترشی سے بولی۔

"ناشتا بناؤ۔"

"اپنی بہن سے کہو۔"

"تمہیں کیوں نہیں۔"

"کیونکہ میں تمہاری ملازم نہیں ہوں۔"

"تو پھر یہاں کر رہی ہو؟" وہ اب کی بار اٹھ بیٹھا تھا اس کی نیند اڑ گئی تھی۔

"میں ان بچوں کی ماں ہوں یہی ہے نا شادی کی وجہ۔ تم یا تمہارے گھر والے میری ذمہ داری نہیں اس لیے مجھ پر حکم چلانے کے بجائے اپنے گھر والوں کو زحمت دو۔"

اس کی اس قدر زبان درازی نے تو اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ سنجیدگی سے بستر سے اترا۔

"تو رات کو سارا پلان شدہ تھا۔"

"ہاں یہی سمجھ سکتے ہو۔"

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے مدمقابل آیا تھا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"تمہاری بہن نے نہیں بتایا تھا کہ میں کیسا ہوں؟"

"نہیں تم اتنے اہم نہیں ہو کہ ہر کوئی ہر وقت تمہاری ہی باتیں کرے۔"

اس نے بھی بڑی بے خوفی سے کہا تھا۔

علینہ کو فیڈر پلا کر بڑے اطمینان سے لٹا کر اسی مطمئن سے انداز میں اس کے قریب سے ہو کر باہر نکلتی چلی گئی۔ وہ مرد اس وقت بالکل بت بن گیا تھا۔ اس کی پوسٹنگ ان دنوں اسی شہر میں تھی گارڈ ہر وقت ڈیوٹی پر تعینات رہتے، سرکاری بنگلہ تھا سیکورٹی سخت تھی۔ قریب ہی دفتر تھا اس لیے اکثر وہ گھر بھی آ جاتا۔ جب وہ لگاتار بہن سے ناشتا، کھانا مانگنے لگا تو وہ بولی۔

"یہ تمہاری بیوی کہاں ہے؟" صائمہ کڑے تیور لیے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ مہارانی کچھ زیادہ نہیں بن رہی۔" کچن میں ماں کو داخل ہوتے دیکھ کر وہ اب ماں سے مخاطب تھی۔

"جاؤ بول کے آؤ کہ سکندر کے لیے ناشتا لگائے۔" الفت نے بیٹے کو دیکھ کر حتی الامکان لہجہ نارمل رکھا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ منہ لٹکا کر واپس آئی تھی اس کا چہرہ شرمندگی کے مارے کچھ سرخ تھا۔

"کیا ہوا آئی نہیں وہ۔"

"کہہ رہی ہے کہ تم دونا بہن ہو اس کی اور اگر تم یہ ذمہ داری نہیں اٹھا سکتیں تو پھر بھائی سے کہو کہ ملازم رکھ دے کھانا بنانے کے لیے۔" اس کی بات پر الفت بھڑک اٹھی تھیں۔

"سنا تم نے یہ لڑکی تو مجھے بالکل ٹھیک نہیں لگ رہی۔ جب سے یہاں آئی ہے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہے۔" اس کی ماں بھی ناراض لگ رہی تھی۔ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا وہ پرسوچ انداز میں قدم اٹھاتا کمرے میں آیا۔

وہ علینہ کو سلائے خود کسی کتاب میں غرق تھی۔ وہ اس کے سر پر کھڑا چند لمحے تک تو اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"آج علیشا کو امی کے کمرے میں سلا دینا۔"

"علیشا میرے ساتھ سوئے گی۔"

"میں نے کہا وہ سنائی نہیں دیا تمہیں۔"

"نہیں کیونکہ نہ تو میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں نہ تمہاری کوئی بات سننا چاہوں گی۔"

کتاب اس کے ہاتھ سے چھین کر وہ نہایت تلخی سے بولا۔

"اپنی اوقات بھولی بیٹھی ہو یہ مت بھولو کہ تم کیا حیثیت رکھتی ہو۔"

"ہاں حیثیت کا تعین تو کیا ہے میں نے، تبھی تو تمہارے ساتھ بولتی ہی نہیں۔" ایک گہرا وار کر کے وہ چادر خود پر ڈالتی بات ہی ختم کر چکی تھی۔ آنے والے دنوں میں یہ ثابت ہو چکا تھا کہ وہ کیا ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے۔ وہ عورت بہت اچھی طرح سمجھانے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ تکونی زندگی جی رہی تھی۔ یہ تکون مجموعہ علیشا، علینہ پر مشتمل تھا۔ یعنی اس مرد کی تو کوئی اوقات ہی نہ تھی کہ وہ اس تکون کے حصار تک پہنچ ہی پاتا۔ اسے اپنا آپ بہت غیر اہم محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ جو ہر وقت سراہے جانے کے شوق میں مبتلا تھا اسے اپنا آپ نظر انداز کرنا سخت کھل رہا تھا۔ یعنی جو کچھ وہ دوسرے کے ساتھ کرتا تھا اب وہ اس کے ساتھ ہونے لگا تھا۔ وہ لڑکی اسے جتلا رہی تھی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ اس کا وجود اس کے لیے نہ ہونے کے برابر ہے۔ اتنا غیر اہم تو کبھی نہیں رہا تھا وہ۔

صبح وہ خود اٹھ کر تیار ہوتا وہ علیشا کو تیار کرتی اسے

ناشتا کروا کر اسکول روانہ کر دیتی اس کی ماں اور بہن اس سے بہت نالاں تھیں۔ اس کا رویہ ان کے ساتھ بھی اچھا نہ تھا۔

"لڑکی میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اپنے شوہر کے کھانے پینے کپڑوں کسی بھی ضرورت کا خیال نہیں رکھتیں ۔۔۔ اس لیے تو تمہیں نہیں لے کر آئی تھی کہ تم مہارانیوں کی طرح بیٹھی شان سے رہو۔"

وہ بڑے جلے دل سے کہہ رہی تھیں جبکہ وہ بڑے مطمئن سے انداز میں بولی تھی۔

"پوتیوں کے لیے ہی تو لائی تھیں نا آپ مجھے وہ ذمہ داری میں بہت اچھی طرح نبھا رہی ہوں اور کیا چاہیے آپ کو۔"

"دیکھا کیسے جواب دے رہی ہے مجھے۔" وہ تو ہتھے سے اکھڑ گئی تھیں۔

"اس کی بہن تو اس جیسی ۔۔۔ نہیں تھی وہ تو بہت با اخلاق ملنسار تھی مجھے کیا خبر تھی کہ یہ آفت ہے پوری کی پوری۔ میری تو توبہ جو اس بلا کو بیاہ لے آئی۔"

"ہاں اسی نیک پروین کی چاہ میں ہی تو ہمارے گھر آئی تھیں آپ تاکہ دوسری پر بھی اسی طرح کے ظلم کے پہاڑ توڑ کر دوسری سے بھی دنیا پاک کر دیں۔"

اس کے اس قدر سچائی پر مبنی بات پر وہ پہلو بدل کر بولیں۔

"تو کیا میں نے مارا تھا اسے۔ مجھے کیوں کوس رہی ہو کیا کمی تھی اسے یہاں" الفت بھڑکتی اپنے حواس خطا کیے جا رہی تھیں۔

"ہر چیز کی کمی تھی محبت کی، دوستی کی، رشتوں کی، دولت کی، اس کے لیے تو ہر چیز ناپید تھی۔" وہ حقیقت دکھانے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔

"آپ سب ٹی وی دیکھنے دیں گے مجھے۔" قدرے جھنجلائے انداز میں ان کو روک کر وہ چلایا تھا۔ اس کے جاتے ہی ماں اس کے قریب بیٹھ کر بولیں۔

"بہت دھوکہ کھایا میں نے، میں تو سمجھی تھی کہ یہ بھی بہن کی طرح سعادت مند ہوگی مگر یہ تو پوری پٹاخہ ہے۔" وہ بنا کچھ کہے نگاہیں ٹی وی اسکرین پر جمائے کہیں اور تھا۔

☆ ☆ ☆

"تو آج آپ کو ہماری یاد آ ہی گئی۔" اس کے آنے پر نازنین نے بڑی دلکش مسکراہٹ سے اسے ویلکم کیا تھا۔

"ہاں بس کچھ طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

"ارے واہ ایسی حالت میں تو تمہیں اپنی بیگم کے پاس ہونا چاہیے تھا نہ کہ ہمارے پاس۔"

عالیشان کشادہ لاؤنج کے صوفے پر اس کے انتہائی قریب بیٹھی وہ بڑے عاشقانہ انداز میں کہے جا رہی تھی۔

"اگر اس کے پاس ہوتا تو پھر یہاں آتا؟" اس نے قدرے سنجیدگی سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"یہ بھی پسند نہیں ہے کیا؟"

پھر کچھ دیر بعد بولی۔

"اگر یہ بھی پسند نہیں تو پھر ہم سے شادی کیوں نہیں کر بیٹھتے۔ روز کا آنا جانا ختم ہو جائے گا۔" آج جانے کیوں نازنین کی باتیں بھی کچھ خاص بھلی نہ لگ رہی تھیں ۔۔۔ وہ بے دلی سے اٹھا۔

"کیوں اتنی جلدی۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

"میں گھر جاؤں گا۔" یہ کہتے ہی وہ سیدھا نکلا تھا۔

وہ ایک اڑیل گھوڑے کی مانند سرکش زندگی کی لگام تھامے اپنی مرضی کی دوڑ لگائے ان میں سے ہر ایک کو پیچھے چھوڑنے کی تگ و دو میں تھی۔

شام کو ۔۔۔ گرم چائے کا کپ لیے جب وہ لاؤنج میں آئی تو الفت کو سکندر کے پاس بیٹھے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی کافی دیر بعد جب وہ باہر نکلی تو ہنوز وہ دونوں وہیں بیٹھے ٹی وی کے کسی پروگرام پر تبصرہ کر رہے تھے۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" اس کی بات پر یکدم سے رخ موڑ کر سکندر نے اسے دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اپنی آواز اسے خود اجنبی لگی تھی۔

"تو کہو نا کیا چھپ کر بیٹیاں پڑھانا چاہتی ہو۔" اس کی ساس نے فوراً کہا تھا۔

"آپ سے بات نہیں کر رہی میں۔" نہایت ترشی سے کہتی وہ ایک بار پھر سکندر کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

"علیشا کو میں کسی اچھے اسکول میں ڈالنا چاہتی ہوں۔ یہ اسکول مجھے پسند نہیں ہے۔"

"اے بی بی کیا کہہ رہی ہو اچھا خاصا تو ہے۔ لڑکی ذات ہے کون سا ہم نے اسے کمشنر لگوانا ہے جو مہنگے مہنگے اسکولوں میں پڑھائیں لڑکا تھوڑی ہے جس نے خاندان کو چلانا ہے۔" ان کی جاہلانہ باتیں اسے سخت ناگوار لگ رہی تھیں۔ تبھی تاثرات بنا چھپائے بولی۔

"میں نے آپ سے مشورہ نہیں مانگا اس کے باپ سے پوچھ رہی ہوں۔"

"دادی ہوں میں اس کی، میں فیصلہ کروں گی۔" وہ سلگ ہی تو گئی تھیں۔

"تم سے پوچھ رہی ہوں کسی اچھے اسکول میں ایڈمٹ کرواؤ گے یا نہیں۔" اس کی بات میں دھونس زیادہ تھی تبھی صائمہ بگڑتی ہوئی بولی۔

"امی صحیح کہہ رہی ہیں اتنے مہنگے اسکول میں ایڈمیشن کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"تم سے پوچھ رہی ہوں۔" وہ براہ راست سکندر کی آنکھوں میں دیکھتی بولی۔

"ٹھیک ہے جو اسکول تمہیں پسند ہے بتا دینا میں کسی آدمی کو بھیج کر ایڈمیشن کروا دوں گا۔" بیٹے کی بات سن کر ماں بھونچکا اور بہن ہکا بکا رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دو دن کے اندر اندر ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ وہ قدرے ریلیکس ہو گئی تھی۔ اگلے کچھ دنوں تک گھر کا ماحول شدید بوجھل رہا تھا۔ اس کی ساس اور نند دونوں بات بے بات سناتی اس کو اوقات یاد دلاتی رہی تھیں۔

"ہم نے اس لیے کم تر گھر میں رشتہ نہیں کیا کہ تم ہمارے سر پر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگو۔ حیا کے دائرے میں وقت بتاؤ گی تو گھر میں رہنے دوں گی ورنہ تو گھر کا دروازہ کھلا ہے۔"

شادی شدہ بیٹیاں بھی ماں کے گھر آئی ہوئی تھیں۔ وہ بھی بھائی کے سامنے بیٹھی اس کی برائیاں کر رہی تھیں۔

"ہمیں تو گھاس تک نہیں ڈالتی۔ ضوبار یہ تو اچھی تھی اتنی خدمت کرتی تھی ہماری اور یہ تو جیسے کہیں کی مہارانی ہو۔ ایک کپ چائے تک کا نہیں پوچھتی۔"

"جھوٹ وہ بولیں جو قابل برداشت ہو جب سے آئی ہیں آپ کون کچن میں جان کھپا رہا ہے آپ کے لیے اگر آپ کے لیے میں ہاتھ باندھے چوبیس گھنٹے بھی کھڑی رہوں تب بھی کوئی نہ کوئی نقص آپ نے نکالنا ہی ہے۔" جانے وہ کب سے آ کر ان کی باتیں سنتی رہی تھی۔

وہ سب اگلے دن بازار جا رہی تھیں سکندر سے رقم لے کر ماں بولی۔

"بچیوں کے کپڑے بھی لے آئیں گے ویسے بھی پھپھیاں جا ہی رہی ہیں۔"

"بچیوں کے رہنے دیں وہ میں خود لے آؤں گی آپ تکلف مت کریں۔" عجوہ نے منع کیا تھا۔

"کیوں پہلے بھی تو میں لاتی تھی۔"

"آپ کے لائے کپڑے مجھے پسند نہیں ہیں۔" اس کی برملا سچی بات پر غصے سے لال پیلی ہوتی الفت نے سب کو مخاطب کرتے کہا۔

"میری ہر بات پر اس کو اعتراض ہے۔ کیا نقص ہوتا ہے ان کپڑوں میں بھلا۔" وہ جرح پر تیار تھیں۔ جس پر نہایت اطمینان سے ان کا اطمینان غارت کرتی وہ بولی۔

"جیسے امیر غریب میں جیسے مہنگے اور سستے میں آپ جو پہنتی ہیں وہ مہنگا اور بچیوں کے سستے سے سوٹ ہوتے ہیں جو کہ مجھے ہرگز پسند نہیں۔" وہ آگ بگولا ہوتی بولیں۔

"کیا ماں کے گھر تم نے کبھی مہنگے سوٹ پہنے ہیں۔"

"نہیں پر یہاں پہنوں گی۔ بائی داوے میں بچیوں کی بات کر رہی تھی اپنی نہیں۔" سکون آمیز لہجہ میں

آگ لگاتی وہ ان کی شاپنگ کا سارا موڈ غارت کر گئی تھی۔ رہی سہی کسر بیٹے نے پوری کردی تھی۔

"اماں بچیوں کے رہنے دیں وہ خود خرید لے گی جو اسے پسند ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ تو باہر چلا گیا جبکہ وہ غش پہ غش کھانے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"مجھے لگتا ہے کہ میرے بچے پہ تعویذ وغیرہ کرواتی ہے۔ وہ تو میری بات رد کر کے کیسے اس کی بات بلا چوں چرا مان لیتا ہے اگر یہی حال رہا تو یہ تو ہمیں گھر سے ہی نکال کر دم لے گی۔"

"اماں سچ کہوں تو بھائی بھی دبنے لگا ہے اس سے۔ پہلے تو ایسا نہ تھا۔" صائمہ بھی نمک پاشی کیے جا رہی تھی۔

اگلے دن جب وہ شاپنگ کے لیے گھر سے نکلنے لگی تو وہ بے ساختہ کہہ بیٹھا تھا۔

"رکو میں لے کر جاتا ہوں تم اکیلی کیسے جاؤ گی۔" اس وقت وہ بلیک پینٹ پر بلیک شرٹ پہنے گلاسز آنکھوں پر چڑھائے کافی سنجیدہ تھا۔

"شکریہ پر میں خود جا سکتی ہوں۔"

"ضد مت کرو ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔" وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

"مجھے عادت نہیں جس طرح آپی دھکے کھاتی کہیں آتی جاتی تھیں بالکل ویسے میں بھی جا سکتی ہوں۔" ایک سخت جملہ اس کے منہ پر مار کر وہ گیٹ سے نکل گئی تھی۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں تمہارے عہدے اور تمہاری مراعات پر۔" دل ہی دل میں بڑبڑاتی ٹیکسی میں مارکیٹ چلی گئی تھی۔

یونیفارم وغیرہ خرید کر اگلی صبح سے علیشا نے اسکول جانا شروع کردیا تھا۔ صبح ناشتے کی ٹیبل پر الفت ایک بار پھر اس کے فیصلے پر ناقدانہ رائے کا اظہار کیے جا رہی تھیں۔

"بچی کو اتنی دور اسکول بھیجنا کتنا مشکل ہوگا ضرورت ہی کیا تھی کہ اتنے دور کے اسکول میں ڈال دیا اب کون لے کر جائے گا؟"

"باپ۔" کچھ ثانیے بعد قدرے سکون سے بولی۔

"باپ ہے نا جب پیدا کر سکتا ہے تو لے جا کیوں نہیں سکتا۔"

اس کے اس سکون آمیز جملہ میں بھی بلا کی کاٹ تھی۔ نوالہ بہ مشکل نگلتے وہ ماں کو دیکھ کر اپنی گمبھیر آواز میں بولا تھا۔

"میں لے جاؤں گا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"علیشا تیار ہے؟" وہ عجوہ پر نظریں جمائے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں چلو اٹھو علیشا۔" اس کا بیگ اور پانی کی بوتل اٹھا کر وہ اس کے ہمراہ باہر پورچ تک آئی۔ گاڑی کے دروازے کے پاس کھڑی وہ سکندر کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ دیر میں وہ ماں کو سکتے میں چھوڑ کر باہر آیا تھا۔ وہ اس کے قریب آکر اس کے پیچھے کھڑا فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولنے کے لیے اس کے بالکل قریب ہوا تھا اس کے سینے سے اس کے کندھے مس ہوئے تھے۔ یکدم سی مڑنے پر وہ بالکل اس کے سینے سے ٹکرائی تھی۔

"راستہ دو۔" نظریں اٹھا کر اس نے بڑے سپاٹ سے انداز میں کہا تھا۔

بڑی خاموشی سے اس نے ہٹ کر راستہ دیا تھا وہ علیشا کو لے کر اسکول چلا گیا تھا پھر تو جیسے یہ اس کی ڈیوٹی میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ اسے خود ہی لے کر جاتا اور واپسی پہ گارڈ کو بھیج دیتا۔

اسے لگ رہا تھا کہ زندگی جو جمود کا شکار تھی یکدم سے اس میں رعنائی اور چاشنی در آئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں جینے کے مزے سے ہم آہنگ ہونے لگا تھا اگرچہ دلکشی رعنائی تو پہلے بھی اس کی زندگی کی ساتھی تھیں مگر خوشی اب دل کے بند خانوں میں رچی بسی وہ تو اس نے کبھی محسوس ہی نہیں کی تھی۔

وہ ایک ایسا مرد تھا جسے ہمیشہ ہر عورت نے چاہا تھا اس کی ظاہری جسمانی خوبصورتی اور عہدہ ہمیشہ اس کی چاہت کی اولین وجوہات رہی تھیں۔ مگر اب اسے لگنے لگا تھا کہ جیسے وہ تو وہ ہے ہی نہیں جسے ہر کوئی سراہتا رہا ہے۔ یہ لڑکی جس طرح اس کی ذات کی نفی کرتی تھی وہ اسے یہ سوچنے پر مجبور کرتا تھا کہ وہ بھی کبھی ریجیکٹ ہو سکتا ہے۔ مگر بات یہاں ریجیکٹ ہونے کی بھی نہیں تھی کچھ اور تھا جو اسے پگھلا رہا تھا۔

کیا اس عورت کا وجود؟ کیا وہ چاہتا تھا کہ وہ اسے اپنی قربت دے کر ساری دوریاں مٹا دے۔ تاکہ اس کے بے چین وجود کو قرار مل سکے جو نظر انداز ہونا کسی طور بھی برداشت نہ کر پا رہا تھا۔ وہ لڑکی کیا بہت حسین تھی جو دل کو مضطرب کر رہی تھی ایسا نہیں تھا۔ اس نے بہت حسین لڑکیاں دیکھی تھیں وہ ان کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی۔ پانچ فٹ پانچ انچ قد، مناسب بدن، گندمی رنگت بڑی آنکھیں کتابی چہرہ۔ وہ پر کشش تھی پر اس قدر حسین مرد کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ مضطرب رہتا اور اضطراب کی اس کیفیت میں گھنٹوں اسی کے بارے میں سوچتا چلا جاتا۔ شاید اس لڑکی نے دور رہ کر اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج سنڈے تھا وہ دیر تک سویا رہا تھا۔ جیسے ہی نیند سے بیدار ہوا تو علیشا کو تیار دیکھ کر فوراً پوچھ بیٹھا تھا۔

"یہ بیگ وغیرہ کہاں لے کر جا رہی ہو؟" علینہ کا چھوٹا بیگ تھامے وہ کمرے سے نکل رہی تھی جب اس نے اسے روکا تھا۔

"ہم نانو کے گھر جا رہے ہیں۔" اطلاع دیتی نکلی تو وہ یکدم سے بستر سے اترتا بڑی سرعت سے پاؤں میں چپل ڈالے باہر آیا تھا۔

خوابیدہ سی آنکھیں، شرٹ کے کھلے بٹن، وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"امی کے ہاں۔" ایک عام سی نظر اس پر ڈال کر وہ علیشا کا ہاتھ تھامے علینہ کو گود میں اٹھائے لاؤنج کا داخلی دروازہ پار کر کے باہر نکل گئی۔ وہ اس کے پیچھے چلا آیا۔

"میں لے کر جاتا ہوں تھوڑی دیر ویٹ کرو کپڑے بدل کر آتا ہوں۔"

"نہیں ہم خود چلے جائیں گے۔"

اس کی ہٹ دھرمی پر ناگوار تاثرات چہرے پر لاتے وہ ناگواری سے بولا۔

"تو پھر ڈرائیور کے ساتھ جاؤ۔"

"نہیں آپی ہمیشہ ٹیکسی استعمال کرتی تھیں میں اس سے اچھی نہیں ہوں کہ گاڑیوں میں بیٹھ کر سفر کروں۔"

"پر میری بیٹیاں ٹیکسی میں سفر نہیں کریں گی۔"

"اچھا۔" وہ تمسخر اڑاتی رک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"کیا آپی علیشا کے ساتھ ٹیکسی پر نہیں آتی تھیں؟"

اس کی بات پر وہ لاجواب ہو گیا۔

"چلو علیشا۔" وہ پیدل ہی چلی گئی۔

وہ بے دلی سے واپس مڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں حیران اس بات پر ہوں کہ وہ آخر چاہتی کیا ہے۔ نہ تو اسے میرے گھر والے اچھے لگتے ہیں نہ ہی میں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس نے شادی محض انتقام لینے کے لیے کی ہو۔ میں مانتا ہوں کہ مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے مگر یار وہ تو بالکل کمپرومائز کرنے پر تیار نہیں۔"

وہ حذیفہ کے سامنے اپنے دل کی باتیں عیاں کر بیٹھا تھا۔ حذیفہ اس کے بچپن کا دوست تھا ان دونوں کی مثالی دوستی آج تک قائم تھی وہ دونوں اپنی کوئی بھی بات چھپاتے نہیں تھے۔

"تمہیں مسئلہ کیا ہے اگر وہ پاس نہیں آتی تو کب تک ایسا کرے گی۔ باہر کیا کم ہیں بتاؤ اسے۔"

"نہیں یار وہ کچھ عجیب شے ہے آسانی سے ماننے

والی نہیں۔"
وہ بہت سنجیدگی سے بولا تھا۔
"چھوڑو اسے آؤ تمہیں آؤٹنگ کراتا ہوں پھر دلنشین سے بھی ملوادوں گا۔"
"نہیں یار اس وقت تو کچھ بھی نہیں۔"
"کیا اپنی دوسری بیوی کے لیے جوگ لینے والے ہو۔" حذیفہ نے مذاق اڑایا تھا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔
"فی الحال تو ہوش و حواس میں ہوں۔" حذیفہ اسے تنگ کرنے لگا کچھ ہی دیر میں وہ وہاں سے چلا آیا تھا۔ گھر آکر پہلی نظر لان میں کھیلتی علیشا پر پڑی تو بے اختیار بھاگ کر وہ اس تک پہنچا تھا۔ اسے گود میں اٹھا کر بولا
"مما کہاں ہیں؟"
"اندر ہیں علینہ کو سلانے لے گئی ہیں۔" اسے چھوڑتا وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا تھا۔ وہ بیگ سے چیزیں نکال کر اپنی جگہوں پر رکھ رہی تھی۔
وہ قریب جاکر دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بہت خاموشی سے اس کے مصروف ہاتھوں کو دیکھتا یکدم سے بولا۔
"کس کے ساتھ آئی ہو؟"
"اکیلے"
"مجھے کال کی ہوتی میں آجاتا لینے" اس کی آنکھیں کچھ پل کے لیے جیسے اس کی آنکھوں میں گڑ گئی تھیں پھر نظریں بدل کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔
پھر نامحسوس انداز میں وہ اس لڑکی کے شکنجے میں جکڑتا چلا گیا۔ ماں الگ ناراض تھی۔ ان کی ناراضی بعض صورتوں میں بجا بھی تھی۔ وہ لڑکی ان کے ساتھ بھی اپنا رویہ بہتر نہ کرپا رہی تھی لیکن وہ بھی مجبور تھا بہرحال وہ اس کی بیٹیوں کی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کررہی تھی۔ اس کی ہر بات وہ بلاچون وچرا مانتا چلا جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ اس کا غلام بنتا جارہا ہو۔ جس میں نہ کہنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ ابھی بھی وہ دفتری کاموں میں الجھا ہوا تھا جب اس کے موبائل پر عجوہ کی کال آئی تھی۔

"علینہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کسی ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لے لیں۔"
"ٹھیک ہے اور کچھ۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ملازم بن جاتا۔
"اور کچھ نہیں" کھٹاک سے فون بند ہوا تھا۔
"کوئی ایسا دن بھی ہوگا جب یہ کہے گی کہ۔" یکدم سے چونک کر اپنی سوچ پر لعنت بھیج کر وہ اپنے پی اے کو اپائنٹمنٹ لینے کا کہہ چکا تھا شام کو وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج کل موسم کچھ بدل سا گیا تھا۔ ہلکی ہلکی سردی پڑنے لگی تھی۔ موسمی اثرات کے ساتھ دلوں کے حالت بھی کبھی کبھار بدل جایا کرتی ہے۔ وہ بھی اس اداس شام میں ضوباریہ کے بارے میں سوچتے سوچتے آبدیدہ ہو گئی تھی۔ کتنی محبت تھی اسے اس شخص سے جو کسی بھی لحاظ سے محبت کے لائق نہ تھا۔ یہاں تک کہ اس شخص کی محبت میں فنا ہو گئی۔ دل میں درد اٹھا تو وحشت سی ہونے لگی۔
اس وقت وہ مرقع اضطراب بنی سوچوں کے تسلسل میں گھری تھی کہ جس سے نکلنا اسے خود بھلا نہ لگ رہا تھا۔ آبلہ پائی کی جس کیفیت سے اس کی بہن دوچار ہوئی تھی وہ کبھی بھول نہیں سکتی تھی۔ اس کی بہن بے وقوف تھی جو اس مرد کی ظاہری خوبصورتی سے متاثر ہو بیٹھی تھی اور اس کے اندر کے تعفن گندگی کو دیکھ ہی نہ سکی جو عجوہ کو نظر آرہی تھی۔ جانتے بوجھتے وہ کس طرح بے ریا محبت کر سکتی تھی اس سے۔ اسے بہن پر دکھ کے ساتھ حیرت بھی ہو رہی تھی۔
زینب کا رشتہ آیا تھا۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ تھا لڑکے کی بہت اچھی جاب تھی سو ماں باپ نے بات پکی کردی تھی۔ وہ ہفتے کے ہفتے ماں کے گھر جاکر تیاریوں میں مدد کردیا کرتی تھی۔ الفت کو بہت اعتراض تھا جس کا برملا اظہار انہوں نے اس کی موجودگی میں کیا تھا۔

"کیا گھر میں اور بہنیں نہیں ہیں جو یہ یہاں سے چل پڑتی ہے۔ اسے کہو کہ گھر میں تنگ کررہے مجھے ہرگز یہ برداشت نہیں ہے کہ یہ آئے روز چل پڑے۔"
اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ بڑے مزے سے جاتی رہی ادھر الفت کڑھ کڑھ کر سکندر کو بھڑکانے کی مسلسل کوشش کرتی رہیں۔
"امی بھائی کو کہنے کی ضرورت نہیں یہ تو خود ان سے ڈرتے ہیں۔" صائمہ نے طنز کیا تو ماں نے بھی کہا۔
"ہاں مجھے بھی ایسے ہی لگ رہا ہے۔" اس نے چپ سادھ لی تھی کچھ کہہ کر وہ ماں کا دل دکھانا چاہتا تھا اور نہ ہی وہ اسے روک سکتا تھا۔ اس قدر بے بسی والی کیفیت اس کی زندگی میں کبھی آئے گی اس نے سوچا تک نہ تھا۔ شادی والے دنوں میں تو وہ ادھر ہی رک گئی تھی۔ اور پھر وہ دن بھی آیا تھا جب اس کے میکے والے عجوہ سمیت شدید حیرت سے دوچار ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

ڈرائنگ روم میں بیٹھا وہ لقمان احمد کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ داماد کو یوں آج یہاں دیکھ کر وہ حقیقی معنوں میں بہت خوش تھے یہ مسرت ان کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔ اس کی خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ راشدہ الگ صوفے پر بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ لقمان نے بیوی کو اشارہ کرکے باہر بلایا ان کے جاتے ہی ڈرائنگ روم میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں علیشا آئی باپ کے گلے لگ کر گود میں بیٹھ گئی۔
"مما کہاں ہیں۔" نہایت دھیمے سے وہ اس کے کان میں بولا تھا۔
"وہ کام کررہی ہیں۔" علیشا نے مختصر کہا۔ اتنے میں سب سے چھوٹی بہن فاطمہ اندر آئی تھی۔
"علیشا آپی بلارہی ہیں" علیشا فوراً اس کی گود سے اتری اور بھاگ کر نکل گئی۔ راشدہ بیگم بھی اندر آکر بیٹھ گئیں۔
"کون سی کلاس میں پڑھتی ہو تم؟" اس نے فاطمہ سے پوچھا تھا۔
"نائنتھ" اس نے کچھ شرما کر کہا تھا۔
"اب کی بار اسکول میں ٹاپ کیا ہے بورڈ کے ایگزیم میں۔" اس کی ماں خوش خوش بتارہی تھی۔
"اوہ! پھر تو بہت لائق ہے۔" وہ خوش دلی سے بولا پھر اس کا ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف بڑھ گیا۔ دو ہزار ہزار کے نوٹ نکال کر بولا۔
"ادھر آؤ یہ انعام تمہارا اگلی دفعہ آؤ گی ٹاپ تو اس سے بھی زیادہ ہوگا۔" راشدہ بیگم ہکابکا رہ گئیں۔
"نہیں بیٹا ایسا نہیں کرو تم شرمندہ کررہے ہو۔"
"آؤ نا" فاطمہ کو جھجکتے دیکھ کر وہ بولا وہ ماں کو سوالیہ نگاہوں سے تکتی رہی پھر اجازت ملنے پر فوراً آگے بڑھ کر روپے تھام لیے تھے۔ کچھ ہی دیر میں انہوں نے چائے کے ساتھ بیشتر لوازمات سے ٹیبل سجادی۔ چائے سے فراغت کے بعد ٹیبل صاف ہو گئی تو اتنے میں ایک بار پھر علیشا اندر آئی۔
"ادھر آؤ۔" علیشا کو اپنے پاس بلا کر وہ ایک بار پھر دھیرے سے بولا تھا۔
"مما کہاں ہیں؟"
"وہ علینہ کو کپڑے پہنا رہی ہیں میرے کپڑے بھی چینج کردیے ہیں۔"
"جاؤ مما سے کہو کہ پاپا بلا رہے ہیں۔" ایک بار پھر وہ انتظار کرنے لگا۔
ایسا انتظار تو کبھی اس نے نہ کیا تھا۔ اس وقت جو کیفیت ہو رہی تھی اس کیفیت سے کبھی اس کا پالا نہ پڑا تھا۔ اس نے تو ہمیشہ اوروں کو انتظار کروایا تھا۔ آج خود اس لذت سے آشنا ہو رہا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ انتظار کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے جان لیوا ہوتا ہے۔ جاں گسل ہوتا ہے۔
دل کی بے چینی عروج پر تھی جس کا گلا گھونٹنا اس کے بس میں نہ تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ چلی آئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ بے اختیار اٹھا تھا۔ اس نے سلام کیا تھا جس کا جواب بے دھیانی میں وہ دے بھی نہ پایا تھا۔ عجوہ کا انداز بہت عجلت بھرا تھا۔ اپنی جیب سے کچھ رقم

نکال کر اس نے اس کی طرف بڑھائی تھی۔
"یہ اپنی ماں کو دینا میں خود کچھ خریدنا چاہتا تھا پر ٹائم نہیں ملا۔" وہ کچھ پل تو رقم کو دیکھتی رہی پھر بولی۔
"ساری تیاری مکمل ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"
"یہ میں تمہیں نہیں تمہاری بہن کو شادی کا گفٹ دے رہا ہوں۔" وہ بھی زچ ہوا تھا۔
"لیکن اتنی رقم میں نہیں لوں گی۔" رقم خاصی بڑی تھی جسے لینے کی غلطی وہ کبھی نہیں کرنے والی تھی۔ ان کے درمیان بات ہو رہی تھی کہ راشدہ بیگم خود اندر آئیں انہیں دیکھ کر اپنے بے وقت آنے پر جیسے سٹپٹا گئیں وہ مڑ کر نکلنے ہی والی تھیں جب سکندر کی آواز پر رکیں۔ وہ رقم اب وہ انہیں دینے لگا تھا۔
"یہ زینب کی شادی کا گفٹ ہے اگر آپ نے نہیں لیا تو پھر میں بہت ناراض ہوں گا اور اگر قبول کر لیا تو پھر میں یہ سمجھوں کہ آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہیں۔"
"نہیں بیٹا اتنی رقم" وہ ہچکچا رہی تھیں۔
پھر اس کی ناراضی کے خیال سے بولیں۔
"بیٹا یہ بہت زیادہ ہیں۔" انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ لیں یا انکار کر دیں۔
"تو ٹھیک ہے نا آپ مجھے بیٹا نہیں سمجھتیں۔" وہ ناراض ہو کر مڑا تو یکدم سے انہوں نے پکارا۔
"نہیں بیٹا اچھا دو میں لے لیتی ہوں۔" کچھ سوچ کر انہوں نے وہ رقم لے لی۔ وہ مسکرا دیا راشدہ چلی گئیں وہ سپاٹ انداز میں کھڑی اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔
"تمہاری ماں کو پتا ہے کہ تم اتنا بڑا گفٹ دے رہے ہو۔"
"یہ رقم میری ماں کی نہیں میری ہے۔" اس نے بنا جھجکے کہا تھا۔
وہ واپس چلا گیا تھا سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی جب اس نے رخصتی والے دن بھی شرکت کی تھی۔ لقمان احمد تو پھولے نہ سما رہے تھے اچھا خاصا رعب پڑ رہا تھا برادری اور پڑوس والوں پر۔ مقام حیرت تھا کہ سکندر جیسا تکبر و غرور والا بندہ اس لڑکی کے ہاتھوں اس قدر با اخلاق بنا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت اسے خود ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ لاونج میں بیٹھی الفت کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔
"کوئی آیا ہے؟" صوفے کی بیک سے سر اٹھا کر اس نے پوچھا۔
"تمہاری بیوی کی دوست ہے یہ لڑکی تو آئے دن آتی رہتی ہے۔" الفت نے ناگواری سے کہا۔
"تو آپ لوگوں کو بھی تھوڑی سی کمپنی دینی چاہیے تھی اسے۔" سکندر کی بات پر صائمہ کا منہ غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔
"کیا بیوی کے ساتھ ساتھ اس کی دوست سے بھی ڈرنے لگے تم۔"
"یہ تم کس طرح بات کر رہی ہو ہر وقت ایک ہی بات۔ بڑی ہو لحاظ کر رہا ہوں آئندہ میں اس قسم کی کوئی بکواس برداشت نہیں کروں گا۔" اسے شدید غصہ آیا تھا صائمہ کی فضول گوئی پر۔
"ہاں نا سارا سارا دن کان بھرتی ہے ہمارے خلاف اب تو ہم برے لگنے لگے ہیں۔"
"تمہارے ساتھ تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" وہ اٹھ کر کمرے میں چلا گیا تھا۔
"دیکھا اماں کیسے مٹھی میں کر لیا ہے۔ میں نہ کہتی تھی کہ کوئی جادو ٹونا کرتی ہے تم بیٹھی رہنا بڑا بھروسہ تھا نا بیٹے پر اب بھگتو۔ غریب گھر کی لڑکی مٹھی میں رہے گی دیکھ لیا نتیجہ۔" وہ ماں کو سنا کر دل کی بھڑاس نکالنے لگی۔ الفت سر جھکائے گہری سوچ میں گم ہو گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ تمہاری مرجھائی شکل مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی پہلے کی طرح فریش فریش رہو یار۔" حذیفہ اسے لتاڑ رہا تھا۔
"چائے پیو گے یا کولڈ ڈرنک۔" وہ دونوں آفس میں تھے حذیفہ نے آج اس کے آفس کا رخ کیا تھا۔
"چائے۔"
"حالات کچھ سازگار ہوئے یا نہیں۔" وہ معنی خیزی سے پوچھتا ہنس پڑا تھا۔
"کچھ بھی صحیح نہیں ہو رہا یار میرے گھر والے میرے خلاف ہوتے جا رہے ہیں۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں قسم سے آفس کی ہزار ٹینشن آسانی سے سہہ لیتا ہوں پر ان کی باتیں بالکل ہضم نہیں ہوتیں۔ اگر اس کی کسی بات کو درست قرار دوں تو ماں بہن ناراض ہو جاتی ہیں۔ میں اس کی اسی بات کو سپورٹ کرتا ہوں جو صحیح ہو مگر صحیح بات میں غلط پہلو نکال کر وہ مجھ پر چڑھ دوڑتی ہیں پہلے ایسا نہیں تھا۔"
"پہلے اس لیے نہیں تھا کہ تم نے کبھی اپنی بیوی کو سپورٹ کیا ہی نہیں تھا۔ سچ کہوں تو تم نہ تو اس کی کوئی بات سنتے تھے نہ دلچسپی لیتے تھے اس لیے وہ ٹوٹلی تمہارے گھر والوں کی تابع بن گئی تھی۔ تمہارے لیے کوئی مسئلے مسائل نہ تھے۔ یہاں بات دوسری ہے۔ تم بیوی میں دلچسپی بھی لے رہے ہو اور اس کی ہر بات بھی سنتے ہو یہی چیز انہیں بری لگ رہی ہے۔"
جہاں اس کے دوہرے رویے کی بات آ جاتی تھی وہاں وہ موضوع ہی ختم کر دیتا تھا۔ اب بھی اس نے ایسے ہی کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے ٹرانسفر آڈر آئے تھے وہ بہت پریشان تھا اتنی دور جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا ایسے پہلے کبھی نہ ہوا تھا پر اب کی بار دل اچاٹ سا تھا۔ جانے کو من نہیں کر رہا تھا مگر مجبوری تھی دن قریب آ رہے تھے وہ اپنی تیاری مکمل کر رہا تھا۔ اب کی بار وہ اکیلا جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے وہ رات کو اس سے بات کرنے کا تہیہ کر کے مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ بچوں کو سلانے کے بعد جب وہ نماز پڑھ کر سونے کے لیے بیڈ کی جانب آئی تو اس نے اس کے قریب آ کر کہا تھا۔
"تم لوگ تیاری کر لو منڈے کو ہم جائیں گے سارا سامان پیک کر لو جو لے کر جانا ہے بعد میں۔۔۔"
"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بھی وہ سکون سے بولی تھی۔
"ٹرانسفر ہوا ہے میرا تم سب ساتھ جاؤ گے میرے۔"
"پر میں تو کہیں نہیں جا رہی۔" اس نے عام سے لہجہ میں کہہ کر بات ہی ختم کر دی تھی۔
"جہاں میں رہوں گا وہاں تم رہو گی۔" اس نے تحمل سے کہا تھا۔
"نہیں تمہارے گھر میں تو یہ قانون نہیں ہے۔ جہاں تم رہتے ہو وہاں بیوی کے بجائے گرل فرینڈ رہتی ہے تمہارے ساتھ۔ اب کی بار بھی قانون مت توڑنا۔" وہ آگ برساتی مڑی تو بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب موڑا تھا۔
"میں اس وقت کسی تلخی کے موڈ میں نہیں ہوں۔ پلیز سیریسلی میرے ساتھ بات کرو۔"
"میں مذاق نہیں کر رہی ہوں اور میرا جواب بھی تم سن چکے ہو۔"
"تم کیوں نہیں جاؤ گی میرے ساتھ؟" اس کے ماتھے پر شکنوں کا جال بن گیا تھا۔
"کیونکہ تمہاری پہلی بیوی کو بھی یہ حق نہیں ملا تھا۔" وہ اس کے اعصاب کو چٹخاتی بولی اور اسے زلزلوں کی زد میں چھوڑ کر وہ سو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ چلا گیا تھا کچھ دن تک تو کوئی کال نہیں آئی تھی صرف ماں سے بات کر لیتا تھا لیکن آج وہ کال کر بیٹھا تھا۔
"بچے کیسے ہیں؟"
"ٹھیک ہیں" مختصر سا جواب آیا۔
"تم کیسی ہو؟"
"ٹھیک اگر ضروری بات نہیں ہے تو میں فون بند کر رہی ہوں۔ علینہ رو رہی ہے" دوسری جانب وہ

فون کاٹ چکا تھا۔ پھر اکثر ایسا ہونے لگا تھا وہ فون کرتا وہ مختصر جواب دے کر فون بند کر دیتی اس مرد کے اوسان خطا ہونے لگے تھے وہ اپنی انا غیرت عزت ہر چیز کو لات مارتا اسے روز فون کرتا اور وہ اسے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیتی۔

"میں ذلیل ہوں نا جو اس کو روز فون کرتا ہوں اگر میں انسان کا بچہ ہوتا تو اس کی شکل بھی نہ دیکھتا۔" ساری بھڑاس حذیفہ پر نکالتا وہ بھڑک رہا تھا۔

"تو مت کرو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"کیسے ٹھیک ہو گی؟ بتاؤ مجھے" وہ اس پر چڑ کر بولا تھا۔

"تم کیوں اتنا پاگل ہو رہے ہو خیر تو ہے نا۔" حذیفہ اسے چھیڑنے لگا تھا۔

"لیکن وہ تو گویا کہیں اور ہی تھا۔

☼ ☼ ☼
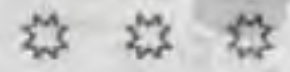
آج پھر وہ مختصر بات کر کے فون بند کر چکی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ بار بار اسے فون کیوں کر رہا تھا۔ اگر وہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی تو اسے کیا آفت پڑی تھی کہ اس سے بات کرنے کے لیے مرا جائے۔ کمرے میں ٹہلتا وہ دونوں مٹھیوں کو بھینچتا سوچ سوچ کر تھک چکا تھا۔ نئے شہر نئے لوگ کچھ بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک مہینہ تین دن ہو چکے تھے اسے یہاں پر یہ ایک مہینہ تین دن تو صدیاں لگ رہی تھیں۔ وہ دل کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا پر دل بہک رہا تھا مچل رہا تھا۔ اس سسکتے اور مچلتے دل کو کسی غمگسار ہمدرد کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی کیونکہ اس کے درد کا درماں کوئی اور نہیں وہی عورت تھی۔

☼ ☼ ☼
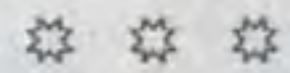
"پاپا آگئے پاپا آگئے۔" علیشا خوشی سے جھومتی سکندر کے گلے لگ کر چیخ چیخ کر سارے گھر کو سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔ ماں ـــــــ سر چوم کر سفر کی تھکان کے بارے میں پوچھنے لگی۔

کچن میں علینہ کا فیڈر گرم پانی میں ابال کر وہ اب علیشا کی فرمائش پر میکرونی بنا رہی تھی۔ الفت نے کچن میں آکر اسے مخاطب کر کے کہا۔

"سکندر کے لیے کھانا لگاؤ وہ صبح سے نہار منہ ہے۔" یہ کہتے ہی وہ چلی گئی اس نے مائیکرو ویو میں کھانا گرم کیا ٹیبل پر لگا کر خود ہی باہر لاؤنج میں آئی۔

"کھانا لگا چکی ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ ایک بار پھر کچن میں غائب ہو گئی تھی۔ جبکہ الفت جو بیٹے کو صائمہ کی شادی کی تاریخ رکھے جانے کی خوشخبری سنا رہی تھی بولیں۔

"جاؤ کھانا کھاؤ بعد میں اس پر بات کریں گے۔"

صائمہ کی شادی کی تاریخ رکھنے جانے پر وہ بھی دل سے خوش ہوا تھا کم از کم وہ ماں کے سامنے اپنے گھر بار کی ہو جائے گی اچھا تھا۔ وہ نہا دھو کر اب فریش فریش لگ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی تازگی بھرا احساس رگ وپے میں دوڑنے لگا تھا۔ اس پر گہری نظر ڈالتا وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ اپنے کاموں میں مصروف تھی وہ کھا کم رہا تھا اور اسے زیادہ دیکھ رہا تھا۔ ایسا کیا تھا کہ جس نے اس کے سارے حواس سلب کر لیے تھے۔ دل الگ راستہ بدل گیا تھا اس کی پشت کو دیکھ کر وہ کھانے سے ہاتھ روک چکا تھا بھوک ساری ختم ہو گئی تھی۔ وہ اٹھا اس کے پاس جا کر بالکل قریب کھڑے ہو کر اس کے جسم کی خوشبو اپنے اندر اتارتا کچھ پل کے لیے بالکل مخمور سا ہو گیا تھا۔ اس کے پرفیوم کی مخصوص مہک اور موجودگی کے احساس پر اس نے رخ موڑا تو اپنے قریب اسے کھڑے دیکھ کر وہ یکدم سے چونک گئی تھی۔

"چائے بنا دو۔" یہ کہتے ہی وہ چلا گیا جبکہ وہ بے اختیار ٹیبل کو دیکھنے لگی اس نے کچھ بھی تو نہیں کھایا تھا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼
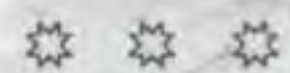
تین دن کی چھٹیاں تھیں ان تین دنوں میں اس نے اپنا کام پورا کرنا تھا۔ رات تک سوچتے سوچتے وہ بالکل تھک چکا تھا۔ اکیلے جانے پر دل کسی صورت آمادہ نہ تھا اسے ہر حال میں منانا تھا چاہے اس کے لیے اسے کسی بھی حد تک جانا پڑے۔ رات کو موقع نہیں ملا تو اگلے دن پھر سے بے چینی عروج پر تھی۔

ادھر ماں اور صائمہ شادی کی تیاریوں میں بہت مصروف ہو گئیں ـــــــ وہ بھی ہوں ہاں میں سرہلاتا ہر چیز سے جیسے غافل تھا۔ شام کو جب علیشا دادی کے پاس تھی اور علینہ سو رہی تھی وہ موقع پاتے ہی لاؤنج سے اپنے کمرے میں آیا تھا۔ وہ علیشا کے یونیفارم استری کر رہی تھی۔ دروازہ لاک کر کے وہ اس کے پاس ہی آیا تھا۔ ایک سرسری عام سی نظر دروازے پر ڈال کر وہ ایک بار پھر سے اپنے کام میں مصروف ہوئی تھی۔

"تم پیکنگ کر لو ہم پرسوں جائیں گے۔" ناپسندیدہ موضوع جس سے وہ خود بچنا چاہ رہا تھا پر مجبوراً بول پڑا تھا۔

"میں تمہیں جواب دے چکی ہوں" عام سا جواب آیا تھا۔

"پر میں لازماً لے کر جاؤں گا" وہ سرکش ہونے لگا۔

"ماں کو لے کر جاؤ۔"

"اسے بھی لے کر جاؤں گا مگر پہلے تم جاؤ گی"

"میں کسی صورت نہیں جاؤں گی۔" وہ اس کی آنکھوں میں بے خوفی سے دیکھتی بولی تھی۔

"کتنی سزا دو گی مجھے، سزا تو پہلے ہی بھگت رہا ہوں میں۔ کم از کم جا تو سکتی ہو تم میرے ساتھ۔" اس کے کندھے دونوں ہاتھ سے تھامے وہ یکدم سے اس کا رخ اپنی جانب موڑ کر بولا۔

"خدا کے لیے بات مان لو میری، کتنا تڑپاؤ گی مجھے کتنی سزا دو گی، کتنی منتیں کروں تمہاری، میں نہیں رہ سکتا وہاں اکیلا کتنی اذیت دو گی مجھے"

"ہاتھ ہٹاؤ" اس کے ہاتھ جھٹک کر وہ ایک بار پھر سے کپڑے استری کرنے لگی۔ ایک بار پھر اس کا چہرہ موڑ کر وہ التجائیہ لہجہ میں بولا۔

"پلیز چلو نا میرے ساتھ تم جو کہو گی وہ میں کروں گا جیسا تم کہو گی ویسا ہی ہو گا میں نہیں رہ سکتا تمہارے بغیر۔"

"یہی تو صوبار یہ بھی کہتی تھی تمہیں کبھی سنا تھا تم نے اسے۔ وہ بھی تو تمہارے بغیر مر گئی۔ کبھی بدکاری کرتے ہوئے اس کی یاد آئی تھی تمہیں۔ اس کے دل کا خون کرتے ہوئے تم تڑپے تھے۔ کس طرح ڈنکے کی چوٹ پر بے وفائی کرتے رہے۔ کانپے تھے اس وقت تم اس کی محبت کا سوچ کر کبھی تم نے اس پر ترس کھایا تھا نہیں نا۔ تو میں تم پر کیوں ترس کھاؤں کیوں رحم کروں تم پر" وہ زہر خند لہجہ میں اسے آئینہ دکھا رہی تھی۔

"ہاں ہوں میں گناہ گار۔ پر اب تو تمہارے ساتھ مخلص ہو گیا ہوں نا۔ اب تو میں اعتراف کرتا ہوں نا کہ میں نے غلط کیا تھا کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟" وہ گڑگڑانے لگا۔

"نہیں" اس کا حتمی جواب اسے سن کر گیا تھا۔

"تم جاؤ گی نا میرے ساتھ" وہ چند ثانیے بعد ہر بات بھلائے ایک بار پھر التجا کرنے لگا تھا۔

"نہیں"

"ایسا مت کرو میں مر جاؤں گا میں وہاں ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا۔"

"تو مت گزارو تمہارے ہر لمحے کے ساتھی ہوتے ہیں۔" گہرا طنز بھی وہ امرت سمجھ کر پی گیا۔ استری کا پلگ نکال کر وہ سارے کپڑے الماری میں ہینگ کرنے لگی۔

"تم چل رہی ہو نا۔" وہ ایک ہی گردان کیے جا رہا تھا۔

"نہیں" زور سے الماری کا دروازہ بند کر کے وہ ایک قہر آلود نظر اس پر ڈال کر جانے لگی تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکتا نم آلود نگاہوں سے تکتا بولا۔ "میں جل رہا ہوں اندر ہی اندر سلگ رہا ہوں میں۔ اگر تم وہاں نہ گئیں تو کچھ کر بیٹھوں گا میں ترس کھاؤ مجھ پر کسی عورت کی موجودگی میرے اندر کی آگ کو ختم نہیں کر سکتی کسی کی صورت بھی اچھی نہیں لگ رہی۔" وہ رونے لگا تھا۔

"تم بات مت کرنا دور رہنا پر میرے ساتھ اس گھر چلو پلیز اگر تم یہاں رہو گی تو میں بھی واپس نہیں جاؤں

گا۔ استعفیٰ دے دوں گا چھوڑ دوں گا یہ جاب۔" وہ ایک پل کے لیے ششدر رہ گئی پھر خود پر قابو پاتے بولی۔

"کچھ بھی کرنے سے پہلے اپنی بیٹیوں کے مستقبل کے بارے میں ضرور سوچنا۔"

"نہیں سوچوں گا جب میری زندگی تباہ ہو گی تو کسی کے بارے میں بھی نہیں سوچوں گا۔ میری بچیوں کا مستقبل تمہارے ہاتھ میں ہے اگر تم جاؤ گی تو وہ خود بخود بہتر مستقبل پالیں گی ورنہ میں استعفیٰ دے دوں گا۔ میں نہیں جاؤں گا۔" دونوں آنکھیں صاف کر کے وہ واش روم میں گھس گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اس نے اس کے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں استعفیٰ لیٹر دیکھا تھا یعنی وہ اس حد تک جا سکتا تھا۔ وہ الجھی الجھی رہی تھی اگر ایسا حقیقتاً ہو جاتا تو وہ اس کی بیٹیوں کی مجرم بن جاتی اپنی بہن کو کیا منہ دکھاتی کہ اس کی ذرا سی ضد کے ہاتھوں ان کا مستقبل تباہ برباد ہو گیا تھا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی اس لیے دوپہر کو جب وہ سونے کے لیے کمرے میں آیا تو وہ خاموشی سے اندر آئی اور شرٹ اتارتے سکندر سے مخاطب ہوئی۔

"کل کس وقت جائیں گے ہم؟" اس کی بات پر کچھ پل کے لیے شاکڈ ہوتا وہ یکدم سے خوشی سے بھرپور آواز میں بولا۔

"جس وقت تم کہو۔" وہ جانے کی تیاری کرنے لگی جبکہ وہ شرٹ کو دوبارہ پہنتا کمرے سے نکل کر سیدھا ماں کے پاس آیا تھا۔ جب ماں کو جانے کا بتایا تو وہ تو سلگ ہی اٹھی تھیں۔

"ہم نہیں جا رہے، دیکھے نہیں رہے، بہن کی شادی کی تیاری کر رہے ہیں اس کا سوچا تم نے نئیہ کیا وہاں جانے کی سوجھی۔"

"امی یہ بیگم صاحبہ کی پڑھائی گئی پٹی ہے۔ وہ کہاں ہماری خوشی برداشت کر سکتی ہے عین شادی والے دنوں میں جانے کی پڑ گئی۔ پہلے تو جانے کا نام نہیں لیا تھا۔ اب کیا آفت پڑ گئی۔"

"امی پلیز آپ بھی ساتھ چلیں وہاں سے تیاری کر لیں گے شادی کے دن تک واپس آجائیں گے ویسے بھی یہ بنگلہ خالی کرنا ہو گا جو ایس پی یہاں پوسٹنگ پر آیا ہے اس کے لیے کم از کم ایک مہینہ تک کا ٹائم ہے۔"

"تو ہم اپنے گھر شفٹ ہو جائیں گے لیکن ابھی اتنی دور نہیں جا سکتے۔ شادی کے بعد میں آجاؤں گی پر ابھی نہیں۔" وہ تو بات ختم کر کے اٹھ گئیں ادھر وہ کشمکش و پیچ میں جتلا واپس کمرے میں آیا تھا اور پھر آنے والے دنوں میں ان کے شفٹ کر جانے کے بعد اس کی ماں بہن بھی اپنے گھر شفٹ ہو گئیں —— اور سرکاری بنگلہ خالی کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر کو ڈیکوریٹ کرنے میں کافی دن لگے تھے۔ وہ کافی تھک چکی تھی مسلسل کام نے نڈھال سا کر دیا تھا۔ اگرچہ ملازم تھے پر زیادہ تر اندر کے کام وہ خود کرتی تھی۔ سارے لان کی کاٹ چھانٹ کر کے اس نے کچھ نئے موسمی پھول لگوائے تھے۔ علیشا کو اسی اسکول کی برانچ میں داخل کر لیا گیا تھا۔ پرسکون ماحول اور پرسکون دن تھے جو بسر ہو رہے تھے۔ وہ اپنے گھر والوں سے دور آئی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے روز گھر بات کرتی۔ یہاں آتے ہی جو اس نے پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ سکندر کا کمرہ الگ سیٹ کیا تھا اور خود بچوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں سوتی تھی۔

اس مرد کو یہ بھی گوارا تھا وہ اس بات پر خوش تھا کہ وہ اس کے ساتھ آئی تھی۔ چھٹی والے دن وہ گھر پر ہی ہوتا تھا کہیں باہر نہیں جاتا تھا۔ علیشا اور علینہ کے ساتھ کھیلتا بولتا۔ آج بھی چھٹی کا دن تھا وہ خلاف معمول جلدی اٹھا تھا۔ وہ بچوں کو ناشتا کروا رہی تھی۔

"گڈ مارننگ پاپا۔" علیشا نے چہکتی آواز میں کہا تھا۔ اس کی بات کا جواب دیتا وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھا اور بولا۔

"میں صرف جوس لوں گا وہ بھی ایپل کا۔" علینہ کو بوائل ایگ کھلا کر وہ اس کے لیے ایپل جوس لے آئی تھی۔ گلاس ٹیبل پر رکھا اور خود اپنا چائے کا کپ اٹھا کر علینہ کی انگلی تھامے لاؤنج میں چلی گئی۔ وہ دھیرے سے مسکراتے جوس پینے لگا تھا۔

اس کی ہر ادا ہر بات پر تو مرتا تھا وہ۔ اس کی بے رخی اسے چند قدم اور قریب کر دیتی تھی وہ اس کی محبت میں دھنستا جا رہا تھا۔ اور اسے مزا آنے لگا ایسا کبھی محسوس نہیں کیا تھا جو اب وہ کر رہا تھا۔ وہ عورت اس کے تکبر و غرور کا سارا نشہ اسے توڑ موڑ کر اتارے گی اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔ اس کی خودی کو بے خودی میں بدل دے گی یقین نہ تھا۔

ماں کے ساتھ بات کر کے وہ ہمیشہ کچھ دنوں کے لیے بوجھل سی رہتی۔ وہ اب بھی ان کے ساتھ بات کر رہی تھی مگر ذہن بہت پیچھے چلا گیا تھا۔ جہاں وہ اور ضوبار یہ اپنے گھر والوں کے ساتھ محبت بھری خوشیوں بھری زندگی جی رہے تھے۔ کتنا سکون تھا ان کی زندگی میں۔ اور یہ سارا سکون اس شخص نے درہم برہم کر دیا تھا۔

"عائشہ کی بات پکی کر دی میں نے بہت اچھے لوگ ہیں تمہارے ابا کو بہت اچھے لگے ہیں۔" ماں خوشی خوشی فون پر بتا رہی تھی۔

"پر اماں وہ تو ابھی چھوٹی ہے۔" اس نے احتجاج کیا تھا۔

"کہاں چھوٹی ہے تھرڈ ایئر میں پڑھتی ہے۔ بس سال بھر کی بات ہے پڑھائی ختم ہو جائے گی۔" ماں تو ہتھیلی پر سرسوں جمائے بیٹھی تھیں۔

"پڑھائی سے پہلے شادی نہیں کرنی۔" اس نے کمزور سا اعتراض کیا تھا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ بس ابھی صرف بات پکی کی ہے۔" ماں کی خوشی محسوس کر کے اس نے زیادہ اعتراض نہیں کیا۔

وہ کچھ دنوں کے لیے صائمہ کی شادی میں گئے تھے۔ سکندر نے بھائیوں والے تمام فرائض ادا کرتے ہوئے بہت دھوم دھام سے صائمہ کو رخصت کیا تھا اس کے میکے والے بھی آئے تھے۔ عجوہ کی ماں نے سونے کی چین تحفے میں دے کر ایک طرح سے سکندر کے تحفے کا بدلہ اتارا تھا۔ وہ ایک خوددار بیٹی کی ماں تھیں یہ سوچ کر وہ مسکرایا تھا۔ جبکہ الفت تو کچھ پل کے لیے بھونچکا سی رہ گئی تھیں۔ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا تھا۔ "اس کی کیا ضرورت تھی؟"

نند کی شادی میں اس نے بھی روایتی بھابھیوں کی طرح اپنے تمام فرائض نبھائے تھے۔ اس کی ساس خوش نظر آرہی تھیں۔ پوری شادی میں سکندر کی نظروں کا مرکز عجوہ ہی رہی۔ حذیفہ اس کا خوب مذاق اڑا رہا تھا۔

"یار مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم اپنی بیوی کے لیے مجنوں بن گئے۔ کیسے تمہاری نظریں بھٹک رہی ہیں جیسے صدیوں سے دیکھا نہ ہو۔ یار ان بلیو ایبل۔"

رخصتی کے بعد وہ میرج ہال سے ضروری کام نپٹا کر گھر واپس آیا تھا۔ سارا گھر بکھرا پڑا تھا ملازمین صفائیاں کر رہے تھے۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا۔

"کل چلیں گے ساری تیاری مکمل رکھنا۔"

"اتنی جلدی تو ممکن نہیں ہے پرسوں چلے جائیں گے۔" عجوہ نے کہا تھا۔

"چھٹی نہیں مل رہی میں امی سے بات کر کے آتا ہوں۔" اسے ٹال کر وہ ماں کے پاس آیا تھا۔

"کل جا رہی ہیں نا آپ۔"

"ایسے کیسے ابھی تو……"

"امی پلیز چھٹی نہیں مل رہی حساس دن شروع ہونے والے ہیں آپ کو پتا ہے نا کہ ملک میں سیکورٹی کا مسئلہ کتنا بڑھ گیا ہے۔ اس لیے سب کی چھٹیاں منسوخ کروا رہے ہیں ان دنوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے" وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے کہہ گئیں۔

اگلی صبح جب صائمہ اور وقار کا ولیمہ تھا وہ بحالت مجبوری واپس چلے گئے تھے لیکن جاتے جاتے صائمہ کے سسرال میں معذرت کرنا نہیں بھولے تھے۔ واپس آکر وہ بہت تھکے ہوئے تھے گھر کی حالت ٹھیک

تھی شاید ملازمین ان کے آنے سے باخبر تھے تبھی پورا گھر صاف ستھرا تھا۔ وہ تو گھر آتے ہی اپنے کمرے میں سونے چلا گیا تھا جبکہ وہ پیکنگ کھول کر چیزیں جگہوں پر رکھنے لگی۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد وہ کشمکش میں گھری تھی۔ اگر الگ کمرے میں سوتی تو اس کی ساس کو شک ہو جاتا اور اگر اس کے کمرے میں جاتی تب بھی دل آمادہ نہ تھا۔ سوچتے سوچتے دماغ کی رگیں تن سی گئی تھیں لیکن یہ مسئلہ گویا الفت نے ہی حل کر دیا تھا۔

"علیشا میرے ساتھ سوئے گی نئی جگہ ہے دل گھبراتا ہے۔"

الفت نے کہا تو علیشا بولی۔

"دادی آپ کے پاس سوؤں گی اگر کہانی سنائیں گی تو۔" اس کے اس قدر جلد مان جانے پر عجوہ حیران رہ گئی تھی۔

"کیوں نہیں کہانیاں بھی سناؤں گی اور چاکلیٹس بھی دوں گی۔" اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ سکندر کو کمرے میں جاتا دیکھ کر اور ساس کو لاؤنج میں ٹی وی کے آگے جما دیکھ کر وہ ناچار اٹھ کر سکندر کے پیچھے کمرے میں آئی تھی۔ علیشا دادی کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اسے کمرے میں دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے اس کا چہرہ متحیر سا ہوا تھا پھر کچھ سوچ کر مطمئن و مسرور ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

حساس دنوں کے باعث سیکیورٹی سخت کر دی گئی تھی۔ وہ خود تمام حالات کا جائزہ لیتا بری طرح مصروف تھا۔ گھر بھی بہت دیر سے آتا تھا۔ چند دنوں کی تھکاوٹ نے بالکل نڈھال سا کر دیا تھا۔ لیکن یہ تھکاوٹ اس وقت فرحت میں بدلی تھی جب بنا کوئی حادثہ سانحہ ہوئے یہ دن بخیریت بیتے تھے۔ وہ پرسکون سا ہو کر گویا ساری تھکاوٹ بھول گیا تھا۔ لیکن کچھ دنوں بعد جب ایک جلوس کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک جلوس میں ہونے والی فائرنگ کے نتیجے میں دو گولیوں کا نشانہ بن گیا۔

اس کی جان بچ گئی تھی۔ ایک گولی بازو میں اور ایک کندھے میں لگی تھی۔ تین دن ہاسپٹل میں رہ کر اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔ ان تین دنوں میں ماں سارا دن اس کے پاس ہاسپٹل میں رہی تھیں۔ اس نے بارہا جانے پر زور دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تھیں۔

وہ ایک بار ہاسپٹل گئی تھی مگر بچوں کی وجہ سے جلد آنا پڑا اس کی ساس نے بھی اسے نہ آنے کی تنبیہہ کی تھی۔

"بچوں کا خیال رکھو میں ہوں یہاں پر۔"

گھر آتے ہی لوگوں کا تانتا بندھا تھا۔

صبح اٹھا تو ناشتے سے پہلے اس نے کپڑے چینج کرنے کا سوچا لیکن وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ خود سے حرکت کر سکتا۔ آپریشن ہونے کے باعث ہاتھ اور کندھا ابھی بھی پٹیوں میں جکڑے تھے۔ ماں اس کے کمرے میں آئیں۔

"ماں عجوہ سے کہیں کہ میرے کپڑے نکال دے چینج کروں گا کئی دن سے چینج نہیں کیے ہاسپٹل کی بو آ رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں بھیجتی ہوں اسے اور میں ناشتا تیار کرتی ہوں تمہارے لیے۔" اس کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے وہ چلی گئیں۔

کچھ دیر بعد وہ چلی آئی تھی۔

الماری سے کپڑے نکال کر اس کے پاس لے آئی۔ برش وہ کر چکا تھا۔ منہ بھی دھلا لگ رہا تھا۔ کچھ سوچتی وہ اس کے نزدیک آ کر بولی۔

"کپڑے چینج کرو گے۔"

سر ہلاتا وہ دائیں ہاتھ سے بٹن کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند ثانیے بعد وہ آگے بڑھی تھی۔ اس کی شرٹ کے بٹن کھول کر اس نے اس کی شرٹ اتاری تھی پھر بڑی سرعت سے اسے کپڑے چینج کروا کر بولی۔

"ناشتے میں کیا لو گے؟" وہ کہہ ہی رہی تھی کہ الفت ناشتا لے آئیں۔

"اچھا کیا جو کپڑے بدل لیے اب ناشتا کرو۔" ان دونوں کو چھوڑ کر وہ میلے کپڑے لے کر باہر چلی گئی۔ اس

کے لمس کو اپنے سینے پر محسوس کرتا وہ بڑی رغبت سے ناشتا کرنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میری شیو بڑھی ہوئی ہے عجیب رف سا حلیہ ہو رہا ہے یار اب ہر کام کے لیے تو اسے نہیں کہہ سکتا نا وہ بھی تھک جاتی ہے۔ تمہیں پتا ہے میں کبھی کسی عورت کے لیے دل سے تیار نہیں ہوا لیکن یہ عورت جو میری بیوی ہے اس کے لیے میں دل سے تیار ہوتا ہوں اگرچہ یہ مجھے گھاس تک نہیں ڈالتی پھر بھی میں اس کے لیے خود کو پرفیوم میں نہلاتا ہوں۔ میں جانے کیوں چاہتا ہوں کہ اسے اچھا لگوں۔ یار کسی بھی عورت کے لیے میں نے یہ سب نہیں کیا۔" حذیفہ جو اس کے زخمی ہونے کا سنتے ہی بھاگ آیا تھا اس وقت اس کے کمرے میں بیٹھا اس کی زبان سے یہ کلمات سن رہا تھا۔

"وہ باقی سب تمہارے حسن سے مرعوب تھیں اور یہ صاحبہ ہرگز نہیں اس لیے تم سر توڑ کوششیں کر رہے ہو۔" حذیفہ خطرناک حد تک صاف گو تھا۔

"تمہاری بیوی بچے کیسے ہیں؟" اس نے بات بدلی تھی۔

"سب ٹھیک ٹھاک" اس نے خوش دلی سے کہا تھا۔ حذیفہ ایک دن رک کر واپس چلا گیا تو تیسرے ہی دن اس کی تینوں بہنیں آگئی تھیں۔ پہلے تو بھائی کو گلے لگائے دھواں دھار روتی رہیں پھر دل کھول کر ہنسی اور قہقہوں کی محفل سجائی جو رات دیر تک جاری رہی۔ سکندر ان کے کمرے میں سب کے ہمراہ تھا۔ وہ سب کاموں سے فارغ ہو کر ان کے پاس آئی تھی۔

"عجوہ تم نے ابھی تک کوئی خوشخبری نہیں سنائی۔" بڑی نند شاکرہ نے یکدم سے سب کے سامنے بات چھیڑی تھی۔ ایک لمحہ کو وہ بھی کچھ بوکھلا سی گئی تھی پھر چہرہ نارمل کرتی بولی۔

"وہ آل ریڈی میرے پاس ہیں۔" اس کے الفاظ میں چھپے طنز پر وہ سب کچھ لمحوں کے لیے چپ کی چپ رہ گئی تھیں۔

"فاخرہ کے بھائی کی بھی یہاں پوسٹنگ ہوئی ہے وہ آج کل یہیں پر ہے۔" کچھ دیر بعد وہ سب اپنے کسی چچا زاد بہن کی بات کرتی ایک بار پھر باتوں میں مشغول ہو گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ باقاعدگی سے اس کے زخموں پر مرہم لگاتی اور ایسا کرتے وقت ہرگز بھی کسی قسم کے تاثرات اس کے چہرے سے آشکار نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت بھی جب بچے آپس میں کھیل رہے تھے۔ بہنیں اور اماں لاونج میں بیٹھی ٹی وی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں وہ اس کے زخموں پر مرہم لگانے بیڈ کنارے بیٹھی احتیاط سے اس کی شرٹ اتار کر زخمی کندھے پر مرہم لگانے لگی۔ اب زخم کافی حد تک ٹھیک ہو چکے تھے وہ اس کے بہت قریب بیٹھی تھی وہ اس کے قرب میں سرشار سا ایک سوال کر بیٹھا۔

"اگر میں مر جاتا تو تمہیں تو خوشی ہوتی نا؟"

اسے خاموش پا کر ایک بار پھر وہ جملہ دہراتا اس کے چہرے پر کچھ تلاشنے لگا۔

"تم خاموشی سے کام کرنے دو گے۔"

"کیوں کیا غلط کہا میں نے۔"

"تمہارے بچوں کے ساتھ کیا دشمنی ہے میری۔" اب کے براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کا سارا سکون درہم برہم کر چکی تھی۔

"میرے بچوں کی پروا ہے اور میری؟" اس کے بازو پر مرہم لگا کر وہ اٹھی تو جیسے زندگی اس کے قریب سے اٹھ گئی۔

کس قدر بدنصیب ہوں کہ اتنے قریب رہ کر بھی میں اس سے کتنا دور ہوں۔ دل میں کہتا وہ سر بیڈ کے سرہانے ٹکا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی بہنیں چلی گئی تھیں۔ گہما گہمی ختم ہو گئی تھی۔ وہ اب تقریباً ٹھیک ہو گیا تھا اور پھر سے ڈیوٹی

جوائن کر چکا تھا۔ ایک بار پھر پرانی ڈگر پر زندگی چل پڑی تھی۔

رات کو دیر تک اسے کمرے میں نہ پا کر وہ باہر چلا آیا تھا۔ وہ لان میں اندھیرے میں بیٹھی جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ ملازم کو بھیج کر اس نے اسے کمرے میں بلوایا تھا۔ باہر سردی تھی حیرت اس بات پر تھی کہ اتنی سخت سردی میں وہ باہر کر کیا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے میں آئی۔ اس نے اسے بغور دیکھا وہ شاید روتی رہی تھی۔ اس کی متورم آنکھیں کسی پریشانی کی غماز تھیں۔ وہ ہیٹر تیز کرتا اس کے پاس آیا۔

"تم باہر کیا کر رہی تھیں۔ کتنی سخت سردی ہے اندازہ ہے تمہیں۔"

"تو کیا ہوتا ہاں کیا ہوتا۔ سردی تم سے زیادہ خوفناک تو نہیں تم سے زیادہ بھیانک تو نہیں"

"کیا مطلب" وہ تو گویا اچھل ہی پڑا تھا۔ اس کا لہجہ اور انداز بہت خراب لگ رہے تھے۔

"تم کتنے مکروہ ہو کتنے گندے ہو بتا دو آج وہ سب جو تم کرتے رہے ہو۔" وہ اس کا گریبان پکڑے چیخ پڑی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" وہ بہت الجھا تھا۔

"تم بدکار ہو پتا تھا مجھے پر اس حد تک کہ چچا زاد بہن تک کو نہیں چھوڑا۔" اس کی آنکھوں کی بے یقینی اور الفاظ نے اس کے چہرے کی رنگت اڑا دی تھی۔ وہ مختل حواس لیے کچھ بول ہی نہ پایا تھا۔

"بالکل ڈر نہیں لگا تمہیں، ذرا احساس نہیں جاگا ذرا نہیں ڈرے تم بولو۔" وہ رونے لگی۔

وہ اپنے حواس کھونے لگا کتنی مشکلوں سے تو وہ اس کے تھوڑی قریب ہوئی تھی اور اب ایک بار پھر وہ دور ہونے والی تھی۔

"کس نے کہا تم سے؟" اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"اسی نے جس کے ساتھ تم نے منہ کالا کیا" ایک ایک لفظ پر زور دیتی وہ چلائی۔

"کیا؟ وہ آئی تھی یہاں" وہ شدید حیران تھا۔

"ہاں اس نے بتایا ہے مجھے۔"

"تو اس نے نہیں بتایا کہ اس نے اپنی مرضی سے۔"

"جھوٹ مت بولو۔"

"ہاں صرف میں ہی جھوٹ بولتا ہوں باقی سب سچے ہیں وہ خود آئی تھی میرے پاس اس نے اپنی رضامندی سے اپنا آپ سونپا تھا مجھے۔ تمہیں میں خطاکار دکھائی دیتا ہوں مگر ان میں ایک لڑکی بھی بری نہیں دکھائی دیتی جو اپنی مرضی سے میری جھولی میں گر رہی ہیں۔ میں نے کبھی کسی کے ساتھ زبردستی نہیں کی۔ اگر میں اتنا کمینہ ہوں تو آج تم میرے نکاح میں ہو کیا میں نے پچھلے تین سال سے تمہیں ہاتھ لگایا۔ بولو کیا میں نے تمہیں چھوا۔ تمہاری مرضی کے بغیر تمہیں ہاتھ تک لگانے کی کوشش کی۔ تمہارے ساتھ تو میں زبردستی بھی کر سکتا ہوں۔ کیا میں نے ایسا کیا۔ بولو۔ یہ سب جہاں خوبصورت ہینڈسم مرد دیکھتی ہیں وہاں مچھلیوں کی طرح پھسلتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب لڑکیاں بری ہیں مگر جس طرح میرے جیسے کمینے مرد ہیں بالکل اسی طرح ان جیسی عورتیں بھی ہیں تم ہر بار میرا احتساب کرنے لگتی ہو۔ میں قسم کھانے کو تیار ہوں وہ خود آئی تھی میرے پاس وہ سب سے پہلی لڑکی ہے جس نے مجھے یہ احساس دلایا تھا کہ میں چاہے جانے کے قابل ہوں۔ اس نے اپنا آپ خود بے مول کر دیا تھا میرے سامنے۔ اب اس کی ذلالت دیکھو کہ خود اپنی عزت کی دھجیاں بکھیرتی پھر رہی ہے۔" وہ غصے اور نفرت کی انتہا پر تھا۔

"میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی میں اب تمہارے ساتھ ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔" وہ تو جیسے بم اس کے اعصاب پر پھوڑ گئی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو پاگل ہو گئی ہو۔" اس کے ہٹیلے انداز پر تو وہ لرز گیا تھا۔

"میں تمہارے ساتھ ہرگز نہیں رہوں گی۔" اس کو دھکا دیتی وہ اپنا بیگ لے کر الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔

"ایسا کیسے کر سکتی ہو تم۔" کھینچ کر اسے وہ روکنے لگا۔

"مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔" وہ چلائی۔

"تمہارے جیسے بدکردار کے ساتھ میں ایک پل نہیں رہ سکتی۔" وہ شدت سے روتی بلکنے لگی تھی۔ اسے روتے دیکھ کر وہ خود پر سارا کنٹرول ختم ہوتا دیکھ رہا تھا۔

"میں مر جاؤں گا اگر تم نے مجھے چھوڑا تو میں مر جاؤں گا۔"

"تو مر جاؤ۔" سختی سے کہتی وہ چیخ پڑی۔

"پلیز ایسا مت کرو پچھلے تین سالوں سے میں کسی عورت کے نزدیک تک نہیں گیا۔ ہر عورت بہن لگتی ہے تمہارے سامنے میں قسم کھاتا ہوں۔ میں نے ان تین سالوں میں کسی عورت کو نہیں چھوا۔ ہاں میں گناہ گار ہوں پر اب میں یہ گناہ ترک کر چکا ہوں یقین کرو میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔"

"نہیں ہے مجھے تمہاری کسی بات کا یقین۔" وہ آنسو صاف کرتی ایک بار پھر بیگ میں کپڑے ڈالنے کے لیے الماری کھولنے لگی۔

"تم کسی سے بھی پوچھ لو تحقیقات کراؤ۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم سے شادی کے بعد میں کسی عورت کے نزدیک نہیں گیا۔" وہ اسے اپنے فیصلے سے نہ ہٹتے دیکھ کر رونے لگا۔

"اگر تم گئیں تو میں سب کچھ تہس نہس کر دوں گا۔ تم نہیں ہو گی تو اس اعلا عہدے سے بھی جان چھڑاؤں گا۔ سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ اور سب سے پہلے تو میں فاخرہ کا خون کروں گا۔ اس نے میری زندگی تباہ کر دی۔ ہر چیز کو آگ لگا دوں گا میں۔ میرے پاس کچھ نہیں رہنا چاہیے سب کچھ تباہ برباد کر کے رکھ دوں گا۔" وہ شدت سے رونے لگا۔

وہ کپڑے بیگ میں رکھنے لگی اسے تیاری کرتا دیکھ کر وہ منت سماجت پر اتر آیا تھا۔

"تم سب کی باتوں پر یقین کرتی ہوں صرف میرا ہی نہیں کرتیں یہ کیسا انصاف ہے۔ میری بات پر یقین کرو۔" اسے ٹس سے مس نہ ہوتا دیکھ کر وہ یکدم سے مڑ کر سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے میں خود کو ہی ختم کر لیتا ہوں۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا اس کے لہجے سے گھبرا کر وہ سرعت سے اس کے پاس جا کر اس کو کھینچ کر بولی۔

"نہیں جا رہی۔" ہچکیوں سے روتی وہ بیگ فرش پر پھینک کر کمرے سے نکل گئی تھی۔ ان دو بیٹیوں نے مجبور نہ کیا ہوتا تو وہ اس قدر ذلت بھری زندگی کیوں گزارتی۔ روتے ہوئے وہ بار بار خود سے کہہ رہی تھی۔

ساری رات سوئی نہیں تھی صبح سوجی آنکھیں سپاٹ چہرہ سے انہیں ناشتا کروا رہی تھی۔ وہ ناشتا کرتے ہوئے اسے بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ بے نیازی سے علیشا اور علینہ کو ناشتا کروا رہی تھی۔ پھر علیشا کو بیگ دے کر بولی۔

"گاڑی میں بیٹھو۔" وہ نکلی تو سکندر بھی اٹھ کر اس کے پیچھے نکل گیا تھا۔ علیشا کو اسکول ڈراپ کرتے ہوئے بھی وہ اس کی ناراضی کو سوچے جا رہا تھا۔ سارا دن آفس میں برا گزرا تھا۔ اس کی زندگی کی نیا پار لگ ہی نہیں رہی تھی۔ جہاں وہ کچھ اچھا ہونے کی امید کرتا وہاں سے بدقسمتی کا نیا در کھل جاتا۔ وہ کوئی بات نہیں کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

جان پر تو اس وقت بن آئی تھی جب اس نے اسے بیگ تیار کرتے دیکھا تھا۔

"کہاں جانا ہے؟"

"عائشہ کی شادی ہونے والی ہے جانا ہے۔"

"پر وہ تو مہینے بعد ہے۔" اس نے جیسے کمزور سا احتجاج کیا۔

"بیس دن بعد امی کے ساتھ تیاریاں کرنی ہیں۔"

"زینب اور فاطمہ تو ہیں نا وہ کر لیں گی۔"

ایک لحہ کے لیے آنکھیں اٹھائے سپاٹ سا دیکھنے کے بعد وہ بولی۔

"میں کروں گی میں جا رہی ہوں۔"

تب سے دل میں کھدبد ہونے لگی تھی۔ اتنے دن اس کے بغیر وہ کیسے رہے گا۔

علینہ کو گلے سے لگائے بار بار چومتا وہ کن انکھیوں سے اسے بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کے جانے تک وہ بار بار سوچ کر اداس ہوتا رہا کہ وہ اتنے دن کیسے ان کے بنا گھر میں رہ پائے گا۔ وہ دن آپہنچا تھا اور وہ انہیں لے کر چلا گیا تھا۔ انہیں چھوڑ کر وہ واپس ڈیوٹی پر آیا تھا۔ گھر میں صرف دو ہی بندے تھے وہ اور اس کی ماں۔ وہ بور ہونے کے لیے بالکل تیار تھا۔

روز رات کو فون کر کے علیشا اور علینہ کے ساتھ بات کر کے ریلیکس ہو جاتا۔ وہ زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ آج بھی جب اس نے بات کی تو وہ ایک دو باتوں کے بعد خدا حافظ کہنے لگی۔

"بات کرو نا۔"

"مجھے نیند آ رہی ہے۔" اس نے کہا تو وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

"پر مجھے نہیں آ رہی۔"

"میں بند کر رہی ہوں۔"

"پلیز کسی اور سے بھی بولنے نہیں دیتیں اور خود بھی بات نہیں کرتیں۔ میں کیا کروں۔" وہ حقیقتاً پریشان تھا۔

"تو کسی اور سے کر لو اپنے دو نمبر جذبے مجھ پر مت لٹاؤ۔" وہ ترشی سے بولی تھی۔

"تم پر اپنے جذبے ہی نہیں پوری ہستی لٹانے کے لیے تیار ہوں۔ اس کی بوجھل —— آواز کے ہر تاثر کو توڑتی وہ سپاٹ انداز میں بولی۔

"ان فضول باتوں کے لیے فون کیا ہے؟"

"میری ہر بات فضول لگتی ہے میں بھی فضول لگتا ہوں پر مجھے نہ تو تمہاری کوئی بات فضول لگتی ہے نہ تم۔ اس لیے میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تم سے بولتا رہوں۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"تمہیں آزادی ہے تم کسی سے بھی بات کر لو پر مجھ سے نہیں۔"

"کل کو —— یہی بولو گی کہ میں تمہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ میں تمہارے کسی بھی جھانسے میں نہیں آؤں گا صرف تمہارے ساتھ بولوں گا۔ تم سے شادی کے بعد تلخ باتیں سن سن کر اب ان باتوں کا عادی ہو گیا ہوں کسی اور کی زبان سے شہد بھی ٹپکتا ہے تو پتھر کی طرح لگتا ہے۔ جو سکون تم سے بات کر کے ملتا ہے وہ کہیں نہیں۔"

"مجھے کام ہے" وہ اس کی باتوں سے تنگ آ کر بولی۔

"مجھ سے زیادہ ضروری ہے" اس کا مخمور لہجہ اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"تمہیں نہیں پتا عجوہ جب وہ مخمور انداز میں بولتا ہے نا تو میں بت بن کر صرف اور صرف اسے سنتی رہتی ہوں۔ میں اس کی آواز اس کے لہجے کی دیوانی ہوں۔" اس کے کانوں میں ضوباریہ کی آواز گونجی تھی۔ تلخ ہو کر بولی۔

"مجھے تمہاری آواز سے نفرت ہے۔ اس لیے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔" اس کی بات پر دوسری جانب یکدم سناٹا چھایا تھا کچھ ثانیے بعد وہ پھیکی ہنسی ہنستا بولا۔

"پر مجھے تو تمہاری آواز سے عشق ہے نا مجھے تو سننے دو۔" پھر وہی مخمور لہجہ۔

"میں بند کر رہی ہوں۔" پھر واقعی اس نے فون کاٹ دیا تھا۔

ایک پھیکی مسکان ہونٹوں پر لاتے وہ موبائل کو گھورتا رہا تھا۔

سرکتے دن رات اسے اپنے آپ سے اور لاپروا کرتے جا رہے تھے آج اس کا رویہ کچھ زیادہ ہی خراب اور جارحانہ تھا۔ صبح آفس میں سب پر بگڑتا وہ جب گھر آیا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ آچکی تھی۔ وہ الفت کے ہمراہ بیٹھی شادی کا احوال سنا رہی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ ساس کے پاس سے اٹھی اسے بیٹھنے کی جگہ دے کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی نظریں مسلسل اسی پر تھیں۔ یکلخت وہ اٹھ کر کچن میں گئی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد وہ علینہ کو لے کر سیدھی کمرے میں گئی تھی۔ اپنی بے اختیاری پر جھنجلاتا وہ کچھ دیر تک تو

ماں کے پاس بیٹھا رہا پھر کمرے میں آیا۔ علینہ کو نہلا کر اس نے اس کے کپڑے بدلے تھے۔ کپڑے بدل کر وہ اسے کھیلنے بھیج کر خود مغرب کی نماز پڑھنے لگی وہ بے چینی سے پورے گھر میں پھرتا پھراتا ایک بار پھر کمرے میں آیا۔

"کیا کھاؤ گے؟"

وہ یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔

"تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔"

"آں" وہ چونک اٹھا۔ اس کے بے ترتیب حلیے کو بغور دیکھتی وہ بولی۔

"کیا کھاؤ گے۔"

"جو بھی ہو۔"

کھانے کی ٹیبل پر وہ برائے نام کھا رہا تھا۔ اس کی پلیٹ بھری پڑی تھی۔ جسے نوٹ کرتے ماں ٹوکے بنا نہ رہ سکی۔

"اپنی حالت دیکھی ہے کتنے کمزور ہو گئے ہو۔ کیوں اڑی ہوئی ہے تمہاری بھوک؟ یہ کیا حالت بنالی اس نے اپنی۔" آخری جملہ انہوں نے عجوہ کو دیکھ کر ادا کیا تھا۔ وہ خجل سی پلیٹ پر جھکی تھی۔

وہ اٹھ گیا تھا۔

پھر اس نے نوٹ کیا وہ دن بہ دن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ کھانے برائے نام کھاتا۔ اکثر نہ بھی کھاتا۔

رات کو حذیفہ سے فون پر بات کر کے وہ کہہ رہا تھا۔ "اگر اس کی نفرت میری موت سے ختم ہو سکتی ہے تو پھر ٹھیک ہے میں مرجاتا ہوں نہ جینا اچھا لگ رہا ہے نہ کھانا۔ وہ کہتی ہے کہ میری آواز اسے سخت بری لگتی ہے۔ تو پھر میں جی کر کیا کروں گا۔ اس سے بہتر ہے کہ میں مر جاؤں۔" بہت دل گیر سا وہ اپنے دل کی ہر بات شیئر کر رہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر وہ موبائل آف کر کے باہر چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دفتر سے آیا تو فاخرہ کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر ناگوار شکنیں ابھر آئی تھیں۔

"یہ کیوں آئی ہے؟" وہ اس کے پیچھے کچن میں آیا تھا۔

"میں ابھی اسے گھر سے نکالتا ہوں۔" وہ برہم تھا۔

"تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔"

"میں اسے کچھ نہ کہوں اور یہ میرا گھر تباہ کر دے میں ایک منٹ بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ سخت اشتعال میں تھا۔

"تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔" ایک ایک لفظ پر زور دیتی وہ اسے روک رہی تھی۔

"تو ٹھیک ہے میں ہی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔" وہ رکا نہیں تھا وہ ٹرے میں چائے اور اسنیکس رکھ کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

"مجھے دیکھ کر اس کی تیوری چڑھ گئی تھی ناراض ہو رہا ہو گا نا۔"

فاخرہ بڑے خوش کن لہجہ میں پوچھنے لگی۔

"ہاں ایسا ہی ہے۔" اس نے بھی سچ اگلا تھا۔

کچھ دیر کے لیے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا پھر قدرے ریلیکس ہو کر بولی۔

"میری زندگی اس کے ہاتھوں تباہ ہوئی ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی کبھی نہیں۔ مجھے برباد کر کے خود کتنی عیش بھری زندگی گزار رہا ہے۔"

"قصور تمہارا بھی ہے۔ تم نے اسے اتنی ہمت کیوں دلائی تھی کہ اس نے آخری حد تک تمہیں مس یوز کیا۔" اس کی بات پر وہ پہلو بدلتی بولی۔

"اس نے زبردستی۔۔۔۔"

"ہرگز نہیں کوئی مرد اتنی ہمت نہیں کر سکتا کہ لڑکی کی ہمت افزائی کے بغیر اسے چھوئے۔ عشق و عاشقی کے چکر میں اتنی نزدیکیاں لڑکیوں کے لیے بھی درست نہیں۔ تم برابر کی قصور وار ہو سارا الزام تم اسے نہیں دے سکتیں۔" اس کی سچی باتوں پر کڑھتی وہ یکدم سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"میں اب گھر جاؤں گی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"ہاں جاتے جاتے یہ بات یاد رکھنا کہ لڑکی جب تک خود کو مس یوز نہ ہونے دے دنیا کا کوئی مرد اسے مس یوز نہیں کر سکتا۔" ایک بار پھر آتشیں لہجہ میں اسے بہت کچھ سمجھا گئی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئی جبکہ وہ چائے کی ٹرے اٹھا کر ڈرائنگ روم سے نکلی تھی۔

"کھانا کھانے آؤ میں ٹیبل لگا چکی ہوں۔" عجوہ نے جھانکتے ہوئے اطلاع دی اور چلی گئی۔ کافی دیر تک وہ نہیں آیا تو وہ ایک بار پھر اسٹڈی روم میں آئی۔

"کھانا کھانے آؤ۔"

"نہیں کھانا مجھے۔"

وہ مسلسل لیپ ٹاپ پر اپنا کوئی کام کیے جا رہا تھا۔

اگلے دن جب وہ شام کو گھر آیا تو آتے ہی بولی۔

"بچے باہر جانا چاہتے ہیں آؤٹنگ کے لیے۔"

"میں جا کر تیار ہوتا ہوں پھر چلتے ہیں" اس کی تیاری میں تقریباً گھنٹہ لگا تھا۔ وہ سب بھی تیار بیٹھے تھے کچھ دیر میں وہ گاڑی میں بیٹھے قریبی جھیل جا رہے تھے۔ ڈرائیونگ وہ خود کر رہا تھا۔ بچے پچھلی سیٹ پر تھے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی وہ ارد گرد کے نظاروں میں کھوئی دنیا سے بے خبر تھی۔ ڈرائیو کرتے ہوئے وہ ایک نظر اس پر بھی ڈال دیتا۔

جھیل کے پاس پہنچتے ہی اتر کر گاڑی روک کر کے انہیں ایک سہل راستہ کی طرف لے آیا۔

سرسبز پہاڑوں کے بیچ یہ جھیل بہت بڑی تھی۔ ڈھلتا سورج جھیل کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہا تھا۔ شفق کی گہری سرخیاں ابھر آئی تھیں۔ کہیں اکا دکا سرمئی بادل بھی منڈلاتے نظر آ رہے تھے۔ سردی کی شدت بڑھنے لگی تھی ٹھنڈی یخ بستہ ہوا ٹھٹھرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

"چلو دیر ہو رہی ہے، بچوں کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔" وہ علیشا اور علینہ کا ہاتھ تھامے گاڑی کی طرف آئے تھے۔ گھر واپسی تک مکمل تاریکی ہر سو چھا گئی تھی۔

زینب کے ہاں کافی عرصہ بعد بیٹا ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ فوراً" جانے کو دل للچایا تھا۔ بچے ساس کے پاس چھوڑنے کا سوچ کر وہ اکیلی جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ علینہ آج کل مونٹیسوری میں تھی اس لیے وہ اسے بھی لے کر نہیں جا سکتی تھی۔

"ماں کیا کہہ رہی ہیں تم جا رہی ہو۔" وہ بہت دلگرفتہ سا پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔" مختصر کہہ کر وہ جلدی جلدی سلاد کاٹنے لگی۔

"کتنے دن رہو گی؟" مجروح لہجہ اس کے منتشر ذہن کا عکاس تھا۔

"لگیں گے کچھ دن۔"

"اور بچے؟"

"وہ امی دیکھ لیں گی۔"

"پر حرج ہو گا ان کا ہوم ورک دیگر کام ماں تو بہتر نہ کر پائیں گی۔"

"یہ میرا ہیڈک نہیں ہے کیا میں ذرا سی خوشی کی بھی حقدار نہیں۔ کیا میں نے تمہارے گھر کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ کیا میں تمہاری ملازمہ ہوں؟" وہ زہرناکی سے بولی۔

اس کا اکھڑا اکھڑا رویہ اسے چپ کرا گیا لیکن کچھ دیر بعد وہ بولا۔

"میں نہیں رہ سکتا۔ میں خود تمہیں لے کر جاؤں گا پھر واپس اسی دن آجائیں گے۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"مجھے کچھ دن رہنا ہے وہاں۔"

"ٹھیک ہے دو تین دن رہ لو پر۔۔۔۔"

"میں ایک مہینہ رہوں گی" اسے غصہ آیا تھا۔

"پلیز۔" وہ کچھ قریب ہوتا التجا کرنے لگا۔

"ہٹو مجھے کام کرنے دو۔"

"کچھ دن کے لیے جاؤ گی نا۔"

"نہیں میں تم سے بھاگ رہی ہوں نفرت کرتی ہوں تم سے، انتہائی برے لگتے ہو مجھے، اس لیے جانا چاہتی ہوں کیا یہ وجہ کافی نہیں بولو۔"

"میں جانے سے منع نہیں کر رہا پر اتنے زیادہ دن رہنے پر۔۔۔۔"

"مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے خود سری سے کہا۔

ہار مانتے وہ گہری سانس خارج کرتا قدرے دھیرے

سے بولا۔
"کس وقت جاؤ گی۔"
"صبح میں خود چلی جاؤں گی تمہیں زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔"
صبح وہ بچوں کو اسکول بھیج کر تیار ہو کر نکلنے والی ہی تھی کہ گیٹ پر اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا گارڈ لپک کر گیا۔
"چلو۔" اس کے ہاتھ سے بیگ لے کر وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پھینکتا فرنٹ سیٹ کھولنے لگا۔
وہ خاموشی سے بیٹھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اس وقت اس کے چہرے پر گہری خاموشی اور ملال ــــ رقم تھا۔
"تم کب تک اذیت دیتی رہو گی، مجھے تکلیف دیتی ہو تو وہ مجھے قبول ہے مگر میری بیٹیاں اگنور ہوں میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔"
"کیوں پہلے کبھی توجہ دی تم نے ان پر کیا آپی کی موجودگی میں تم نے کبھی علیشا پر محبت بھری نظر ڈالی تھی؟ تم تو اس وقت اپنی عیاشیوں میں مگن تھے نا تمہیں کیا فکر تھی اپنی بچی بیوی کی۔" وہ تنفر سے کہتی چپ ہوئی۔
"ہاں کیا میں نے سب۔ لیکن میں ماضی میں جا کر صحیح نہیں کر سکتا اسی حال کو اچھا کر کے مستقبل کو بہتر بنا سکتا ہوں۔ تم نے تو مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ پچھلی غلطیوں کا احساس دلاتی ہو جب کچھ ٹھیک کرنے لگوں تو بھی طنز کے تیر چلا کر میرا منہ بند کر دیتی ہو اب کروں تو کیا؟" اسٹیرنگ پر زور سے ہاتھ مارتا وہ چلایا تھا۔ اسے سارا غصہ اس کے جانے پر آرہا تھا۔ یہ دوری اسے ناقابل برداشت لگ رہی تھی۔ وہ بہت اشتعال میں گاڑی چلا رہا تھا۔
"تمہیں آپی سے ذرا بھی محبت نہیں تھی؟" اس نے خلاف توقع سوال کیا تھا۔ وہ کچھ پل کے لیے گڑبڑایا پھر قدرے سنبھل کر بولا۔
"سچ بولوں یا جھوٹ؟"
"سچ" اس نے بہت دکھ سے کہا تھا وہ اس کا جواب جان گئی تھی۔
"نہیں" اس پر ایک نظر ڈال کر بولا۔
"اب تم اور نفرت کرو مجھ سے سچ اگلوانے کی وجہ بھی یہی ہے۔" وہ سخت ناراض ہوا تھا۔
"اور جن کے ساتھ گناہ آلود وقت گزارا؟" اب کے اس کے لہجے کی کاٹ پر وہ شرمندہ ہو کر بولا۔
"کیا تم ان باتوں کو بھول نہیں سکتیں؟ اب تو میں ایسا کچھ نہیں کرتا۔ اب تو میں مخلص ہوں تمہارے ساتھ۔ میں سچ کہہ رہا ہوں ایک لڑکی بھی نہیں میری زندگی میں۔ میری ساری محبت صرف تمہاری ہے۔" اس کا اشتعال اب مکمل طور پر ختم ہوا تھا اور وہ اس سے بڑے جذب سے کہتا اسے محبت بھری نظر سے دیکھ رہا تھا۔
باہر کے مناظر میں کھوئی اپنی نم آلود آنکھیں شیشے پر جمائے وہ دل میں روئے جا رہی تھی۔
وہ روز فون کرتا۔ علیشا اور علینہ بھی بات کرتیں۔
"مما کب آئیں گی۔" وہ منہ بسور کر کہتی۔
"بس کچھ دنوں بعد بیٹا۔" وہ پچکارتی۔
"پاپا سے بات کریں۔" علینہ پاپا کو فون پکڑا کر علیشا کے پیچھے بھاگتی نکل گئی۔ کھڑکی میں کھڑا وہ بہت دبی آواز میں بولا۔
"کب آؤ گی؟"
"کوئی پتا نہیں۔ مجھے امی بلا رہی ہیں۔" یکدم سے فون بند کر کے وہ رابطہ کاٹ چکی تھی۔ موبائل دیوار پر مارتا وہ کمرے کی ساری حالت بگاڑ چکا تھا۔
اس کی دنیا تہ وبالا ہو گئی تھی جب راشدہ نے کال کر کے کہا تھا۔
"بیٹا تم دونوں کے بیچ کیا بات ہوئی ہے مجھے کھل کر بتاؤ عجوہ کیوں گھر واپس نہیں جانا چاہتی۔" راشدہ کی بات سن کر وہ سکتے میں آگیا تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے تو وہ بول ہی نہ پایا تھا پھر زبان خشک ہونٹوں پر پھیر کر وہ لڑکھڑاتے لہجہ میں بولا۔
"آنٹی مجھے سمجھ نہیں آئی آپ کیا کہہ رہی ہیں" وہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔
"بیٹا وہ واپس گھر نہیں آنا چاہتی، میرے لاکھ سمجھانے پر بھی روتی رہتی ہے اور جانے سے انکار کر رہی ہے کیا مسئلہ ہے بتاؤ مجھے۔"
"کچھ نہیں ہے آنٹی میں سچ کہہ رہا ہوں میں، ہم میں کوئی لڑائی نہیں میں سمجھ نہیں پا رہا کہ یہ کیوں ایسا کہہ رہی ہے۔" کچھ سوچ کر وہ بولا۔
"آنٹی میری بات کرا دیں اس سے پلیز۔" وہ بہت آزردہ ہوا تھا۔
کچھ لمحوں بعد اس کی آواز ابھری تھی۔
"کہو کیا کہنا ہے؟"
"یہ تم کیا تماشا کرنے لگی ہو تم کیوں میری جان لینے پر تلی ہو کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا خدا کے لیے واپس آؤ۔" وہ رونے لگا۔
"نہیں آسکتی"
"میں مر جاؤں گا کیا کروں تمہارے لیے جو تمہیں خوش کرے بولو کیا کروں تمہارے لیے؟ اگر تم واپس نہیں آئیں تو میں کچھ بھی کر جاؤں گا بچوں کو زہر دے کر مار دوں گا اور پھر خود زہر کھا کر مر جاؤں گا۔ سنا تم نے۔" وہ چلایا۔ کال کاٹ کر وہ شدت سے روتا اپنی محبت کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہونے لگا تھا۔
وہ سڑکوں کی خاک چھانتا دو دن سے باہر تھا۔ اسے کچھ بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا ساری دنیا ہر چیز بری لگ رہی تھی۔ دگرگوں ہوتی حالت، مخدوش کیفیت نے بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ تغافل کی کہر خود پر چڑھائے وہ گھر سے لاتعلق اپنا غم غلط کر رہا تھا۔ ماں بار بار کال کر رہی تھیں وہ کسی کال کا جواب نہ دے رہا تھا۔
دل کی دنیا ویران تھی وہ محبت کا سوگ منا رہا تھا۔ اس کی محبت اسے مارنے کی بھرپور کوشش میں تھی وہ مرنے کا اپنے مرنے کا سوگ منا رہا تھا۔ تھک ہار کر وہ گاڑی میں بیٹھا شدید یاسیت میں گاڑی ڈرائیو کرتا اپنی لٹتی زندگی پر سوچے جا رہا تھا۔
کچھ بھی تو نہیں بچا تھا کچھ بھی تو نہیں، وہ لٹا پٹا گھر آیا تھا۔ گارڈ نے گیٹ کھولا تھا۔ گھر پر سناٹا طاری تھا۔
خاموشی کا راج تھا وہ سیدھا کمرے کی جانب آیا تھا۔ دونوں بچیاں دادی کے پاس سوتی تھیں وہ اندر آکر سوئچ بورڈ کا بٹن آن کر چکا تھا۔ تاریکی اجالے میں بدل چکی تھی۔ وہ مڑ کر بیڈ کی جانب آیا اور ٹھٹک کر رک گیا۔
کمبل میں لپٹے وجود کو دیکھ کر وہ کچھ پل کے لیے تو دم بخود رہ گیا تھا۔ روح واپس آئی تو جان آئی لب خود بخود مسکرا اٹھے تھے تیز لائٹ سے آنکھیں چندھیائیں تو وہ مندی مندی آنکھیں رگڑتی اٹھ بیٹھی۔
"آگئیں تم۔" وہ والہانہ اس کی طرف بڑھا تھا۔
دوپٹہ اٹھاتی وہ بیڈ سے اتری تھی۔ "کھانا کھاؤ گے؟"
"نہیں" اس کی بھوک اڑ چکی تھی۔ اب وہ بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھتا بولا۔
"چائے بنا دو"
وہ چائے بنانے چلی گئی۔ کچھ دیر تک تو وہ خوشی سے بے حال دل کو کنٹرول کرتا رہا پھر اس کے پیچھے کچن میں آیا۔ وہ چائے بنا رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ رو

فوزیہ سلیم

بھی رہی ہے۔ چائے کپ میں انڈیل کر وہ جوں ہی مڑی اسے دیکھ کر ٹھٹک کر رکی۔ اپنے بائیں ہاتھ سے آنسو صاف کرتی کپ اسے پکڑا کر کترا کر جانے لگی۔ کپ ٹیبل پر رکھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے روکتے بولا۔

"یہ کیا حرکتیں شروع کر دیں تم نے۔" وہ خاموشی سے کھڑی اب شدت سے آنسو بہانے لگی۔

"کیا ہوا ہے؟ کیا اب پھر کسی نے کچھ کہہ دیا ہے؟" ایک خاموش نظر اٹھائے اس کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ اس کا ہاتھ ہٹاتی جانے لگی۔

"بات کا جواب دو۔" ایک بار پھر وہ سامنے آیا۔

"تم ایسے چھپ نہیں سکتیں، اب بولو جواب دو کیا بات ہے؟" وہ اب قدرے سختی سے بولا۔ وہ بنا آنکھیں اٹھائے شدت گریہ سے اس مرد کا چین و سکون تہ وبالا کر رہی تھی۔ دونوں کندھوں سے تھامے وہ اب محبت سے پوچھنے لگا۔

"جو بھی اس وقت تمہارے اندر چل رہا ہے بول دو۔ بول دو میں سننے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ کہو کیا تمہیں رلا رہا ہے بولو۔" وہ اکسا رہا تھا۔ کافی دیر بعد جب اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں دیکھتا مبہوت رہ گیا تھا۔ اسے دم بخود ہوتا دیکھ کر وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں گئی۔ وہ کچھ ساعت بعد جیسے بیدار ہوا۔ تیز قدموں سے بھاگتا اس کے پیچھے گیا تھا۔ دروازہ لاکڈ تھا۔

"کھولو" وہ دستک دینے لگا۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔

"دروازہ کھولو پلیز۔" وہ نہیں کھول رہی تھی۔ وہ مسکرانے لگا تھا۔

"کھولو نا پلیز۔" مسکراتا اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ مرنے کے قریب تھا۔

"ماں آواز سن رہی ہیں پلیز۔" ایک بار پھر وہ مسکراتا بولا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھول دیا گیا تھا وہ سرعت سے اندر آیا تھا۔ دروازہ لاک کر کے اس کے قریب آکر بولا۔

"تم کب تک بھاگو گی مجھ سے۔" اس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کر کے بڑی دلکشی سے بولنے لگا۔

"تو یہ وجہ ہے نہ آنے کی میں تو کچھ اور سمجھا تھا۔ اب بولو جان مانگو گی وہ بھی دوں گا۔ صرف ایک بار صرف ایک بار اعتراف کر لو کہ محبت کرنے لگی ہو مجھ سے۔" اس کی ساحرانہ آواز اس کی سماعتوں میں رس گھولنے لگی تھی۔ وہ آپی کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی تھی۔

"آپی جس مرد سے تمہیں عشق تھا اس سے تاحیات نفرت کیسے کر سکتی تھی میں۔ کیونکہ مجھے تم سے عشق تھا جس چیز کو تم پسند کرتی تھیں، میں اس سے کیسے نفرت کر سکتی تھی۔ یہ خوف تو مجھے نہ آنے پر مجبور کر رہا تھا۔ صرف اور صرف تمہاری بیٹیوں کی خاطر ہار مان لی میں نے۔ ورنہ تو میں تمہارے ساتھ بے وفائی کبھی نہ کرتی۔" وہ دل ہی دل میں عجیب و غریب تاویلیں دے رہی تھی۔

"ایک بار کہو صرف ایک بار کہ تم محبت کرتی ہو" اس کی گمبھیر اور دلکش آواز نے ایک بار پھر سے جکڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی خاموشی پر زیر لب مسکراتا بولا۔

"اوکے میں تو کر سکتا ہوں نا محبت۔" وہ مجسم سوال بنا کھڑا تھا۔

دھیرے دھیرے اس کے ہاتھ اس کے گرد حصار باندھنے لگے تھے۔ اس کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ پھر یہ حصار کچھ اور مضبوط ہوا تھا۔ اس مرد کے وجود میں برق سی دوڑ گئی تھی۔ ایک پاک عورت کا وجود اس مرد کے وجود کو کسی ان چھوئے احساس سے دوچار کر رہا تھا۔ اس کے کسی عمل میں مزاحمت نہیں تھی۔ اس کی ہمت بڑھی اور وہ اسے دیوانہ وار اپنی محبت کا احساس دلانے لگا تھا۔ وہ عورت مضبوط تھی اس مرد کو چاروں شانے چت کر دینے کے بعد اسے اپنا آپ سونپ گئی تھی۔

☆

پانچ سال بعد ہی سہی ٹھنڈی گرم محبت کی آہیں بھرتے بھرتے ہم نے آپ کو پا ہی لیا امبرین فاروق!" حجلہ عروسی میں سر جھکائے خوب صورت سی پری کو عشال ملک نے کہا تھا! اور بیٹھتے ہی اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا وہ اس کے روپ کو آنکھوں کے راستے دل میں اتار رہا تھا اور امبرین فاروق کا دل اتنی ہی شدت سے دھڑک رہا تھا عشال ملک اس کے نوخیز حسن، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے یاقوتی ہونٹ اور مقناطیسی آنکھوں میں ڈوب رہا تھا دل میں جذبوں کی فراوانی سرخوشی اور آنکھوں میں دید کا شوق پلک جھپکنے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔

"مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا تم میرے پاس ہو! میری محبت میری زندگی! میرا دل کر رہا ہے کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤں اور اعلان کروں میں نے اپنی محبت کو پالیا ہے میری فتح ہو گئی ہے مجھے میری امبر مل گئی ہے۔" وہ اس کے دودھیا گداز ہاتھوں کو لبوں سے لگاتا مخمور لہجے میں کہتا امبرین فاروق کی پوری ہستی کو ہلا گیا تھا۔ اتنی تڑپ اتنی چاہت وہ تو زمین تھی عشال ملک کی محبت نے اسے واقعی امبر بنا دیا تھا وہ زیر لب مسکرائی تھی۔

"سچ سچ بتاؤ تم کہیں بنگال میں پیدا تو نہیں ہوئی تھیں تمہارا حسن تو بنگالیوں کو بھی مات دے گیا اور مجھ جیسے پتھر دل بندے پر جادو کر گیا۔"

امبرین فاروق کی سیاہ جھالر جیسی پلکیں مزید جھک گئیں۔

چمن ویران ہے اب تک شگوفے کھل نہیں پائے

بڑی تاخیر کر دی ہے کسی نے مسکرانے میں

عشال ملک لفظوں کا کھلاڑی تھا اور ہر جملے کے آخر میں شعر ادا کرنے کی پرانی عادت امبرین فاروق کے لبوں پر مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ دل تو سینے میں اچھل کود کر رہا تھا سامنے بیٹھا بہت اپنا سا بندہ اسے مزید نا جز کر رہا تھا۔

"یار کھل کر مسکرا بھی دو پانچ سال کافی نہیں ترسانے کے لیے۔"

ساتھ ہی اس کا نازک ہاتھ کھینچ کر اپنے اوپر گرا لیا تھا روشن چاند کی جگمگاہٹ میں وہ رات محبت کی بے تابیاں شبنم سے بھیگی بے تاب سرگوشیاں سنتے گزر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

امبرین فاروق کو لگتا تھا یہ زندگی تو کوئی اور ہے جسے عشال ملک کی دیوانگی نے اسے ہو! میں تحلیل کر رکھا تھا اک اک لمحہ امر تھا محبت تھا.... عشق کی یہ کون سی منزل تھی؟ ہر گزرتے دن کے ساتھ عشال ملک کی محبت میں وارفتگی بڑھتی جا رہی تھی۔ عشال ملک نے سب سے ٹکر لے کر ذات برداری سے باہر شادی کی تھی۔

امبرین فاروق اس وقت FCS کے پیپر دینے آئی تھی عشال کے کالج جب عشال سے ٹکر ہوئی اور وہ پہلی نظر کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا بچپن کی منگ بھی چھوڑ دی خاندان کی باتیں بھی سنیں ماں کی ناراضی بھی جھیلی، بہنوں کے طعنے بھی سنے۔ مزید امبرین فاروق کے والدین کی سخت ترین شرائط بھی پوری کیں۔ امبرین کے والد کی شرط تھی ایک تو وہ امبرین کو ایم اے کرنے سے پہلے رخصت نہیں کریں گے دوسرا اسے اپنا کاروبار کرنا ہوگا اور گھر بنانا ہوگا۔ یہ سب اتنا آسان بھی نہ تھا پورے پانچ برس بعد وہ تمام شرائط پوری کرنے کے قابل ہوا تھا۔

گزرے پانچ برس عشال ملک نے کیسے گزارے تھے لمحہ لمحہ امید کا دامن تھام کر ایسے میں امبرین سے بھی کوئی رابطہ نہ تھا جو کوئی آس کوئی سہارا کوئی محبت کا جگنو وقت کو مختصر کرتا، وجہ امبرین کے والد تھے جنہوں نے موبائل پر بھی رابطہ نہ کرنے دیا تھا امبرین بھی پردہ کرتی تھی اور اس نے بھی کوئی میل ملاقات کی کوششیں نہیں کی تھیں عشال ملک امبرین فاروق کے کردار کا بھی قائل ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

عشال ملک کے والد حیات نہ تھے، والدہ بھی اس رشتے کے خلاف تھیں اس کی شادی پر بھی بہت مشکل سے راضی ہوئی تھیں کیونکہ عشال کے دونوں بڑے بھائیوں نے بھی پسند سے شادی کی تھی اور ان کی بیویاں انہیں اپنے من پسند شہروں میں لے کر جا بسی تھیں۔ دو بہنیں تھیں ایک شادی شدہ اور دوسری کالج میں پڑھ رہی تھی۔ نٹ کھٹ سی مہوش اور اس سے چھوٹا دیور بلال ملک وہ بھی فرسٹ ایئر کے دوسرے سال میں تھا سارا دن وہ دونوں چھوٹے گھر میں اودھم مچائے رکھتے امبرین کو بھی ان سے پیار تھا عشال ملک نے امبرین فاروق کو اپنی ذات کے لیے پابند نہیں کیا تھا کہا تھا تو بس اتنا کہ "میری ماں کا خیال رکھنا ان کا کہا کبھی نہ ٹالنا وہ ہم سے ابھی خفا ہیں لیکن وقت گزرنے پر ٹھیک ہو جائیں گی بس تمہیں انہیں راضی رکھنا ہے۔" اور امبرین نے یہ بات پلو سے باندھ لی وہ ویسے بھی سب سے مل جل کر رہنے والی تھی محبت سے گندھی ہوئی لڑکی۔ عشال کی محبت، وارفتگی توجہ اور وفا کے عہد و پیمان اس کے اندر روز توانائی لاتے تھے جس قدر عشال کی محبت اس پر نچھاور ہو رہی تھی وہ اس قدر چوکس چوبند رہتی۔ یوں لگتا تھا اس کے اندر خون نہیں عشال کی محبت دوڑتی ہے اور امبرین فاروق کے ہر انداز سے چھلکتی بھی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو جان من کچھ پل میرے پاس بھی رک جایا کرو" امبرین جو کمرے میں کسی کام سے آئی تھی عشال ملک کی گرفت میں آگئی۔ وہ ہر لمحے کسی نہ کسی موقع کی تلاش میں رہتا تھا قربتوں کا خواہش مند۔

"کیا کرتے ہیں آپ باہر ماریہ آپا آئی ہیں بچوں کے ساتھ۔" امبرین نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"سب کے لیے ہے تمہارے پاس ٹائم بس میرے لیے نہیں ہے تمہاری خاطر دوڑا دوڑا دفتر جاتا ہوں دوڑا دوڑا گھر آتا ہوں۔" عشال ملک نے اتنے معصوم انداز میں کہا کہ امبرین بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔ اور وہ دیوانہ وار اسے دیکھتا چلا گیا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟" امبرین نے اس کی نشیلی آنکھوں میں دیکھا اور گھبرا کر پوچھا۔

"تمہاری مسکراہٹ بہت پیاری ہے امبر عشال یوں لگتا ہے کہ دور پہاڑوں سے شفاف پانی گر رہا ہو یا پھر امبر سے سفید موتی گر رہے ہوں تم واقعی ساحرہ ہو۔" اس کی آنکھوں میں نشہ سا اتر آیا تھا اور آواز بھی رسیلی ہو رہی تھی۔ وہ اس کی مخمور آنکھوں میں دیکھتی خود بھی پگھلنے لگی تھی۔ عشال ملک کے بدن سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو امبرین فاروق کو جکڑ گئی تھی۔ وہ خود سپردگی کے عالم میں اس کے بازوؤں میں بہہ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ جذبات مزید بہکتے عشال کی بہن ماریہ پکارتی اس طرف آرہی تھی۔ عشال ملک نے چونک کر گہرا سانس لیا۔

جھکی جھکی وہ حیا سے پلکیں

رکی رکی وہ ادا سے نظریں

پیام بھی رہ گئے ادھورے

سلام بھی نہ تمام آئے!

حیا سے سرخ پڑتے چہرے پر جھکتے ہوئے عشال ملک شعر پڑھنے سے باز نہ آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

امبرین جتنا عشال کی والدہ کا خیال رکھنے کو ششیں کرتی فیروزہ بیگم اتنا ہی امبرین سے بے زار نظر آتیں حالانکہ وہ ان کے پہلے حکم پر ہی تمام کام چھوڑ کر حاضر ہو جاتی۔ امبرین کو لگتا وہ سخت ناریل جیسی ہیں باہر سے انتہائی سخت اور اندر سے اتنی ہی نرم کبھی کبھی ان کا رویہ خود بخود ماؤں جیسا ہو جاتا۔ اور کبھی انتہائی اجنبیت بھرا ہتک آمیز ایسا خاص کر تب ہوتا جب عشال کی بڑی بہن ملنے آتی اور نہ جانے کون سی پٹی پڑھاتی جو لمحوں میں وہ آنکھوں کو ماتھے پر رکھ لیتی تھیں۔ دو سال ہونے کو آئے تھے ابھی تک امبرین کی گود ہری نہیں ہوئی تھی۔ امبرین اندر سے خوفزدہ بھی

تھی جبکہ عشال ملک مطمئن تھا۔

"یار اچھا ہے نا ابھی ہم آزاد ہیں صرف میں اور تم! بعد میں تو بچے ہو جائیں گے تو تم میرے ہاتھ بھی نہیں آؤ گی۔" اور وہ مزید اس سے کیا کہتی ایسا جواب سن کر۔ فیروزہ بیگم اٹھتے بیٹھتے خالی آنگن کی صدائیں دینے لگی تھیں۔ گلی محلے کی بوڑھیاں بھی اب اکثر ہی یہ سوال بلا جھجک پوچھنے لگی تھیں وہ پریشان ہو کر عشال پر زور دینے لگی کہ باقاعدہ ڈاکٹر کو چیک کروائیں۔ عشال ملک اس کے اطمینان کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا اور رپورٹ آنے پر پورے گھر میں جشن کا سماں چھا گیا تھا رپورٹ پوزیٹو تھی۔

عشال ملک پہلے سے بھی بڑھ کر اس کا دیوانہ ہو رہا تھا اور اب تو فیروزہ بیگم بھی اس کے ناز نخرے اٹھانے میں خوشی محسوس کرتی تھیں۔ کرتی بھی کیوں نہ آخر اس گھر کی پہلی خوشی تھی اور چند ماہ گزرنے کے بعد اس کی جھولی میں گول گپلو سا آریان ملک آگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا تھا۔ عشال ملک دفتر سے آنے کے بعد آریان سے دل بھر کر کھیلتا اس کے ننھے منے ہاتھوں کو دیوانہ وار چومتا اس کے چہرے پر پیار کرتا گویا دو گھنٹوں کے اندر پیار کر کر کے بچے کو تنگ کر دیتا اور آریان باپ کے شدت بھرے لاڈ سے تنگ آکر ماں کی طرف ہمکنے لگتا۔

☆ ☆ ☆

وقت گزرنے کے ساتھ ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں۔ عشال ملک کا خاندان بہت بڑا تھا۔ چچا تایا پھپھو اور ان کے بچے جن کی شادیاں ہو گئی تھیں ان کے بچے۔ روز ہی آمد و رفت رہتی سال بھر تو آریان کو دیکھنے والوں کی لائن لگی رہی اور امبرین کے علاوہ گھر میں کوئی کام کرنے والا بھی نہ تھا۔ ساس تو بیڈ سے نہیں اترتی تھیں اور نند مہوش یونیورسٹی جاتی تھی لیکن کام کو ہاتھ تک نہ لگاتی تھی۔ شادی شدہ نند بھی آجاتی بچوں کے ساتھ تو ہفتے سے پہلے اس کی واپسی نہ ہوتی۔ ایسے میں جو تباہ ہو رہی تھی وہ امبرین کی شخصیت تھی۔ کہاں تو وہ شادی کے دو سال تک ماں نہ بن سکی تھی اور کہاں عشال کی بیٹی کی خواہش تک میں دو بچوں کی ماں بن گئی تھی۔ آریان سے چھوٹا فیضان ملک اور اس سے چھوٹی ماہین ملک۔ وہ ابھی چھ ماہ کی تھی اور جب سے پیدا ہوئی تھی بیمار ہی رہتی تھی۔ بچوں کی ذمہ داری اور گھر کے کام کرتے کرتے وہ تھکنے لگی تھی رنگت زرد ہو رہی تھی۔ ایسے میں عشال کو بھی ٹائم نہ دے پاتی تو اس کا موڈ الگ آف رہتا۔ عشال ملک نے بہت کوششیں کیں کہ نوکرانی رکھ لی جائے گھر کے اوپر کے کام کے لیے، کم از کم امبرین بچوں پر توجہ ہی ڈھنگ سے دے سکے۔ نوکرانی کا سن کر ہی فیروزہ بیگم آگ بگولا ہو گئیں۔

"بھئی ہم نے بھی تو چھ بچے پیدا کیے ہیں۔ ڈھنگ سے کھاتے بھی تھے کام بھی کرتے تھے اور بچوں کو مہمانوں کو گھر کو سنبھالتے بھی تھے۔ ہم نے تو نوکرانی کا دم چھلا نہ لگایا۔ آج کل کی لڑکیوں کے رنگ ہی نرالے ہیں۔ تین بچے پیدا کیے وہ بھی آپریشن کے ساتھ۔ گھر میں افراد ہی کتنے ہیں جو نوکرانی رکھی جائے۔ ویسے بھی آج کل کسی کا بھروسا نہیں نوکرانیاں ہی گھر کو لوٹ کر چلی جاتی ہیں اور نہ ہی ہم اس کے حق میں ہیں۔" ماں کے واضح انکار پر عشال ملک خاموش ہو گیا اور امبرین فاروق خون کے آنسو پی کے رہ گئی۔

گزرتے وقت کے ساتھ امبرین فاروق کو لگنے لگا تھا وہ بالکل تنہا ہوتی جا رہی ہے اندر سے خالی۔ عشال ملک اس سے دور، بہت دور جا رہا ہے نہ تو وہ اس کی نشالی آنکھیں اس کے تعاقب اٹھتی تھیں نہ رسیلی آواز گونجتی تھی۔ عشال ملک کے محبت بھرے وہ الفاظ ہی تو تھے جو اس کے اندر توانائی بھرتے تھے وہ ہر کسی کا مسکرا کر استقبال کرتی تھی۔ دوسری طرف امبرین کی ساس تھیں جن کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ امبرین کو تیر محسوس ہوتے تھے، خنجر جیسے الفاظ جو اسے اندر باہر سے زخمی کر دیتے تھے۔ ہر انسان کی پوری زندگی ان لفظوں کے درمیان ہی گھومتی ہے مختلف چہروں کی زبان سے ادا ہونے والے یہ الفاظ ہی تو ہوتے ہیں جو سننے والے کو زمین سے آسمان پر اور آسمان سے زمین پر گراتے ہیں۔ عشال کے سامنے وہ اپنا دامن صاف بچا لیتی تھیں اور آگے پیچھے اسے نکمی، جاہل، ست اور نہ جانے کیا کیا القابات سے نوازتی تھیں!

امبرین فاروق کی رہی سہی ہمت بھی ان دو لوگوں کے رویوں اور لفظوں نے نچوڑ لی تھی۔ وہ خاموش سے خاموش تر ہوتی چلی گئی تھی کسی بھی شکوے کے بنا اپنے آنسو اپنے اندر چھپا لیتی تھی۔ خاموشی سے اس گھر کی اور بچوں کی خدمت کیے جا رہی تھی۔

دن بھر میں میں اتنا تھک جاتی کہ بچوں کو سلاتے سلاتے بچوں کے پاس ہی سو جاتی۔ عشال کا موڈ تو اب ٹھیک ہوتا ہی نہیں تھا بولتا کیا تھا کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا ذرا سی بات پر بھی چیخنے لگتا تھا اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد تک وہی محبت کا اظہار اور اعتبار دیتا آیا ہے۔ امبر نے تو ایک بار بھی والہانہ اظہار نہیں کیا اگر وہ مغرور ہے اور انا پرست ہے تو ٹھیک ہے مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

رہی سہی کسر فیروزہ بیگم نے پوری کر دی تھی امبرین سے بدگمان کر دیا تھا وہ اک پل بھی اس کے بنا نہ رہنے والا عشال ملک اب ڈھنگ سے بات نہیں کرتا تھا۔

ایسے میں امبرین کے جذبات نہ مرتے تو کیا ہوتا وہ شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی اور سہارا دینے والا ناراض تھا دور تھا۔ آریان چار سال کا ہو گیا تھا امبرین کے چھوٹے دیور بلال نے اس کا اسکول میں ایڈمیشن کروا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"پلیز بھابھی جلدی ناشتا لگا دیں بہت دیر ہو گئی ہے اور آریان تیار ہے؟" بلال ملک نے کھانے کی ٹیبل پر پہنچتے ہی شور مچایا تھا۔ امبرین اس کے آگے ناشتا لگا کر آریان کی طرف لپکی تھی۔

"میری چائے میں بہو بیگم میٹھا ڈالنا آج پھر بھول گئیں۔ کتنی مرتبہ بتایا ہے مجھ سے پھیکی چائے نہیں پی جاتی۔" فیروزہ بیگم نے دہائی دی تھی یہ ان کا معمول تھا اچھی بھلی چیز میں نقص نکالنے کا۔ امبرین آریان کو بیگ دے کر ساس کی طرف گئی تھی۔ دونوں چھوٹے بچے بھی اٹھ گئے تھے اور منہ پھاڑے رو رہے تھے۔

"ارے بھابھی میں نے آپ سے کل کہا تھا کہ میرے لیے آج انڈا فرائی نہ کرنا صرف بوائل چاہیے۔ اس طرح تو بہت موٹی ہو جاؤں گی۔" نند صاحبہ نے اپنا آرڈر دیتے ہی عشال کے سامنے سے انڈا اور دودھ کا گلاس اٹھایا تھا۔ مہوش روز یونہی نرچ کرتی تھی۔

بچوں کے رونے کی آواز زور و شور سے آرہی تھی۔ امبرین نے بے بسی سے عشال کو دیکھا تھا کیونکہ مہوش ملک تو کب کی جا چکی تھی۔ ہر صبح یونہی افراتفری مچی رہتی تھی اور امبرین بھاگ بھاگ کر نڈھال ہو جاتی۔ عشال ملک نے انتہائی غصے کی حالت میں امبرین کو دیکھا اور اس اک نظر سے امبرین کے زرد چہرے پر سایا سا آکر گزر گیا دل میں بھی کہیں درد اٹھا تھا اس سے پہلے کہ وہ کچن کی طرف پھر بھاگتی عشال نے غصے سے ٹیبل پر ہاتھ مارا تھا نتیجتاً شیشے کا گلاس زمین بوس ہوا اور کرچیاں قریب کھڑی امبرین کے پاؤں پر وہ سی کی آواز سے نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔

عشال اس کی پروا کیے بنا کرسی کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا۔ اتنا درد شاید کانچ کے چبھ جانے کا نہیں تھا جتنا عشال ملک کے بے پروائی کا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ سر جھکائے درد کی شدید لہروں کو ضبط کرتی رہی تھی۔ کانچ کا ٹکڑا بری طرح اس کے انگوٹھے میں چبھا ہوا تھا۔ بچوں کے رونے کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ کافی دیر گزرنے کے بعد فیروزہ بیگم خود ہی بڑبڑاتی ہوئی اس تک آئی تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے؟ تم یہیں پر جم گئی ہو۔ بچوں نے الگ مجھے تنگ کر رکھا ہے۔" سفید فرش پر خون کی دھار نے انہیں حواس باختہ کیا تھا۔

"ارے یہ خون۔ خون کہاں سے نکل رہا ہے؟" اور اس کو دیکھتے ہوئے برابر والے گھر کو بھاگی تھیں جن کی

لڑکی ڈاکٹر تھی۔ ہانپتی کانپتی اگلے لمحے وہ اس کے ساتھ آموجود ہوئیں۔ امبرین کا زرد رنگ مزید سفید ہو گیا تھا وہ بالکل ساکت سی پاؤں کو دبائے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر نے بہت نرمی سے کانچ کا ٹکڑا نکالا۔ درد کی ایک تیز لہر پورے وجود میں پھیل گئی تھی۔ بینڈیج کرنے کے بعد وہ اسے آرام کا کہہ کر چلی گئی۔

فیروزہ بیگم کا نرم دل بھی بے دار ہوا تھا وہ سرد مہری دور کہیں چلی گئی تھی بچوں کو سنبھالنے کے ساتھ وہ بار بار امبرین کو بھی دیکھ رہی تھیں کچھ نہ کچھ کھلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ امبرین ساکت سی لیٹی چھت کو دیکھ رہی تھی کہیں دور خلاؤں میں گم گہری سوچ میں الجھی ہوئی اے محبت تیرے انجام پر رونا آیا! کاش عشال ملک تم نے شروع سے ہی مجھے اس قدر ٹوٹ کر نہ چاہا ہوتا۔ تم نے تو مجھے امبر پر بٹھا کر اوندھے منہ زمین پر گرا لیا ہے۔ تمہاری آنکھوں میں محبت کی جگہ اجنبیت کیسے آ گئی، تمام عہد و پیماں تو تم نے کیے تھے پھر تم ہی راستہ کیوں بدل گئے۔ بیٹی کی تمہیں شدید خواہش تھی۔ رب سوہنے نے ہمیں اس رحمت سے بھی نواز دیا اور تم نے بیٹی کو کبھی جی بھر کر پیار بھی نہیں کیا۔ کیسی تھی تمہاری محبت۔

"مرد کی محبت تو بہار کے موسم جیسی ہوتی ہے، بہو بیگم! چند دنوں میں کھلے گلابوں کی خوش گمانیاں، نکھرتی کلیوں جیسے خواب سدا بہار کے پودے کی طرح یہ مرد آنکھوں میں اتار دیتے ہیں اور پھر بہار کے جاتے ہی کبھی سردی کی طرح موڈ بھی سرد ہو جاتا ہے اور گرمی کی طرح موڈ گرم! اور باقی زندگی میں خزاں ٹھہر جاتی ہے! بہار کا موسم تو کہیں شروع میں ہی روٹھ جاتا ہے ان کی محبتیں تو رات کے کسی پہر میں برستی ہیں، جب انہیں مطلب ہو، اور اس وقت عورت صرف نیند کی میٹھی آغوش کی تلاش میں ہوتی ہے۔" ساس کی ساری باتیں سچ ہی تھیں امبرین نے آنکھوں کو بے دردی سے رگڑا۔

اے محبت تیرے حصار میں
اے محبت تیرے اعتبار میں
خود کو فنا کیا ہم نے!
خود کو مٹا دیا ہم نے!

"مما آپ کی کلائی پر کیا ہوا ہے؟" آریان کی نظر امبرین کی زخمی کلائی پر پڑی تھی۔

"کل استری کر رہی تھی بیٹا تو استری لگ گئی۔" ابھی نہ کہہ سکی ساس کی تیز آواز پر جلدی جلدی میں ایسا ہو گیا۔

"مما جی آپ کے پاؤں پر بھی چوٹ لگی ہے۔"

"ہاں بیٹا بس کچھ پتا نہیں چلا۔" اب وہ چار سالہ آریان کو کیا سمجھاتی۔

"مما جی آپ اتنا کام مت کیا کریں! میں پاپا اور چاچو سے بولوں گا اپنے کپڑے خود پریس کیا کریں اور پھوپھو بھی اپنا کام کیا کریں۔" آریان کا چہرہ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

"میرا بیٹا میری جان۔" امبرین نے آریان کو بانہوں میں بھر لیا۔ یوں لگا تھا تمام زخموں کا مرہم اولاد کی صورت میں ملنے والا ہے۔

عشال ملک محسوس کر رہا تھا امبرین کی انتہا درجے کی خاموشی کو، پاؤں سے لڑکھڑا کر چلنا بھی نظر میں تھا لیکن گھر میں کسی نے ذکر نہیں کیا تو وہ بھی انا کا نام نہاد جھنڈا لے کر ایک طرف کھڑا تھا۔ فیروزہ بیگم کا جھکاؤ بھی امبرین کی طرف ہو گیا تھا۔

عشال ملک کے موبائل پر پچھلے ماہ سے کوئی مسلسل SMS بھیج رہا تھا۔ عشال کو اندازہ تھا کہ کوئی لڑکی ہے جو دوستی کی طرف مائل کر رہی ہے اور ایک دن اس کی کال سے واضح بھی ہو گیا عشال نے بہت رسانت سے اسے سمجھایا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور تین بچوں کا باپ ہے۔ اس کے باوجود لڑکی اس سے دوستی پر بضد تھی۔ عشال ملک ایک ذمہ دار مرد تھا اور اس کا ماضی بالکل صاف تھا۔ امبرین فاروق کو چاہا تھا اور اس کو پا لیا تھا۔ اس کا اپنا خیال تھا کہ موبائل کا صرف ایک فائدہ ہے اور باقی ننانوے فیصد نقصانات ہیں آنے والی ساری نسل اس موبائل کے ذریعے تباہ ہو رہی تھی۔ اگر لوگ کہتے تھے موبائل کے آنے سے دنیا مٹھی میں آ جاتی ہے تو یہ سچ ہی تھا اور لڑکیاں دنیا سے کھیلنے کے لیے بے تاب تھیں۔ عشال ملک کو بہت افسوس تھا اس کے بار بار سمجھانے پر بھی وہ اسے میسجز کیے جا رہی تھی۔

عشال ملک کے موبائل کی اسکرین بار بار روشن ہو رہی تھی ساتھ والے کمرے میں امبرین بچوں کو سلا رہی تھی وہ جانتا تھا کہ اس کے بچے کتنے ضدی ہیں اور سوتے کتنی مشکل سے ہیں۔ وائبریٹ کیا ہوا موبائل بار بار بج رہا تھا اور عشال ملک کا پارہ اتنا ہی ہائی ہو رہا تھا۔ عشال نے اسے سختی سے منع بھی کیا تھا لیکن وہ لڑکی بھی نہ جانے کس مٹی سے بنی تھی۔ مسلسل دستک سے انسان جاگ ہی جاتا ہے اور اٹھنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ عشال ملک نے نہایت طیش میں کال ریسیو کی تھی۔

"کیا تکلیف ہے تمہیں، جب میں نے ایک بار بتایا ہے آئی ایم میرڈ تو سمجھ نہیں آئی۔ کس گھٹیا طبیعت کی لڑکی ہو تم ایک مرد تمہیں منع کر رہا ہے اور تم اپنے گھٹیا پن سے باز ہی نہیں آ رہیں۔ حد ہوتی ہے بے غیرتی کی بھی۔" وہ اونچی آواز سے برس رہا تھا۔ اتنی اونچی آواز سن کر ساتھ والے کمرے میں سوئے ہوئے دونوں بچے نیند سے ڈر کر اٹھ گئے تھے اور اب زور زور سے رو رہے تھے امبرین انہیں سنبھالنے میں ہلکان ہو رہی تھی۔ آریان باہر سے بھاگتا ہوا عشال کے کمرے میں آیا تھا۔

"پاپا جی دادو کہہ رہی ہیں اتنا اونچا کیوں بول رہے ہیں بھائی اور ماہین کو مما نے اتنی مشکل سے سلایا تھا آپ نے جگا دیا اور مما کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔" عشال ملک کے چلانے سے کال خود بخود ڈراپ ہو گئی تھی۔ امبرین کا سن کر وہ ذرا دھیما پڑا تھا۔

"کیا ہوا ہے تمہاری مما کو؟" آریان کا بازو پکڑ کر قریب کیا اور آہستہ سے پوچھا۔

"آپ کو نہیں پتا مما کو پرسوں سے تیز بخار ہے اور ان کی کلائی پر استری سے زخم آیا ہے اور پاؤں پر بھی چوٹ لگی ہوئی ہے۔" آریان اپنی طرف سے اہم خبر

دے رہا تھا۔

"مجھے کون سا الہام ہوتا ہے یا کسی نے مجھے بتایا ہے تمہاری مما تو اپنے غرور میں رہتی ہیں۔" اس سے پہلے کہ آریان کچھ اور کہتا فیروزہ بیگم زور زور سے بولتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ بچوں کا چونکہ اٹیچ روم تھا عشال کے کمرے سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔

"شاباش بیٹے میں پوچھتی ہوں یہ گھر ہے یا میدان جو تم لاؤڈ اسپیکر لگا کر بات کر رہے تھے سارا دن بچی جانوروں کی طرح کام بھی کرتی رہے اور ساری رات تمہارے منہ بسورتے بچوں کے ساتھ جاگ جاگ کر بیمار ہو جائے اور تمہیں کسی کی پروا ہی نہیں ہے میں پوچھتی ہوں کون سی ذمہ داری ادا کر رہے ہو تم؟" کہاں تو فیروزہ بیگم امبرین فاروق سے نالاں رہتی تھیں اور اب الڈ الڈ کر پیار آرہا تھا اور وہ اپنے لاڈلے بیٹے کی کلاس لے رہی تھیں۔ عشال منہ کھولے ماں کو دیکھ رہا تھا یہ کایا کیسے پلٹ گئی تو کیا امبرین کی بے لوث خدمت نے فیروزہ بیگم کا دل جیت لیا ہے۔ وہ اپنی سوچوں میں ڈوبا تھا۔

"کون سا فرض ادا کر رہے ہو؟ کہاں تو تمہارے عشق مشکے ختم نہیں تھے اب تم اس پھول جیسی بچی کا حال تک نہیں پوچھتے بوجھ تو کیا کم کرو گے۔"

"وہ مما" عشال نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم!" کہتے ہوئے وہ ساتھ والے کمرے میں آگئی تھیں جہاں اذہان ملک امبرین کے بازوؤں سے روتا بلکتا نکلا جا رہا تھا فیروزہ بیگم نے بلال کو آواز دے کر اذہان اسے تھما دیا تھا کہ وہ اسی کا لاڈلا تھا اور انہیں یقین تھا بلال اسے خاموش کروا لے گا امبرین اب ماہین کو چپ کروا رہی تھی۔

"آریان آؤ تم میرے ساتھ۔" آریان کے ساتھ وہ باہر نکل گئیں۔

عشال ملک ندامت بھرے قدم اٹھاتا ہوا ساتھ والے کمرے میں آیا تھا جہاں اب بھی امبرین ماہین کو خاموش کروانے میں ہلکان ہو رہی تھی۔ عشال کو بچوں کے کمرے میں دیکھ کر امبرین کی آنکھوں میں حیرت چمکی تھی لیکن اگلے لمحے اس نے نظریں دوسری طرف کر لیں۔

"کیا ہوا ہے اسے؟ خاموش کیوں نہیں ہو رہی؟" عشال چلتا ہوا قریب آیا تھا امبرین کچھ نہیں بولی۔

"لاؤ اسے مجھے دو میں کوشش کرتا ہوں خاموش کروانے کی۔" زبردستی اس کے بازوؤں سے ماہین کو لیا اور باہر نکل گیا۔ امبرین کا بخار اور کمزوری سے برا حال تھا کچھ بولا بھی نہ گیا۔ بچی شاید گرمی کی وجہ سے بھی ڈسٹرب تھی عشال نے صحن میں دو چار ہی چکر لگائے تھے اور وہ اس کے شانے سے لگ کر بے سدھ ہو گئی۔

وہ اسے اٹھائے امبرین کے پاس آیا تھا وہ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے شاید سو گئی تھی۔ عشال نے بچی کو بیڈ پر لٹا کر ہلکی سی چادر اوڑھا دی پھر امبرین کو دیکھا زرد پڑتی رنگت اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اور آنکھوں کے گرد پڑے سیاہ حلقے کاٹن کے سوٹ میں وہ صدیوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ عشال کے دل کو کچھ ہوا تھا اس کی یہ حالت دیکھ کر اور افسوس تھا کہ اس کی اس حالت کا ذمہ دار بھی وہی تھا۔ کہاں اس کا کنول جیسا نازک سراپا اور کہاں اب وہ مرجھائے پھول کی مانند لگ رہی تھی۔

"امبر۔ امبر۔" بے خود ہو کر اسے پکارا تھا اور اس کے رخسار کو ہلکا سا چھوا تو اندازا ہوا کہ اسے کتنا بخار ہے۔

"امبر" تیسری پکار پر وہ چونک کر اٹھی نیند سے بوجھل پلکیں بمشکل کھولی تھیں۔

"بیٹھ کر کیوں سو رہی ہو نیند آرہی ہے تو سیدھی ہو کر لیٹ جاؤ نا۔" امبرین نے حیرت سے اسے دیکھا اور اگلے لمحے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی تو اس نے سامنے آکر پوچھا۔

"راستہ دیں مجھے کپڑے پریس کرنے ہیں۔" رات کے اس پہر بھی اسے ان سب کی فکر تھی اپنی حالت سے بے نیاز۔ امبرین کا لہجہ انتہائی روکھا تھا۔ عشال کو محسوس ہوا اس لمحے کہ وہ اس سے شدید ناراض ہے۔

"کپڑے صبح کو پریس کر لینا ابھی تمہیں نیند آرہی ہے سو جاؤ۔" عشال نے اس کی آنکھوں میں نیند کے سرخ ڈورے دیکھتے ہوئے کہا۔

"صبح نہ لائٹ ہوتی ہے نہ ٹائم۔" وہ جلد وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔ عشال ملک نے ایک نظر اسے دیکھا اور اگلے لمحے اس کے نازک وجود کو بازوؤں میں اٹھا کر بیڈ پر آگیا تھا۔

"پلیز چھوڑیں۔" امبرین کے احتجاج میں ناگواری تھی۔

"بے فکر رہو کوئی زبردستی نہیں کرنے والا تمہارے ساتھ۔" ہلکا سا مسکرا کر وضاحت دی۔

"یہ تمہاری کلائی پر کیا ہوا ہے۔"

"استری لگ گئی تھی۔"

"اور پاؤں پر کیا ہوا ہے؟" عشال نے پٹی والے سوجے پاؤں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جواباً جن نظروں سے امبرین نے اسے دیکھا تھا عشال کے اندر تک شرمندگی اتر گئی۔

"کانچ چبھ گیا تھا پاؤں میں" امبرین نے کہنے کے ساتھ ہی وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ عشال کو یاد آیا تھا پچھلے ہفتے وہ کس طرح غصے میں گلاس پر ہاتھ مار کر گیا تھا اور وہی گلاس امبرین کے پاؤں پر لگا ہو گا۔

"سوری امبر مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔" بیڈ سے اترتی امبرین کو بمشکل بٹھایا تھا۔

"چھوڑیں مجھے۔" وہ غصے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے بولی تھی۔ وہ بھی عشال تھا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت ناراض ہو گزرے دنوں کو سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں میں اپنی زندگی سے دور کیسے رہا۔" وہ واقعی لفظوں کا کھلاڑی تھا۔

"اپنی محبت کے بنا نہ جانے میرے دل میں یہ بات کیوں بیٹھ گئی تھی۔ کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں، مجھ سے دور رہنے کی کوششیں کرتی ہو۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کی ذمہ داری میں بٹ گئی ہو۔ میں تمہیں صرف اپنے قریب ہی دیکھنا چاہتا تھا تمہارا بوجھ بانٹنے کی بجائے تمہیں مزید تنہا کر دیا۔ پچھلے چند دنوں سے ان ہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ شاید اس دن غصہ بھی ان سوچوں کا نتیجہ تھا۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی میں آئندہ بہت خیال رکھوں گا تمہارا۔" عشال نے اس کا گرم ہاتھ اپنے ٹھنڈے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ سر جھکائے رونے میں مصروف تھی۔

"آپ کو اندازا ہی نہیں ہے آپ نے کتنی اذیت دی ہے مجھے، آپ کی محبت اور توجہ ہی تھی جو میرے اندر توانائی بھرتی تھی۔" پہلی بار زبان سے شکوہ ادا ہوا۔ عشال نے اسے کھینچ کر اپنے بازوؤں میں چھپا لیا امبرین کا جلتا بدن ہلکورے لینے لگا۔

"دیکھو تو تمہیں کتنا تیز بخار ہے اور تم نے مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں آپ کو بتانے کی۔" وہ روتے روتے ضدی بنی عشال بے اختیار مسکرا دیا۔

"تو نہ بتاؤ میں آئندہ سے اپنے گلاب کی خبر گیری

خود رکھ لیا کروں گا۔ اچھا اب معاف کردو نا میری بیٹی ماہین کی خاطر۔" عشال نے اس کے چہرے سے آنسو صاف کرنے کی کوشش کی امبرین نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"بچوں کو درمیان میں مت لائیں۔" فوراً" جواب آیا۔

"تو بچے بھی تو ہمارے درمیان آئے ہیں بلکہ سارا قصور ہی بچوں کا ہے۔" اور امبرین اس پاگل شخص کو سمجھا نہیں سکتی تھی۔

"تمہیں بخار بہت تیز ہو رہا ہے صبح تو نہ جانے کب ہو۔" عشال نے کلاک دیکھا تین بجے تھے۔

"چلو آؤ ابھی چلتے ہیں ہسپتال! کوئی تو ہسپتال کھلا ہوگا۔" عشال ملک سچ میں پریشان ہوا تھا۔

"ممانے ساتھ والی ڈاکٹر کو بلوایا تھا اس نے دی ہے میڈیسن اور وہ میں نے کھائی ہیں صبح تک آجائے گا آرام میں بہت تھکی ہوئی ہوں مجھے سونے دیں۔" امبرین نے کہتے ہوئے اپنا سر اٹھا کر تکیے پر رکھا۔ اور عشال ملک نے جھنجلا کر اس کا سر دوبارہ گود میں رکھ لیا۔

"یہاں کیا تکلیف ہے تمہیں، سونا ہے تو میں سلا دیتا ہوں۔" اس بار امبرین نے خاموشی سے آنکھیں موند لی تھیں اور عشال ملک اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا تھا۔ امبرین فاروق کتنے عرصے کے بعد بے فکر ہو کر گہری نیند سوئی تھی۔

جب وہ صبح اٹھی تھی تو سب کچھ ہی بدلا ہوا تھا۔ سامنے ہی آریان اور عشال کے کپڑے استری شدہ ہینگر تھے "یقیناً" عشال ملک نے کیے ہوں گے وہ سوچتی ہوئی کچن کی طرف گئی وہاں کا منظر مزید بدلا ہوا تھا۔ فیروزہ بیگم ناشتا بنا رہی تھیں۔ مہوش ملک ناشتا سرو کر رہی تھی آریان اسکول جانے کے لیے تیار تھا اور بلال کے ساتھ ناشتا کرنے میں مصروف تھا۔" اذہان اور ماہین سوئے ہوئے تھے۔ عشال کی سب سے پہلے اس پر نظر پڑی تھی اور وہ فوراً" اس کی طرف لپکا تھا۔

"ارے تم اٹھ گئیں منہ دھو لیا ہے تو جلدی سے آجاؤ ناشتا کرلو پھر میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ عشال کے سہارے کھانے کی ٹیبل تک آگئی۔

"پیاری بھابھی! جیو ہزار سال۔" بلال نے اسے دیکھ کر نعرہ لگایا تو وہ مسکرا دی۔

"بیٹا ادھر کیوں آگئیں آرام کرتیں اتنا تو بخار ہے تمہیں، میں ابھی تمہیں ناشتا بھجوانے والی تھی۔ مہوش، بھابھی کے لیے ہلکا سا دودھ گرم کر کے لاؤ۔" فیروزہ بیگم پیار سے کہتی اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ سب کی محبت اور توجہ پا کر امبرین کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"ارے میری جان روتی کیوں ہو، بس ہم ہی غلط تھے انسان ہیں نا۔ اب تم ہمیں معاف کردو آئندہ ہم سب تمہارا بہت خیال رکھیں گے۔" فیروزہ بیگم نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

اس دن کے بعد امبرین کی بڑی نند بھی کم آنے لگی تھی کیونکہ فیروزہ بیگم نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ بی بی اپنے گھر میں رہو اور اپنی ساس شوہر کا خیال رکھو ہمارے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مہوش یونیورسٹی سے فارغ ہوئی تو اسے کچن کے کاموں میں لگا دیا۔ الگ سے نوکرانی بھی رکھ دی تھی۔ امبرین کے صبر اور محبت نے سب کو اپنا بنا لیا تھا۔

مجھے اس مٹی سے خدا نے بنایا ہے فراز!
جو ازل سے رہ گئی تھی وفا کے لیے!

امبرین کو کہتے ہوئے عشال نے اسے قریب کیا تھا۔ امبرین نے گھور کر دیکھا۔

"ہمارے بچے بڑے ہو جائیں گے پر آپ نہ جانے کب بڑے ہوں گے۔" تو وہ قہقہہ لگا کر ہنستا ہوا اس کو محبت کے حصار میں لے چکا تھا۔

☼ ☼

ناول

رفاقت جاوید

تخت اور تختہ

"ہیلو حنی۔" آمنہ نے نہایت اپنائیت سے کہا۔

"کون؟" دوسری طرف اک شناسا آواز میں انجانے پن کی جھلک سے وہ چونک گئی۔

"ارے یار تم اتنی جلدی اپنی آنو کو بھول گئیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ میں آتی ہوں تمہیں جوتے لگانے ذرا تیاری پکڑو۔" وہ دھمکی کے انداز میں بولی۔

"اب پہچانی۔" دوسری طرف آواز میں کسی قسم کے جذبات کا دخل نہ تھا۔

"ارے تو تا چشم عورت، تمہیں میرے یہاں آنے کی رتی بھر خوشی نہیں ہوئی کیوں حنیہ؟ کیا ہوا؟ مجھ سے ایسی کون سی غلطی سرزد ہو گئی۔" آمنہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں تم کب آئیں؟" لہجہ نارمل تھا۔

"کل آئی ہوں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تمہاری اسٹیٹ سے تم سے ملاقات کا شرف حاصل کیے بغیر واپس چلی جاؤں۔" آمنہ نے پیار بھرے لہجے میں کہا ہی تھا کہ فون بند ہو گیا اور اس کے بعد کئی مرتبہ فون ملانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ وہ افسردہ سی ہو کر رہ گئی۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے سردی میں قدرے اضافہ ہو چکا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار نے ماحول کو اداس و غمگین سا بنا دیا تھا۔ شاید یہ افسردگی آمنہ کے اندر کی تھی کہ اسے اس شہر کا چپہ چپہ مایوس اور سوگوار معلوم ہو رہا تھا۔ حنیہ نے کال کاٹ کر اس کو حیران و رنجیدہ تو کیا ہی ساتھ ہی وہ پریشان بھی ہو گئی اور وہ ہمت کر کے تیار ہو کر حنیہ کے گھر کی جانب چل پڑی۔

حنیہ تو ایسی دوست تھی جو روتوں کو ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دے اور ہنستوں کو پل بھر میں دھاڑیں مارنے پر مجبور کر دے۔ صلح و اتفاق میں بیٹھے ہوئے دوستوں میں ایسی شرلی چھوڑتی کہ اک جھگڑے اور فساد کا ماحول چار سو برپا ہو جاتا۔ اور پھر سب کو ایسا متحد کرتی کہ معلوم بھی نہ ہوتا کہ ابھی یہاں کوئی جھگڑا ہو رہا تھا۔ آج فون پر اس کا غیر دوستانہ رویہ اسے مضطرب کر گیا تھا۔ وہ راستے بھر اس کی خیریت کی دعائیں مانگتی اس کے گھر کی طرف رواں دواں تھی۔ ماضی اس کے سامنے فلم کی مانند گھوم گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

حنیہ کا تعلق ایک مڈل کلاس سفید پوش بے حد شریف اور بے ضرر خاندان سے تھا۔ تین بھائیوں اور سب سے چھوٹی بہن ہونے کے ناتے وہ خاصی سرچڑھی منہ پھٹ اور دیدہ دلیر واقع ہوئی تھی۔ تعلیمی میدان میں حد درجے فطین و ذہین اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی سر فہرست تھی۔ اس کے منہ سے نکلی ہوئی کسی بات کو رد نہ کیا جاتا تھا۔ صوم و صلواۃ کا پابند یہ گھرانہ پردہ داری میں بھی لاجواب تھا۔ حنیہ نے آٹھ سال کی عمر میں ہی خود کو حجاب میں چھپا لیا تھا۔ یہ اس کی گھریلو اقدار ہی تھیں جو اس کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کر رہی تھیں۔ آمنہ اس کی کلاس فیلو تھی وہ پہلی کلاس سے اس کے ساتھ تھی۔

آمنہ کا گاؤں نزدیک ہی تھا۔ اس لیے اس کا آنا جانا ایسا دشوار تو تھا نہیں کہ اسے ہوسٹل کی ضرورت محسوس ہوتی۔ وہ روزانہ علی الصبح اسکول، کالج اور یونیورسٹی وقت پر پہنچتی رہی اور سر شام گھونسلوں کی جانب واپس جانے والوں پرندوں کے ہمراہ اپنے گاؤں واپس چلی جاتی۔ وقت تو ہر لمحے اپنے پروں کے ساتھ کبھی آہستہ اور کبھی تیز و تند اڑتا چلا جاتا ہے۔ اسی اصول کے تحت وقت ماضی اور حال سے نکل کر مستقبل کی طرف گامزن ہو چکا تھا۔

حنیہ نے آج اپنے آخری امتحان کا رزلٹ حاصل کر لیا تھا۔ مسرت و انبساط میں سرشار وہ آکاش کی رفعتوں کو چھو کر ان میں گم ہو جانا چاہتی تھی۔ والدین اس کی خوشیوں کے حصے دار بننے سے پیشتر ہی اس دار فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ ان کا اچانک حادثے میں شکار ہو جانے کا دکھ حنیہ کو ہر موڑ پر رلا جاتا تھا۔ آج بھی وہ جہاں خوشیوں سے ہمکنار تھی تو دکھوں کی آماجگاہ کا در بھی کھل کر اسے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

تینوں بھائی اپنی بیگمات اور بچوں کے ہمراہ اپنی زندگی میں شاداں و فرحاں رہتے۔ انہیں حنیہ کے احساس محرومی کا خیال آتا نہ ہی اس کی ننھی منی خوشیوں منانے کا تکلف کیا جاتا۔ آج کی خوشی تو ایسی عظیم الشان تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی اسے کندھوں پر اٹھا کر زمانے میں اس کی بہترین کامیابی کا ڈھنڈورا پٹوا دے۔ مگر خواہش دل میں ہی دب کر حسرت کا پہناوا اوڑھ کر وجود کی گہرائیوں میں جا کر چھپ گئی تھی۔ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہی اپنی خوشی سیلی بریٹ کرنے کے پروگرام بنتے اور برس خالی دیکھ کر ٹوٹ جاتے۔ زندگی اسی تناسب سے چل رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنی رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیے۔

جس دن یہ انکم ٹیکس آفیسر کی حیثیت سے اپنے آفس گئی تو تب بھی وہ اپنی بڑی خوشی اور کامیابی میں بالکل تنہا تھی۔ گھر سے نکلتے وقت نہ کسی نے منہ میٹھا کرایا، نہ کسی نے دودھ پلا کر دعا دی۔ اک عام صبح کی طرح وہ تیار ہوئی اور ٹیکسی پر آفس چلی گئی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اسے والدین یاد نہ آتے۔ جنہوں نے اس سے جو توقعات رکھی تھیں، جو سہانے سپنے دیکھے تھے، جنہیں آج خوش قسمتی سے اک خوش آئند تعبیر مل گئی تھی۔

دھان پان سی گوری چٹی حنیہ اپنی عمر سے کہیں چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ مردوں کے بیچ کام کرتے ہوئے اسے عجیب تو لگتا۔ مگر اس کی شرافت اور پاکیزگی کا اندازہ لگانا دوسروں کے لیے دشوار تو تھا نہیں۔ اس لیے بہت جلد ہی اس نے اپنے گرد و پیش کا ماحول اپنے مطابق ڈھال لیا تھا۔ اپنے کام سے مطلب رکھنا، اپنے کام سے دیانت داری اور راست بازی اور وقت سے انصاف کرنا، اس نے اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔ پہلی تنخواہ کے وصول ہوتے ہی تینوں بھابھیاں اسے مارکیٹ لے گئیں اور اپنی پسند اور ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کی تنخواہ سے خوب دل کھول کر شاپنگ کی اور اس کے بدلے چند عارضی اور وقتی تعریفیں اس کے دامن میں ڈال دی گئیں۔ وہ سب کے ارادوں، نیت اور خوشامد کے عارضی پن کو بخوبی جانتی تھی۔ جس کا اظہار کرنا اس کی فطرت کے عین منافی تھا۔

بھائی اس کی شادی کے لیے فکر مند ہوتے، نہ ہی کبھی اس بارے میں گفتگو ہوتی۔ بھابھیوں کو گھر میں اس کی موجودگی کھٹکتی تو تھی۔ مگر اس کے کنواری رہنے کے ان گنت فوائد ان کی زبان پر تالا لگا دیتے۔ آخر ایک دن بڑی بھابھی نے سوچا کہ گھر کی دولت گھر میں ہی سما جائے تو اس میں مضائقہ ہی کیا ہے؟ اپنے بھائی سے مشورہ کیا۔ بھائی دس سال کے طویل عرصے میں بھی ایم بی بی ایس کی ڈگری لینے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ جسے مستقل مزاجی کا نام دے کر بھابھی اس کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کو یکجا کیے جاتی تھیں۔ بے چارا گھسیارا سا نیم ڈاکٹر مسلو موشن میں جب بات کرتا تو سننے والا مارے الجھن کے سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ بات اختتام پذیر ہونے سے پہلے ہی سامع بھاگنے کی کرتا۔

بھابھی کا رویہ قدرے بدل کر حنیہ کو حیرت و اشتیاق میں مبتلا کر گیا۔ وہ ان کی چال بازی اور مکاری کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ آج تو وہ منہ کھولے ہکا بکا بھابھی کے شہد میں ڈوبے ہوئے الفاظ پر غور کر رہی تھی۔ شرارت کی پھڑکتی رگ کو دبا کر بھابھی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"میری چھوٹی بہنا آج کے بعد ناشتا کیے بغیر آفس جانا منع ہے۔ آئندہ ناشتا میں بناؤں گی اور تمہیں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی۔ یہ کوئی بات نہ ہوئی کہ صبح بھوکی پیاسی نکل جاتی ہو اور شام کو واپس آ کر بچا کھچا کھا کر سو جاتی ہو۔ بہنا اس طرح بہت جلد بڑھاپا پکڑ لو گی۔" لہجے میں بے پناہ لگاوٹ تھی۔ وہ خاموش حیرت سے انہیں تکتی رہی۔

"بچے! مجھے نخرے دکھا کر اپنی من مانیاں کروا لیا کرو تمہاری ماں کے درجے پر کھڑی ہوں۔" وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"بیٹیاں تو چند دنوں کی مہمان ہوتی ہیں۔ کیا پتا کب تمہارا دانا پانی اس گھر سے اٹھ جائے۔"

"مہمان چند دنوں کی؟ یہ کیا تبدیلی ہے؟ کیوں اور کیسے؟" نہ جانے کتنے ہی سوال اس کے ذہن میں گھوم کر قلبی سکون کو برباد کر گئے۔ مگر لبوں پر خاموشی کی مہر ثبت تھی۔ وہ ابھی گہری سوچ میں ہی گھری ہوئی تھی کہ بھابھی کا بھائی آدھمکا۔

"اپیا آپ کو ڈھونڈتا ہوا ادھر نکل آیا۔ مجھے علم تھا کہ آپ یہاں ہوں گی۔" وہ کھی کھی کرتے ہوئے بولا۔

"تو بھئی کمال بھی آگیا۔ تم دونوں گپ شپ لگاؤ۔ میں گرم گرم چائے یہاں ہی لے آتی ہوں۔" وہ خوشی سے چہکنے لگیں۔

"اپیا جان' ود پکوڑا۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا تھا۔ حنیہ نے بمشکل ہنسی پر قابو پایا۔ اپیا دیکھو اور اپیا کا بھائی دیکھو' الو کہیں کا۔

"نوکری چاکری کیسی جارہی ہے؟" وہ آنکھیں جھکائے ہوئے بولا۔

"بہت اچھی۔" وہ ابھی بھی حیران و پریشان تھی۔

"یار سنا ہے انکم ٹیکس والوں کے تو وارے نیارے ہیں۔ یار کچھ ہمیں بھی تو عیش و لیش کروا دو۔" وہ کچھ کنفیوز سا ہوئے جارہا تھا۔ آج تک تو اس نے بات تک نہ کی تھی۔

آج اس کے لہجے میں کنفیوژن کے ساتھ ہلکی سی خود اعتمادی کی نمایاں جھلک نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ بھابھی کی میٹھی چپڑی باتیں اور کمال کی باکمال گھاتیں۔ دال میں کالے کی مقدار خاصی قابل توجہ تھی۔ کمال اسے اتنی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ وہ چونک کر اسے گھورنے لگی۔ معاملہ اتنا گمبھیر تو تھا نہیں کہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتا۔ یہ تک پہنچ کر پژمردگی میں گھر کر رہ گئی کہ اس کی زندگی میں اب اک نئے ڈرامے کی شروعات ہونے والی تھی۔ جس کے اختتام پذیر ہونے کی اسے قطعاً خبر نہ تھی۔ لیکن اپنے ارادے اور فیصلے پر مستحکم ہونا اس کا حق بھی بنتا تھا اور اس وقت اسے شدید ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ لحاظ و احترام میں ہلکی سی لرزش اس کو تاحیات گہرے کنویں کی نذر کرسکتی تھی۔ اپنی زندگی کے فیصلوں میں وہ کسی کو اختیارات دینے کی قائل ہی نہ تھی۔ سب سے شکسار کے اپنے بھائی ہی روبرو کیوں نہ آجائیں؟

یہ سوچ کر اس نے دل کو تسلی و تشفی دے کر بہلانے کی کوشش کی تو کمال اس کے قریب بیٹھ کر اسے پیار و محبت سے مغلوب ہوتے ہوئے بولا۔

"اپیا نے تم سے ذکر تو کیا ہوگا۔ آئی ایم ویری امپرسڈ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ آئی لائیک یو سوچ' یو کانٹ امیجن۔" وہ اس کے قریب کھسکا تو وہ تیزی سے کھڑی ہوگئی۔ قہرباں نظروں سے اسے گھورا اور ایک سرعت کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ سامنے سے بھابھی چلی آرہی تھیں۔ ان کی جہاندیدہ آنکھوں نے حنیہ کے چہرے پر پھیلے ہوئے تاثرات کا فوری طور پر اندازہ لگالیا تھا۔ انہیں اپنے بے وقوف اور نادان بھائی سے بے وقوفی کی ہی توقع تھی۔ انجان سی بن کر حنیہ سے گویا ہوئیں۔

"چائے کے ساتھ گرما گرم پکوڑے اس جاڑے میں خوب مزا دیں گے۔ آؤ کمرے میں ہی چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"مجھے تو مالٹے کا جوس پینا ہے اپیا۔" وہ بھی پیچھے آکر کھڑا ہوگیا۔

"ارے باؤلے تو بھی کمال ہے' کمال کی باتیں کرتے ہو۔ پہلے ہی چھینک رہے ہو کبھی کھانس کر ماحول کو پراگندہ کررہے ہو اور فرمائش ہے مالٹے کا جوس پینے کی۔" اپیا نے دل ہی دل میں کوسا اور دانت پیس کر رہ گئیں۔

"کمال بھائی میں آپ کو ابھی مالٹے کا جوس نکال دیتی ہوں۔" اس کی رگ شرارت پھڑکی۔ تو اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا تو کمال اپنے میلے کچیلے دانت نکال کر تشکر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ نظر انداز کرتی کچن کی جانب چلی گئی اور اپیا بیگم حیرت سے اسے جاتا دیکھتی رہ گئیں اور کمال سے اشتیاق بھرے لہجے میں بولیں۔

"کمال تم نے تو کمال کا جادو کردکھایا۔ ورنہ یہ کسی کو منہ تک تو لگاتی نہیں۔ ہر ایک کا مذاق اڑانا اور کیڑے نکالنا تو کوئی اس سے سیکھے۔ اگر تم اسے پھانسنے میں کامیاب ہوجاتے ہو تو پھر تم ستارہ جرات کے حق دار ٹھہرائے جاسکتے ہو۔"

"اپیا میں تو سیدھا سادا کھرا اور سچا انسان ہوں۔ میں نے اپنی آمادگی کا اظہار نہایت مسرت و انبساط میں کردیا ہے یہ اسی کا ری ایکشن ہے۔ وہ بھی اپنی پریشانیوں سے واقف تو ہے نا۔ نہ ماں' باپ نہ ہی بھائی اس کے بھابھیوں کو ویسے بھی یہ ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس نے میری آفر کو دل و جان سے قبول کرلیا ہے۔ اب شادی جلد ہی کرادیجیے گا۔ یہ دیکھیے بال تو کھچڑی بن چکے ہیں۔ ماتھے کی شکنیں بڑھتی ہوتی عمر کی غمازی کررہی ہیں۔" وہ سر ان کے سامنے جھکا کر بولا۔

"بس تم دعا کرو کہ یہ چھپکلی قابو میں آجائے۔" اپیا نے آہستگی سے کہا۔

"خود کو تو سمجھتی ہے جیسے سرخاب کا پر تو اسے ہی لگا ہو۔"

"میں نے بھی محسوس تو کیا ہے۔ مگر نیور مائنڈ۔۔۔ گھر بیٹھ کر اس کی کمائی کے مزے بھی تو میں ہی اڑاؤں گا نا۔" وہ رازداری سے بولا۔

"چپ رہو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی نا تو سارے کا سارا ناٹک ہی بگڑ جائے گا۔" وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولیں۔

"منہ پر پٹی باندھ لو کان کھلے رکھو۔ اللہ کرے اس محاذ پر کامرانی تمہارے قدموں کی لونڈی بن جائے۔"

"ایسے ہی ہوگا اپیا۔" وہ خود اعتمادی سے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

اسی اثنا حنیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ دونوں بہن' بھائی اس کے بیڈ پر آلتی پالتی مارے نہایت بے تکلفی کے روپ میں نظر آئے۔ تو اس کے بدن میں اک جھرجھری سی کوند گئی۔ مگر خود پر قابو پاتے ہوئے جوس کا گلاس کمال کی طرف بڑھاتے ہوئے نہایت اپنائیت سے بولی۔

"میں نے اپنے ہاتھوں سے نکالا ہے۔ بجلی نے تو عین وقت پر جواب ہی دے ڈالا۔ مگر میں نے سوچا کمال بھائی تو آج میرے مہمان ہیں۔ ان کی خواہش کو پوری کرنا میری عزت افزائی ہے۔"

"تھینک یو یار یو آر ٹو اسمارٹ۔" وہ گلاس پکڑتے ہوئے بولا۔

"اپیا آپ حنیہ کے لیے چائے اور پکوڑے تو منگوالیں۔"

"ماسی لا رہی ہے۔ بھابھی آپ کو سخت سردی محسوس ہورہی ہے۔ ہیٹر کے قریب آجائیے۔" وہ ہیٹر کے سامنے قالین پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کمال بھائی آپ جلدی سے جوس پی لیجیے۔ پھر چائے میں ہمیں کمپنی دیجیے گا۔ آپ کے بغیر مزا کہاں۔"

"ضرور ضرور۔" وہ ہنستے ہوئے جوس کا گھونٹ لے کر چھینکا۔ کالی مرچ اور نمک کی مقدار کو برداشت کرتا وہ تیزی سے جوس کا گلاس چڑھا گیا۔ حنیہ کی پذیرائی مقصد تھا۔

"کمال بھائی! مزے کا تھا نا۔" وہ آنکھیں گھما کر بولی۔

"تمہارے ہاتھ کا جوس خوش ذائقہ نہ ہو تا بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟" اس نے کھانستے ہوئے بات مکمل کی اور تیزی سے باتھ روم کی طرف چلا گیا اور وہ اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

اسی لمحہ ماسی ٹرے میں پکوڑے اور چائے لے کر پہنچ گئی۔ ہیٹر کے سامنے حنیہ نے کپڑا بچھا کر اس پر ٹرے رکھ کر کمال کو آواز دی۔

"آپ کے بغیر پکوڑے ہمارے گلے سے نہ اتریں گے۔ بھابھی آپ تو شروع کریں ٹھنڈے ہوجائیں گے۔" بھابھی ہیٹر کے سامنے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر اپنی طمانیت کا اظہار کررہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد کمال بھی باتھ روم سے باہر نکل آیا۔ آنکھیں لال ہورہی تھیں' چہرہ بھیگا ہوا تھا۔

"ارے کیا ہوا تمہیں؟" اپیا سیدھی بیٹھ کر فکر مند سی ہوگئیں۔

"پہلا وضو کیا ہے۔ وقت نماز ہو چلا ہے۔" وہ ٹشو پیپر سے بہتی ہوئی ناک کو صاف کرتے ہوئے بولا۔

"جوس کافی ٹھنڈا تھا مجھے اس سردی میں نہیں پینا چاہیے تھا۔ خیر حنیہ کے ہاتھ کا بنا ہوا تھا انکار یا اعتراض کرنا مناسب نہیں لگا' سوچ لیا۔"

"بس ابھی چائے کی پیالی طبیعت ٹھیک کیے دیتی ہے۔" حنیہ نے بے حد لگاوٹ سے کہا۔

"آیئے ناہیٹر کے سامنے آجایئے۔" وہ بھی گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر ایسے بیٹھا جیسے جنت میں براجمان حور سے خاطرداری اور تواضع کروانے لگا ہو۔ حنیہ نے پکوڑوں کی ڈش اس کی طرف بڑھائی تو کمال نے آنکھیں ملتے ہوئے مسکرا کر پکوڑا اٹھایا اور ساتھ ہی اس کے ہاتھ پر چٹکی کاٹ کر بولا۔

"اگر تو تم نے بنائے ہیں تو ان کا جواب نہ ہوگا۔"

"سوری کمال بھائی! ماسی نے ہی بنائے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"مگر ہیں مزے دار' چٹ پٹے' چٹخارے دار۔" بھابھی نے کھاتے ہوئے کہا۔ حنیہ چائے بنانے لگی۔ دونوں بہن' بھائی پکوڑوں پر ٹوٹ پڑے اور تعریفوں کا حساب کتاب رکھنا مشکل ہوگیا۔

چائے کے سیشن میں حنیہ پیش پیش تھی مگر پکوڑوں کو اس نے چھو کر نہ دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرہ قہقہوں سے گونجنے لگا بہن' بھائی لوٹ پوٹ ہوتے غنودگی اور بے ہوشی ایسی طاری ہوئی کہ دونوں وہیں پر ڈھیر ہوگئے۔ حنیہ احساس فتح مندی سے اٹھی۔ ایک پرسکون انگڑائی لی ہیٹر کو آف کیا۔ "چلے ہیں مجھ سے رشتہ جوڑنے بے وقوف کہیں کے۔ نہ منہ' نہ متھا' جن پہاڑوں لتھا۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور اپنا پرس اٹھا کر گنگناتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

گھر میں ہنگامہ برپا تھا۔ تینوں بھائی اور بھابھیاں حنیہ کی جانی دشمن بنے ہوئے تھے۔ حنیہ سے ہزاروں سوال کیے جارہے تھے۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح خاموشی سے مخالف پارٹی کی چپ کا انتظار کررہی تھی۔ اس کی سوچ کے مطابق وہ ابھی ان کے ایک بھی سوال کا جواب دینے کے حق میں نہ تھی۔ کیونکہ اس وقت اس کی شنوائی کا وقت ہی نہ تھا۔ یہ وقت تھا ہر طرف سے گالی گلوچ' ڈانٹ ڈپٹ اور لعن طعن سننے کا۔ وہ سر جھکائے سب کی گفتگو کو نظر انداز کیے نئی شرارت کے بارے میں سوچے جارہی تھی۔ جب سب اپنی اپنی قیاس آرائیوں اور دھمکیوں کے بعد تھک ہار کر خاموش ہوگئے تو پھر حنیہ گویا ہوئی۔

"کیا اب مجھے بولنے کی اجازت ہے۔"

"ہاں کرو بکواس' ذرا تمہاری شیطانیت کی وجہ ہم بھی تو جانیں۔" بڑے بھیا نے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر کہا۔

"بھیا میں نے پکوڑوں میں اپنے ہاتھوں سے الک توڑ کر ڈالی تھی۔" وہ آہستگی سے جھوٹ بول رہی تھی۔

"تمہیں بھنگ کے پتوں اور پالک کے پتوں میں فرق نظر نہیں آیا۔ جھوٹی کہانی گھڑنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ تم میری ماں نہیں ہو میں تمہارے باپ جیسا ہوں۔ کیسے بے وقوف بن سکتا ہوں۔" بڑے بھیا نے غیظ و غضب سے کہا۔

"دس دفعہ مالی سے کہہ چکی ہوں کہ سبزی کے ایریا کی صفائی کرلو مگر کیا مجال جو ایک بار بھی کان پر جوں رینگ جائے۔ مالی کی لاپروائی اور اس کی چالاکی اور مکاری آج ہمیں موت کی نیند سلا چکی ہوتی۔" بھابھی نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"میاں غور سے سن لیجیے یہ ہماری ناک کٹوا کر رہے گی۔ اس کی شادی کی فکر کریں۔ بہت سال ہم نے اس کی خدمت کرلی۔ جس کا انجام تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے نا۔ آج ہم بہن بھائی تو مر گئے ہوتے۔"

"کمال اس کے لیے خوب رہے گا۔ تمہارا فیصلہ سو فیصدی درست ہے۔ باہر کے کسی شریف گھرانے میں چلی گئی تو نباہ ممکن نہیں۔ کمال اپنا ہے شریف النفس لڑکا ہے۔ اس کو برداشت کرہی لے گا۔" بھیا نے اپنا فیصلہ سنایا۔ تو اس نے دوسرے بھائیوں کی طرف

التجائیہ نظروں سے دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر اثباتی انداز دیکھ کر وہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی اور وہ اس کی شادی کے پروگرام بنانے لگے۔

آخر سب سے چھوٹی بھابھی نے جرات کرکے اس فیصلے کی خلاف ورزی کردی۔ وہ انہیں حقیقی اور اصلی دنیا سے روشناس کرنا چاہ رہی تھی کہ حنیہ برسر روزگار ہے۔ خود مختاری اور آزادی ان ہی بھائیوں نے دے کر اسے پروان چڑھایا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں دخل اندازی کرکے اپنی دردسری میں اضافہ نہ کریں۔ سب اسے اس کے حال پر چھوڑ کر مطمئن تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی بھری جوانی کی کڑکتی دوپہر کے اٹھائیسویں سال کو خیرباد کہنے کو تھی۔ کسی کو اس کی شادی کی فکر نہ تھی۔ وہ کب کہاں جاتی ہے؟ کن دوستوں کی محفل میں بیٹھتی ہے؟ کسی کو کوئی سروکار نہ تھا۔ چھٹی کمرے میں بند رہ کر گزار دیتی۔ نہ اس کی کمی کسی کو محسوس ہوتی' نہ ہی اسے ان کی توجہ و ضرورت کا احساس ہوتا۔ آج وہ اس کی شادی کا فیصلہ اس کی رضامندی کے بغیر کیسے کرسکتے تھے۔ چھوٹی بھابھی کا اعتراض سب کی سمجھ میں آگیا۔ بڑی بھابھی نے بھی ہاں میں ہاں تو ملادی مگر وہ حنیہ کو اپنی بھابھی بنانے کے چیلنج کو اندر ہی اندر دبا کر نئی ترکیب کے بارے میں سوچنے لگیں۔ محفل برخاست ہوگئی۔ سب اپنے اپنے کمروں کی جانب چل پڑے۔

بڑی بھابھی نے حنیہ کے کمرے میں جھانکا تو دنگ رہ گئیں۔ حنیہ ان کی کسی بات کی پروا کیے بغیر میوزک انجوائے کررہی تھی۔ گنگناتی ہوئی اپنے ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں کے لمبے ناخنوں پر نیل پالش لگا رہی تھی۔ حد درجے کی ڈھیٹ اور بے غیرت واقع ہوئی ہے۔ بھابھی بڑبڑاتی ہوئی ناگن کی مانند بل کھا رہی تھیں۔

اس نے اپنی تنہائی' آزادی اور خود مختاری سے ایسا دل لگایا تھا کہ وہ شادی کے تصور سے ہی کانپ جایا کرتی تھی۔ اسے ایسی زندگی کی تمنا نہیں تھی جو اس کو زنجیروں میں مقید کرکے اسے اتنا بے بس کردے کہ اس کی آواز اس کے گلے میں ہی دب کر رہ جائے۔ وہ اپنے ارادوں کی پختگی پر بھروسا رکھتے ہوئے پرسکون و مطمئن تھی۔ دنیا جو بھی کہے' جو فیصلہ کرے اس کی بلا سے وہ شادی تو کرنے سے رہی۔

☼ ☼ ☼

علی مرتضیٰ سات بھائیوں اور تین بہنوں کے ساتھ اپنے بچپن کو انجوائے کرتا ہوا جوان ہوا تھا۔ خاندان پشت در پشت سے کاروبار میں منسلک تھا۔ آج ان کے اتفاق و اتحاد کی برکت سے ہر بھائی دو فیکٹریوں کا مالک تھا۔ علی مرتضیٰ بھی اپنے بھائیوں کی طرح تعلیمی میدان میں بہت پیچھے رہ گیا۔ بڑے بھائی ہمیشہ چھوٹوں کے لیے اک مثال بنا کرتے ہیں۔ اس لیے بے پناہ دولت کے باوجود خاندان میں جاہلانہ باتیں اور حرکات ان کی سوچ کی پسماندگی کا واضح ثبوت تھیں۔ علی مرتضیٰ کو بھی والد صاحب نے ایک فیکٹری کی تمام تر ذمہ داریاں سونپنے کا اعلان کردیا اور اسے بخوبی اندازہ تھا کہ یہ فیکٹری اس کی قابلیت کا امتحان ہے وہ چاہے تو اس فیکٹری کے بل پر دس اور کھڑی کرلے اور چاہے تو اس کو لے ڈوبے۔ سرو قد و قامت والا خوبرو خوش رو علی مرتضیٰ نے جذبہ شوق سے اپنی فیکٹری کے احاطے میں اعتماد سے قدم رکھتے ہی سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔ والد صاحب کو ایسی فکر لاحق ہوئی کہ وہ اس کی شادی کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ ماں اور بہنوں نے شہر کی جانی پہچانی بزنس کمیونٹی میں اس کے رشتے کے لیے بہتر سے بہتر لڑکی کی جستجو شروع کردی۔

علی مرتضیٰ دن بہ دن فیکٹری کے معاملات میں اتنا گھستا چلا گیا کہ اسے گردوپیش کی خبر تک نہ رہی۔ سال کے آخر میں انکم ٹیکس کی بھاری ادائیگی اسے ڈسٹرب کرنے لگی۔ وہ اپنے دوست کی وساطت سے حنیہ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مگر بدقسمتی سے حنیہ نہ تو کسی کی پوزیشن سے امپریس ہوتی تھی' نہ ہی کسی کی سفارش کو اہمیت دیتی تھی۔

اس نے انکم ٹیکس میں کمی کرنے سے انکار کر دیا اور وہ تذبذب کے عالم میں مبتلا واپس آگیا۔ ذہن کے ہر گوشے میں اس کا انکار گونج رہا تھا۔ کیا لڑکی تھی۔ شائستگی سی کیے گئے انکار میں بھی حد درجہ تحقیر نمایاں تھی جس کا اسے اس وقت تو احساس نہ ہوا تھا۔ مگر اب اضطراری کیفیت بتدریج بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ شب بھر اس نے آنکھوں میں ہی کاٹ دی اور آخر صبح تک اس نے حنیہ کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

☼ ☼ ☼

"علی مرتضیٰ صاحب! میں آپ کا غیر قانونی کام ہرگز نہیں کروں گی۔ چاہے آپ ہر گھنٹے بعد ایک خوب صورت بو کے میرے لیے کیوں نہ بھیج دیں۔" وہ ٹیبل پر رکھے ہوئے پھولوں کو بے دردی سے ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے بڑبڑائی۔

"بہت گھٹیا انسان ہے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا ہے' ذلیل کہیں کا۔ روزانہ بلاناغہ یوں پھول بھیج دینا کہاں کی شرافت ہے۔ میری اچھی بھلی بنی بنائی ریپوٹیشن تو تباہ کرنے لگا ہے۔ ایسے ندیدے اور ڈھیٹ انسان سے سمجھ داری کی توقع عبث ہے۔ مجھے حفظ ماتقدم اپنا رد عمل نہایت نارمل رکھنا چاہیے۔ وہ مجھے نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔" حنیہ کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت کے ساتھ خوف کی لہر بھی دوڑ گئی۔ وہ سر پکڑ کر اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس کے بارے میں سوچنے لگی کہ ایک دم سے آفس کا دروازہ کھلا اور وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ لبوں پر سجائے سامنے کھڑا تھا۔

"آپ کو اندر آنے کی کس نے اجازت دی ہے؟" وہ تیزی سے اس کے مدمقابل کھڑی ہو کر بولی۔

"آپ کو اخلاق و قانون کے مطابق مجھ سے ملاقات کا وقت لینا چاہیے تھا۔ ہر کام کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اچھے بھلے سمجھ دار قسم کے مرد معلوم ہوتے ہیں۔ آدمیت کے جامے میں رہ کر مجھ سے ملنے کی کوشش کریں تو مناسب رہے گا۔"

"میں جانتا ہوں میڈم!" لہجے میں بے پناہ دھیما پن تھا۔

"آئی ایم سوری۔" وہ اس وقت پرلے درجے کا صلح جو اور سادہ طبیعت کا مرد معلوم ہو رہا تھا۔ لب و لہجے میں اکھڑ پن اور بے باکی کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ قدرے امپریس ہوئی۔ مگر اعصابی جنگ جاری تھی۔ بمشکل بولی۔

"تشریف رکھیے۔" وہ کرسی پر نہایت شاہانہ انداز سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔

"یہ آپ کی خام خیالی ہے کہ میں قانون و ضابطے کی حدوں کو پار کر کے آپ کے لیے اک ناجائز کام کروں گی۔" لہجے میں ناگواری در آئی۔ اس نے استعجاب سے اس کی طرف دیکھا۔ مگر ایک لفظ تک بولنا گوارا نہ کیا۔

"یوسف! صاحب کے لیے کافی بناؤ۔" وہ آفس بوائے کی طرف دیکھ کر بولی۔ آفس میں طویل خاموشی چھا گئی۔ لڑکا کافی اس کے سامنے رکھ کر باہر نکل گیا۔

"فرمائیے جناب۔ کیا کیا جائے؟ کیونکہ میں آپ سے مبارزت مول لینے کے حق میں نہیں ہوں۔ آپ کو میری مجبوری کی خبر ہونی چاہیے کہ میں رشوت خور نہیں ہوں۔" وہ خود اعتمادی سے بولی۔

اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا نظر آیا مگر خاموشی بدستور قائم تھی۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین کے ناتے — بے انتہا کنونسنگ پاور کا مالک تھا' تمام ڈھنگ سے روشناس۔ حنیہ نے ایک ثانیے کو اس کا بغور جائزہ لیا۔ کس قدر مہذب اور شائستہ لگ رہا تھا۔ جبکہ جوں ہی منہ کھولتا تھا۔ اس کے انداز گفتگو سے اس کی تعلیم و تربیت کا اندازہ لگانا قطعاً" مشکل نہ تھا۔

"میں آپ کے کیس پر نظرثانی کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ مسئلہ جینوئن ہوا تو آپ کی ہر ممکن مدد کروں گی۔" وہ اسے ٹالتے ہوئے بولی۔ اس انقلاب پر اس نے تسکین و طمانیت سے بھرپور سانس لی۔ چہرے کی بے عذر اور بے ضرر چھاپ نے حنیہ کا دل موم کر دیا۔

"آپ بے فکر رہیے۔" وہ مسکرا دی۔

"آئندہ پھول بھیجنے کی تکلیف مت کیجیے گا بہت

نوازش ہو گی۔" یک طرفہ گفتگو حرف آخر تک پہنچ گئی۔ تو وہ گویا ہوا۔

"شکریہ۔ میں آج ٹیکس کے سلسلے میں نہیں آیا تھا۔ جس پالیسی کو توڑنے میں آپ کو دوسروں کے سامنے ہتکی کا اندیشہ ہے۔ وہ کام میں آپ سے ہرگز نہیں کروانا چاہتا۔" لہجے میں حریصانہ استدعا کی ہلکی سی جھلک بھی نہ تھی۔ وہ سراسیمہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ بہت چالاک اور مکار ہے یا پھر بے حد سیدھا سادا اور معصوم۔ حنیہ بھی جواباً "حسن عملی اور بلند کرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"مدعا بیان کیجیے۔"

"میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس وقت وہ عاجزی و انکساری کا پیکر معلوم ہو رہا تھا۔

"مجھے آپ جیسی نڈر' بے باک اور سچی شریک حیات کی ضرورت ہے۔" اعتراف و اظہار میں بے پناہ سادگی تھی۔ بے ساختہ وہ بول اٹھی۔

"میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔" اس پاکیزہ اور مقدس شبیہ کا ہر انداز اور ہر لفظ لاتعلقی اور اجنبیت ظاہر کر رہا تھا اور تھی بھی حقیقت۔ یہ ناآشنا دوسری دفعہ ہی تو مل رہا تھا۔

"آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے۔ پھر گھر والوں کو آپ کے گھر بھیجوں گا۔ انکار یا اعتراض کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس خواہش کا اظہار والدین کے سامنے کھلم کھلا بغاوت اور شورش ہے۔ ہماری شادیاں خاندان تک ہی محدود رہتی ہیں لیکن مجھے امید ہے ماں جی کو ضرور منا لوں گا باقی کسی کی پروا نہیں مجھے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ حنیہ کے اعصاب پر غصہ و حیرت چھا گئی۔ من میں کھلبلی سی مچ گئی۔ چہرے پر تیکھا پن نمایاں تھا مگر پورے دورانیے میں حنیہ نے خود پر قابو رکھا تھا۔

"اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں مجھے شامل کر لیجیے۔ آپ کو عیش و عشرت کی زندگی تحفے میں بخش دوں گا یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔ کبھی عہد شکنی نہیں کروں گا۔" لہجہ التجائیہ تھا۔

"میری بات کا یقین کیجیے۔ مجھے شادی سے بے پناہ نفرت ہے۔ میں کسی کے ماتحت زندگی گزارنے کی قائل نہیں ہوں۔ چاہے کوئی میرے لیے آسمان سے تارے ہی کیوں نہ توڑ لائے۔ میں اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہیں ہوں۔" وہ بدمزگی کا ماحول بنا کر خود ساختہ پریشانیوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ نہایت ملائمت سے بولی۔

"یہ حتمی اور آخری فیصلہ سمجھیے۔"

"دیکھیے میں بہت پڑھا لکھا نہ سہی مگر عقل و سمجھ تو رکھتا ہوں۔ آپ میں بے شمار خوبیاں موجود ہیں۔ شادی آزمائش و امتحان کا نام نہیں' خوشی' آبادی اور یکجائی کا نام ہے۔" وہ نہایت تحمل سے بولا اور دل ہی دل میں خود کو داد دینے لگا۔ کیونکہ پچھلی رات اس نے ان تمام باتوں کا جو رٹا لگایا تھا حرف بہ حرف ذہن میں محفوظ تھا اور زبان ادائیگی میں لڑکھڑائی بھی نہ تھی۔

"تعلیم ڈگریوں کے حصول کا نام نہیں' ذہنی وسعت کا نام ہے۔"

"ماشاء اللہ بہت خوب۔" وہ آہستگی سے بولی۔ تو وہ مسکرا دیا۔ حنیہ کو وہ مردانگی اور سچائی کا مجسمہ لگ رہا تھا۔'

اگلے لمحے اس خیال کو سرعت سے جھٹک کر ملول سی ہو گئی۔ وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"میں آپ سے رابطہ رکھوں گا۔ سوچنے کے لیے جتنا وقت درکار ہو منظور ہے۔ مگر فیصلہ انصاف کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔"

"پلیز۔ ایسا مت سوچیے میں خود کو جانتی ہوں کہ آپ کے سامنے ہتھیار ڈالنا میری فطرت کے برعکس ہے۔ میں اپنی زندگی میں بہت خوش ہوں۔" وہ خود اعتمادی سے بولی۔

"آپ کو میرا ہم خیال و ہم نوا ہونا پڑے گا۔" وہ بھی اعتماد سے بولا۔

"بندہ آپ کا منتظر رہے گا۔ انکار کی صورت میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔ میرا بھی اٹل فیصلہ ہے

یہ۔ اسے مت بھولیے گا۔"

"نہ جان، نہ پہچان، میں تیرا مہمان۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"لگتا ہے خوامخواہ تڑیاں دکھانے اور دھمکیاں دینے اور چلا ہے شادی رچانے، وہ بھی حنیہ بیگ سے جو اتنی سیدھی نہیں، جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ احمق نہ ہو۔"

☆ ☆ ☆

"یہ لڑکی ایسے بھاگوں والی ہوگی۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔" بڑی بھابھی نے، مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی اپنی دیورانی سے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

"اپنے نصیب اس نے اپنی مرضی اور پسند کے مطابق لکھوائے ہیں بھئی۔" وہ بھی حقارت سے بولیں۔

"نہ جانے کب سے عشق چل رہا تھا؟ ویسے ہاتھ بہت خوب مارا ہے۔ زندگی عیش میں گزارے گی۔" لہجے میں حسرت تھی۔

"ہاتھیوں سے دوستی رکھیں تو دروازے وسیع و عریض رکھنے چاہئیں۔ ہم تو ان کے مقابلے میں کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ میری بات یاد رکھنا شوہر کے ہوتے ہوئے بھی غلامانہ زندگی بسر کرے گی اس کی جوتی بن کر رہے گی۔ اپنے ساتھ کے لوگوں میں رشتے بہتر رہتے ہیں۔" دوسری نے ناک منہ چڑھا کر کہا۔

"بھئی امیر و کبیر خاوند کی جوتی بھی تو ہیرے و جواہرات سے جڑی ہوتی ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولیں۔

"سر میں پڑی تو کم از کم غلاظت کے بجائے دولت کی پر تسکین جھنکار تو ہوگی نا۔"

"تمہارے بھائی میں کس چیز کی کمی تھی جو اس نے ایسا جان لیوا ناٹک کھیلا تھا۔ خدا کی قسم اگر میری بہن کنواری ہوتی تو میں خود بول کر اسے رشتہ دے دیتی۔ مگر افسوس کہ ایسی تیز طرار لڑکیوں کو شریف النفس اور سیدھے سادھے لوگ کیونکر پسند آئیں گے۔"

دوسری نے اک لمبی آہ بھری۔

"ویسے آپس کی بات ہے۔ علی مرتضیٰ کا خاندان دولت مند ضرور ہے۔ مگر ہیں وہ سانجھے گاے ٹائپ کے لوگ۔۔ اس کو تو سمجھ آئے گی۔ جب اس کی جینز اور منی سی ٹاپ چولہے کی نذر کردی جائے گی۔" بڑی بھابھی نے جل کر خوشی کا اظہار کیا۔

"ڈیزائنر کے کپڑے اس کی جگہ لے لیں گے۔ آپ نے یہ تو سوچا ہی نہیں۔" وہ چڑانے کے انداز میں بولیں۔

"ایسی بھی بات نہیں، اس کی ماں کو دیکھا ہے، ٹوٹے ہوئے صوفے کی مانند لگتی ہے۔ دوسری بہوؤں کی طرح بچے پیدا کروا کرا سے بھی اپنے جیسا روپ دے ڈالے گی۔ ایسے لوگوں کو بچوں کی فوج بنانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ بے چارے ذہنی غریب و مفلس جو ٹھہرے۔ ہم متوسط طبقے کے لوگ ان دونوں قسم کی کیٹگری میں نہیں آتے۔ یہ اپنی خوش قسمتی سمجھو۔" وہ مزاحیہ انداز میں بات ٹالنا چاہ رہی تھیں کہ حنیہ آفس سے آگئی۔ دعا سلام کے بعد اپنے کمرے کی طرف مڑی ہی تھی کہ بڑی بھابھی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"ارے بنو رانی تمام معاملات بذات خود ہی طے کرلیے۔ اب شادی کی ڈیٹ بتانا مت بھولنا، ہمیں بھی تو شادی کی تیاری کرنی ہے نا۔" وہ ہمیشہ کی طرح ان کی بے وقوفانہ بات کو نظر انداز کرکے آگے بڑھ گئی۔

دونوں قہقہہ لگا اٹھیں۔

"میسنی جتنی اوپر دکھتی ہے نا اس سے ڈبل نیچے ہے۔ سسرال میں یہ چالاکیاں اور مکاریاں نہ چلیں گی۔ ذرا دیکھ تو سہی کہ کیا درگت بنتی ہے اس کی۔ علی مرتضیٰ کے ساتھ کھڑی کیا لگے گی؟" بڑی بھابھی نے نفرت آگیں لہجے میں کہا۔

"گلی ڈنڈا کیسی بے جوڑ اور بے ڈھنگی جوڑی بنے گی۔" دوسری نے اپنے دل کو تسلی دی اور شادی کے لیے ڈریسز بنانے پر تبادلہ خیالات ہونے لگا۔

☆ ☆ ☆

"حنیہ کیسی عجیب بات ہے کہ جو لڑکیاں مجھ پر جان چھڑکتی ہیں۔ میرے نام کو اپنے نام کے ساتھ منسوب کرنے کی خواہش میں دن رات گھلتی رہتی ہیں۔ میں نے انہیں کس بے دردی سے ٹھکرا دیا اور ایک ایسی انجان لڑکی جو فطرتاً ان سب سے مختلف ہے۔ اس کی منتیں، چاپلوسیاں کرکے کتنی مشکل سے اسے پاسکا ہوں۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تاحیات میری وفادار رہنا۔ میرے خاندان میں اس قانون کے پیش نظر رشتے طے ہوتے ہیں اور اس کی خلاف ورزی کرنے والی بیوی کی چھٹی پل بھر میں ہوجاتی ہے۔ ہمارے خاندان میں طلاق کو گناہ کبیرہ تصور کرتے ہوئے بیوی سے کنارہ کشی تو نہیں کی جاتی، مگر اس سے کسی قسم کا تعلق و ربط بھی نہیں رکھا جاتا۔ اولیت وفا اور ایثار کو دی جاتی ہے۔" علی مرتضیٰ نے اپنے خیالات اس کی سماعتوں میں انڈیل دیے۔ حنیہ نے کافی کا سپ لیتے ہوئے سوچا۔

"تم اپنی دولت کے بل بوتے پر شادی سے پہلے ہی ایسی باتیں کرسکتے ہو۔ مگر کم میں بھی نہیں، تم سیر ہو تو میں سوا سیر ہوں۔ تمہیں ایسی نکیل ڈالوں گی کہ جان چھڑانا بھی چاہو گے تو چھڑا نہ سکو گے۔ میں تمہاری خبیث سوچ کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور اپنی مجبوری سے بھی باخبر ہوں کہ مجھے تم جیسا دولت مند شوہر اس جنم میں تو ملنے سے رہا۔ تمام عمر بھابھیوں کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر گزارنے سے بہتر ہے کہ اپنے شوہر کی غیر مناسب اور غیر موزوں باتوں کو سیر ماور سمجھ کر کیوں نہ پی جاؤں اور پھر ایسے کم تعلیم یافتہ شوہر کو اپنے آئینے میں اتارنا کوہ ہمالیہ کو سر کرنا تو ہے نہیں اور نہ ہی ہرن سے کستوری حاصل کرنے کے مترادف ہے۔ زبان کو میٹھا رکھو تو خوب نبھے گا یہ رشتہ۔" وہ فہمائشی انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

وہ جو شادی کا سوچ کر دہل جایا کرتی تھی۔ اب مستقبل کے روشن و تابناک ہونے کی آس میں قدرے مطمئن نظر آنے لگی تھی۔ علی مرتضیٰ اس سے شادی کے فیصلے پر نازاں ہو کر جھوم اٹھا۔ میری زندگی میں کامیابیوں کے رنگ یہی لڑکی بھر سکتی ہے۔

☆ ☆ ☆

برادری میں حنیہ کی شادی نے بھائیوں کی ناک ایسی اونچی کی تھی کہ وہ بہن پر واری صدقے ہوتے نہ تھکتے تھے۔ کیونکہ ان کے خاندان میں ایسی نصیبوں والی بیٹی تو پشتوں سے پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ ولیمے کی شان و شوکت دیکھنے لائق تھی۔ مگر بھابھیوں کی جلن و حسد کی انتہا تھی نہ ہی رزالت و کمینے پن کے اظہار میں عزت و لحاظ کا دخل تھا۔ حنیہ جیسی پڑھی لکھی لڑکی سسرال کو بھا گئی تھی۔ اس کے اسٹائل پر ینگ لڑکیاں قربان ہوئے جارہی تھیں۔ رشتے میں کسی کی ماہی، تو کسی کی چاچی۔ سب اپنی فرینڈز سے ملوانے میں خوشی و انبساط سے سرشار تھیں۔ حنیہ بھی چاؤ و چونچلوں میں خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔

حنیہ، ساس اور سسر کے گھر میں شوہر کے ساتھ شاداں و فرحاں تھی۔ سب کو اس کا صبح سویرے آفس جانا اور سرِشام واپس آنا بہت بھلا لگتا تھا۔ روایتی خاندان میں ایک تبدیلی رونما ہوگئی۔ علی مرتضیٰ کو حنیہ اپنے حلقے میں متعارف کرانے لگی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ انکم ٹیکس اور کسٹم کے سرکل کا حصہ بن گیا۔ جہاں کی دنیا اس کی سوچ سے بالکل نرالی تھی۔ ڈانس پارٹیز کی مخلوط محفلوں میں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔

حنیہ اب اپنے شوہر کے ساتھ بہ نفسِ نفیس ان میں شامل ہونے لگی تھی اس لیے علی مرتضیٰ کا ساتھ دینے میں اسے قباحت محسوس نہ ہوتی اور یوں شوہر کو وہ اشاروں پر نچاتی۔ فیکٹری کے تمام ٹیکس معاف کروا دیے جاتے۔ فیکٹری کا مال دوسرے ملکوں میں سپلائی ہونے لگا۔ دولت کی فراوانی کا کریڈٹ حنیہ کو جانے لگا۔ جلد ہی علی مرتضیٰ نے دوسری فیکٹری بنالی تیسری کا بھی آغاز ہوگیا۔

حنیہ نے چند سالوں میں اسے خاندان کا چمکتا دمکتا وہ ستارہ بنادیا جس کی ضوفشانی کو سب حسرت و رشک سے دیکھتے ہوئے اپنے بیٹوں کے لیے حنیہ جیسی لڑکی

کے متلاشی ہو گئے۔ جس نے مجازی خدا کی پرستش میں اپنے تمام اصول تیاگ دیے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پانچ سال کے عرصے میں تین خوب صورت بیٹوں سے نوازدیا۔ حنیہ نے جاب چھوڑنے کا ہلکا سا اظہار کیا تو علی کو اک جھٹکا سا لگا۔ ریاکاری اور خودغرضی عود کر آئی۔ حنیہ کو ایثار و وفا کا سبق شادی سے پہلے ہی سنا کر خاموش کرادیا گیا تھا۔ جو اسے ازبر تھا۔ بچے آیا گورنس کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے لگے۔ ان میں خوداعتمادی کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے رات کا بیشتر حصہ وہ ان کے کمرے میں گزار کر اپنی تڑپتی ممتا کو بہلانے کی کوشش کرنے لگتی۔

اتنی بے پناہ دولت کی فراوانی سے لطف اندوز ہونے کا اس کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ علی مرتضیٰ کو اس کی تنخواہ سے غرض تھی' نہ ہی اس کے بینک بیلنس سے دلچسپی تھی۔ اس کی آڑ میں وہ آکاش کی بے حدو بیکراں وسعتوں میں سما جانا چاہتا تھا۔ حنیہ اس کے لیے ایک مضبوط اور پائیدار ریل کی حیثیت رکھتی تھی اور وہ ریل اس کی نوکری ہی تو تھی۔ اور وہ اس بات پر یقین کرنے پر مجبور ہو جاتی کہ طمع اور لالچ کی کہانی کا کبھی اینڈ نہیں ہوتا۔

بچے نوکروں کی نگہداشت میں سب کے ساتھ بدتمیزی اور ضدی پن پر اترے رہتے۔ پڑھائی کی جانب رجحان کم تھا۔ چند مہینوں کے بعد اسکول بدلا جاتا' ٹیوٹر نئے آجاتے مگر رزلٹ کبھی درست نہ آتا۔ حنیہ کی پریشانی عروج پر تھی۔ مگر علی کو اس کی رتی بھر پروا تھی' نہ فکر۔

وہ جب بھی یاسیت بھرے لہجے میں اپنی فکرمندی کا اظہار کرتی۔ وہ یہ کہہ کر چپ کرا دیتا کہ تعلیم کی اہمیت اگر دولت سے زیادہ ہوتی تو میں آج بھکاری ہوتا۔ ہم نے بچوں کو ڈاکٹر یا انجینئر کی ڈگری دلا کر کرنا کیا ہے۔ میٹرک بھی ان کے لیے کافی ہے اور یہ جو دولت ہوتی ہے نا ہر عیب کی پردہ داری کے لیے کافی ہے۔ بھوکے نہیں مریں گے لاکھوں کو کھلا کر شکم سیری کریں گے فکر نہ کیا کرو۔ خوامخواہ اپنی صحت اک غیر ضروری مسئلے میں خراب کر رہی ہو۔ ایک دن سوچ سوچ کر مخبوط الحواس ہو جاؤ گی۔

وہ رات کس قدر جان لیوا اور بھیانک تھی جب ان کا سولہ سالہ بیٹا شہرام شراب کے نشے میں دھت گھر پہنچا۔ ممتا بلک کر دہائی دینے لگی۔ اسے اپنا میکا اور اس کے اصول سادگی اور پاکیزگی نے بے کل کر دیا۔ ایسی علتوں سے پاک اس گھرانے میں میاں' بیوی کا رشتہ کس قدر مستحکم تھا۔ اولاد کیسی فرماں بردار اور لائق فائق تھی۔ آج نقطہ نظر یکسر بدل گیا۔ اس ماحول کی پروردہ حنیہ اپنی اولاد کی تربیت کا حق ادا نہ کر سکی۔ وہ خودساختہ پریشانیوں سے نکلنے کے لیے بے تاب تو اک عرصہ دراز سے تھی۔ اب اس کی رفاقت میں گہرائی میں اترتی جا رہی تھی۔ نکلنا محال ہو گیا تھا۔ حنیہ نے بیٹے کی حالت دیکھ کر اسے مکے گھونسے اور تھپڑوں سے زخمی کر دیا' ناک سے خون نکلنے لگا۔ علی گھر پہ نہیں تھا ورنہ قیامت کا گھنٹہ تو بج چکا ہوتا۔ ڈاکٹر کو گھر بلا کر اسے دوا اور انجکشن دے کر سلا دیا۔ حنیہ تمام رات اس کے ساتھ لیٹی اپنی قسمت کو کوستی رہی۔ گزرے ہوئے وقت کا پچھتاوا اتنا تھا کہ اسی عالم میں صبح ہو گئی۔ بے داری شب اور غموں کی اتھاہ گہرائیوں میں گھری ہوئی حنیہ آفس نہ جا سکی۔ وہ بیٹے کو ترس و رحم بھری نظروں سے گھورتی رہی۔ دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے جناب نے آنکھ کھولی' ماں کو اپنے قریب دیکھ کر اچھے سے بیٹھا سر میں درد کی شدت سے لاچار سا ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ ذہن پر زور دینے سے اس کی پیشانی پر عرق ندامت کے قطرے ابھرے اور اگلے ہی لمحے وہ طنزیہ نظروں سے حنیہ کو دیکھنے لگا۔ عزت و احترام اور لحاظ جوئی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بدتمیزی سے چیخا۔

"آپ نے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی جرات کیسے کی؟ میں نے ایسا کون سا ظلم ڈھا دیا؟ میں نے آپ کی آغوش میں جب آنکھ کھولی تھی تو مجھے اسی خوشبو نے ویلکم کیا تھا۔ سوال مجھ سے کرنے کے بجائے خود سے کریں۔ صحیح جواب پا کر آپ کو مجھ سے معافی مانگنا ہو گی۔" حنیہ پہلے آزردہ و پُرملال بیٹھی تھی۔ اختلاج قلب مزید بڑھ گیا اور کمرے کی فضا ایک نقطے پر منجمد ہو کر رہ گئی۔ ممتا کی گرمی کی شدت میں سردمہری شامل ہو گئی اور مردنی سی آواز آئی۔

"اس عمر میں تمہارے یہ کرتوت و لچھن' ناک کٹوا کر رکھ دی ہے تم نے۔ باپ کو آنے دو وہ دھنائی کرواؤں گی کہ دماغ کے سارے کیڑے اپنی موت آپ مر جائیں گے۔" لمحہ بھر کے توقف کے بعد گویا ہوئی۔

"اٹھو' جا کر نہا دھو کر ناشتے کے لیے آجاؤ۔ تمہارے باپ کے آنے کا وقت ہے۔ بہتر ہے اپنی حالت درست کر لو ورنہ...."

"ورنہ کیا؟" وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"مجھے قتل کر دیں گے۔ پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں۔ میں نے وہی کیا جو میں بچپن سے دیکھ رہا تھا پھر تکلیف کس بات کی۔ مہربانی فرما کر میرے کمرے سے نکل جائیے۔ اگر آپ سے میرا رشتہ بیٹے کا نہ ہوتا تو میرا ردِعمل ناقابل فراموش ہوتا۔" لہجہ ایسا زہر بھرا تھا کہ وہ غصے سے کانپنے لگی۔ اعصابی کمزوری پہلے ہی حدوں کو چھو رہی تھی۔ رہی سہی کسر اس نے نکال دی۔ وہ بستر سے اٹھا۔ ماں کو بازو سے کھینچتا ہوا دروازے سے باہر تک لے آیا اور اپنے کمرے کو لاک کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

دوسرا بیٹا بہرام اٹھارہ سال مکمل کرنے کے انتظار میں تھا کیونکہ ماں ہر بات پر اسے نابالغ ہونے کا جتا کر اسے اپنے قابو میں رکھنا چاہتی تھی۔ پھر بھی جب داؤ لگتا گاڑی نکال کر لے جاتا۔ باپ کے اعتراض کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اس کی طرف سے بیٹوں کو کھلی چھوٹ تھی۔ شہرام کی اس کم عمری میں شراب پینا۔ اسکول سے غائب رہنا اور بیسیوں دوستوں کے ہمراہ آوارہ گردی میں مارے مارے پھرنا حنیہ کو ہر وقت بے قرار رکھتا۔ مگر علی اپنی دنیا میں اتنا مگن اور مست تھا کہ اسے فکر ہوتی' نہ ہی پروا ہوتی۔

جب وہ گھر واپس آیا تو حنیہ بستر سے لگ چکی تھی۔ وجہ گوش گزار کرنے پر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ الٹا اسے تسلی و تشفی دیتے ہوئے شراب پینے کے آداب ڈھنگ اور طور و اطوار کی ٹریننگ دینی شروع کر دی۔ حنیہ کو آج دولت کی زیادتی کے بھیانک روپ تڑپانے لگے تھے۔

ابھی تو زندگی نے مجھ سے حساب کتاب لینے کی شروعات کی ہے۔ میں ایک مذہبی گھرانے کی پروردہ اور علی مرتضیٰ بھی ایک سادہ سے خاندان کا فرد ہم نے تو آنے والی نئی نسل کے لیے تباہی و بربادی کے تمام رستے کھول دیے ہیں۔ اب آگے خدا خیر ہی کرے۔ وہ جائے نماز پر سالہا سال کے بعد سجدہ ریز ہو کر باری تعالیٰ سے فریادیں اور التجائیں کر رہی تھی۔ چند ہفتوں بعد گھر میں اک اور بہت بڑے دھماکے نے حنیہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ علی مرتضیٰ پر تو رتی بھر اثر نہ ہوا تھا۔ وہ دولت کے نشے میں مست تھا۔

بڑا بیٹا دن دھاڑے میڈ کی تیرہ سالہ بیٹی کو بہلا پھسلا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس بچی کی چیخوں سے بنگلہ لرز اٹھا تھا۔ حنیہ آفس میں ہی تھی۔ جب میڈ نے تمام حالات ——— اس کے گوش گزار کیے۔ وہ اسی وقت گھر پہنچی اور فوراً بچی کو قریبی کلینک میں لے گئی۔ جب بیٹے کو لعن طعن ہو رہی تھی تو وہ گرج دار آواز میں بولا۔

"ماما خاموش... پلیز میرے ایک سوال کا جواب دے دیجیے۔ میں خود کو قصوروار مان کر یہ گھر چھوڑ جاؤں گا۔ اگر بابا کو گھر کی ہر میڈ پر حق جتانے کی اجازت ہے تو مجھ پر اعتراض کیوں؟" ایک چھناکے سے اعتماد اور بھروسے کے ٹوٹنے کی آواز نے حنیہ کو چکرا کے رکھ دیا۔ وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔ علی مرتضیٰ نے ہنس کر ٹال دیا اور حنیہ سے گویا ہوا۔

"مبارک ہو پتر جوان ہو گیا ہے۔" اس نے چونک کر شوہر کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر نہ ملال تھا' نہ ہی معصوم بچی کی عزت لٹ جانے کا دکھ تھا۔

تیسرا بیٹا کینیڈا انڈر گریڈز میں تھا۔ بار بار فیل ہو جانے کی شرمندگی میں اتنا پریشان ہوا کہ رزلٹ سننے

کے بعد ہی اس نے گولیاں کھا کر خود کو ختم کر ڈالا۔ اس خبر کے بعد حنیہ بستر سے ہی لگ گئی۔ اس غم نے اس پر آگہی کے در وا کر دیے اسے اپنی کوتاہیوں کا شدت سے احساس ہو رہا تھا پر علی پر ابھی بھی دولت کا ہی بھوت سوار تھا جس نے اس کی عقل اور آنکھوں پر پردے ڈال دیے تھے۔

شوہر کے کہنے پر وہ ابھی بھی آفس جاتی تھی۔ کام میں دل لگتا، نہ ہی کسی پل سکون ملتا۔ اگر تھوڑا بہت اطمینان حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی تو وہ یاد الٰہی تھی۔ رات بھر سجدہ ریز رہتی۔ تمام دن تسبیح پڑھ کر معافی کی عرضداشت پیش کرتی رہتی۔ اس نے سب کی مخالفت کے باوجود خود کو بلیک گاؤن اور حجاب میں چھپا لیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ گھر سے باہر قدم نہ رکھتی۔ مگر خاوند کی خواہش کے مطابق اسے آفس جانا ہی تھا کیونکہ فیکٹریوں کا ٹیکس کروڑوں کی صورت میں کھڑا تھا۔ جسے کلیر کرانا اس کا فرض تھا۔ مگر اس بار وہ اپنے وطن کو دغا دے کر اپنی دولت میں مزید اضافہ کرنے پر دل سے تیار نہ ہو رہی تھی۔ جبکہ خاوند کا پریشر اسے سر اٹھانے نہ دے رہا تھا۔ مگر وہ روزانہ ٹال مٹول کر جاتی۔

"تم میری بات نہیں مانوگی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ حنیہ بیگم ذرا غور سے سن کر فیصلہ کرنا۔" علی مرتضیٰ نے گرجتے ہوئے کہا۔ اتنی بلند آواز میں کہ وہ سوکھے پتے کی مانند لرزنے لگی تھی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو علی مرتضیٰ، تم نے جس لالچ میں مجھ سے شادی کی تھی۔ اگر اس طمع کو ہی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو سچ ہے کہ تم اس رشتے کو توڑ دوگے۔" وہ نقاہت سے بولی۔

"علی میں اپنے رب سے التجا کر رہی ہوں کہ مجھ سے اس دنیا کی ہر آسائش کے بدلے سکون جیسی دولت سے نواز دے۔ مجھے یہ فیکٹریاں اور ملیں نہیں چاہئیں۔ مجھے یہ محل، یہ گاڑیاں، ہیرے جواہرات سے نفرت ہو گئی ہے۔"

"تمہارے منہ میں خاک! کیسی بدشگونی کی باتیں کرنے لگی ہو۔ اولاد کے بگڑنے اور جوان بیٹے کی ناگہانی موت کا مجھے بھی دکھ ہے، ہمارے بچے ہمارا اثاثہ ہیں اور ان کی طرف سے بھلی خبر سننے کو کون ترس گئے ہیں۔ لیکن اس پر میرا کوئی اختیار نہیں اور نہ ہی میں دولت کو کوئی دوش دیتا ہوں۔ ہم پشتوں سے امیر کبیر لوگ ہیں۔ نام و ناموس اور شان و شوکت ہمارے در کی لونڈی رہی ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ تمہاری مہربانیوں سے ہم مال دار ہوئے ہیں۔ یہ خوش فہمی اپنے ذہن و قلب سے نکال دو۔ اگر تم میری زندگی میں شریک نہ بھی ہوتیں تو وقت کے ساتھ میری دولت میں اضافہ ہی ہوتا، گھاٹا ہرگز نہ ہوتا۔" دولت کے تکبر میں اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔

"اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اور اس کی نعمتوں کے شکرانے میں سجدہ ریز ہو جائیں۔ ہم پہلے ہی نہ جانے کن گناہوں کی پاداش میں آزمائشوں اور مصیبتوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔" اس کے لہجے میں خوف ہویدا تھا۔

"جن گناہوں کی طرف تمہارا اشارہ ہے۔ وہ ڈولی میں تم اپنے ساتھ لے کر اس خاندان میں شریک ہوئی تھیں۔ ہم ایسی علتوں سے بالکل نابلد اور نہایت پاکیزگی سے زندگی کو انجوائے کر رہے تھے۔ تم نے مجھے ان باتوں سے متعارف کرایا تھا۔ پھر شیطان مجھ پر ایسا حاوی ہو گیا کہ مجھے یہ گلیمر بہت پرکشش معلوم ہوا اور اب میرا یہ حال ہے کہ شراب پیے بغیر مجھے نیند ہی نہیں آتی۔ اس کے علاوہ بھی میری زندگی میں تمہاری وجہ سے کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سب کا میں عادی ہو چکا ہوں، کیونکہ سلو پوائزن نے میری قوت ارادی کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ بتاؤ اس معاملے میں تم قصوروار ہو کہ میں۔" لہجے میں اتنی تلخی تھی کہ اس کی سماعتوں میں جیسے کسی نے زہر انڈیل کر اس کے وجود میں کڑواہٹ بھر دی ہو۔

"بزدل اور کم ہمت مرد ہمیشہ اپنی غلطیوں اور گناہوں کی غلاظت بیوی پر تھوپ کر سرخرو ہونے کی کوشش میں اپنا بنا بنایا امیج تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ مجھے

آپ سے یہ امید نہ تھی۔" وہ بھی تیز لہجے میں بولی۔

"میں نے آپ کی کامیابیوں کی خاطر اپنے قانون اور اصولوں کو داغ دار کر دیا۔ آپ کو ایسے لوگوں سے انٹروڈیوس کرایا جو آپ کی بزنس میں ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتے رہے۔ غلاظت بھری زندگی کا انتخاب آپ کی اپنی طرف سے تھا اور ظاہر ہے ایک بیوی ہونے کے ناطے مجھے آپ کا ساتھ دینا پڑا تھا۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ علی ہم اپنے بچے کو واپس لانے کا اختیار تو نہیں رکھتے۔ لیکن بلاشبہ اپنے دو بگڑے ہوئے بچوں کو راہ راست پر لا سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" وہ سوالیہ انداز میں بولا۔

"زندگی کی روش بدل کر۔" وہ پر امید لہجے میں بولی۔

"اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ جب بچوں کو تمہاری ضرورت تھی اس وقت تم P.R بنانے میں مگن تھیں۔" وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

" P.R ؟" وہ سرہلا کر بولی۔

"سب کچھ تمہارے لیے میں نے کیا تھا۔ آج مجھے ہی بے حس ماں کے خطاب سے نواز کر بچوں کی نظروں سے گرانا چاہ رہے ہو۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"سچائی کی کڑواہٹ ناقابل برداشت ہوتی ہے نا، ہضم نہیں ہوتی۔ مگر ہے تو یہی سچ۔" وہ طنزیہ ہنس رہا تھا۔

"یہ دنیا بھی کیسی عجیب ہے؟ اس کے مکین کبھی اپنے گریبان میں جھانکنے کو اولیت ہی نہیں دیتے۔ ہمیشہ انگلی دوسروں کی جانب اٹھا کر انہیں عارضی اطمینان تو دے دیتی ہے۔ مگر ضمیر کی لعنت ملامت نہیں عمر کے کسی حصے میں بے دار کرنے میں کامیاب ضرور ہوتی ہو گی۔ آج نہیں تو کل آپ کو احساس ضرور ہو گا کہ میں جن جن گناہوں کی مرتکب ہوئی اس میں انٹرسٹ کا محور آپ تھے۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"تم نے میرے لیے ایسا کون سا کمال کر دیا ہے جو احسانات کی طویل فہرست ختم ہونے میں نہیں آرہی۔ تم ذرا اپنے گرد و پیش کا جائزہ لو۔ ٹیکس کی ادائیگی میں کہاں کہاں گھپلے نہیں ہوئے۔ اک معمولی لیول سے لے کر ہائی فائی لیول کے لوگوں نے بھی ٹیکس کو معاف کرانے کی تگ و دو میں دوسروں کی جیبیں بھر کر خود کو فوائد پہنچائے ہیں۔ وہ ادارے جن پر ہم فخر و احترام سے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کی جرات نہ کر سکتے تھے۔ آج وہ بھی اسی گناہ میں ملوث ہیں۔ ہم تو ان کے مقابلے میں بہت چھوٹے درجے کے لوگ ہیں۔ ہم نے لوگوں کے حقوق غصب نہیں کیے ہیں، نہ ہی معصوم عوام کی جائیداد پر قبضے کر کے انہیں نہتا کیا ہے۔ میرے پاس جو بھی ہے میری اپنی محنت و مشقت کا ہے۔ جاؤ نکل جاؤ اس بازار میں جہاں ہر ایک کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ انہیں پکڑو، پھر میرے پاس آنا اپنی انکم کی پائی پائی پر ٹیکس ادا کر دوں گا' میرا تم سے وعدہ ہے۔" وہ قدرے نرم پڑ گیا تھا۔

"ایک ناجائز کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر ہزاروں شیطانوں کے پلو پکڑ کر چلنا پڑتا ہے۔ ہمارے چار سو چھوٹے بڑے شیاطین کی بھرمار ہے۔ جن سے ہمیں کام نکلوانا پڑتا ہے لیکن کیا ہم وہ تمام سہارے چھوڑ نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ تو بہت غفور و رحیم ہے بہت بڑی ہستی ہے، علی اس کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں۔" وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

"مثلاً" وہ پھر متذبذب نظر آنے لگا۔

"بس اللہ کے اصولوں پر چل کر اک نئی خوش آئند زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ علی ذہنی سکون و اطمینان قلب کے بغیر یہ دنیا قیامت گاہ اور زندگی عذاب الٰہی کی آماجگاہ ہے۔ جس کے ہم بہت پرانے باسی ہیں۔" وہ نہایت ملائمت سے بولی۔

"دیکھیے گا ہم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور فضل و کرم کے دروازے کھل جائیں گے۔"

"تم بالکل ہی پاگل ہو گئی ہو۔ جاؤ گولیاں کھاؤ اور سونے کی تیاری کرو۔ ورنہ صبح آفس نہیں جا پاؤ گی۔ میں تمہیں ذہنی طور پر اتنا کمزور نہیں سمجھتا تھا۔ کیا ہو گیا ہے ایسا کہ تم سنبھلنے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔" وہ فکرمندی سے بولا۔

"ابھی اور کیا کچھ ہونا باقی ہے علی۔ سب کچھ تو

ہمارے ساتھ ہو گیا اور کس امتحان کا انتظار ہے آپ کو۔" وہ اس کے سینے سے لگی بلک بلک کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

"حنیہ! کب سے تمہیں فون کر رہا ہوں۔ تمہارا موبائل ہی بند تھا۔ کہاں ہو؟ کیا کسی میٹنگ میں بیٹھی ہو۔" علی نے ایک ہی سانس میں سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

دو بجے بہت اہم میٹنگ ہے۔ آپ میرے لیے دعا کریں کہ میں سینئرز کو اپنے ایجنڈے سے روشناس کر کے کنوینس کر سکوں۔" لہجے میں تسلی کی رمق موجود تھی۔

"تمہارے لیے بہت ساری دعائیں ہیں۔ یار میرا کام بھی اٹکا ہوا ہے۔ ذرا اس پر بھی غور کرنا۔ فائل تمہاری ٹیبل پر گل سڑ رہی ہے۔ کچھ رحم کرو جان۔" وہ نہایت سعادت مندی سے بولا۔ تو اس نے موبائل بند کر دیا۔

اب وہ تہجد کی نماز کے بعد فجر کی نماز تک خشوع و خضوع سے باری تعالیٰ کے حضور سجدے میں گر گر معافی تلافی کرتی رہتی۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ فراخدلی سے خیرات و صدقہ دے کر سیدھی آفس چلی جاتی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ ہر ویک اینڈ گھر پر بھی کسی نہ کسی پیر کو بلا کر عبادت کی جانے لگی۔ تعویذ گنڈوں کی مدد سے ذہنی سکون بحال کرنے کی کاوش شروع ہو گئی۔ علی مرتضیٰ اسے پیار سے سمجھاتا، غصہ بھی دکھاتا، ہر طرح کی دھمکیاں بھی دیتا مگر حنیہ باز نہ آئی۔ آخر اس نے ایک دن حج پر جانے کی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔ علی مرتضیٰ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کے سر پر ایک وزنی ہتھوڑا رسید کر دیا ہو۔ اچنبھے سے بولا

"ابھی ہم جوان ہیں یہ تمام ڈھکوسلے بڑھاپے کے لیے رکھ چھوڑو۔ جب ہم اور کچھ بھی کرنے کے قابل نہ رہیں گے تو اس پکنک پلس عبادت کا مزا لوٹیں گے۔ ذرا صبر کرو۔ زیادہ سال نہیں رہ گئے ہیں۔ ہر کام کا اک وقت ہوتا ہے۔ تمام فرائض کی ادائیگی کے بعد حج ہم پر واجب ہوتا ہے۔"

"لیکن میں تو تیاری شروع کرنے والی ہوں اگر آپ ساتھ نہیں دیں گے تو میں کسی گروپ کو جوائن کر لوں گی۔" وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

"قسم سے حنیہ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"چل نہیں گیا علی! ایک نقطے پر ایک ذات پر اٹک گیا ہے۔" وہ عقیدت مندی سے بولی۔

"آپ سن لیجیے میں اس سال حج پر جا رہی ہوں۔ اس کے حضور اپنی غلطیوں کی معافی اور اپنے بچوں کے ایمان، جان و صحت کے تحفظ کی بھیک مانگوں گی۔ وہ مجھے معاف فرما کر دونوں جہانوں کا سکون میری جھولی میں بھر دے گا۔"

"اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے۔ تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہمارے وجود کے ہر گوشے میں بستا ہے۔ پھر وہاں ہی جا کر التجا کرنے کی کیا تک بنتی ہے۔ مجھے تمہاری منطق قطعاً" سمجھ نہیں آتی۔ دراصل یہ جو عورت ذات ہے نا اسے ذرا سی ڈھیل ملے تو اپنی حیثیت کو ہی فراموش کر دیتی ہے۔ پہلے پاؤں کی جوتی بن کر رہتی ہے۔ بچوں کے جوان ہوتے ہی سر کا تاج بن کر اپنی حیثیت منوانے لگتی ہے۔" وہ خفگی سے بولا۔

"مجھے میرا مقام بہت مقدس اور عظیم معلوم ہوتا ہے علی۔ حج سے واپس آ کر میں اپنے اصلی اور حقیقی کردار کو اپنا لوں گی۔ آئی لواٹ علی! آئی لواٹ۔ کاش میں اس وقار و کروفر کو بحال کرنے کے تمام ہنر پہلے جان گئی ہوتی۔ اب میں اس گھر میں ملکہ کے عہدے پر فائز ہو کر حکومت کروں گی۔ یہاں زمانہ جہالیت کی گواہی دینے والی محفلوں کے بجائے درس و تدریس کی محفلیں سجیں گی۔ ناچ گانے کی جگہ میلاد شریف پڑھا جائے گا اور میں شاداں و فرحاں نیک خصلت لوگوں کی خدمت گزاری کرنے میں فخر محسوس کروں گی۔ کتنا مزا آئے گا جب آپ صبح کام پر جائیں گے تو آپ کی سلامتی کے لیے آپ پر دم کر کے رخصت کروں گی۔ بچوں کی حفاظت کا حصار باندھ کر اپنی دعاؤں کے سائے میں انہیں اللہ حافظ کہوں گی۔ علی میرا یہ مقام مجھے واپس لوٹا دیجیے گا۔ مجھے جاب کو خیرباد کہنے کی اجازت دے دیجیے۔" اس کے لہجے کے فسوں میں نہ جانے کیا اثر تھا کہ علی نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

"میری جان! میں ذہنی طور پر حج کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں۔ کیا اگلے سال تک انتظار کر سکتی ہو۔" وہ نہایت ملائمت سے بولا۔

"آپ نہیں سمجھیں گے۔ مجھے اندیشہ ہے اس دن کا۔ جب ہم پھر سے کسی نئی آزمائش کا لقمہ بن جائیں گے۔ آپ کس قدر سنگدل اور نڈر واقع ہوئے ہیں۔ میرا لحاظ تو در کنار خدا تعالیٰ کا ڈر ہے نہ ہی خوف ہے۔ توبہ استغفار۔" وہ اس کی باتوں سے اتنی خائف ہو گئی کہ کانپنے لگی۔

"میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی اسی سال۔ آپ کو اگلے سال تک جینے کا مژدہ مل گیا ہو گا مگر میرے ساتھ ایسا کوئی معجزہ رونما نہیں ہوا۔" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"نہیں یار! یہ تو ناانصافی ہو گی ہم نے زندگی کا پرائم ٹائم اکٹھے گزارا ہے۔ اب تمہیں اکیلے کیسے بھیج دوں؟ چلو کیا یاد کرو گی کہ کس حاتم طائی سے پالا پڑا ہے۔ ہم اس گروپ کو جوائن کریں گے۔ جس پر پینتیس لاکھ خرچ آتا ہے۔ اتنی آسائشوں میں حج کراؤں گا کہ تمہیں مزا ہی آ جائے گا۔" وہ اس کے جذبہ شوق سے مرعوب ہو کر بولا۔

"ویسے تمہاری ثابت قدمی کو مان گیا ہوں۔"

"کیا ہم عام لوگوں کے ساتھ حج نہیں کر سکتے۔ مزا تو اس حج کا آئے گا جانو۔ مجھے حرام کے پیسے پر حج کرنے والے لوگوں کے ہمراہ طواف اور سعی کرنے میں بہت ندامت محسوس ہو گی۔" وہ متذبذب سی ہو کر بولی۔

"بال کی کھال مت نکالو۔ میرے ساتھ حج کرنے کی یہی پہلی اور آخری شرط ہے۔ آگے تمہاری مرضی۔" اس نے آخری اور حتمی فیصلہ سنایا اور اٹھ کر چلا گیا۔

حنیہ نے سوچ بچار کے بعد اس کی شرط ماننے میں عافیت و مصلحت سمجھی اور حج کی تیاریاں ہونے لگیں۔
حج کے دوران دونوں کی مسلسل چپقلش نے اس کا ذہنی و دلی سکون تو غارت کر ہی دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے گھر میں ندامت کے مارے اس کی گھگھی بندھ جاتی۔ علی مرتضیٰ کی غیر مناسب باتوں پر اللہ کے حضور معافی کی عرضداشت پیش کرنے میں گھنٹوں سجدہ ریز رہتی اور وہ مسلسل اسے ہر عبادت کو مختصر کرنے کی ہدایت کرتا۔
اس کے انکاری رویّے سے وہ اور چڑ جاتا۔ حنیہ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور علی مرتضیٰ پر اس کی دھتکار و پھٹکار نے ان کے درمیان اک وسیع و عریض خلیج حائل کردی تھی۔ بھلا شیطان اور ایمان کی یکجائی کیسے ممکن ہوسکتی تھی؟ آخر دونوں اپنے خیالات کے اختلافات کے ساتھ واپس آگئے۔
ملکی حالات پہلے ناگفتہ بہ تھے۔ اب ایک نئی آزمائش نے سر اٹھا کر اس ملک کے ہر باشندے کو پریشان کردیا تھا۔ بجلی نہیں تو پانی کا فقدان۔ گیس نہیں تو پیٹرول ملنا۔ جب انرجی کا فقدان ملوں اور فیکٹریوں پر اثر انداز ہونے لگا تو مزدور بے چارے بھوکے اور پیاسے سڑکوں پر نکل آئے۔ اور ملوں کارخانے اور فیکٹریوں پر تالے پڑ گئے۔ تو ان کے مالکان پر بھی عذاب ٹوٹ پڑا۔ بینک کے قرضے اور ان پر انٹرسٹ نے کمر ہی توڑ دی۔
علی مرتضیٰ بھی اس شکنجے میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ اور اس بے بسی نے اس کی تربیت کے ۔۔۔ چھپے ہوئے پہلوؤں کو اچانک عریاں کردیا۔ انداز گفتگو میں جہالت ٹپک رہی ہوتی۔ بات کرنے سے پہلے بھاری گالی پرانی عادت کی غمازی کرکے حنیہ کو گہری کھائیوں میں گرادیتی۔
پیشانی پر پھیلی ہوئی ان گنت شکنوں میں پریشانی کم رعونت اور قہر نمایاں ہوتا۔ دونوں بیٹے پہلے ہی باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اخلاقیات و اخلاص کے دائرے سے نکل چکے تھے۔ رہی سہی کسر اب پوری ہوگئی تھی۔
حنیہ کی راتوں کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ اور دوا کے استعمال کے باوجود ڈیپریشن بتدریج بڑھتا گیا۔ علی مرتضیٰ نے بھی خود کو گھر میں بند کرلیا۔ گھنٹوں زندگی کی اس انہونی ٹریجڈی پر سر کھپاتا۔ غصے میں ڈانٹتا، پیٹتا، گالیاں دیتا، شراب کے نشے میں دھت رہتا لیکن اتنی بڑی ناکامی کا سامنا کرنے کے باوجود اس نے سبق نہ سیکھا تھا کہ سب تقدیر کا لکھا ہے۔ وہ نہ تو پہلے اپنے روزی و رزق کا ذمہ دار تھا نہ ہی اب ہے۔ وہ اس حقیقت کے سامنے جھکنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ تمام ملبہ حنیہ کی عبادت پر گرتا۔ اس کے حج کرنے کو قصوروار ٹھہراتا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کا حج قبول کرلیا ہوتا تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ وہ اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کرتی مگر اس پر رتی بھر اثر نہ ہوتا۔
اب اس سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا تھا کہ تمام فیکٹریوں کو سیل کرکے بینک کو قرضے کی رقم واپس کرکے اپنے اور غیروں کے سامنے سرخرو ہوجائے مگر اتنا بڑا فیصلہ کرنا اتنا آسان تو تھا نہیں۔ دن گزرنے کے ساتھ صحت گرنے لگی۔ نقاہت اور لاغرپن اس کی چال ڈھال سے عیاں ہونے لگا۔
آمنہ جب تک اس کے گھر پہنچی۔ وہ حنیہ کی بے رخی کو پریشانی کا نام دے کر خاصی مضطرب ہوگئی تھی۔ وہ داخلی دروازے کے پاس دیر تک کھڑی سوچتی رہی کہ اندر جایا جائے یا چپکے سے واپس مڑ جائے۔

☼ ☼ ☼

آمنہ نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ گھٹا ٹوپ اداسیوں اور مایوسیوں نے اس کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ وہ ایک ہی سوال کیے جارہی تھی۔
"حنیہ کچھ بتاؤ گی تو مجھے رونے کی وجہ معلوم ہوگی۔ ایسا کیا ہوگیا؟"
"ہم لٹ گئے اور تمہیں خبر تک نہیں؟ کیسی دوست ہو میری۔" وہ چیخ کر بولی۔
"میں نے کچھ ماہ قبل سنا تھا کہ تم اور بھائی صاحب حج کرکے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتی۔ یار گاؤں میں رہتی ہوں وہاں کی پالیٹکس کے بکھیڑوں میں ہی زندگی گزر گئی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔
"بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟"
"تم کس دنیا میں رہتی ہو۔ بھوک ننگ اور بیماری ہمارے ملک کا مقدر بن چکی ہے اس وقت امراو غربا سب برابر ہوچکے ہیں۔" حنیہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔
"یہی تو ہمارا دین فرماتا ہے۔ اگر ہم برابری کا سلوک روا نہیں رکھیں گے تو پھر نیلی چھت والا خود انصاف کرے گا۔ سو اس نے اپنے جلال کی ہلکی سی جھلک ہمیں دکھا کر سبق سکھانے کی کوشش تو کی ہے۔ چلو بیٹھو تو چائے پیتے ہیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔" وہ قدرے سنبھل گئی تھی۔
اسی اثنا میں میڈ جوس لے کر حاضر ہوگئی۔ وسیع و عریض لاؤنج میں اس شدت کی سردی میں بھی گرمی محسوس ہورہی تھی۔ گیس نہ سہی، امیروں کے لیے ایسی کون سی مشکلات تھیں کہ گیس کا بدل نہ ڈھونڈ لیتے۔ بجلی سرے سے غائب تھی۔ مگر گھر روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ نوکروں کی اک فوج آگے پیچھے اپنی ڈیوٹی نبھا رہی تھی۔ گیراج میں چار عدد گاڑیاں، مرسڈیز، لینڈ کروزر، ہنڈا اور ٹیوٹا کرولا امارت کی نشاندہی کررہی تھیں تو پھر اتنا رونا دھونا کس بات کا۔
آمنہ سوچ میں پڑ گئی۔
"آمنہ میں تمہاری فیلنگ کو جان سکتی ہوں۔ سب کچھ چلے جانے کا مجھے دکھ ہے نہ ہی پشیمانی ہے۔ بس مجھے فکر ہے علی مرتضیٰ کی۔ اس نے تو دل کو ہی لگالیا ہے یہ صدمہ۔ لگتا ہے کسی حاسد کی نظر ہی کھا گئی ہمیں۔ بیٹے کی ناگہانی موت کا زخم ابھی بھرا نہیں تھا کہ نئی آزمائش نے گھیر لیا۔ مجھے ان پر رحم کے ساتھ غصہ بھی بے پناہ آتا ہے۔ مگر اپنے اندر ہی اندر اس کو دبا لیتی ہوں۔" وہ اسے دیکھتے ہی پھٹ پڑی تھی۔
"آمنہ میرا گھر جنت کا گہوارہ تھا بس کہیں میں غلطیوں پر تھی تو کہیں وہ۔ گھر کا شیرازہ ہی بکھر کر رہ گیا۔ دولت تو ہاتھوں کی میل ہے آمنہ آج ہے تو کل نہیں۔ اس کے جانے کا کیا غم؟ مجھے دکھ اور پچھتاوا تو اپنے دل کے ٹکڑے کے چلے جانے پر ہے۔ جس کی واپسی کی امید اور توقع ہی نہیں۔ خدا کا شکر ہے ہم تو ابھی سروائیو کررہے ہیں ہمارے دوست احباب کی عبرت ناک حالت کو دیکھ کر بھی علی خدا کا شکر ادا نہیں کرتے۔ میں نے جاب چھوڑ کر اپنا وقت بچوں کے ساتھ اور گھر میں گزارنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ مگر میں نے علی کی تسلی و تشفی کے لیے اپنے ارادوں کو بدل لیا۔ میں ہر طریقے سے ان کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ لیکن سب بے سود۔ تم انہیں دیکھو گی تو پہچان نہ پاؤ گی ذہنی مریض لگتے ہیں۔"
"کہاں ہیں بھائی صاحب؟" وہ تجسس بھرے لہجے میں بولی۔
"وہ آگئے۔" علی مرتضیٰ کو آتے ہوئے دیکھ کر حنیہ مسکرا کر بولی۔
"ارے آمنہ تم کیسے رستہ بھول گئیں؟" علی نے اس کے قریب آکر کہا اور سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور حنیہ کو غور سے دیکھ کر بولا۔
"تم سہیلی کو پاکر بڑی خوش نظر آرہی ہو۔ دراصل میں اسے بہت برا لگنے لگا ہوں۔ یہ دولت بڑی عجیب شے ہے۔ ہاتھ میں ہے تو اس کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا۔ جب یہ دغا دے جاتی ہے تو ہر رشتے کی وفا اور ایثار کا رچایا ہوا ڈھونگ کھل کر سامنے آجاتا ہے حتیٰ کہ بیوی اور اولاد میں بھی نفرت اور حقارت عود آتی ہے یہ الو کی پٹھی جو خود کو وفا کی دیوی ہونے کا دعوا کرتی تھی پیار و ایثار کی پتلی بن کر مجھے بے وقوف بنانے میں ماہر تھی۔ میری کم مائیگی پر میرے دل و دماغ سے ایسے نکل گئی جیسے بند مٹھی سے ریت۔ جس کے بکھر جانے کی خبر تب ہوتی ہے جب اس کی ضرورت محسوس ہو۔" حنیہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ سراسر اول فول بک رہا تھا جبکہ اس نے اپنی بیماری اور دکھوں میں بھی اس کو نہیں چھوڑا تھا۔ اللہ سے لو لگانے

کا مقصد اس سے علیحدگی ہرگز نہ تھی۔ بلکہ اس کی قربت کی چاہ حد درجہ بڑھ گئی تھی۔

اس وقت اس کے تمام ٹھوس دلائل اور باتیں رائیگاں جاتیں۔ اس لیے وہ خاموشی سے نگاہیں نیچی کرکے بیٹھ گئی۔ آمنہ نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ مگر بات گھوم پھر کر حنیہ پر آجاتی۔ نجانے کتنی ہی شکایتوں اور شکووں کی فہرست آمنہ کے سامنے کھل چکی تھی۔ حنیہ کے صبر کا پیمانہ ایسا لبریز ہوا کہ وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی بے ہوشی میں چلی گئی۔ آمنہ پریشانی میں چیخ اٹھی۔

"یہ روز کا معمول ہے اس کا۔ ابھی ہوش میں آجائے گی۔ فکر کی بات نہیں" وہ نفرت سے بولا۔

"سب جذباتی ہتھکنڈے ہیں۔"

"علی بھائی! آپ تو ایسے کبھی نہ تھے۔" آمنہ حیرت سے بولی۔

"بس بہت سال بے وقوف بنے رہے ہم اس مکار کے ہاتھوں۔" نفرت بدستور قائم تھی۔

"کیا ظلم کردیا ہے اس نے۔" وہ تذبذب میں بولی۔

"پہلے اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔ بعد میں اس موضوع پر بات کریں گے۔"

"ابھی ہوش میں آجائے گی۔ فکر مت کرو۔" وہ روکھائی سے بولا۔

کافی دیر سے میڈ اس کے ہاتھ پاؤں رگڑ رہی تھی۔ آمنہ نے منہ میں چمچے سے پانی ڈالا تو حنیہ نے ہلکی سی جنبش کی۔

"حنیہ۔" آمنہ نے اسے تڑپ کر آواز دی۔ تو اس نے نیم وا آنکھوں سے گردوپیش کو سر گھما کر دیکھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

"اپنے گھر میں اپنی جنت میں۔" آمنہ نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے نہایت اپنائیت سے کہا۔

"یہ دیکھو علی بھائی کتنے فکر مند ہو رہے ہیں۔ ہوش میں آؤ۔" اس نے بے یقینی سے شوہر کی طرف دیکھا۔

جس کے چہرے پر فکر مندی کی ہلکی سی جھلک بھی نہ تھی۔

"میری تمام پریشانیوں اور ناکامیوں کا سبب یہ عورت ہے۔ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ اس کی وجہ سے میں ذلیل و خوار ہو کر رہ گیا ہوں۔ اب یہ حال ہے کہ نہ اپنے منہ لگاتے ہیں نہ ہی غیروں کو اپنا سکا ہوں۔ رشتے پہلے ہی اس پر قربان کردیے۔ رہی سہی کسر اب نکل گئی۔" وہ مسلسل بولے جارہا تھا۔

"اس پاگل نے میری دوست کا کیا حشر کردیا ہے۔" آمنہ نے دل میں سوچا۔

"یہ بندہ ہے ہی بے حس، بے پروا اور ناکامیوں کا تمام ملبہ بیوی پر ڈال کر اسے زندہ درگور کرنے والا۔ حنیہ اس ماحول میں زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں اس کے لیے کیا کرسکتی ہوں؟ محلوں میں آباد لوگوں کی مسرت و شادمانی کی قیمت بہت اونچی ہے۔ کل کی آس کا دخل ہے نہ حالات سے جنگ و جدل کرنے کے ہتھیار موجود ہیں۔ انہیں آسائشوں اور راحتوں نے کس قدر محتاج اور کمزور کردیا ہے کہ اس کی کمی کا تصور ہی پاگل اور جنونی بنائے جارہا ہے۔ فقط دولت کے پجاری یہ لوگ کتنے بدقسمت ہیں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی نہتے۔" وہ اس کی باتوں سے پژمردہ نظر آنے لگی۔

"تم کس سوچ میں پڑ گئی ہو، چند دن اس گھر میں گزارو عادی ہوجاؤ گی۔" علی تلخ لہجے میں بولا۔

"میں یہاں ایک منٹ بھی رکنا نہیں چاہوں گی۔" وہ بھی دوبدو بولی۔

"تمہاری اس بات پر پورا یقین کرتا ہوں۔ یہ میرا ہی حوصلہ اور ہمت ہے کہ اس جہنم میں زندگی گزار رہا ہوں۔" وہ اس کی تلخی کو نظر انداز کرکے بولا۔

"یہ جہنم آپ کو ہی نصیب ہو۔ میں حنیہ کو اپنے ساتھ اپنے گاؤں لے کر جارہی ہوں۔ جب تک اللہ تعالیٰ آپ کو دولت واپس نہیں دیتا، مرا ہوا بیٹا زندہ نہیں ہوجاتا دو بیٹے راہ راست پر نہیں آجاتے تب تک حنیہ میرے پاس رہے گی۔"

"بہت بڑی ذمہ داری اٹھانے جارہی ہو ذرا سوچ

سمجھ کر فیصلہ کرو۔ تمہارے ساتھ اس کا رشتہ تو خون کا نہیں دنیاداری کا ہے۔" وہ چڑ سا گیا تھا۔

"اس کی غیر موجودگی میں آپ کی ہر کھوئی ہوئی خوشی کی واپسی کے امکان ہیں نا۔ یہ آپ کے لیے منحوس ثابت ہوئی۔ سبز قدم ایسی کہ آپ کو کوڑی کوڑی کا محتاج کردیا۔" لہجہ طنز سے لبریز تھا۔

"اس میں شک نہیں۔ پہلے والا علی مرتضیٰ یاد کرو اور آج والا اک حقیقت بن کر تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ زمین و آسمان کا فرق ہے۔" وہ اناپ شناپ بکے جارہا تھا۔ غیر مناسب اور غیر موزوں دلائل۔ جن کی کوئی تک ہی نہ بنتی تھی۔ آمنہ خاموش ہوگئی اس کے پاس اس سرپھرے اور پاگل انسان کے لیے نہ کوئی نصیحت تھی نہ ہی کوئی منطق تھی۔

اس نے غم سے نڈھال اور کمزوری سے ڈولتی ہوئی حنیہ کو سہارا دیا اور باہر نکل آئی۔ ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

"مجھے کہاں لے جارہی ہو؟" وہ نقاہت سے بولی۔

"اپنی حویلی۔ جہاں تم سکون سے کچھ دن گزار سکو گی۔" وہ اس کے ہاتھ پر پیار کرتے ہوئے بولی۔

"جہاں تم ہر لحاظ سے بے قصور تصور کی جاؤ گی۔"

"حویلی۔۔۔؟ یعنی گاؤں، بھلا اس مشکل وقت میں علی کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ کیسے جاسکتی ہوں۔ ہم دونوں تخت سے تختے تک کے سفر میں برابر کے شریک ہیں۔ تو آج اس شراکت کے صدقے ہم ایک ہیں آمنہ قیامت تک کے لیے۔" لہجے میں علی کے لیے بے پناہ ہمدردی تھی۔

"تمہیں بھائی صاحب پاگل قرار دے چکے ہیں۔ تم تندرست ہونے کے بعد بمعہ ہوش و حواس کے بصد شوق اپنے گھر واپس آجاؤ گی ان شاءاللہ۔" وہ پیار بھرے لہجے میں بولی۔

"نہیں آمنہ میں نے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر ہر حال میں ان سے جینے اور مرنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں عہد شکن نہیں کہلوانا چاہتی۔ میں علی کی منکوحہ اور ان کے بچوں کی ماں ہوں۔ ان کی مورل سپورٹ تو بن سکتی

ہوں نا اس وقت نہیں آمنہ منتظر رہنا ایک دن تم سے ملنے کے لیے تمہاری طرف آؤں گی۔" وہ اسے تھپکی دیتے ہوئے بولی۔

"مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔" آمنہ نے سرد مہری سے کہا۔

"زندہ رہوگی تو مجھ تک رسائی ہوگی نا۔"

"میں علی کے لیے ہر قیمت پر زندہ رہوں گی۔ اور اس دن کے آنے کی دعا کروں گی جب تختے سے واپسی کے سفر کی شروعات ہوجائے گی۔ اور علی اپنی تمام تر رعنائیوں اور کامرانیوں کے ہمراہ تخت پر براجمان ہوجائیں گے۔ تب تک میرا انتظار کرنا۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"مطلب یہ ہوا کہ ایک لاابالی شریر اور لاپروا لڑکی مشرقی بیوی کے روپ میں شوہر کو مجازی خدا، دیوتا اور شہنشاہ عالم تسلیم کرچکی ہے۔ یعنی داسی بن گئیں تم۔" وہ حیرت و اشتیاق سے بولی۔

"ہاں میرا یہ رتبہ بہت عظیم الشان اور قابل ستائش ہے آمنہ۔ تم نے شادی کی ہوتی تو تمہیں علم ہوتا کہ تخت پر تو میں ان کی شریک رہی۔ خوب مزے لوٹے بے پناہ عزت و تکریم ملی۔ آج تختے کی باری پر انہیں تنہا چھوڑ دوں۔ یہ بات تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے آمنہ۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"مجھے علی سے بے پناہ محبت ہے۔ ان کے بغیر میرا سانس گھٹ جائے گا۔ جیسے مچھلی بن آب کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ بالکل اسی کے مصداق۔"

"تم نے تو پڑھ لکھ کر چولہے میں جھونک دیں اپنی تمام ڈگریاں۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ تمہارے جیسی بزدل لڑکیاں ہی تو جوتے کھاتی ہیں جانم۔" وہ خفگی سے بولی۔

"میں تمہارے ان خیالات سے اتفاق نہیں کروں گی۔ عورت کی تعلیم اور برسر روزگار ہونے کے مقصد کو خود غرضی اور مفاد پرستی کا نام دینا بہت بڑی توہین اور اہانت ہے۔ تعلیم سے تو زندگی کی گاڑی کو احسن طریقے سے چلانا مقصود ہے۔ ایڈجسٹ منٹ ہر رشتے کی تکمیل کی اہم ضرورت ہے آمنہ۔ ہم چار لفظ پڑھ کر شوہر کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے میں اپنی ہتک اور کمتری کا گمان کیوں کرنے لگتے ہیں۔ تعلیم ہمیں اس احساس سے نجات دلانے کا کام دیتی ہے۔ ہم میں خود اعتمادی اور شوہر پر بھروسہ رکھنے کا سبق سکھاتی ہے۔ نشیب و فراز اور مدوجزر میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہر طرح کی مشکلات اور آزمائشوں سے بخیر و خوبی نکلنے کی راہ کا تعین کرتی ہے اور ایک ساتھ جینے مرنے کی تلقین کرتی ہے۔ علی نے بھلے وقتوں میں مجھے آسمان کا ستارا بنا کر میری پرستش کی۔ اور آج بھی وہ اسی ستارے کی لو میں اپنے رستے کا چناؤ کرتے ہیں۔ یہ برا وقت نہایت عارضی اور وقتی ہے ان میں ایمان کی پختگی آنے تک، یہ سفر میں انہی کے ساتھ طے کروں گی۔ تم نے مجھے راستہ دکھایا ہے کہ میں اپنی ہمت کو بحال کر کے ان کے منتشر اور متزلزل ایمان کو یکجا کرنے کی کاوش کر سکوں۔

وہ سمجھانے کے انداز میں خاصی مستحکم لگنے لگی تھی۔ چہرے پر مایوسی کی سیاہی اور اداسی کی مردنی میں کمی صاف نظر آرہی تھی۔

"میں تمہاری تمام منطق کو غلط اور بے بنیاد قرار دیتی ہوں۔ تم سراب کے پیچھے بھاگ کر اپنی زندگی کے قیمتی ماہ و سال ضائع کر رہی ہو۔ علی بھائی سر تا پا بدل چکے ہیں۔ انہیں تم سے نفرت ہے یار۔"

"میں یہ بھی مانتی ہوں۔ پھر بھی اپنی جنت اور اس میں رہنے والے مکینوں کو یوں تنہا چھوڑ کر جانا عورت کے ماتھے کا کلنک ہے۔ میں نے کہا نا تم نہیں سمجھو گی۔ یہ وہ رشتہ ہے جس کی گہرائی، مضبوطی اور پائیداری کا تم اندازہ ہی نہیں لگا سکتیں۔ وہ اسے کنوینس کرنے کی کوشش میں تھی کہ علی پیچھے کھڑا تمام باتیں سن کر سامنے آگیا۔ نہایت ملائمت سے بولا۔

"آمنہ اندر چلو۔ میں تمہارا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے میرے جہنم کدہ کو جنت میں بدل دیا۔ ہم دونوں کا سفر تختے سے تخت کی جانب رخ موڑ چکا ہے۔"

اور اس نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ آگے بڑھ کر حنیہ کو گلے لگا لیا۔

"ہم عمرے پر جائیں گے اور اللہ کے حضور اپنی تمام تر غلطیوں کی معافی مانگنے میں آپ میری سفارش بھی کریں گی اور میری ہمت بڑھانے میں میری مدد بھی کریں گی۔"

حنیہ کی آنکھیں جو کرب کے آنسو بہایا کرتی تھیں۔ آج خوشی کے آنسوؤں سے اشکبار تھیں اور آمنہ اس حسین امتزاج پر فتح مندی سے مسکرا رہی تھی۔

☼ ☼

عنیزہ نوشین

محبت اور غرور

"میں تمہیں قتل کرنے پر مجبور ہوں مگر میں اسے قتل نہیں قربانی سمجھتا ہوں۔" اوتھیلو اور ڈیسڈی مونا شیکسپیئر کے دو کردار اس وقت پردہ اسکرین پر نمودار تھے۔ ڈیسڈی مونا کی خوب صورت آنکھوں میں خوف بھر گیا۔

"مگر میرا جرم کیا ہے میرے آقا؟" اس کی مترنم آواز میں خوف ہلکورے لے رہا تھا۔

"اپنا جرم یاد کرو اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو!" اوتھیلو گویا ہوا۔

"میرا واحد جرم یہ ہے کہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔۔۔"

مونا کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی۔ صویدہ حیدر سے ضبط کرنا مشکل ہو گیا تو وہ چپکے سے باہر نکل آئی۔

"اے خدایا! مجھے سکون اور اطمینان قلب بخش دے اور میری محبت کو کبھی رسوا نہ کرنا۔" اوتھیلو اور ڈیسڈی مونا کے انجام کی طرف بڑھتے ڈائیلاگز اس کے دل کو چیر رہے تھے۔ ڈرامیٹک سوسائٹی کے تھرو یہ ڈرامہ زلزلہ زدگان کی امداد کے لیے پیش کیا جا رہا تھا۔

"یہ بیٹھے بیٹھے تم کس مراقبے میں چلی جاتی ہو؟ اتنا اچھا کلائمکس چل رہا تھا مگر مجھے تمہاری وجہ سے اٹھنا پڑا۔ ویسے یار۔۔۔ مان گئی۔ کیا جاندار ایکٹنگ کی ہے لٹریچر والوں نے، بالکل حقیقت کا سا گمان ہوتا ہے۔" وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی کہ اس کی نظر صویدہ پر پڑی جو خود کو کسی حد تک کمپوز کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

"چیئر اپ یار! چلو کیفے ٹیریا چلتے ہیں۔۔۔" انزلہ نے اس کا ذہن بٹایا تو وہ چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی۔ گھر واپسی تک اس کی یہی کیفیت رہی اور ایسا اکثر اس وقت ہوتا جب اس ہرجائی کی یاد اس کے دل میں پناہ گزیں ہوتی۔

اس وقت بھی وہ "نسخہ ہائے وفا" تھامے، جانے کن سوچوں میں غرق تھی کہ اسے خلود کی آمد کا پتا بھی نہ چل سکا۔

"کیا ہو گیا ہے آپی آپ کو؟ جب سے گاؤں سے واپسی ہوئی ہے، تب سے اسی طرح اداس و غمگین رہتی ہیں۔ کیا مجھ سے بھی شیئر نہیں کریں گی؟" صویدہ کے ساتھ ساتھ ماحول بھی گہرے غم کا غماز تھا۔ "دشت تنہائی" اسٹیریو میں گونج رہی تھی۔ پردے گرے ہوئے اور اتنی گرمی میں اے سی آف کیے بیٹھی صویدہ پر اسے حیرت کے ساتھ ساتھ دکھ بھی ہوا۔

"بعض دکھ نہ کہنے ہی بہتر ہیں۔ اکثر اوقات ہم دکھوں کو شیئر کریں تو یہ مزید تشنگی پیدا کرتے ہیں اور تم تو ابھی چھوٹی ہو سو میں تمہیں مبتلائے غم صویدہ نہیں دیکھ سکتی۔" اس نے پھیکی ہنسی کے ساتھ اسے ٹالا۔

"اچھا! اب آپ باہر نکلیں۔ ہم لوگ ڈبلز کی ایک گیم لگا رہے ہیں اور نوشیرواں سے آئس کریم کی شرط لگی ہے۔" وہ اسے وارن کرتی جا چکی تھی اور صویدہ پھر سے "نسخہ ہائے وفا" میں کھو گئی تھی۔

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

☼ ☼ ☼

پورے اسٹیشن پر اداسی، ویرانی اور خزاں کا ڈیرا تھا۔ سردی میں ٹھٹھرتے خشک پتے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ پٹڑی کے اس طرف کھیتوں کا لامحدود سلسلہ تھا۔ کہیں کہیں شیشم کے ٹنڈ منڈ درخت براجمان تھے۔ صبح کے چھ بجے، دن کا سا سماں تھا۔ ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ جانوروں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آوازیں بھی دور سے سنائی دے رہی تھیں۔ فضا پر عجب سا کیف طاری تھا۔ وہ کپکپاتی ہوئی پاپا کے پیچھے چھپ گئی کہ یکایک ایک کوچوان ان کی طرف بڑھا۔

"بابو! کتھے جانا ایہہ۔ میری گوری جہازاں توں وی ودھ کے ایہہ۔ ایہہ تہانوں منٹاں وچ پہنچا دیوے گی۔"

(صاحب! کدھر جانا ہے۔ میری گوری جہازوں سے بھی بڑھ کر ہے یہ آپ کو منٹوں میں مطلوبہ جگہ تک پہنچا دے گی۔)

پنجابی لہجے میں بولتا وہ ان سے سوال کر رہا تھا۔ پاپا مسکراتے ہوئے پتا بتانے لگے۔

"او جی تسی چودھریاں دے پروہنے او۔۔۔ تے فیر ساڈے وی پروہنے ہوئے۔ ہن تسی ناں بیہ جاؤ تے گوری دا کمال ویکھو۔"

(ارے تو آپ چوہدری کے مہمان ہیں۔ تو پھر ہمارے بھی مہمان ہوئے۔ اب آپ جلدی سے سوار ہو جائیں اور گوری کا کمال دیکھیں۔۔۔) وہ خوشی سے بولا تو پاپا صویدہ کو لے کر تانگے میں سوار ہو گئے۔

جوں جوں تانگہ چل رہا تھا ٹک ٹک کی آواز گونجتی جا رہی تھی اور صویدہ حیدر، سردی میں ٹھٹھرتی ہوئی اس آواز کو انجوائے کر رہی تھی مگر جب کہیں کوئی ڈھلوان سطح آتی تو بے اختیار ایک چیخ اس کے گلے سے برآمد ہوتی۔ خدا خدا کر کے یہ لوگ حویلی پہنچے۔

بڑے شاندار طریقے سے ان کا استقبال کیا گیا۔ کھانے کے بعد وہ لوگ آرام کی غرض سے اٹھ گئے۔ صویدہ کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اب تک محض کتابوں میں ہی گاؤں وغیرہ کے بارے میں پڑھا تھا مگر حقیقی خوشی اسے اپنے آبائی گاؤں میں آ کر ہوئی جو کہ پنجاب میں تھا۔

رات کے کھانے پر تمام مردوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ تایا ابا چھوٹے تایا چچا جان اور ان کی فوج ظفر موج سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ جب تمام بزرگ مل کر بیٹھے تو نوجوانوں نے بھی اپنی محفل الگ سجالی۔ دہکتی انگیٹھیوں اور کشمیری چائے کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔

"ایسی چائے میں نے زندگی میں کبھی نہیں پی۔۔۔" چائے کی چسکی لیتے ہی صویدہ اپنی فیلنگز کو روک نہ سکی۔

"اسے کشمیری چائے کہتے ہیں۔ ویسے اس کا قہوہ بھی بن سکتا ہے۔ یہ ہمارے ہاں اسپیشلی پی جاتی ہے۔" چھوٹے تایا کی نمرہ نے جواب دیا اور ذرا کان کے نزدیک ہو کر دھیرے سے کہا۔

"اس سے عمر اور خوب صورتی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہم لڑکیاں خصوصی طور پر اس کا اہتمام کرتی ہیں۔" دوسروں نے بھی اس کی تائید کی۔

"بھئی! تم لوگ سب کا تعارف تو کروا دو۔ بعد میں بھلے سے باتیں کرتی رہنا۔۔۔" ایک لڑکی نے کہا جو ان سب میں بڑی دکھائی دے رہی تھی۔

"میں خود ہی کروا دیتی ہوں۔" جب کسی کو بھی اس پر مائل نہ دیکھا تو خود ہی شروع ہو گئی۔

"مجھے کہکشاں کہتے ہیں۔ تمہارے تایا ابا کی بیٹی ہوں اور خیر سے دو معصوم معماروں کی والدہ ہونے کا شرف بھی ہمیں حاصل ہے۔" فخر سے کہا گیا۔

"اور ہمارے علاوہ ہمارے لاڈلے، اکلوتے بھیا جانی ہیں اور یہ جو تمہارے ساتھ گھسی بیٹھی ہے۔ یہ نمرہ ہے۔ چھوٹے تایا کی بیٹی اور وہ جو سامنے آنکھیں مسلتی نظر آ رہی ہے۔ یہ اس کی بہن ثمرہ ہے اور یہ دونوں دو عدد بھائی رکھتی ہیں۔ پھر چاچو رہ جاتے ہیں۔ جن کی صاحبزادی ثمرہ کے ساتھ بیٹھی ہماری ٹوہ میں ہے۔ وہ رمشہ ہے۔ اس کے نام کا مطلب پھولوں کا گلدستہ ہے ان کا ایک عدد بھائی ہے۔ باقی خواتین جن میں دادی ماں، اماں، تائی ماں اور چچی ہیں، ان سب سے تو تم مل ہی چکی ہو۔ اب میرے خیال میں تم ہم سب کو جان گئی ہو تو پھر ہماری دوستی پکی۔" اس نے تائید چاہی تو صویدہ نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے چند دن عزیز و اقارب کے ہاں دعوتیں کھاتے گزرے کہ ایک دن پاپا نے واپسی کا قصد کر لیا۔

"ارے بیٹا! اس نے تو ابھی تک پورا گاؤں بھی نہیں دیکھا اور ابھی بھی کتنے ہی لوگ تمہیں اپنے ہاں بلانا چاہ رہے ہیں۔" دادی ماں نے پاپا سے کہا۔

"مجھے تو ایک اہم میٹنگ اٹینڈ کرنا ہے اس لیے میں مزید نہیں رک سکتا۔ اگر صویدہ رکنا چاہتی ہے تو کوئی زبردستی نہیں۔" پاپا نے فیصلہ صویدہ پر چھوڑ دیا جو واپسی کے نام پر ہی اداس ہو رہی تھی۔ ابھی تو اس نے پورا گاؤں بھی نہیں دیکھا تھا۔

"پاپا! آپ ایک دن اور رک جائیں تاکہ میں گاؤں دیکھ لوں، پھر اکٹھے چلیں گے۔" صویدہ نے پاپا کو مناتا

چاہا مگر وہ بات گول کر گئے اور یوں صویدہ محض شوق میں رک گئی۔

☼ ☼ ☼

حویلی میں تو عید کا سا سماں تھا۔ تمام کزنز صویدہ کے آگے گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔ وہ انہیں پہلے ہی دن سے اچھی لگی تھی۔ جینز میں ملبوس گلے میں اسکارف لپیٹے۔ وہ ان سب کے لیے دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ اہم بھی ہو گئی تھی۔ بغیر کسی تزئین و زیبائش کے اور یورپین لک میں وہ خاص لگتی۔ وہ بھی ان میں جلد ہی گھل مل گئی تھی اور اس میں بڑا عمل دخل صویدہ کی سادہ طبیعت کا بھی تھا۔

آج کا تمام دن گاؤں کی سیر کے لیے مخصوص تھا۔ اس نے بڑے جوش و خروش سے غسل کرنے کی تیاری کی اور جب جینز میں ملبوس باہر نکلی تو بے اختیار ٹھٹک گئی اور جب مقابل کی نظر اٹھی تو اس کی آنکھوں میں بھی حیرانگی تھی جو چند منٹ میں ناگواری میں بدل گئی۔ وہ بہت بولڈ سہی مگر اس وقت ایک اجنبی کی کاٹ دار نظروں کے سامنے اس لباس میں جھجک محسوس کر رہی تھی۔ اسی اثنا میں دادی ماں نے اسے دیکھا۔

"ارے... صویدہ رک کیوں گئیں، آؤ نا! اور تم کہاں جا رہے ہو؟" ساتھ ہی اجنبی شخص سے سوال کیا۔

"میں ذرا ڈیرے پر جا رہا ہوں۔" مختصر سا جواب دیتا وہ شخص رخصت ہوا۔

"یہ تمہارے تایا کا بیٹا اذن ہے۔ شہر میں کسی کام کی غرض سے گیا تھا۔ آج ہی واپسی ہوئی ہے۔ تم بتاؤ! تیار ہو تو لڑکیوں کو بلواؤں۔" دادی ماں نے پوچھا۔

"ج، جی جی۔" پھنسی پھنسی آواز نکلی مگر اس کی ساری گھبراہٹ سرسبز کھیت اور اونچے لمبے درخت دیکھ کر دور ہو گئی۔ کینو توڑ توڑ کر کھانے کا مزہ اسے پہلی بار آ رہا تھا۔ وہ بہت ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی اور جب ٹھنڈی ندی میں پیر ڈالے تو فورا" ہی نکال لیے جبکہ باقی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس دیں۔

"اتنی سردی میں کوئی پاگل ہی ہو گا، جو یہ حرکت کرے گا۔" صویدہ نے ان کی ہنسی کے جواب میں کہا۔

"ارے، ہم لوگ تو بچپن میں اس میں نہاتے بھی تھے اور اب بھی ہم جیسے مضبوط اور سخت لوگ اس ٹھنڈ ونڈ سے نہیں ڈرتے۔" نمرہ نے فخر سے گردن اکڑا کر کہا۔

"محترمہ! ذرا گردن نیچی کر لیں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ ٹوٹ ہی جائے۔" اس کا یہ کہنا تھا کہ تمام لڑکیاں شور مچانے لگیں۔

"چلو بھئی! بچیو حویلی سے پیغام آیا ہے کہ شام کے سائے ڈھلنے سے پہلے ہمیں وہاں ہونا چاہیے۔" بوا شریفاں نے انہیں نہایت ہی سختی سے کہا کیونکہ ان کا ابھی بھی حویلی واپس جانے کو جی نہ چاہ رہا تھا مگر اذن چونکہ آ چکا تھا اور وہ لڑکیوں کا زیادہ دیر باہر رہنا پسند نہیں کرتا تھا سو سب نے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

لڑکیوں کے ساتھ ساتھ چاچو اور چھوٹے تایا کے بیٹوں کے ساتھ بھی وہ کافی فرینک ہو چکی تھی۔ چونکہ گاؤں میں انٹر تک کالج تھا لہٰذا مزید تعلیم کے لیے قریبی شہر سے رجوع کرنا پڑتا۔ نمرہ اور کہکشاں بی اے کر چکی تھیں، جبکہ باقی تمام لوگ ابھی تعلیمی مراحل طے کر رہے تھے۔ چاچو کے بیٹے اسجد سے اس کی خوب چھنتی تھی۔ وہ بھی اتنے کم عرصے میں اس پر جان چھڑکنے لگا تھا۔ وہ اکثر سائنس کے مضامین میں اس کی ہیلپ کروا دیتی کیونکہ گریجویشن وہ سائنس مضامین میں کر چکی تھی اور اب انگلش لٹریچر کا موڈ تھا۔ اس وقت بھی وہ اسجد کو نیوٹن کے لاز سمجھا رہی تھی کہ اذن کی آمد ہوئی۔ نجانے صویدہ کو دیکھ کر وہ اوور ری ایکٹ کیوں کرتا تھا۔ حالانکہ اس کی کبھی بھی اس سے کوئی بات تک نہ ہوئی تھی۔ وہ اسجد سے مخاطب ہوا۔

"اسجد! تمہیں پتا نہیں کھانے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ چلو جلدی سے اٹھو اور دستر خوان پر آ جاؤ۔" اور ساتھ ہی خونخوار نظروں سے صویدہ کو دیکھتا باہر نکل گیا۔

"پتا نہیں کیا پرابلم ہے ان کے ساتھ... حالانکہ مجھے بھی کھانے کا کہہ سکتے تھے۔ نہ جانے میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟" وہ سوچنے لگی اور یہی بات رات کو وہ نمرہ سے کہہ بیٹھی تو جواب میں نمرہ نے بتایا۔

"آپی تھنک! تمہاری ڈریسنگ انہیں ناگوار گزرتی ہے۔ دیکھو نا، ایک تو ماحول اور پھر گھر میں زیادہ تر مرد ہوتے ہیں اور ایسے میں تمہارا اس حلیے میں چلنا پھرنا ہمیں خود اوکورڈ لگتا ہے۔ برا نہیں ماننا۔" ڈرتے ڈرتے اس نے اپنے دل کی بات بھی کہہ کر اس کے تاثرات جانچے۔

"ایکچولی یہ میری روٹین بن گئی ہے اور پھر میں اس میں کمفرٹیبل فیل کرتی ہوں۔ لیکن تم لوگوں کے لیے کوشش کروں گی کہ تمہارے جیسے ڈریسز ہی پہنوں۔" حسب عادت وہ جلد ہی مان گئی اور نمرہ کو اس لمحے اتنی پیاری لگی کہ بے اختیار اس نے صویدہ کی بلائیں لے ڈالیں۔

"تمہیں کس نے کہا تھا کہ اتنے طوفان میں مرنے کے لیے باہر نکلو۔ ایک تو موسم کے تیور اوپر سے ان نازک اندام حسینہ کو ساتھ لے لیا۔ تم میں عقل نام کی ہے یا نہیں؟" وہ غصہ نمرہ پر اتار رہا تھا اور دیکھ صویدہ کو رہا تھا۔

"ایکسکیوزمی! میں نے اسے فورس کیا تھا۔ ایکچولی میں چاہ رہی تھی کہ واپسی سے پہلے اس حسین موسم کا نظارہ کھیتوں میں کیا جائے۔"

صویدہ نے سارا الزام اپنے سر لے لیا اور نمرہ جو موسموں کی دیوانی تھی، تشکر بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اذن نے اس کی بات سنے بغیر واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔ وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔

"ویسے تمہارے یہ کزن محترم، سڑیل ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی ال مینرڈ اور بیک ورڈ سے ہیں؟" صویدہ نے نمرہ سے تائید چاہی۔

"توبہ کرو! اتنے اچھے تو ہیں اور بائی دا وے! آپ کے بھی کچھ لگتے ہیں۔ بلکہ کچھ خاص لگتے ہیں۔" نمرہ نے معنی خیزی سے جواب دیا۔ جبکہ وہ ٹھٹھکی۔

"کیا مطلب؟"

"ک، ک، کچھ نہیں۔" نمرہ یہ کہہ کر چپ ہو گئی۔

"آپ لوگوں کو ذرا بھی احساس نہیں جوان لڑکیوں کو اس موسم میں تنہا باہر جانے دیا اوپر سے ان محترمہ کا حلیہ۔ آئندہ اگر یہی حلیہ ہوا تو میں ان کے باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دوں گا اور تم جو بچی بنی پھرتی ہو۔ اس وقت مجھے انتہائی زہر لگ رہی ہو۔ چلو جاؤ! اور جلدی سے قہوہ بنا کر لاؤ۔ توبہ مجھے تو چھینکیں آنے لگیں۔"

گھر آکر بھی اس کا غصہ کم نہ ہوا اور اماں پر برس پڑا اور جب وہ دونوں باہر نکل گئیں تو مناسب الفاظ میں اماں کو احساس دلایا کہ جب وہ اس حلیے میں باہر نکلتی ہے تو گاؤں کے وہ مرد جو حویلی کی بیٹیوں کو دیکھ کر نظریں جھکا لیتے تھے، وہی اس کو آنکھیں جھپکائے بغیر دیکھتے ہیں۔ لہٰذا فورا" اس کے حلیے پر توجہ دی جائے۔

وہ خود تو زیادہ کنزرویٹو نہ تھا مگر شرع کے برخلاف کام اسے بھی ناگوار گزرتے اور یوں تو اس کے لباس کو خصوصی طور پر تنقید کا نشانہ بناتا اور جب ان کے حوالے سے وہ باہر نکلتی تو اسے بے حد شرم محسوس ہوتی کہ حویلی کی لڑکیاں بغیر چادروں کے باہر کبھی نہ نکلی تھیں اور اندر بیٹھی صویدہ سوچ رہی تھی کہ کیا یہ شخص سائیکی ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کا علاج ضرور ہونا چاہیے۔ صرف لباس کی وجہ سے وہ مجھ سے خار کھاتا ہے۔ اتنا تو وہ جان ہی گئی تھی۔ یہ بھی علم میں آیا تھا کہ موصوف ڈبل ایم اے ہیں اور وہ بھی انگلش لٹریچر میں۔ صویدہ کو تو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

☼ ☼ ☼

روز صبح تائی ماں قرآن حکیم کی تلاوت کرتی تھیں اور ان کی آواز فضا کو پرنور بنا دیتی۔

آج صویدہ کی آنکھ جلد ہی کھل گئی تھی۔ وہ دالان سے ہوتی ہوئی صحن میں آ گئی اور تائی ماں کے پاس بیٹھ کر تلاوت سننے لگی۔ "بیٹا! دوپٹا سر پر لے لو۔" تائی ماں نے کہا تو اس نے بے اختیار شرمندگی سے سر جھکا دیا جبکہ تائی ماں کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ کیا کہہ بیٹھی

ہیں۔ جھٹ انہوں نے اپنے دوپٹے کا آدھا حصہ اس کی طرف بڑھا دیا تو اس نے سر پر لے لیا۔ کمرے سے باہر آتے اذن کے لیے یہ منظر حیران کن تھا۔ وہ طنزیہ ہنسی ہنسا اور سر جھٹک کر باورچی خانے کی جانب چل دیا۔

قرآن حکیم میں کئی ایک مقامات پر مسلم خواتین کو پردے کے احکامات فرمائے گئے ہیں۔ میں تمہیں سورہ النساء کا ترجمہ بھی سناؤں گی تاکہ تمہاری معلومات میں اضافہ ہو۔" تائی ماں نے اس کی دلچسپی دیکھ کر کہا۔

"مگر آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟ یعنی ہم تو صرف قرآن پاک عربی زبان میں پڑھتے ہیں' بغیر کسی مطالب کو سمجھے۔"

"ہمارے دور میں دنیاوی تعلیم سے زیادہ دینی تعلیم پر توجہ دی جاتی تھی اور یہ میرے والدین کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے' جنہوں نے مجھے قرآن حکیم حفظ کروانے کے ساتھ ساتھ تشریح و تفسیر پر بھی توجہ دی۔ اس کے علاوہ دیگر اسلامی کتب بھی میں نے پڑھ رکھی ہیں۔" وہ حیرت سے منہ کھولے تائی ماں کی باتیں سن رہی تھی۔ جب رات کو سونے کی غرض سے لیٹی تو صبح کی تمام باتیں ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔

"واقعی! اذن دستور صحیح کہتا ہے۔ جینز اور ٹاپ کا اسلام میں کوئی بھی تصور نہیں اور میں لیکن مجھے تو آج تک کسی نے نہیں بتایا۔ مما اپنی سوشل ایکٹویٹیز میں مصروف تو پاپا بزنس میں باقی بہن' بھائی بھی اپنی اپنی مرضی کے مالک میں ضرور کوشش کروں گی عمل کرنے کی۔" اس نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا۔

وہ ساری رات سوچتے گزری اور فجر کی اذان نے اس میں نئی قوت بھر دی۔ وہ بستر سے نیچے اتری اور باہر کی طرف چل دی مگر اماں کے کمرے سے آتی آوازوں نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

"اماں! آپ نے سوچ بھی کیسے لیا؟ اس دیسی میم کو میں قطعی پسند نہیں کرتا میں آپ لوگوں کو کیسے سمجھاؤں؟" اذن کی آواز آئی۔

"بیٹا! شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے مگر آہستہ آہستہ تم اسے اپنے ماحول میں ڈھال لینا۔" تایا ابا کی آواز بھی ساتھ ہی آئی۔

"ابا' وہ کوئی موم کی گڑیا نہیں کہ جسے جیسے چاہا موڑ لیا۔ ایک جیتی جاگتی لڑکی ہے اور ویسے بھی آزاد ماحول کی پروردہ ہے۔ شہر کی ہوا اسے راس آچکی ہے' گاؤں کی زندگی اس کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہو گی؟" لہجے میں زمانے بھر کی کاٹ تھی۔

"آخر کچھ تو اہمیت ہے کیونکہ وہ کچھ عرصے سے ادھر ہی ہے اور پھر کیوں نہ محبت ہو گی' آخر یہ اس کی آبائی زمین ہے۔ اس کی اصل۔" ابا نے برہم ہو کر کہا۔

"بہرحال تم اپنی سناؤ۔ اس کی فکر چھوڑو۔ وہ ہمارا مسئلہ ہے۔"

"ابا' میں قطعی راضی نہیں۔ ایک باکردار اور نیک لڑکی میری زندگی میں شامل ہو گی اور جو لڑکی آزاد خیال ہو' میں اسے اپنی زندگی میں کیسے شامل کر لوں۔۔۔" اس کی بات نے تو صویدہ کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔

اندازہ تو اسے ہو گیا تھا کہ بات اسی کے متعلق ہو رہی ہے۔ سو وہ وہیں کھڑی رہی اور آخری بات کے اختتام پر رکی نہیں اور گرتے پڑتے کمرے میں آگئی۔ مارے غصے کے اس کے نتھنے سرخ ہو گئے۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کتنی انسلٹ کی تھی اس شخص نے اس کی۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر اپنی پیکنگ شروع کر دی اور صبح جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ گھر والے اس کے اچانک فیصلے پر حیران تھے۔

"بیٹا! ابھی کچھ دن اور رک جاؤ۔ کماد کی کٹائی ہو جائے پھر چلی جانا۔ لوگ تو دور دور سے بیلنا دیکھنے آتے ہیں۔" دادی ماں نے کہا۔

مگر وہ کسی کی نہ سن رہی تھی۔ مجبوراً انہیں اسے رخصت کرنا پڑا۔

گھر آکر اسے چپ سے لگ گئی۔ سب ہی اس کی خاموشی کا سبب گاؤں سے واپسی سمجھ رہے تھے مگر انزلہ' جو اس کی اکلوتی سہیلی تھی۔ اس سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ تمام بات سن کر اس نے افسوس سے سر ہلایا اور کافی حد تک صویدہ کی دلجوئی میں لگ گئی۔

اسے رہ رہ کر وہ دن یاد آرہا تھا جب پاپا اپنے آبائی گاؤں جانے کے لیے تیار ہوئے تو وہ بھی ساتھ چل دی اور وہاں پہنچ کر جو محبت اسے ملی' اس کی امید اسے قطعی نہیں تھی۔ لیکن ایک شخص جس کا نام اذن دستور تھا اور اس کے تایا ابا کا بیٹا تھا اس سے بیر رکھتا تھا اور جب اس کی باتیں صویدہ کے کانوں میں پڑیں تو اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے اور اگلی بات کیے واپسی کی ٹھانی۔ اس کی باتیں صویدہ کے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھیں۔ وہ اکثر ہی ان الفاظ میں کھوئی رہتی جو اذن دستور نے صویدہ حیدر کی شان میں کہے تھے۔ وہ جتنا انہیں بھلانا چاہتی اتنا ہی وہ اس کے اعصاب پر سوار ہوتے۔

اور اس سے نفرت کرتے کرتے نجانے کب اس کی محبت دل میں آن سمائی وہ جان نہ سکی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ اکثر محبتیں' نفرتوں سے وجود میں آتی ہیں مگر آج یہ قول اس پر سچ ثابت ہوا۔ وہ جتنا اسے بھلاتی' اتنا ہی وہ یاد آتا۔ وہ کسی حد تک نماز کی پابندی کرنے لگی تھی۔ تلاوت قرآن پاک کرنے کی بھی حتی المقدور کوشش کرتی۔ اس نے جینز پہننا چھوڑ دی اور بڑا سا دوپٹا اوڑھتی۔

"بیٹا! میں پچھلے کچھ عرصے سے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ سوچا تھا کہ خود ہی بتادو گی مگر میرا انتظار' انتظار ہی رہا۔ آخر کیا پرابلم ہے؟ جو آپ کو چین نہیں لینے دیتی۔" پاپا نے بالآخر اسے پکڑ ہی لیا۔

"ک۔۔۔ کچھ نہیں پاپا کچھ بھی تو نہیں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کچھ تو ہے۔ جس کی پردہ داری کی جا رہی ہے۔ میں کیسے یقین کر لوں؟ جس لڑکی کے قہقہوں سے در و

دیوار گونج اٹھتے تھے، آج وہ کہیں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ بیٹا، پرابلمز شیئر کرنے سے ہی کم ہوتی ہیں۔" پاپا کے لہجے میں اداسی جھلک رہی تھی۔ آخر کو ان کی لاڈلی بیٹی کا معاملہ تھا وہ اتنے بے خبر نہیں تھے۔

"آخر کچھ تو ہوا ہے؟ یقیناً" گاؤں میں کوئی بات ہوئی ہے۔" وہ قیافہ شناسی کرتے اس کو آرام کا کہہ کر باہر نکل گئے۔ تو صویدہ نے تشکر کا سانس لیا۔ بعض اوقات وضاحتیں دینا، دنیا کا مشکل ترین کام لگتا ہے اور صویدہ کو بچپن ہی سے وضاحتیں دینے سے چڑ تھی۔

"صویدہ یار! کتنی ڈل ہو گئی ہو؟ اب تو تم گیمز میں بھی ہمارا ساتھ نہیں دیتیں اور یہ تمہارے چلّے کو کیا ہو رہا ہے؟ واؤ! اٹس امیزنگ چینج۔" نوشیرواں اور سبکتگین آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئے اور صویدہ کو دیکھ کر ادھر ہی آ گئے۔

سبکتگین گو کہ اس سے بڑا تھا اور خلو اور نوشیرواں چھوٹے مگر بہن، بھائیوں میں کسی بھی قسم کا تکلف نہیں تھا۔ صویدہ میں آئی تبدیلی انہیں بھی چونکا گئی تھی مگر وہ اس کے خود بولنے کے انتظار میں تھے۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے حیدر! آپ کیا سوچ رہے ہیں۔" آمنہ حیدر کے پیچھے جا کھڑی ہوئیں۔

"میں سوچ رہا تھا آمنہ کہ اولاد کا دکھ انسان کو کسی قابل نہیں چھوڑتا۔" وہ دکھ سے گویا ہوئے۔

"میں سمجھی نہیں۔" آمنہ نے کہا۔

"آج کل صویدہ ڈپریس ہے اور میں نے اس سے بات کی تو ٹال گئی۔ میں تو اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ مجھے شک ہے کوئی بات ہے ضرور جب سے گاؤں سے واپس آئی ہے، اس کی یہی کیفیت ہے۔" باپ کے لہجے میں بیٹی کا کرب بول رہا تھا۔

"میرا ارادہ سبکتگین کے لیے چھوٹے بھاجی کی نمو کا ہے۔" انہوں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"حیدر! اگر سبکتگین سے تو پوچھ لیں۔" انہوں نے حیدر کو روکنا چاہا تو انہوں نے جواب دیا۔

"اس سے میں بات کر چکا ہوں۔ دیکھو آمنہ! میں نے ساری زندگی صرف تمہاری مانی۔ اب میں تھک گیا ہوں۔ مجھے اپنی زمین، اپنے پیارے، بہت یاد آتے ہیں۔ میں رشتے مضبوط کرنے کے اقدامات کر رہا ہوں اور دوسرے لفظوں میں اپنی کوتاہیوں کا کفارہ بھی ادا کرنا ہے۔ اب تمہاری ایک بھی نہیں چلنی اور پھر اولاد کی خوشی سے بڑھ کر کیا ہو گا؟ تم صرف ماں نہیں، دوست بن کر سوچو۔" انہیں سوچوں میں چھوڑ کر وہ لیٹ گئے۔

☼ ☼ ☼

وہ دن عام دنوں سے ہٹ کر تھا۔ اجلی اجلی صبح بہار کی نوخیز کلی معلوم ہو رہی تھی۔ فضا میں عجب سی مستی طاری تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ ماحول کو تابناک بنا رہی تھی۔ کیاریوں میں پھول اپنے جوبن پر تھے۔ امرود اور جامن کے پیڑ عجب انداز میں مسکا رہے تھے۔ نیم، کیکر اور آم کے درخت بہار کی صبح کو خوش آمدید کہہ رہے تھے مگر اس کا دل بس ایک ہی لے میں دھڑک رہا تھا۔

فجر کے بعد تسبیح لے کر وہ لان میں ہی آ گئی اور ننگے پاؤں گھاس پر چلنے لگی، جس سے جسم کو تراوٹ محسوس ہو رہی تھی مگر آنکھوں کی تراوٹ تو محض ایک ہستی کے انتظار میں تھی۔ اداس اور خالی خالی آنکھوں سے وہ آسمان کو تک رہی تھی کہ یکایک بیرونی گیٹ کھلا اور ایک گاڑی زن سے اندر داخل ہوئی اور اس سے برآمد ہونے والی ہستیوں نے اسے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

"محترمہ! ہم کوئی جن بھوت نہیں، جو تم فریز ہو گئی ہو، ذرا تمیز لحاظ چھو کر بھی نہیں گزرا۔" نمو غیرت دلانے کی کوشش میں تھی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور بغیر کسی جنبش کے اماں اور تایا ابا کے پیچھے آنے والی ہستی کو تک رہی تھی۔ یوں کہ اگر آنکھیں بند ہو گئیں تو نجانے یہ منظر پھر نظر نہیں آئے۔ نمو معنی خیزی سے کھانسی مگر وہ ہوش میں اس وقت آئی جب اماں نے اس کو چٹاچٹ پیار کیا تایا ابا نے سر پر دست شفقت پھیرا اور وہ دشمن جاں محض مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ مسمرائزسی ان کے پیچھے لان چیئرز کی طرف بڑھ گئی۔ خوشگوار ماحول میں چائے پی گئی اور رات کو کھانے کے بعد نمرہ نے اسے جالیا۔

"اب فرمائیے محترمہ! وہ سب کیا تھا؟"

"میں کچھ سمجھی نہیں۔" وہ انجان بن گئی۔

"آپ انہیں چھوڑیں میں بتاتی ہوں۔" خلو نے انٹری دی۔

"کیا؟" دونوں کی سوالیہ نظریں اس پر مرکوز ہو گئیں۔

"ہمیں پہلے تو شک تھا مگر آج یقین ہو گیا کہ آپی مبتلائے غم عشق ہیں۔ سبکتگین بھیا نے اس مرض کو دریافت کیا اور ہم نے مہر لگا دی۔ نوشیرواں تو اسی وقت آپی کے پاس دوڑا مگر بھیا نے ہمیں روک دیا کہ آپی خود ڈسکس کریں گی مگر وہ دن اور آج کا دن۔ ہم اس بات کو ترس ہی گئے۔" خلو نے کہتے ہی پر شکوہ نگاہ صویدہ پر ڈالی تو وہ اس کی باتوں سے جز بز ہو کر سر جھکا کر رہ گئی۔

"اچھا! تو اب میں سمجھا، وہ بے قراریاں رتجگے، تنہائی سے بھری غزلیں اور شاعری وہ بھی سیڈ، محترمہ ہمشیرہ صاحبہ! ہمیں دعائیں دیں۔ وقت پر انٹری ماری ورنہ آپ ہاتھ ملتی رہ جاتیں۔" سبکتگین جو دروازے سے باہر کھڑا تھا، نوشیرواں کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"اور اگر یہ محترمہ ساتھ نہ دیتیں تو ہماری نیا کبھی پار نہ لگ سکتی۔" ساتھ ہی ذو معنی انداز سے نمرہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ گلنار ہو گئی جبکہ صویدہ حیرت سے منہ کھولے کبھی سبکتگین اور کبھی نمرہ کو دیکھ رہی تھی اس کے چہرے پر ایک رنگ آ اور ایک رنگ جا رہا تھا۔ نوشیرواں اور خلو نے معنی خیزی سے دونوں کو دیکھا تو نمرہ نے باہر کی راہ لی مگر اس کی کلائی صویدہ کے ہاتھوں میں تھی۔

"اچھا! تو یہ معاملہ تھا۔" اس نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

"ارے تف ہے تم پر، کیسی بہن ہو۔ تم سے زیادہ تو یہ چھوٹے جینئس ہیں جنہیں معاملے کی ہوا لگ گئی اور تم۔ چلو چھوڑو، تمہیں معاف کیا مگر اس طرح نہیں۔ پہلے اچھی سی کافی اور وہ بھی اپنے ہاتھوں سے پلاؤ۔" سبکتگین نے گلو خلاصی کی تو وہ مسکراتی ہوئی کچن کو روانہ ہو گئی مگر دروازے پر ہی اس کے قدم ٹھٹھک گئے۔

اگر چور کو چور کہا جائے تو وہ برابر چوری کرتا رہے گا کہ بدنام تو وہ ہو ہی گیا ہے۔ بجائے اس کے، اس کے ساتھ انتہائی اچھے طریقے سے پیش آیا جائے اور اسے اس کی غلط حرکت کا احساس دلایا جائے تو وہ نہ صرف شرمندہ ہوتا ہے بلکہ برائی سے توبہ بھی کر لیتا ہے۔

صویدہ کو ڈی گریڈ کرنا میں نے اپنا فرض جانا۔ اس کا حلیہ، انداز تکلم اور لڑکوں والی حرکتیں، بولڈنیس مجھے کوفت میں مبتلا کرتے رہے۔ ناچار رد عمل کے طور پر میں اس سے نہایت سختی سے پیش آتا۔ میں اس کے ساتھ ناروا سلوک کرنے پر خود کو حق بجانب سمجھتا۔ بڑوں کو بھی کئی بار اس کے حلیے سے لے کر اس کی ہر بات پر توجہ دلا چکا تھا مگر وہ ٹال جاتے اور پھر جب اماں ابا نے میری بیوی کا قرعہ اس کے نام نکالا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے کھڑکی سے اس کی جھلک دیکھ لی تھی اور مجھے مزید غصہ آیا کہ وہ ہماری پرسنل گفتگو کس خوشی میں سن رہی ہے۔ تو میں نے جان بوجھ کر اس کے بارے میں ایسی باتیں کرنی شروع کر دیں، جنہیں سن کر اسے غصہ آئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ بس میں تو اسے ڈی گریڈ کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر جب اگلی ہی صبح وہ واپسی کے لیے اصرار کرنے لگی تو میں اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ اس کا الوداعی شکوہ، بولتی آنکھیں اور کپکپاتے ہونٹ بار بار میری نگاہوں میں گھوم جاتے میں اپنے رویے پر شرمندہ تھا مگر اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت اور اس کا تائی ماں کے پاس بیٹھنا

مجھے بڑا ڈھکوسلہ معلوم ہوتا تھا جب تائی ماں کی زبانی میرے علم میں آیا کہ اس کا دین میں انٹرسٹ تھا تو میں مزید پاتال میں گر گیا۔

دن اپنی روٹین سے گزر رہے تھے مگر میں جب بھی سونے کے لیے لیٹتا تو وہ شکوہ کرتی آنکھیں میری نگاہوں میں پھر جاتیں۔ میں نے ایک، دو بار کوشش کی کہ اس سے ایکسکیوز کر لوں مگر انا آڑے آتی رہی۔ انہی دنوں بڑے چاچو دو تین چکر لگا چکے تھے اور بڑوں میں کیا باتیں ہوتی تھیں میں ان سے بے خبر تھا۔ البتہ ایک دن سبکتگین کی مس کالز یکے بعد دیگرے موصول ہوئیں تو میں نے اسے ری کال کرنے کی کوشش نہیں کی۔

دوسرے روز میں اپنے کمرے میں تھا کہ نمرہ دوڑتی ہوئی آئی اور کارڈلیس میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔ دوسری جانب سے جو کچھ کہا گیا میں نے بڑے تحمل و ضبط سے سنا۔

اگلے ہفتے بڑے چاچو، سبکتگین کے ہمراہ حویلی میں داخل ہوئے۔ انہوں نے نمرہ کے لیے سبکتگین کا رشتہ مانگا تو ابا نے بے ساختہ اپنی خواہش کا اظہار بھی کر ڈالا میری مرضی اماں کے ذریعے، ان تک پہنچ چکی تھی۔ دادی ماں کے خوشی کے مارے آنسو نکل گئے۔

طے یہ پایا کہ پہلے باضابطہ طور پر یہاں سے رشتہ جائے گا اور پھر چاچو لوگ آئیں گے۔ سو اسی غرض سے ہم نے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہمارا استقبال نہایت ہی پرتپاک طریقے سے ہوا۔ بڑی چچی کے تیور خطرناک نظر آرہے تھے مگر انہوں نے ظاہر نہ کیے اور جب رشتے کی بابت بات کی گئی تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹالا کہ صویدہ سے پوچھ کر وہ فیصلہ کریں گی۔ اور جو صویدہ کا فیصلہ ہوگا، وہی مانا جائے گا۔ بڑے چاچو نے ہمیں اچھی امید دلائی اور پھر صویدہ کا رد عمل ہم خود ملاحظہ کر چکے تھے مگر پھر بھی فارمیلٹی تو نبھانا ہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں موضوع گفتگو بدل گیا اور یوں سبکتگین، خلود اور نوشیرواں کی ملی بھگت سے میں کچن میں موجود تھا اور انتظار کے جاں گسل لمحات گزار رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سامنے ہی ڈائننگ چیئر پر وہ ستم گر براجمان تھا۔ اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے کہ اذن کی آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک لیے۔

"میں آبلہ پائی کے دور سے گزر کر آیا ہوں۔ کیا معافی کا حقدار بھی نہیں؟"

صویدہ کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں اور یکایک پلکوں کی باڑ توڑ کر آنسو باہر نکل گئے۔ اس نے خود کو سنبھالا اور کچن میں داخل ہو گئی۔

"بیٹھو!" اس نے کہا، جیسے وہ میزبان اور صویدہ مہمان ہو۔ وہ بھی بغیر کسی پس و پیش کے بیٹھ گئی۔

"میں نے ہمیشہ تمہیں ڈی گریڈ کیا لیکن پھر بھی تم نے مجھ سے محبت کی؟" اس کی غیر متوقع بات پر وہ سر اٹھا کر دیکھتی رہ گئی اور جب گویا ہوئی تو آواز میں سکون تھا۔

"میں نے ایک بار اپنی ایک کلاس فیلو کو محبت کے نقصانات پر طویل و عریض لیکچر دیا تھا۔ محبت میرے نزدیک فارغ لوگوں کا کام تھا۔ میں محبت کرنے والوں کا مذاق اڑاتی تھی اور جب مجھے محبت کے آکٹوپس نے جکڑا تو مجھے پتا ہی نہ چل سکا۔ میں نفرت کرتے کرتے محبت کرنے لگی۔ محبت سے میں نے جانا کہ محبت تو ایک ایسا جذبہ ہے جو محب اور محبوب کے درمیان پوشیدہ ہے۔ محبت لمحوں میں تسخیر کر لیتی ہے۔ میں نے محبت کے بارے میں جاننا شروع کیا تو مجھ پر منکشف ہوا کہ محبت صرف لڑکے یا لڑکی میں موجود جذبے کا نام نہیں۔

محبت تو خدا کو اپنی کائنات سے ہے۔ محبت کے وجود نے کافر کو مسلمان کیا۔ یہ محبت ہی تھی کہ آگ ابراہیم پر گلزار ہوئی، یونس مچھلی کے پیٹ سے صحیح و سالم برآمد ہوئے موسیٰ کی کشتی پار لگی۔ عیسیٰ کو زندہ اٹھا لیا گیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب خدا کا درجہ دیا گیا۔ میں اور کیا کیا بتاؤں بس میں محبت میں دین کو سمجھنے لگی اور وہ تمام باتیں چھوڑ دیں جو میرے محبوب کو ناپسند تھیں۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ آپ کا ساتھ ہمیشہ کے لیے ملے گا۔ بلکہ میں نے محبت اس آس پر قائم رکھی کہ محبت میرے محبوب کو مجھ سے ملادے گی۔ اس محبت کے صدقے جو خداوند کریم نے اپنی پیدا کردہ مخلوق سے کی۔"

"بس کرو! میں کہیں بے ہوش نہ ہو جاؤں؟ اف۔ اس قدر گاڑھا فلسفہ! اظہار کے اور بھی بڑے طریقے ہیں اور وہ میں تم پر قانونی اور شرعی حقوق رکھنے کے بعد استعمال کروں گا۔ پھر بتانا کس کی محبت میں وزن ہے۔"

گلے شکوے دور ہوئے تو اس نے معنی خیز شرارت کی جبکہ صویدہ کٹ کر رہ گئی۔

باہر کھڑی مما کو صویدہ کا فیصلہ معلوم ہو چکا تھا سو انہوں نے ڈرائننگ روم کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☼ ☼ ☼

بہار کی آمد نے ہر سو پھول کھلا دیے۔ سرسبز کھیت اور مضبوط درخت اپنی خوب صورتی پر نازاں تھے۔ اب بھی تمام گھروں سے گھمر گھمر کی آوازیں آرہی تھیں۔ کہیں کہیں گزرتے جانوروں کے گلوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں، ٹیوب ویل کی آواز بھی اس میں شامل تھی اور حویلی کا سماں آج سے پہلے اتنا خوب صورت کبھی بھی نہ تھا۔

اماں لسی بلو رہی تھیں۔ تائی ماں تلاوت کر رہی تھیں۔ مرد گھر سے نکلنے کو تیار تھے۔ بچے اسکول روانہ ہو چکے تھے تو نمرہ اور رمشہ پراٹھے بنانے میں مگن تھیں۔

تمام لوگ دستر خوان پر ناشتے کے لیے بیٹھ چکے تھے۔

"صویدہ صائم کو پکڑ لے تاکہ میں بھی ناشتا کر لوں۔" دادی ماں نے صویدہ کو آواز دی جبکہ اذن لے اٹھنے بھی نہیں دے رہا تھا۔

"کتنا آکورڈ سا لگتا ہے کہ سارے بڑے باہر انتظار کر رہے ہیں اور آپ نے مجھے کمرے میں قید کر رکھا ہے۔ اب تو کچھ شرم کر لیں۔ ایک بچے کے ابا جان بھی بن گئے ہیں۔" صویدہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"یار قسم سے، جب تم اس طرح کی باتیں کرتی ہو تو کہیں سے نہیں لگتا کہ تم یونیورسٹی کی ہوا کھا چکی ہو اور کسی زمانے میں جینز زیب تن کرتی تھیں اور اب تمہیں چوہدرائن والے خالص اسٹائل میں دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں بھی جٹ بادشاہ ہوں۔"

اذن کو اس کا یہ روپ مزید شرارت پر اکسا رہا تھا۔

"اوں! یہ چوہدرائن کے ساتھ جٹ کا کیا کام؟" صویدہ بھی شرارت میں شامل ہو گئی۔

صویدہ نے اس کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی ہاتھ چھڑا لیا اور دروازے کی طرف بھاگی۔ جبکہ وہ ہاتھ مل کر رہ گیا۔ وہ اسے انگوٹھا دکھاتی باہر نکل گئی۔

اور اذن سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اپنی انا کے خول میں ہی بند رہتا تو یوں کبھی بھی اس کی زندگی پر سکون نہ ہوتی اور بھلا ہو سبکتگین اور نمرہ کا، جن کی پر زور کوششوں سے ان کا ملن ممکن ہوا تھا اور اسی نیکی کے صلے میں وہ دونوں ایک بھرپور ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ ☼

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ مگر وہ اس سے بات نہیں کرتی۔۔۔ مگر زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے حس ہے۔ میں اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو اس کے کالج میں ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔۔۔ رخسار اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے۔۔۔ اور روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رگو میلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔۔۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو پیلس میں لنچ کی دعوت دیتی ہے۔۔۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے۔ اور انہیں پیلس میں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے۔۔۔ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔۔۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے۔۔۔ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے۔۔۔ اب آگے پڑھیں۔

—۳۷—

سینتیسویں قسط

نمل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے سننے میں غلطی ہوئی ہے یا عظمت خلیل سے بولنے میں۔
"کیا... کیا کہا آپ نے؟"
"ایک دفعہ میں کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی! میں نے کہا ہے خرم نے منگنی توڑ دی ہے۔" عظمت خلیل کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ نمل حیرت کی زیادتی سے سن ہو گئی۔ یہ اطلاع اگر عظمت خلیل کے علاوہ کسی اور نے دی ہوتی تو شاید وہ یہ سوچ بھی سکتی تھی کہ یہ کوئی مذاق ہے۔ لیکن عظمت خلیل سے تو ایسی توقع کی ہی نہیں جا سکتی پھر وہ اس خبر پر یقین نہ کرے تو اور کیا کرے۔
"تم نے سنا نہیں تم فوراً گھر آ رہی ہو ابھی اور اسی وقت"۔ عظمت خلیل دھاڑ کر بولے تو نمل کچھ کہہ ہی نہ سکی اور دوسری طرف انہوں نے فون بند کر دیا۔ نمل کتنی دیر بے یقینی کے عالم میں کھڑی رہی کہ سنبل کو اپنے قریب آتا دیکھ کر وہ اپنے حواس جمع کرنے کی کوشش کرنے لگی۔
"کیا ہوا سب خیریت تو ہے۔" سنبل نے اس کے چہرے سے کچھ اخذ کر لیا تھا تب ہی پریشانی سے بولی۔
"ہاں... پتا نہیں خیریت ہے یا نہیں" نمل تذبذب کا شکار تھی۔
"کیا مطلب" سنبل الجھی۔
"ابو کا فون تھا خرم نے منگنی توڑ دی ہے۔" نمل نے سنبل کو بغور دیکھتے ہوئے کہا اس کی توقع کے مطابق سنبل اس کی بات سنتے ہی ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگی۔
"ابو نے مجھے گھر بلایا ہے مجھے فوراً جانا ہو گا۔"
"ٹھیک... لیکن نمل..." سنبل کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔
"خبر تو واقعی بہت شاکنگ ہے لیکن اس پر تبصرہ بعد میں کریں گے۔ مجھے امی کی فکر ہو رہی ہے پتا نہیں ابو ان کے ساتھ کیسے پیش آ رہے ہوں گے مجھے فوراً گھر جانا ہو گا۔" نمل نے موبائل بیگ میں ڈالتے ہوئے جلدی جلدی کہا۔
"تم اور رومیلہ اکٹھے نہیں پڑھ سکتے۔" سنبل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔
"کیا مطلب؟" نمل ٹھٹک گئی۔
"آج سے رومیلہ نے آنا شروع کیا ہے تو تم آنا چھوڑ دو گی۔" سنبل گہرا سانس کھینچتے ہوئے بولی۔
"میں کیوں چھوڑ دوں گی؟ میں صرف ابھی گھر جا رہی ہوں امی کی وجہ سے۔" نمل نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
"کیسے بے وقوف بن رہی ہو نمل! کیا تم اپنے فادر کو نہیں جانتیں۔ خرم نے منگنی چاہے جس وجہ سے بھی توڑی ہو الزام سارا تم پر ہی آئے گا اور تمہارے والد کا غصہ بھی ہمیشہ صرف تم لوگوں پر نکلتا ہے چاہے غلطی کسی کی بھی ہو۔ لہٰذا ان سے یہ توقع بے کار ہے کہ وہ تمہیں دوبارہ اس یونیورسٹی میں بھیجیں گے جہاں خرم پڑھتا ہے۔" سنبل کے مایوسی سے کہنے پر نمل چند لمحوں کے لیے بالکل لاجواب ہو گئی۔
سنبل ٹھیک کہہ رہی تھی اب بہت مشکل ہی تھا کہ عظمت خلیل اسے یونیورسٹی آنے دیتے ایک بار وہ رشیدہ کو سختی سے منع کر دیں گے تو رشیدہ کسی نہ کسی طرح جذباتی دباؤ ڈال کر نمل کو یونیورسٹی جانے سے روک لیں گی۔
"چلو خیر ابھی تو تم آنٹی کے پاس جاؤ بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔" سنبل نے اسے سوچ میں ڈوبتا دیکھ کر تسلی دی۔
"بعد میں کیا دیکھیں گے ابو رومیلہ کے ابرار بھائی سے زیادہ مختلف نہیں ہیں وہ بھی اپنے غصے کا ری ایکشن دکھانے کے لیے میری شادی جلد بازی میں کسی اور شخص کے ساتھ طے بھی کر سکتے ہیں۔ گھر جانے سے پہلے مجھے خرم سے بات کرنی چاہیے ذرا پتا تو چلے کہ اس نے منگنی کیوں توڑی ہے اور اس کی وجہ کیا بتائی ہے۔" نمل نے بیگ کی زپ کھولتے ہوئے کہا۔
"منگنی خرم کے پیرنٹس نے توڑی ہو گی کل جو کچھ وہ دیکھ کر گئے ہیں اس کے بعد وہ اس گھر سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے ہوں گے۔ بہت سے لوگوں کی عادت ہوتی ہے ایسے گھر سے لڑکی لینا پسند نہیں کرتے جہاں کا ماحول انہیں پسند نہ آئے۔" سنبل نے تنفر سے کہا۔
"مجھے نہیں لگتا کہ یہ فیصلہ اس کے والدین کا ہے میرے گھر سے جاتے وقت وہ لوگ اتنے بے زار نہیں تھے کہ گھر جا کر منگنی توڑنے کا فیصلہ کر لیتے اور نہ ہی خرم اتنا فرماں بردار ہے کہ ان کے کہنے پر کوئی قدم اٹھائے۔ ابو نے کہا تھا خرم کا فون آیا ہے اس نے منگنی توڑ دی ہے۔ گویا ان کی براہ راست خرم سے بات ہوئی ہے۔ اتنی اہم بات خرم نے کیوں کی۔ یہ ڈسکشن تو فرقان انکل کو کرنا چاہیے تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ منگنی خرم نے اپنے پیرنٹس کے خلاف جا کر توڑی ہے اسی لیے انہوں نے خود بات کرنے سے بھی انکار کر دیا۔" نمل موبائل ہاتھ میں پکڑے تانے بانے بنتی رہی۔
"تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے خرم کے منگنی توڑنے کی؟ اس طرح منگنی توڑ کر تو اس نے اپنی شکست قبول کر لی ہے اور اس کا شکست قبول کر لینا بلاوجہ کا نہیں ہو سکتا" سنبل سوچتے ہوئے بولی۔
"کل گھر پر بھی اس کا رویہ بہت عجیب تھا۔ ک... کہیں اس نے امی کی وجہ سے..." نمل نے چونکتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
"رشیدہ آنٹی!" سنبل نے اچنبھے کے ساتھ دہرایا۔
"ہاں... او مائی گاڈ کہیں اس نے ابو کے سامنے امی سے کسی قسم کا ہمدردی کا اظہار وغیرہ نہ کر دیا ہو کل جس طرح ابو امی کے ساتھ پیش آ رہے تھے وہ خرم کو پسند نہیں آیا تھا اگر اس نے اس بارے میں ابو سے کوئی بات کی ہو گی تو ابو کا موڈ امی سے بہت بری طرح خراب ہو گا پتا نہیں وہ ان کو کتنی باتیں سنا چکے ہوں گے۔" نمل اس خیال کے آتے ہی بری طرح مضطرب ہو گئی اور اپنے موبائل میں خرم کا نمبر تلاش کرنے لگی اور تب ہی اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے پاس تو خرم کا موبائل نمبر ہے ہی نہیں۔
"تمہارے پاس خرم کا نمبر ہو گا؟" اس نے سنبل سے پوچھا تو وہ بھی چونک اٹھی۔
"نہیں... کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی اس کا نمبر لینے کی۔ تم کہو تو میں آسیہ وغیرہ سے پوچھ لوں ان کے پاس ہو گا۔"
"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ خوامخواہ میں انہیں سوال جواب کرنے کا موقع مل جائے گا۔ پتا کرتے ہیں اگر وہ یونیورسٹی آیا ہے تو اس سے براہ راست بات کر لیتے ہیں۔ اگر اس نے یہ منگنی والدین کے خلاف جا کر توڑی ہے تب تو گھر سے فرار حاصل کرنے کے لیے ضرور آئے گا۔" نمل نے نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے پرسوچ انداز میں کہا تو سنبل نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے خرم کی تلاش میں اس کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے۔
رومیلہ باقی لڑکیوں کے ساتھ کینٹین میں ہی مصروف گفتگو تھی اور اگر فارغ بھی ہوتی تب بھی نمل رشیدہ کا خیال آتے ہی اتنی پریشان ہو گئی تھی کہ وہ خرم کو جلد سے جلد تلاش کرنے میں لگ گئی تاکہ سچائی کا پتا چلتے ہی وہ گھر پہنچ کر چیختے اور غراتے عظمت خلیل کے سامنے رشیدہ کی ڈھال بن کر کھڑی ہو سکے۔ کچھ ہی دیر میں اسے دوسرے اسٹوڈنٹس کے ذریعے یہ تو پتا چل گیا کہ خرم یونیورسٹی آیا ہے مگر وہ ہے کہاں یہ جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔
آخر جب نمل نے تھک کر اس سے ملنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تب پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے اچانک وہ سامنے آ گیا نمل اس پر نظر پڑتے ہی تیز قدموں سے اس کی طرف بڑھنے لگی۔ خرم بھی اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر

رک گیا نمل نے اس کے سامنے آتے ہی بغیر کسی تمہید کے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" ایک تو وہ رشیدہ کا سوچ کر پہلے ہی پریشان تھی اس پر خرم کو تلاش کرنے میں جو وقت اور محنت صرف ہوئی تھی اس نے نمل کو شدید قسم کی جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ تبھی اس کا لہجہ خود بخود نہایت تیکھا ہو گیا۔

"کیا؟" خرم سمجھ نہیں سکا اسے امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی نمل کو اس کے منگنی توڑ دینے کی اطلاع مل سکتی ہے اس نے یہیں یونیورسٹی آکر تو عظمت خلیل کو فون کیا تھا۔

اس کے بعد سے اس کا دل اتنا بے زار ہوا تھا کہ وہ گھر جانے کے ارادے سے پارکنگ میں آگیا تھا مگر یہاں آنے کے بعد اس کا گھر جانے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا وہ سوچ رہا تھا اس وقت تو کوئی مال بھی نہیں کھلا ہو گا کہ وہ اسی میں جا کر بیٹھ جائے ایک طرح سے وہ خالی الذہنی کے عالم میں پارکنگ میں ٹہل رہا تھا چنانچہ نمل کی بات اس کے سر پر سے گزر گئی۔

نمل کو اس کا انجان بننا مزید سلگا گیا تو وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولی۔

"تمہیں اگر منگنی توڑنی تھی تو اتنے عرصے انتظار کیوں کیا؟ بلکہ تم نے منگنی کی کیوں تھی جب تمہیں شادی نہیں کرنی تھی۔" خرم کی سمجھ میں نہ آیا اسے کیا جواب دے۔

یہ بات ابھی اس نے صرف عظمت خلیل سے کی تھی لہٰذا یہ اطلاع اسے عظمت خلیل سے ہی ملی تھی اور اس کا انداز بتلا رہا تھا کہ انہوں نے خاصے سخت طریقے سے اس سے گفتگو کی ہے تبھی وہ اتنی بپھری ہوئی ہے خرم نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے رسانیت سے کہا۔

"تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں نے منگنی کیوں کی تھی اور اب کیوں توڑ دی کیا تمہارے لیے اتنا کافی نہیں ہے کہ تم جو چاہتی تھیں وہ ہو گیا ہے۔" "میں اگر صرف اپنے بارے میں سوچنے والوں میں سے ہوتی تو یہ منگنی ہو ہی نہیں سکتی تھی مجھے خود سے زیادہ اپنی ماں کی فکر ہے اس لیے پوچھ رہی ہوں تم نے ابو سے کیا کہا ہے؟"

"میں نے ان سے کچھ نہیں کہا صرف معذرت کی ہے کہ میں یہ شادی نہیں کر سکتا۔" خرم نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے سکون سے کہا۔ "اور تمہیں لگتا ہے کہ انہوں نے تمہاری معذرت قبول کر لی۔

کل رات تم ہمارے گھر آئے اور آج صبح تم نے شادی سے انکار کر دیا اس کا صاف مطلب تو یہی ہے نا کہ کل تم اس قدر تنگ آکر وہاں سے اٹھے تھے کہ گھر جاتے ہی تم نے فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ میں جانتی ہوں تمہارے انکار کی وجہ کل ہمارے گھر آنا نہیں ہے لیکن میرے ابو کو یہ بات کون سمجھائے گا۔ تم نے یہ منگنی کوئی اپنی خوشی سے تو کی نہیں تھی' مجھے امید تھی تم شادی کے بعد مجھے چھوڑو گے' تم نے سمجھداری دکھاتے ہوئے پہلے ہی گلے کا طوق اتار کر پھینک دیا۔ لیکن مجھے اس کی فکر نہیں کہ تم نے کیا کیا اور کیوں کیا۔ مجھے صرف اس بات سے غرض ہے کہ تم نے کیسے کیا؟" "تمہیں ابو کو فون کر کے پوری بات تفصیل سے بتانی ہو گی کہ تم اس شادی کے لیے کبھی سیریس تھے ہی نہیں۔ تم نے ایسے ہی بس وقتی جوش کے زیر اثر منگنی کر لی تھی اور اب وہ جوش ٹھنڈا ہو گیا ہے تو منگنی توڑ دی۔

ان تمام باتوں کے پیچھے میری امی کی کوئی غلطی نہیں ہے' انہوں نے کل ایسا کچھ بھی کہا یا کیا نہیں تھا جس کے باعث تم نے یہ قدم اٹھایا۔" نمل رکے بغیر ایک سانس میں بول رہی تھی۔

وہ تو خرم کو دیکھتے ہی تیز تیز چلتی اس تک آگئی تھی جبکہ سنبل کے قدم خرم پر نظر پڑتے ہی سست پڑ گئے تھے لہٰذا وہ اب ان دونوں کے نزدیک پہنچی تھی یہ اور بات تھی کہ نمل کی آواز اسے پہلے سے سنائی دے رہی تھی اس کا غصہ دیکھتے ہوئے سنبل کچھ قدم کے فاصلے پر ہی خاموشی سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"کیا انہوں نے تمہاری والدہ کو مورد الزام ٹھہرایا ہے؟" خرم جو بڑے غور سے اس کی بات سن رہا تھا اس کے خاموش ہونے پر سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

"ہاں۔" نمل یقین سے بولی کیونکہ وہ اپنے والد کو اچھی طرح جانتی تھی ان کے فوراً" اسے گھر بلانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ رشیدہ اور نمل پر اپنا غصہ نکال سکیں آخر کو انہوں نے نمل کی مرضی کے بغیر یہ منگنی کر دی تھی' انہیں کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنے کے لیے ان دونوں کو ہی کچوکے لگانے تھے۔

"اگر یہ بات ہے تو میں ان سے فون پر دوبارہ بات کر کے اس منگنی کو توڑنے کی ساری ذمہ داری خود پر لے لیتا ہوں حالانکہ جتنا میں انہیں سمجھ سکا ہوں اس کی روشنی میں' میں چاہے ان سے جو بھی کہہ لوں انہیں مجھ پر یقین نہیں آئے گا اور وہ تمہیں اور آنٹی کو ہی کسی نہ کسی طرح اذیت دیں گے۔ لیکن اگر تمہیں لگتا ہے کہ میرے بات کرنے سے سچویشن پر کوئی فرق پڑ سکتا ہے تو میں ابھی بات کر لیتا ہوں" خرم بڑی بردباری سے بات کر رہا تھا۔

اس کے لہجے یا گفتگو میں اس کے والد کی فطرت کو لے کر ہلکا سا بھی طنز یا تمسخر نہیں تھا بلکہ اس کے رویے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ واقعی اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہو۔

نمل کے غصے میں جیسے ایک ٹھہراؤ آگیا وہ کسی سوچ میں گھری اسے دیکھے گئی۔

وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا جب وہ عظمت خلیل کو جاننے کا دعوا کرتی ہے تو پھر یہ کیسے فراموش کر گئی کہ خرم چاہے جو بھی کہہ لے انہیں نمل اور رشیدہ سے ہی خائف ہونا ہے پھر بھلا کیا ضرورت تھی اتنے شدید رد عمل کا مظاہرہ کرنے کی۔

عظمت خلیل نے گھر آنے کو کہا تھا اسے چپ چاپ گھر چلے جانا چاہیے تھا وہ اگر کل سے اسے یونیورسٹی نہیں آنے دیتے تب بھی یہ نمل کا مسئلہ تھا خرم کا نہیں' جو اس کی جان کھائی جائے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟ تم کہو تو ابھی فون کر لوں۔" خرم نے اسے چپ دیکھ کر کہا۔

"نہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" نمل بے ساختہ بولی پھر اپنی خجالت مٹانے کے لیے وضاحت دینے لگی۔

"دراصل میں کل جو کچھ ہوا مجھے لگا تم نے ابو سے امی کی شکایت کرتے ہوئے شادی سے انکار کیا ہو گا۔ اگر تم نے ایسا کچھ کہا ہوتا تو ابو واقعی امی کے لیے ایک قیامت کھڑی کر دیتے۔"

"میں نے جب منگنی کی تھی تب یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ تمہارے گھر کا ماحول کیسا ہے اور اب جبکہ توڑی ہے تو بھی مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ کل کیا ہوا۔ پھر مجھے کیا ضرورت ہے تمہارے ابو کے سامنے جھوٹی تاویلیں پیش کرنے کی۔" خرم نے نہایت ٹھوس لہجے میں کہا۔

"تو سچ کیا ہے؟" نمل خود کو ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی تھی۔

وہ خرم کی طرف سے کسی غلط بات کی توقع کر رہی تھی کہ اس نے رشیدہ یا نمل پر کوئی الزام رکھ کر اپنی جان چھڑائی ہو گی مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اب عظمت خلیل اپنی عادت کے مطابق ایک بلاوجہ کا ہنگامہ کھڑا کریں گے اور کچھ دنوں بعد پھر سب کچھ معمول کے مطابق ہو جائے گا ان سب کی تو وہ بچپن سے عادی تھی۔

اس وقت سب سے اہم بات یہ تھی کہ خرم نے اسے اس زبردستی کے بندھن سے آزاد کر دیا تھا اور اچانک ایک خوشگوار احساس نے اس کا سارا غصہ ختم کر دیا تھا۔ رشیدہ کی طرف سے اسے ابھی بھی فکر تھی اس لیے اسے ابھی بھی گھر پہنچنے کی جلدی تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ خرم کی اس کایا پلٹ کا سبب ہی نہ پوچھتی۔

"کیا مطلب؟" خرم سمجھا ہی نہیں۔

"مطلب یہ کہ اگر تم نے کل امی ابو کے بیچ کشیدگی دیکھ کر اس منگنی کو ختم نہیں کیا' تو پھر کیوں کیا ہے' تم تو زبردستی مجھ سے شادی کرنے کا عہد کیے بیٹھے تھے۔" نمل کا انداز چڑانے والا نہیں تھا بلکہ زندگی میں پہلی بار وہ بڑے

مسکراتے لہجے میں اس سے سوال کر رہی تھی۔
خرم بے اختیار اسے دیکھے گیا ایک بار اس نے جھوٹ موٹ میں نمل سے کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اس لیے اس نے یہ منگنی کی ہے تب نمل چند ثانیوں کے لیے پتھرا گئی تھی۔
آج اس کا شدت سے دل چاہا کہ وہ اسے بتادے کہ وہ واقعی اس سے محبت کرتا ہے اس لیے محض اس کی خوشی کی خاطر اس نے اپنے دل کی ایک نہ سنی اور اس کے حصول کا پورا اختیار رکھتے ہوئے بھی خاموشی سے اپنے اختیار سے دست بردار ہو گیا۔ مگر وہ یہ سب کہہ نہیں سکا کوئی چیز اسے یہ کہنے سے روک رہی تھی اس کی انا یا شاید کچھ اور وہ سمجھ نہیں سکا۔
خرم کو خاموش دیکھ کر نمل آنکھوں کو ذرا سا چندھیاتے ہوئے بولی۔
"تم نے سوچا تو ہر پہلو پر ہو گا۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ تم نے جذبات میں آکر منگنی توڑ دی کہ کون اس نام نہاد رشتے کو نبھائے گا۔ آرام سے دس بارہ سال بعد شادی کروں گا مگر یہ لوگ اتنی لمبی منگنی رکھنے نہیں دیں گے لہٰذا جتنی جلدی اس بات کو ختم کر دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے اس رشتے کو جتنا طول دیا جائے گا آگے اتنے ہی مسائل ہوں گے۔
لیکن اس منگنی کے ٹوٹنے پر یونیورسٹی کا ری ایکشن معمولی نہیں ہو گا یہاں سب ۔ بہت کچھ کہیں گے تمہیں منگنی توڑنی ہی تھی تو اپنا فائنل کلیئر کرنے کے بعد توڑتے ایک بار یہاں سے چلے جاتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا یہاں لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔" نمل اب باقاعدہ اسے مشورہ دے رہی تھی۔
اس نے آج تک اتنے سکون سے کبھی خرم سے بات نہیں کی تھی ان کے بیچ ہمیشہ یا تو بحث ہوئی تھی یا محض دوسروں کو سنانے کے لیے طنزیہ گفتگو۔ آج پہلی بار وہ اتنے خوشگوار انداز میں بات کر رہی تھی کہ خرم کا دل چاہنے لگا وہ بس بولتی رہے۔
پہلی بار اسے لگ رہا تھا کہ نمل سے پرسکون ماحول میں بات کرنا کتنا خوبصورت احساس ہے۔ جو ایک زبردستی کے رشتے میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔
دوسرے کو اذیت دے کر بظاہر شاید انسان کو یہ لگتا ہو کہ اس کی انا کو تسکین مل رہی ہے لیکن در حقیقت انسان کا ضمیر مر رہا ہوتا ہے اور جب ضمیر مرنے لگے تو ذہنی سکون اور قلبی آرام سب ختم ہو جاتا ہے۔
یہ اذیت چاہے انسان جان بوجھ کر دے یا انجانے میں اس کا اثر دونوں فریقین پر پڑ رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اپنے فیصلے پر دکھی ہونے کے باوجود وہ مطمئن تھا اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا چنانچہ نمل کے سوال پر وہ اپنی ازلی لاپروائی کے ساتھ بولا۔
"فرق تو مجھے اب بھی نہیں پڑتا کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔
YouKnowMeWhoCares۔"
"لیکن پھر بھی اس اچانک فیصلے کے پیچھے کوئی وجہ تو ہو گی۔" نمل بضد تھی جاننے پر۔
"ہاں ہے وجہ مگر وہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔" خرم نے نہایت صاف گوئی سے کہا تو نمل کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد سنجیدگی سے کہنے لگی۔
"کہیں یہ وجہ وہی تو نہیں جس کے بارے میں یونیورسٹی میں سب بات کر رہے ہیں۔" خرم کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگا تو نمل وضاحت کرتے ہوئے بولی۔
"دیکھو مجھے تمہارے پرسنل معاملے میں بولنے کا حق تو نہیں ہے لیکن تمہارے پیرنٹس بہت اچھے ہیں صرف ان کی خاطر میں ایک مشورہ دوں گی۔۔۔ کوئی بھی ایسا فیصلہ مت کرنا جس سے انہیں تکلیف پہنچے۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" خرم نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا تو نمل کچھ جھجکتے ہوئے کہنے لگی۔

"کیا یہ سب تم زوبیہ کے لیے کررہے ہو؟" خرم کو قطعی امید نہیں تھی کہ نمل یہ سوچ سکتی ہے۔
اس کا تو جیسے ایک دم دماغ ہی گھوم گیا اس کے چہرے پر سختی کے تاثرات ابھرتے دیکھ کر نمل جلدی سے کہنے لگی۔

"میں نے صرف ایک اندازے کے مطابق کہا ہے اس کی تائید یا تردید کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں اور میں یہ سب صرف فرقان انکل اور آنٹی کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔ وہ دونوں بہت کیئرنگ ہیں تمہیں اندازہ نہیں ہے تم کتنے لکی ہو۔ والدین کو تو کبھی دکھ نہیں دینا چاہیے اور ایسے پیرنٹس کو تو بالکل بھی نہیں۔ کسی بھی والدین کی یہ خواہش نہیں ہوسکتی کہ اس کی اولاد کی شادی کسی ذہنی بیمار شخص سے ہو خاص طور پر ایسی صورت میں جب ان کی ایک ہی اولاد ہو۔" نمل بڑی رسانیت سے بول رہی تھی۔

خرم کو یقین تھا وہ یہ سب بلاوجہ نصیحت کرنے کے لیے نہیں کہہ رہی اُسے واقعی اس کے والدین کی فکر ہے لیکن خرم زوبیہ اور اپنے بارے میں فرقان حسن کے منہ سے سن کر اتنا تپا ہوا تھا کہ نمل کے منہ سے زوبیہ کا نام سنتے ہی اس کا تنفس بڑھنے لگا۔

"میں یہ سب زوبیہ کے لیے نہیں کررہا نہ ہی میرے اور زوبیہ کے بیچ ایسا کچھ ہے کہ مجھے اس کی خاطر منگنی توڑ کر اپنے والدین کو دکھ دینا پڑے میں تو یہ سب......" خرم نے کچھ کہتے کہتے سختی سے لب بھینچ لیے۔
نمل اس کے ردعمل پر کچھ سٹپٹا سی گئی تھی اسے عادت نہیں تھی ذاتی معاملے میں دخل دینے کی اور یہ تو تھا بھی اتنا حساس موضوع کہ اس پر بات کرنے سے پہلے تو دس بار سوچنا چاہیے خاص طور پر تب جب سامنے والے سے آپ کی کوئی گہری دوستی یا وابستگی بھی نہ ہو۔

خرم کے چبا کر کہنے پر سنبل بھی بے اختیار ان کے قریب آگئی۔

"نمل کا مقصد آپ کو طعنے مارنا نہیں تھا وہ تو یہ سب آپ کے والدین کی خاطر کہہ رہی تھی ورنہ تو یہ آپ لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ نے چاہے جس وجہ سے بھی یہ منگنی توڑی ہے ہم پر بہت احسان کیا ہے شادی کوئی مذاق نہیں ہے جو کسی بھی وقت کرلی اور کہیں بھی جاکر توڑ دی۔ اگر آپ پورے خلوص سے نمل کی طرف بڑھے ہوتے تب تو بات الگ تھی لیکن نہ آپ مخلص تھے نہ نمل مطمئن، ایسے رشتے کو بروقت ختم کردینا ہی بہتر تھا اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یونیورسٹی میں کون کیا سوچ رہا ہے۔" سنبل جلدی جلدی بولی تو خرم ہنوز خشک لہجے میں بولا۔

"میرے بارے میں کوئی کچھ بھی سوچے مجھے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن کسی لڑکی کے بارے میں غلط رائے رکھنا اور بغیر تصدیق کے اس کا دوسروں کے سامنے اظہار کردینا نہایت غلط بات ہے۔
زوبیہ پاگل خانے میں ہے۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں ہوسکتا اس کی اذیت اور تکلیف کا۔
نہ جانے اسے وہاں کب تک رہنا پڑے۔
پتا نہیں وہ کبھی وہاں سے نکلے گی بھی یا نہیں۔
اس کی خاطر میرا تم سے منگنی توڑنا نہایت حماقت کی بات ہے۔"

"آئی ایم سوری۔" نمل بری طرح شرمندہ ہوگئی تھی اس کے چہرے پر پھیلی خجالت دیکھ کر خرم نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ کچھ دیر نمل کو دیکھتے رہنے کے بعد بہت دھیمے لہجے میں کہتا اپنا گاڑی کی طرف مڑ گیا۔
"It'sOk" نمل اور سنبل خاموشی سے اسے جاتا دیکھتی رہیں کہ اچانک سنبل نے اسے پکار لیا تو وہ اپنی جگہ

رک گیا مگر پلٹا تب بھی نہیں، بس ذرا سی گردن موڑ کر سنبل کو دیکھنے لگا جس کا سوال خرم تو کیا نمل تک کو حیران کر گیا تھا۔
"کیا یہ منگنی آپ نے اس لیے توڑی ہے کہ نمل خوش نہیں ہے؟" نمل منہ کھولے سنبل کو دیکھنے لگی۔ مگر سنبل کی نظریں خرم پر جمی تھیں جو ایک حیران نظر اس پر ڈال کر نمل کو دیکھنے لگا تھا مگر نمل اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔" نمل دانت پیستے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں بولی مگر سنبل پر جیسے کوئی اثر نہ ہوا وہ بڑی گہری نظروں سے خرم کا مشاہدہ کررہی تھی جو بالکل خاموش کھڑا تھا۔
اور اس کی اسی خاموشی نے نمل کو چونکنے پر مجبور کیا تھا وہ اس کی طرف سے کسی استہزائیہ ہنسی یا تمسخرانہ فقرے کی منتظر تھی تبھی اسے سنبل کا یہ سوال کرنا سخت گراں گزرا تھا جس نے یہ پوچھ کر ایسا تاثر دیا تھا جیسے وہ دونوں بڑے خوش فہم ہوں اور جانے کون سی تصوراتی دنیا میں رہ رہے ہوں۔
لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے سنبل کا مذاق اڑایا نہ ہی کوئی چھچھورا سا قہقہہ مارا بلکہ اس نے تو سنبل کے سوال کی نفی بھی نہیں کی حالانکہ اسے فوراً انکار کردینا چاہیے تھا۔ نمل نے بے ساختہ خرم کی جانب دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا نظریں ملنے پر وہ بغیر کچھ کہے فوراً اپنی گاڑی کی طرف گھوم گیا پھر گاڑی میں بیٹھنے سے لے کر گاڑی نکال کر لے جانے تک اس نے ان دونوں کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ جبکہ وہ دونوں کتنی ہی دیر اس دھول کو دیکھتی رہیں جو خرم کی گاڑی اڑا کر گئی تھی۔
نمل دانستہ سنبل کی طرف دیکھنے سے گریزاں تھی وہ اس وقت اس موضوع پر کچھ بولنا تو در کنار کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی اس کے برعکس سنبل سوچوں میں اتنی غرق تھی کہ کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔
"سنبل میں گھر جارہی ہوں پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔" نمل نے کہا اور سنبل کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ گئی۔ سارے راستے اس کا ذہن بری طرح منتشر رہا، کسی بھی ایک نکتہ پر وہ یکسو ہو کر سوچ نہیں پارہی تھی۔
کبھی ذہن رشیدہ کی طرف چلا جاتا کبھی عظمت خلیل کے غصے کے بارے میں سوچنے لگتی اچانک اسے فرقان حسن اور مسز فرقان سے کل رات والی ملاقات کا خیال آنے لگتا تو کبھی خرم کی رویے کی یہ تبدیلی اسے الجھانے لگتی۔
ان ہی ساری الجھنوں کے ساتھ جب وہ گھر پہنچی تو عظمت خلیل، رشیدہ پر چیخ چلا کر تھک چکے تھے البتہ نمل کو دیکھتے ہی انہیں ایک نئی قوت مل گئی تو وہ ایک بار پھر شروع ہوگئے۔ نمل کی توقع کے مطابق ان کی گفتگو کا لب لباب یہی تھا کہ کل وہ دونوں ماں بیٹی اس قدر بد اخلاقی سے پیش آئیں کہ خرم کی عزت نفس مجروح ہوگئی۔
فرقان صاحب کو عظمت خلیل نے فون کیا تھا اور وہ بیٹے کی حرکت پر سخت شرمندہ تھے گو کہ عظمت خلیل ان کے ساتھ بھی نرمی سے پیش نہیں آئے تھے لیکن ان کا معذرت خواہانہ انداز سن کر وہ اپنی بھڑاس نہ نکال سکے اور پھر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی ان کے پاس رشیدہ اور نمل موجود تھیں جن پر اپنی جھنجلاہٹ نکالنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔
نمل خاموشی سے رشیدہ کی وہیل چیئر کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ رشیدہ بے آواز رو رہی تھیں نمل اس وقت کچھ کہہ کر ہنگامے کو ہوا نہیں دینا چاہتی تھی ویسے بھی اس کے پاس کہنے کے لیے ایسا کچھ خاص تھا بھی نہیں۔
خرم میں بظاہر ایسی کوئی برائی نہیں تھی جسے بنیاد بنا کر وہ عظمت خلیل کے فیصلے کو غلط قرار دیتی۔ البتہ ان کی جلد بازی اور رشیدہ اور نمل سے مشورہ کیے بغیر سب طے کردینا اخلاقی اور شرعی لحاظ سے غلط تھا مگر اس وقت اس پر بات کرنا بے سود تھا اور یہ تو انہیں پتا نہیں تھا کہ خرم کا اس سے منگنی کرنے کا مقصد کیا تھا۔ لہٰذا یہ شکایت کرنے کا

تو سرے سے حق ہی نہیں بنتا تھا۔

"کل ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تمہارا رویہ فرقان حسن اور بھابھی کے ساتھ کس قدر خشک اور روکھا پھیکا ہے خرم سے بھی تم نے ڈھنگ سے کوئی بات نہیں کی۔ بھلا ایسی لڑکی سے اسے شادی کرنے کی ضرورت کیا ہے یونیورسٹی میں بھی تم اس کے ساتھ ایسے ہی پیش آتی ہو گی۔ بے زار آگیا ہو گا وہ۔" عظمت خلیل صرف جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے تھے ورنہ انہیں کیا پتا نمل ان کے آنے سے پہلے فرقان حسن اور مسز فرقان کے ساتھ بڑے خوشگوار ماحول میں باتیں کر رہی تھی۔

"تم اب کل سے یونیورسٹی نہیں جاؤ گی۔" جب رشیدہ اور نمل ان کی کسی بھی بات پر کچھ نہ بولیں تو آخر تھک کر انہوں نے صرف نمل کو بتانے کے لیے وہی کہا جس کی نمل کو امید تھی۔

نمل نے ایک نظر رشیدہ کے چہرے پر ڈالی جہاں دکھ اور ملال کا ایک پورا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اشک تھے کہ بہے جا رہے تھے۔

نمل نے دوبارہ سر جھکا لیا اس وقت رشیدہ کے لیے بس وہ یہی کر سکتی تھی کہ بپھرے ہوئے عظمت خلیل سے کوئی بحث نہ کرتی اگر وہ کچھ کہتی تو عظمت خلیل جواباً "اتنا زہر اگلتے کہ رشیدہ کی رگ و پے میں خون کی جگہ دکھ اور تلخیاں گردش کرنے لگتیں۔

عظمت خلیل حکم صادر کر کے پاؤں پٹختے گھر سے باہر نکل گئے تو رشیدہ جو بے آواز آنسو بہا رہی تھیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

نمل اٹھ کر ان کے لیے پانی لے آئی جسے پینے کے بھی کافی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئیں۔

"کیا تمہیں پتا ہے کہ یہ سب کیوں ہوا؟" نمل جیسے کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہی۔ جو اسے پتا تھا پتا نہیں وہ کتنا صحیح تھا کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے نفی میں سر ہلا دیا تو رشید ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"چلو جو بھی وجہ ہو۔ تم جو چاہتی تھیں وہ ہو گیا اللہ کرے اسی میں تمہاری بہتری ہو اور ہم سب کی بھی" نمل کچھ بھی نہ بولی بس سر جھکائے بیٹھی رہی تو رشیدہ وہیل چیئر کچن کی جانب گھماتے ہوئے کہنے لگیں۔

"ابھی کچھ دن یونیورسٹی نہ جاؤ۔ تھوڑا ان کا غصہ ٹھنڈا ہونے دو اور پھر خرم بھی وہیں ہوتا ہے کچھ دن ہر زبان پر یہی چرچہ ہو گا لوگوں کی باتیں تمہیں خوامخواہ پریشان کریں گی۔" رشیدہ یہ کہہ کر چلی گئیں۔

جبکہ نمل صرف سوچتی رہ گئی کہ وہ جب بھی جائے گی نئے سرے سے لوگ اس موضوع پر بات کرنے لگیں گے اس کا گھر میں بیٹھنا کوئی حل نہیں البتہ یہ واقعی سچ تھا کہ عظمت خلیل کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے یہ کرنا بہت ضروری تھا کیونکہ جو کچھ ہوا تھا وہ انہیں شدید پیچ و تاب میں مبتلا کر گیا تھا اور ان کی یہ چڑچڑاہٹ پتا نہیں کتنے طویل عرصے تک نمل اور رشیدہ پر نکلنی تھی۔

اگر یہ سب صرف زبان تک محدود رہتا۔ تب تو ٹھیک تھا لیکن اگر وہ ردعمل کے طور پر مزید کوئی فیصلہ کرنے والے تھے تب تو جانے کیا ہو گا۔

☼ ☼ ☼
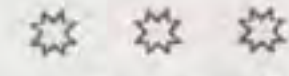
زندگی جو بالکل بے کیف اور بے مقصد ہو گئی تھی وہ ایک بار پھر رومیلہ کو معمول پر آتی لگنے لگی حالانکہ ابھی بھی حالات کے پیچ و خم جوں کے توں تھے مگر رومیلہ کو ایک — بہترین مصروفیت مل گئی تھی۔

اپنی تعلیم دوبارہ شروع کر کے اسے ذہنی طور پر بہت سکون ملا تھا پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اس ماحول سے تھوڑی دیر کے لیے باہر بھی جاتی تھی بس اس بات کا دکھ تھا کہ اس کے آتے ہی نمل نے آنا چھوڑ دیا تھا۔

خرم کی حرکتوں سے وہ واقف تھی اور زبردستی کے رشتے کے نتائج کو عملاً" بھگت بھی رہی تھی لہٰذا جو ہوا تھا وہ اسے سب کے لیے بہتر سمجھ رہی تھی بس ایک خرم کا رویہ اسے اور سنبل کو الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔

خرم نے منگنی ٹوٹنے کا ذکر یونیورسٹی میں نہیں کیا لیکن عظمت خلیل نے اپنے سرکل میں سب کو بتا دیا جو کہ قدرتی طور پر یونیورسٹی تک پہنچ گیا۔ پھر جب خرم سے تصدیق کی گئی تو اس نے قبول کر لیا۔

پھر تو جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ ہر جگہ ' ہر کلاس ' ہر ڈیسک اور ہر ٹیبل پر یہی ذکر ہوتا رہا۔ سنبل اور رومیلہ ہر سوال کے جواب میں پتا نہیں کہہ کر تھک گئیں۔ رومیلہ تو سیدھی خرم کے پاس بات کرنے پہنچ گئی اور اسے اچھا خاصا سنانے لگی۔

"کیا ضرورت تھی تمہیں منگنی کرنے کی۔ تم نے اسے چھوٹی بات سمجھ رکھا تھا نا بھلے ہی اس کی شرعی حیثیت کوئی نہ ہو لیکن یہ ایک کمٹ منٹ ہے اور جب کمٹ منٹ ٹوٹتی ہے تو دونوں کی ذات پر انگلیاں اٹھتی ہیں۔"

"تو کیا کرتا لوگوں کو خاموش رکھنے کے لیے یہ جانتے ہوئے بھی نمل سے شادی کر لیتا کہ نمل اس رشتے سے خوش نہیں ہے۔" خرم نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

"تو یہ بات اس وقت کیوں نہیں سوچی جب منگنی کر رہے تھے۔" رومیلہ زچ ہو کر بولی۔

خرم کچھ دیر تو بڑی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بہت ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

"تمہیں اس بات پر اعتراض ہے کہ میں نے غلطی کیوں کی۔ اس بات پر خوشی نہیں کہ میں اپنی غلطی سدھار رہا ہوں۔"

"تمہیں سدھارنے کا خیال بہت دیر سے آیا ہے۔" رومیلہ چبا کر بولی۔

"نہیں مجھے بالکل بروقت آیا ہے ورنہ میرا ارادہ اسے شادی کے بعد چھوڑنے کا تھا جو کہ مجھے یقین ہے کہ بدل جاتا لیکن اس وقت فیصلہ بدلنے میں اور ابھی بدلنے میں بہت فرق ہے۔ ہے نا۔" خرم نے براہ راست رومیلہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو رومیلہ بھی کچھ دیر بس اسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر بغیر کچھ بولے خاموشی سے پلٹ گئی۔

یونیورسٹی سے گھر جا کر اس نے اپنی اور خرم کی گفتگو کے بارے میں نمل کو سب بتا دیا تو نمل اس پر چڑھ دوڑی۔

"تمہیں ضرورت کیا تھی خرم سے بات کرنے کی۔ منگنیاں ٹوٹتی ہیں تو باتیں تو بنتی ہیں لیکن پھر آہستہ آہستہ سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ تمہارے اس طرح پوچھنے سے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ہمیں منگنی ٹوٹنے کا بڑا دکھ ہے۔"

"دکھ تو مجھے واقعی ہے نمل۔" رومیلہ بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ بولی۔

"خرم کی تمہارے ساتھ شادی پر مجھے محض اس لیے اعتراض تھا کہ وہ تمہارے ساتھ مخلص نہیں ہے لیکن اب مجھے لگتا ہے وہ واحد اعتراض بھی دور ہو گیا ہے۔ اسے منگنی توڑنے کے بجائے ایک بار اپنے دل کی بات کھل کر تم سے کہنی چاہیے تھی۔ مگر شاید اس نے تمہارے رویے کی سختی دیکھتے ہوئے ایسا کوئی ارادہ نہیں کیا جو کہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی حماقت ہے۔" نمل اس کی بات پر خاموش ہی رہی۔

خرم کے رویے کو صحیح کر وہ خود الجھی ہوئی تھی۔ بے شک اسے کبھی خرم کی طرف سے کسی خوب صورت اظہار اور نازک احساسات کی خواہش نہیں رہی مگر رشیدہ کو اس رشتے کے ٹوٹنے سے بہت دکھ ہوا تھا۔

گھر کے ماحول میں پھیلی کشیدگی دیکھ کر اسے واقعی — خیال آ رہا تھا کہ اگر بیچ کی کوئی راہ نکل آتی تو کتنا اچھا

ہوتا۔

اسے خاموش دیکھ کر رومیلہ نے موضوع بدل دیا۔

"اچھا تم سناؤ تمہارے یونیورسٹی آنے کے کچھ امکان پیدا ہوئے کیا۔"

"فی الحال تو ابو بہت غصے میں ہیں۔ ابھی ایک ڈیڑھ ہفتے تک تو کوئی امکان نہیں۔" نمل کی بات پر رومیلہ نے ایک ُدو ادھر ادھر کی باتیں کر کے فون بند کر دیا۔

نمل سے اس موضوع پر اب بات کرنا بے کار تھا۔ وہ اب کچھ نہیں کر سکتی تھی مگر رومیلہ کا دل چاہتا تھا کہ خرم ایک بار کھل کر اپنے احساسات کا اظہار کر دے۔ آیا اسے نمل سے محبت ہو گئی ہے یا یہ سب صرف انانیت پر مبنی ایک عقل مندانہ فیصلہ ہے۔ جس کے پیش نظر اپنی انا سے ہٹ کر سب کی بہتری ملحوظ ہوتی ہے۔

جیسے کہ الیان کر رہا تھا۔ اس نے رومیلہ سے ساری کدورت بالائے طاق رکھ کر بالکل دوستانہ ماحول بنا لیا تھا۔ اگرچہ اس سے بات وہ ہمیشہ شگفتہ غفار اور ریاض غفار کی غیر موجودگی میں کرتا تھا مگر ایک اس کے رویّے کی نرمی شگفتہ غفار کے خاموش نظروں کے کوڑوں پر مرہم رکھ دیتی تھی۔

رومیلہ نے یونیورسٹی جانا شروع کیا تھا تو ایک دن جب شگفتہ غفار اور ریاض غفار گھر پر نہیں تھے۔ الیان آفس سے جلدی اٹھ آیا اور اسے زبردستی بازار لے گیا۔

"جو کپڑے تم شادی سے پہلے پہن کر جاتی تھیں وہی تم اب بھی پہن کر جاؤ گی تو لوگ کیا سوچیں گے تمہیں ایک ٹھیک ٹھاک کلیکشن کی ضرورت ہے یونیورسٹی جانے کے لیے۔" الیان دو ٹوک لہجے میں بولا۔

رومیلہ نے بحث کے لیے منہ کھولا تو وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"اگر ممی کچھ پوچھیں تو کہہ دینا میرے جہیز کے کپڑے ہیں۔"

"میرے جہیز کے کپڑے میرے پاس واقعی موجود ہیں۔" رومیلہ نے بحث سے پہلے ہی تھک کر بتایا۔

"گھر میں تم ہر وقت ان چار کپڑوں میں گھومتی ہو اس سے صاف ظاہر ہے کہ تمہارے جہیز کے کپڑے صرف فنکشنز اور پارٹیز میں پہننے کے قابل ہیں۔ ان میں تم یونیورسٹی تو نہیں جا سکتیں نا۔" الیان کی بات میں اتنا وثوق اور وزن تھا کہ رومیلہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اس کے جہیز کے کپڑے یونیورسٹی میں پہننے کے قابل نہیں تھے اور پھر الیان کے ساتھ وقت گزارنے کا تجربہ رومیلہ کے لیے بہت انوکھا اور خوب صورت ہوتا تھا کیونکہ ایسے موقع بہت کم میسر آتے تھے۔

رومیلہ بازار میں کپڑوں اور دیگر اشیا سے زیادہ الیان کی سنگت کو محسوس کرنے میں مصروف رہی۔ الیان نے خود ہی اس کے لیے کافی سارے ریڈی میڈ کپڑے اٹھا لیے۔ وہ تو اتنے پیسے خرچ ہونے پر شرمندہ ہی ہو رہی تھی۔ مگر ایک چیز اسے پتا چل گئی تھی کہ نا صرف الیان کی پسند بہت اچھی ہے بلکہ دوسروں پر خرچ کرنے کے معاملے میں وہ بالکل بھی بخیل نہیں ہے۔

اس نے رومیلہ کے لیے ہر چیز بہت عمدہ اور پرائز ٹیگ دیکھے بغیر خریدی تھی۔ اسی لیے جب گھر پہنچنے پر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو رومیلہ نے خاص طور پر اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اسے پکار لیا۔

"الیان۔" الیان چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے کبھی اس طرح الیان کا نام نہیں لیا تھا۔

"تھینک یو سو مچ۔" رومیلہ کا لہجہ بھاری ہو گیا تھا۔ الیان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر بغیر کچھ بولے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رومیلہ بھی اپنے کمرے میں آکر سارے شاپرز بستر پر ڈال کر بستر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے الیان کی سنگت میں وہ جتنی خوش تھی گھر آتے ہی اچانک اس پر اتنی ہی اداسی طاری ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ دائمی نہیں تھا۔ بلکہ ایک خواب کی طرح تھا جو نیند ٹوٹتے ہی نیند کے ساتھ غائب ہو جاتا تھا۔ بس دیکھنے والی بات یہ تھی کہ نیند کا دورانیہ کتنا طویل ہوتا ہے اور پھر جب یہ طے ہو کہ اس خواب کو بکھر ہی جانا ہے تو وہ جتنا طویل ہو گا اتنی تکلیف دے گا ٹوٹنے پر۔

وہ خالی الذہنی کے عالم میں جانے کتنی دیر ایسے ہی بیٹھی رہی کہ تب ہی سرداراں نے آکر ریاض غفار کے بلانے کا بتایا تو وہ ایک دم چونک اٹھی۔

وہ گھر بھی آ گئے اور اسے پتا بھی نہیں چلا۔ وہ تو کرائی کو "تم چلو میں آتی ہوں" کہہ کر تیزی سے باتھ روم میں گھس گئی۔

ہاتھ منہ دھو کر بال ہاتھوں سے ٹھیک کرتی جب وہ نیچے کامن میں پہنچی تو سب کو وہیں ٹی وی کے سامنے براجمان پایا۔ اسے دیکھتے ہی شگفتہ غفار کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات مزید گہرے ہو گئے۔ رومیلہ کچھ پریشان ہو کر سب کو دیکھنے لگی۔ سب سے پہلا خیال یہی آیا جانے اس سے کیا غلطی ہو گئی یا پھر ابرار بھائی نے ان سے کچھ کہہ دیا۔

وہ سلام کر کے منتظر نظروں سے ریاض غفار کو دیکھنے لگی۔ جن کی سمجھ میں شاید یہ نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں۔ آخر وہ سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے رک رک کر کہنے لگے۔

"کل بریرہ اپنے شوہر کے ساتھ آ رہی ہے۔ حامد تو دو دن رہ کر چلا جائے گا مگر نانی اماں ساتھ آ رہی ہیں اور وہ کافی دن رکیں گی۔" وہ کہہ کر ایک دم خاموش ہو گئے۔ رومیلہ سمجھ ہی گئی تھی وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ تب ہی تو شگفتہ غفار کے چہرے پر اتنی ناگواری پھیلی ہے کیونکہ الیان اور رومیلہ کو ان کے سامنے خوش حال میاں ُبیوی کے طور پر رہنا ہو گا جو کہ شگفتہ غفار کے لیے نہایت مشکل صورت حال ہو گی۔

"ان لوگوں کے سامنے ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے بریرہ کی سسرال پر کوئی برا تاثر پڑے۔" ریاض غفار اپنی بات کہہ کر الیان کو دیکھنے لگے تو الیان ان کی مشکل آسان کرتے ہوئے فوراً بولا۔

"رومیلہ سمجھ گئی ہے ڈیڈی آپ فکر مت کریں۔" الیان تو اس کے آنے سے پہلے ہی یہ بات کہہ سکتا تھا۔ مگر شگفتہ غفار کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ انہیں اگر بھنک بھی پڑ جاتی کہ الیان اور رومیلہ کے بیچ کوئی بات چیت ہے تو وہ ابرار کی ساری دھمکیوں کو بھول بھال کر رومیلہ کو تاڑ کر رکھ دیتیں۔

اس لیے جب اس نے ان سب کی آمد کے متعلق سنا تو اس نے خود ہی ریاض غفار کو مشورہ دیا کہ آپ رومیلہ کو بلا کر سمجھا دیں کہ اسے ان سب کے سامنے کس طرح رہنا ہے اس کا یہ اجنبیوں والا انداز نانی اماں تو کیا خود حامد کو بھی مشکوک کر دے گا ان لوگوں پر کچھ ظاہر نہیں ہونا چاہیے۔

شگفتہ غفار ُالیان کی بات پر بپھر گئیں مگر خود انہیں بھی پتا تھا کہ الیان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لہٰذا وہ اعتراض نہ کر سکیں اور محض بڑبڑا کر رہ گئیں۔

ریاض غفار الیان کی یقین دہانی پر فوراً وہاں سے اٹھ گئے تو الیان بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا رومیلہ بھی جانے کے لیے پلٹ گئی مگر شگفتہ غفار کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

"سنو لڑکی... نانی اماں اور حامد کا بہانہ کر کے الیان کے سر پر منڈلانے کی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے اسے اس کے نام سے مخاطب کرنا تک ضروری نہیں سمجھا۔

رومیلہ پلٹ کر کچھ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگی جو ایک ایک لفظ چبا کر بول رہی تھیں۔

"ہو سکتا ہے الیان تمہیں اپنے کمرے میں رہنے کے لیے کہے لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نانی اماں اور حامد سب جلدی سو جانے والے لوگ ہیں۔ ان کے اپنے اپنے کمروں میں چلے جانے کے بعد تم الیان کے کمرے میں جاتی ہو یا کسی دوسرے روم میں اس کی انہیں کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ ہاں بہ شرط یہ کہ تم اس بات کو

ظاہر نہ کرنا چاہو تو۔" رومیلہ زخمی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

اسے تو خیال بھی نہیں آیا تھا الیان کے کمرے میں جا کر سونے کا۔ اسے خود بھی علم تھا اتنے بڑے گھر میں حامد اور نانی اماں کو بھلا کیا اندازہ ہوگا کہ وہ کون سے کمرے میں موجود ہے اور اسے کون سے کمرے میں موجود ہونا چاہیے۔ مگر شگفتہ غفار کے ذہن میں یہ بات گھر کر چکی تھی کہ رومیلہ ان کے بیٹے کو پھنسانے کی کوششوں میں سرگرداں ہے۔ لہٰذا وہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیں گی۔

رومیلہ تاسف بھری نظروں سے انہیں دیکھتی رہ گئی مگر وہ اپنی بات کہہ کر اس کے احساسات محسوس کر لینے کے باوجود گردن اکڑا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

اگلے دن رومیلہ تو تیار ہو کر یونیورسٹی چلی گئی۔ ان لوگوں کو دوپہر تک آنا تھا۔ اسے گھر میں بیٹھنے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ شگفتہ غفار اپنی بیٹی کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے اس کی پسند کے کھانے بنانا چاہتی تھیں۔ چنانچہ رومیلہ کو چھٹی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس کی پڑھائی شروع ہونے پر شگفتہ غفار خوش ہیں۔

شاید اس لیے الیان نے اتنی آسانی سے اس کے لیے ڈرائیور اور گاڑی تک ارینج کر دی کہ وہ خود چاہتی تھیں کہ رومیلہ ہر وقت گھر میں رہنے کہ بجائے گھر سے نکل جائے۔ اسے گھر میں اکیلا چھوڑ کر اپنی پارٹیز میں جانا انہیں کچھ بے چین سا رکھتا تھا۔ وہ خود چار ساڑھے چار بجے تک گھر سے باہر رہنے لگی تو انہیں ایک عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ تب ہی انہوں نے کبھی اس کے آنے جانے پر کوئی طنز کا تیر نہیں چلایا۔

لہٰذا رومیلہ گھر پر رک کر ان کی خوشی غارت نہیں کرنا چاہتی تھی جو صبح سے ملازموں کو ہدایتیں دیتی پھر رہی تھیں کہ.....

بریرہ کا کمرہ ٹھیک کر دو۔

بریرہ کا باتھ روم اچھی طرح دھو دو۔

بریرہ کو گاجر کا حلوہ پسند ہے سردار اں گاجریں کش کر کے مجھے دے دو۔ میں چڑھا دوں، پھر تم بھون دینا۔

ان کے ہر ہر انداز سے بے پایاں خوشی جھلک رہی تھی۔ ان کے چہرے کو دیکھ کر لگ نہیں رہا تھا کہ وہ کبھی نفرت سے کسی کو دیکھ بھی سکتی ہیں۔ اس وقت وہ صرف ممتا کے جذبات سے چور ہو رہی تھیں۔ رومیلہ کی پلکیں بھیگنے لگیں تو وہ وقت سے پہلے یونیورسٹی کے لیے نکل گئی۔ اس پل اسے صحیح معنوں میں بریرہ پر رشک آ رہا تھا۔ وہ قسمت سے نالاں نہیں ہونا چاہتی تھی لیکن سینے میں بھر تا دھواں بار بار اس کی آنکھیں جلانے لگتا۔

سارا دن یونیورسٹی میں بھی وہ ان دونوں ماں بیٹی کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ "یقیناً" ادھر بریرہ بھی ماں کے گھر آنے کی خوشی میں ایسے ہی بولائے بولائے پھر رہی ہوگی۔ سنبل بخار کی وجہ سے یونیورسٹی نہیں آئی تھی۔ ورنہ شاید وہی اس کا دھیان بٹا دیتی۔ اس نے خود کو لیکچرز میں محو کرنا چاہا مگر کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ اس دن وہ جان بوجھ کر دیر سے گھر پہنچی۔ کیونکہ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا شگفتہ غفار کے ساتھ ساتھ بریرہ کی بھی چبھتی ہوئی نظریں برداشت کرنے کا۔

لیکن آخر کب تک فرار حاصل کر سکتی تھی۔ سوا پانچ بجے جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو وہ سب لان میں کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

الیان اور ریاض غفار دونوں بریرہ کی وجہ سے آج جلدی آ گئے تھے۔ اس نے نزدیک آ کر بغیر کسی کی جانب دیکھے اپنا بیگ ایک خالی کرسی پر رکھتے ہوئے سلام کر دیا۔ اتنے لوگوں کی بیٹھک میں ویسے بھی اجتماعی سلام کیا جاتا ہے اور اس نے جان بوجھ کر کیا تھا تاکہ شگفتہ غفار اور بریرہ کے تاثرات نہ دیکھنے پڑیں۔

نانی اماں ریاض غفار اور حامد نے آگے پیچھے اس کے سلام کا جواب دے دیا تو اس کا بھرم رہ گیا۔ جب وہ بیگ کرسی پر رکھ کر پلٹی تو نانی اماں نے اس کی جانب بانہیں پھیلا دیں۔ وہ ایک دم شرمندہ ہوتی ان کی جانب بڑھ گئی۔ انہوں نے بڑے والہانہ انداز میں اسے خود سے لگایا اور اس کا ماتھا چوم کر اس کی خیر خیریت پوچھنے لگیں۔

رومیلہ کا موڈ خود بخود خوش گوار ہو گیا۔ طبیعت پر چھایا بوجھل پن قدرے کم ہوا تو وہ کچھ دیر سب کے ساتھ وہیں بیٹھی رہی۔ پھر مغرب کی اذان ہونے پر سب ہی وہاں سے اٹھ گئے۔ نانی اماں جلدی کھانا کھا کر سونے کی عادی تھیں۔ لہٰذا انہیں مغرب کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد کھانا دے دیا گیا تھا تاکہ وہ عشا کے بعد سو جائیں۔ البتہ حامد بریرہ اور شگفتہ غفار بازار کے لیے نکل گئے۔ حامد کو بہنوں کے لیے کچھ چیزیں لینی تھیں اور حامد کے پاس بس کل کا دن تھا۔ پرسوں صبح صبح اسے چلے جانا تھا اور یہ بات تو رومیلہ کو پہلے سے پتا تھی کہ شگفتہ غفار اور بریرہ میں سے کوئی بھی اسے چلنے کے لیے ہرگز نہیں کہے گا۔ لہٰذا ان کے بغیر پوچھے چلے جانے پر اسے کوئی صدمہ نہیں ہوا۔

ریاض غفار اپنے کمرے میں چلے گئے تھے تو وہ اپنی کتابیں لیے لان میں آ بیٹھی۔

اسے پڑھائی پر توجہ دینے کی سخت ضرورت تھی۔ پچھلے کئی ہفتوں سے اس کی بالکل پڑھائی نہیں ہوئی تھی اور پچھلے کچھ دنوں سے وہ خاصی محنت بھی کر رہی تھی۔ لیکن آج تو وہ صرف کتاب کھول کر اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ جبکہ ذہن کہیں اور پرواز کر رہا تھا اور کسی ایک نقطہ پر ٹک بھی نہیں رہا تھا۔ اب لامتناہی سوچوں کا سیلاب جو امڈا چلا آ رہا تھا۔ مگر ایک دم کسی نے اس پر بند باندھ دیا۔

رومیلہ نے بری طرح چونک کر اپنے سامنے آئی چیز کی طرف دیکھا۔ وہ ایک رول کیا ہوا اخبار تھا۔ اس اخبار کو دیکھتے ہوئے رومیلہ کی نظریں خود بخود اخبار کو تھامے ہاتھ اور ہاتھ سے ہوتیں الیان کے چہرے پر جا ٹھہریں۔

"دکھانا تو تمہیں صبح میں ہی چاہتا تھا مگر موقع نہیں ملا۔" الیان نے خود ہی رول کیا اخبار کھول کر ایک صفحہ اس کے سامنے کر دیا۔

رومیلہ الجھن بھری نظروں سے اخبار کی سرخی کو دیکھنے لگی۔ جہاں چند ملزمان کی گرفتاری کی خبر لگی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" رومیلہ نے صرف سرخی پڑھنے کے بعد اخبار ہاتھ میں لیے بغیر بوریت سے بھرے لہجے میں پوچھا۔

"یہ گلفام اور مرزا صاحب ہیں۔ ساتھ میں وہ گلفام بھی جو کینیڈا میں مقیم ہے۔" رومیلہ ایک بار پھر بری طرح چونک اٹھی۔

اب کی بار وہ بے اختیار اخبار ہاتھ میں لے کر تصویر پر غور کرنے لگی۔

اس نے مرزا صاحب اور ان کے بیٹے گلفام کو اتنی بار دیکھا ہی نہیں تھا کہ ایک نظر میں پہچان پاتی۔ ہاں البتہ اب غور کرنے پر وہ دونوں شکلیں اسے یاد آ گئیں ان کے ساتھ دو لوگ اور بھی کھڑے تھے۔ ایک تھوڑا بوڑھا سا آدمی تھا جبکہ ایک نا صرف نوجوان تھا بلکہ خاصی اچھی شکل و صورت کا مالک تھا۔

"یہ وہ گلفام ہے جس سے کینیڈا میں نمل آفس جا کر ملی تھی اور یہ بڈھا جو تم لوگوں کے سامنے کبھی نہیں آیا ان کے گینگ کا لیڈر ہے۔ کسے لوٹنا ہے، کب لوٹنا ہے، کیسے لوٹنا ہے؟۔ یہ سب یہی پلان کرتا ہے۔" الیان نے ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب رکھی اور اس پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم لوگ پہلے لوگ نہیں ہو جو ان کے دھوکے کا شکار بنے۔ انہوں نے بہت لڑکیوں کی زندگیاں برباد کی ہیں۔ پاکستان میں مقیم گلفام جس کا اصل نام کامران ہے۔ شادی کر کے لڑکیوں کو کینیڈا لے جاتا ہے اور وہاں ان دونوں کے پاس چھوڑ کر کچھ دنوں کے لیے روپوش ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ اس لڑکی کو کچھ مہینے حبس بے جا میں رکھ کر اس

سے غلط کام کراتے ہیں اور جب وہ پوری طرح سے برباد ہو جاتی ہے اور واپس اپنے گھر جانے کے قابل نہیں رہتی کیونکہ اسے پتا ہوتا ہے اب گھر والے بھی اسے قبول نہیں کریں گے۔ الٹا گھر والوں کو اس کی وجہ سے بدنامی کا سامنا کرنا پڑے گا تب یہ دونوں ان لڑکیوں کو آگے بیچ دیتے ہیں۔

یوں سمجھ لو یہ لوگ، بہت چھوٹے پیمانے پر کام کرتے ہیں۔ آگے جو گینگ ہے جنہیں یہ لڑکیاں سپلائی کرتے ہیں۔ ان تک تو کینیڈا کی حکومت بھی نہیں پہنچ پائی کیونکہ ان کی جڑیں بہت اندر تک پھیلی ہیں۔ انہیں لڑکیوں کے سر پر بندوق رکھ کر کچھ نہیں کرانا ہوتا۔ ان کے پاس لڑکی ٹرینڈ ہو کر آتی ہے۔ وہ پس پردہ رہ کر صرف ہدایتیں دیتے ہیں کہ اسے کب اور کہاں جانا ہے۔ اس کام کا بھتہ علاقے کی پولیس کو بھی جاتا ہے۔ تاکہ وہ خاموشی سے انہیں اپنا کام کرنے دے۔ اللہ نے چاہا تو کبھی نہ کبھی وہ لوگ بھی پکڑے جائیں گے۔ لیکن فی الحال ان چاروں کے چھوٹنے کی کوئی امید نہیں۔" رومیلہ سن بیٹھی الیان کو سن رہی تھی۔

وہ خبر پڑھنا چاہتی تھی لیکن آنکھوں میں اتنی دھند جمع ہو گئی تھی کہ سارے الفاظ گڈمڈ ہو گئے تھے۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اخبار پر گرفت اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ کناروں سے اخبار بالکل چرمرا ہو گیا تھا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ جو کچھ اس نے سنا تھا وہ معمولی بات نہیں تھی۔ یہ سب اس کے ساتھ ہو سکتا تھا ہونے والا تھا۔ لیکن اس پاک ذات نے جب عرش بنایا تھا تو اس پر لکھ دیا تھا کہ وہ اپنے بندوں پر ہمیشہ رحیم رہے گا۔

اور یہ صرف اور صرف اس کا رحم تھا کہ وہ اس عذاب میں مبتلا ہونے سے بچ گئی تھی۔ ظاہری اسباب میں بھلے ہی سب تمل نے کیا تھا۔ مگر تمل کو اللہ تعالیٰ نے چنا تھا اس سعادت کے لیے ورنہ بشر کی کیا بساط کہ وہ ارادہ کرے اور عمل کر سکے۔

اس کے دل میں اگر خیال بھی آتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ ڈالتا ہے ورنہ اگر رومیلہ کے نصیب میں یہ تباہی لکھی ہوتی تو تمل کینیڈا جا کر اس شخص سے ملنے کا ارادہ بھی نہیں کرتی۔ کیسے بال بال بچایا تھا اس رحیم و کریم ذات نے اسے ورنہ آج پتا نہیں وہ کہاں ہوتی۔ خوف اور احساس تشکر سے رومیلہ کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔

"بے فکر رہو یہ لوگ اب باہر نہیں آئیں گے اور جو لوگ ان کے پیچھے ہیں وہ بھی یہ نہیں جانتے کہ یہ سب کس نے کیا ہے۔ میں نے خود منظر پر آئے بغیر بہت ہی خفیہ طریقے سے اپنے ذرائع استعمال کیے ہیں۔ تاکہ میرے ذریعے تم اور تمہارے ذریعے تمل تک کوئی تانے بانے بنتا پہنچ نہ سکے۔" الیان سمجھا وہ خوف زدہ ہو رہی ہے تب ہی اسے تسلی دینے لگا۔

وہ اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی مگر اس قابل ہی نہیں تھی کہ کچھ بول پاتی۔ کچھ کہنے کی کوشش میں وہ ایک دم ہی رو پڑی تو الیان نے اس کے ہاتھ سے اخبار لیتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ریلیکس یار۔۔۔ تم اب بالکل محفوظ ہو۔ پتا نہیں ابرار نے کیا دیکھ کر شادی طے کی تھی۔ یہ لوگ عام طور پر ایسے گھروں کو ٹارگٹ کرتے ہیں جہاں لڑکیوں کی لائن لگی ہوتی ہے۔ گھر میں باپ، بھائی نہیں ہوتے جو ڈھنگ سے معلومات کر سکیں۔ بس باہر کا رشتہ سن کر بیوی، ماں جلد سے جلد لڑکی کو اپنے گھر کا کرنے کے چکر میں اس کے سر سے چادر ہی کھینچ لیتی ہے۔

یہ باپ، بیٹا کچھ عرصے کسی نئی جگہ پر بزنس یا جاب کرنے تھوڑا پیسہ کمانے کے ساتھ ساتھ تھوڑے تعلقات پیدا کرتے ہیں اور پھر کسی شکار کو ڈھونڈ کر پورا جال بچھاتے ہیں۔ اسی کارروائی کے درمیان ان کی ابرار سے ملاقات ہو گئی اور ان ـــــ لوگوں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ شخص بغیر کسی معلومات کے رشتہ دے دے گا۔" الیان ہاتھ میں اخبار پکڑے ان لوگوں کی تصویریں دیکھنے لگا جن کے چہرے بالکل صاف ستھرے تھے۔ کوئی خباثت اور کسی

قسم کی مکاری ان کے چہروں سے نہیں چھلک رہی تھی۔ لیکن اندر سے وہ لوگ کتنے سیاہ اور کتنے غلیظ تھے یہ اب بہت لوگ جانتے تھے۔

رومیلہ روتے روتے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا۔ ؟یقین نہیں آرہا کہ یہ لوگ باہر آ کر تم سے بدلہ نہیں لیں گے۔" الیان اس کے دیکھنے کو کچھ اور ہی سمجھا۔

"اول تو ایسا ممکن نہیں لیکن خدانخواستہ ایسا ہوتا بھی ہے تو کیا ہر شخص یہ سوچ کر خاموش ہو جائے کہ ان سے بدلہ لے کر ان سے دشمنی ہو جائے گی تو انہیں ان کے انجام تک کون پہنچائے گا۔ کسی کو تو آگے بڑھنا ہوگا نا ان جرائم کی روک تھام کے لیے۔ جو لوگ ان کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ وہ انہیں ڈھونڈ نہیں پاتے اور جو بچ جاتے ہیں۔ وہ اپنی آئندہ زندگی کو محفوظ رکھنے کے لیے ان سے الجھنا نہیں چاہتے۔ تو پھر آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے۔ خیر تم بے فکر رہو۔ میں نے کہا نا تم پر یا تمل پر شک تک نہیں کر سکتا کوئی۔ میں خود نہیں چاہتا کہ یہ لوگ اگر جیل سے نکل آئیں یا ان کے گینگ کا کوئی دوسرا آدمی تم لوگوں کو تکلیف پہنچائے۔" الیان بڑے سکون سے رسانیت بھرے لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

رومیلہ کو یہ فکر تو تھی ہی نہیں کہ یہ لوگ اس سے بدلہ لے سکیں گے یا نہیں۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کے حضور تشکرانہ آنسو بہا رہی تھی۔ جس نے کسی طرح اس کے ناموس کی حفاظت کی تھی اور اسے ان شیطان صفت لوگوں سے بچا کر الیان جیسے شخص کی پناہ میں دے دیا۔ جس کی اپنی بہن ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں اپنا ذہنی سکون گنوا بیٹھی تھی۔ شاید اسی لیے اس کے دل میں ان عورتوں کے لیے اتنا درد تھا جو ان لوگوں کے ہتھے چڑھ چکی تھیں اور اسی لیے وہ ان لوگوں کو سلاخوں کے پیچھے کرنے کے لیے اس قدر سرگرم عمل رہا کہ اتنی جلدی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

رومیلہ بے اختیار عقیدت بھری نظروں سے الیان کو دیکھے گئی جو اس کے جذبات سے بے خبر مزید کہہ رہا تھا۔

"اچھا ایک بات کا خیال رکھنا۔ ان کی گرفتاری کی خبر تو سارے شہر کو ہو چکی ہوگی لیکن کسی کو یہ مت بتانا کہ یہ سب میں نے کیا ہے۔ تمل کو چھوڑ کر کیونکہ وہ کافی سمجھ دار ہے لیکن ابرار سے کچھ مت کہنا اور نہ ہی ایسے کسی شخص سے جس کے ذریعے ابرار تک یہ بات پہنچنے کا خطرہ ہو۔"

"کیوں؟" رومیلہ بے ساختہ بولی۔ اس کے خیال میں تو سب سے پہلے ابرار کو ہی بتانا چاہیے تھا کہ اس کا فیصلہ کس قدر غلط تھا۔ اس نے تو اپنی بہن کو کھائی میں دھکیل دیا تھا۔

"کیوں، کیا کرے گا وہ جان کر؟" الیان نے الٹا اسی سے پوچھا۔

"آپ نے اتنی محنت۔۔۔"

"میں نے یہ ساری محنت اسے دکھانے کے لیے نہیں کی۔ جس مقصد سے کی تھی وہ پورا ہو گیا یعنی کہ ایسے لوگوں کو معاشرے میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔" الیان نے رومیلہ کی بات کاٹ دی پھر اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"ابرار بالکل بھی سمجھ دار انسان نہیں ہے وہ صرف ایک انا پرست اور ضدی شخص ہے۔ وہ کوئی کام کسی کی بھلائی کے لیے نہیں کرتا۔ جب اسے پتا چلا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ اسے اسی وقت ان لوگوں کے خلاف ایکشن لینا تھا۔ جبکہ وہ یہ سب کرنے کی بجائے انہیں نیچا دکھانے کی کوشش میں جت گیا اور پھر اس کوشش میں اس نے ان ہی لوگوں کا راستہ اپنا لیا۔ یعنی ایک لڑکی کا اغوا۔

اور اس کے بدلے میں اس نے مانگا کیا اپنی بہن کی سیفٹی یا اس کا کیریئر؟

نہیں، اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ وہ جو کرنا چاہتا تھا کر چکا ہے۔ اسے ان لوگوں پر ثابت کرنا تھا کہ وہ دو دن میں اپنی بہن کی شادی کر سکتا ہے سو اس نے کر دی۔

اسی لیے میں اسے بتانے سے منع کر رہا ہوں۔ یہ جاننے کے بعد کہ یہ سب میں نے کیا ہے۔ وہ شرمندہ ہرگز نہیں ہو گا کہ یہ تو بھائی ہونے کی حیثیت سے اسے کرنا چاہیے تھا۔ بلکہ وہ جیل میں گلفام سے ملنے جائے گا اور اسے چڑائے گا کہ یہ سب اس نے کیا ہے بلاوجہ کے ڈائیلاگ بول کر اترائے گا اور گلفام اس سے بدلہ لینے کے لیے بھڑک اٹھے گا۔

وہ اگر خود باہر نہیں بھی آسکا تو بھی اپنے کسی آدمی کے ذریعے ابرار کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور وہ تو ہے ہی ایک کمینہ انسان لہٰذا وہ بھی ابرار کی طرح اس کی بہن پر ہی وار کرے گا۔" رومیلہ اس کی باتوں کی قائل ہونے کے ساتھ ساتھ بری طرح شرمندہ بھی ہو گئی اور صفائی دینے والے انداز میں کہنے لگی۔

"ابرار بھائی ایک انا پرست انسان ضرور ہیں۔ مگر وہ کوئی مجرم پیشہ نہیں ہیں۔ بریرہ کو اغوا...."

"میں جانتا ہوں۔" الیان نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"جب میں گلفام کے بارے میں اتنا کچھ پتا کر سکتا ہوں تو کیا ابرار کی معلومات نہیں کرا سکتا۔" الیان نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

"دیکھو رومیلہ کچھ لوگ مجبوری میں جرائم کرتے ہیں اور کچھ لوگ فطرتاً مجرم ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے اس نے بریرہ کو کوئی تکلیف نہیں دی۔ بلکہ بڑی عزت سے رکھا۔ لیکن اس کی فطرت میں سرکشی موجود ہے اگر اس کا کام ٹھیک طریقے سے نہیں ہو رہا ہو گا تو وہ اسے فوراً غلط طریقے سے کر لے گا۔ ایسے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں اور انہیں مجرم ہی کہا جاتا ہے" الیان کے گمبھیر لہجے پر رومیلہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر بہت ٹھہر ٹھہر کر پوچھنے لگی۔

"تو کیا... آپ ابرار بھائی.... سے بھی بدلہ لیں گے۔" رومیلہ کے سوال پر الیان خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ اس کا جواب جاننے کے لیے جتنی بے چین تھی الیان کی خاموشی اتنی ہی طویل ہو رہی تھی۔ کتنی دیر وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے کہ اچانک گیٹ کے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی تو ان دونوں کی توجہ گیٹ کی جانب ہو گئی۔

چوکیدار کے گیٹ کھولنے پر فور وہیل اندر داخل ہو گئی۔ شگفتہ غفار، حامد اور بریرہ کے ساتھ شاپنگ سے لوٹ آئی تھیں۔

رومیلہ فور وہیل کو پورچ میں داخل ہوتا دیکھ کر اپنی جگہ سے فوراً اٹھ گئی۔ اس سے پہلے کہ شگفتہ غفار کی نظر اس پر پڑتی وہ جلد سے جلد اندر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ایک قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ جھٹکے سے رک گئی۔ اس کا ہاتھ الیان کے ہاتھ میں تھا جسے شگفتہ غفار کے آجانے پر بھی الیان نے چھوڑا نہیں تھا۔

رومیلہ شدید حیرانی سے اسے دیکھنے لگی جو یک ٹک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ الیان نے اس کا ہاتھ کیوں پکڑ رکھا تھا اور اگر پکڑا بھی تھا تو اب شگفتہ غفار کے آجانے پر چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔ مگر وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ اس سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ وہ الیان پر سے نظریں ہٹا کر گاڑی کی طرف دیکھنے لگی جو پورچ سے گزر کر گھر کے دروازے کے سامنے رک گئی تھی۔ سب سے پہلے اس میں سے حامد اترا تھا۔ اس کے بعد شاپرز سے لدی پھندی بریرہ اور پھر شگفتہ غفار کی باری تھی۔

رومیلہ کی گھبراہٹ سوا ہو گئی تھی۔ مگر الیان تھا کہ اس کی حالت سمجھنے کے باوجود اس کا ہاتھ نہیں چھوڑ رہا تھا۔

(باقی آئندہ)

مکمل ناول

سودا

سمیرا حمید

"او میری میا! مجھے معاف رکھیو ہیجڑے تو یہ رہے۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور دونوں ہاتھ اس کے عین منہ کے سامنے لا کر زور سے تالی بجائی۔

ڈھول بجایا جا رہا تھا۔ تینوں آوازیں ڈوب ابھر رہی تھیں۔

وہ بت بنی کھڑی تھی۔ سرخ ریشمی سوٹ میں گہرا میک اپ تھوپے بالوں کو کھولے دوپٹے کو دور پرے جھٹکے وہ تالی پیٹ رہا تھا ایک پیر کو اٹھائے ناچ ناچ کر اس کے گرد گول گول گھوم رہا تھا۔

وہ چلانے لگی وہ ناچتا ہی رہا تالی کی آواز نے زور پکڑ لیا ڈھول اور زور سے بجنے لگا الٹے سیدھے بال گہرا میک اپ گڈمڈ ہونے لگے گول گول گھومتی زمین بھی اسی کے ساتھ پیر اٹھائے ناچنے لگی۔

نوری اور زیادہ چلانے لگی چلاتی ہوئی ہی ہڑبڑا کر اٹھی۔

یہ گرو اس کی جان لے گا اس کی نیندوں میں آجاتا اسی ڈر سے وہ سوتی نہیں تھی آدھی جان نوری کی نکل چکی تھی اب پوری لے کر ہی وہ ٹلے گا' رات کا پہلا پہر ہی گزرا تھا وہ ایسے ہانپ رہی تھی جیسے اپنی پیدائش کے دن سے بھاگی پھر رہی ہو کائنات کے سارے حشرات اس کے پیچھے اسے نوچ کھانے کے لیے لگے ہوں۔ وہ اٹھ کر باہر بھاگی چھوٹے سے لان میں کرسی پر بیٹھ گئی ٹھنڈے گھاس پر تپتے پیر رکھے جاڑے کی راتوں میں وہ بنا شال سوئیٹر کے بجتی تالیوں اور باز گشتوں سے کانپ رہی تھی۔

میری میا۔

اس نے سر تھام لیا اور کانپتی رہی

"نوری" کوئی اسے جھٹکے دے رہا تھا وہ ہڑبڑائی کہ وہی آگیا

"جا جا کر اندر سو" وہ جھنجلایا ہوا کہہ کر چلا گیا' اس نے خوف سے اندر کی طرف دیکھا۔

"وہ آیا کہ آیا۔" اپنے کمرے میں وہ نہ جا سکی بس کمرے میں جس میں ساٹھ ہزار کا بیڈ چالیس ہزار کی دو کرسیاں اور بارہ ہزار والا میز رکھا تھا یا بیس ہزار کا قالین تھا جو ذرا سے حصے میں بچھا تھا سفید چمکتے ماربل پر گہرا سبز قالین' بہت کچھ تھا کمرے میں اس کی الماریوں میں اس سارے گھر میں کچن کی الماریوں میں فریج کے خانوں میں' بہت جمع کیا تھا ان دونوں نے گھر بھر میں بہت کچھ تھا بہت کچھ ان کے پیٹ میں جا چکا تھا پیٹ سے سارے جسم کی نالیوں میں خون بن کر پہنچا تھا انہوں نے بہت کچھ کھایا تھا' بہت پیا تھا' وہ کس کمرے میں جائے اور سو جائے؟؟ اس میں یا اس میں یا اوپر والے یا کسی بھی کمرے میں چلی جائے؟؟ نہیں وہ ہر جگہ ہے جہاں جہاں وہ سوتی ہے اگر وہ اڑ کر آسمان پر بھی جا سوئی تو وہ وہاں بھی ضرور آئے گا انہیں ہیجڑا کہنے والا۔

دن کا اجالا پھیل رہا تھا وہ اندر آئی اور دونوں بچیوں کے بیڈ پر جگہ بنا کر لیٹ گئی دونوں کے ہاتھوں کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔

بچے فرشتے ہوتے ہیں نا شاید کوئی فرشتہ اسے بچالے' کس سے؟؟ نوری کو نوری سے نوری کو نوری کے ہی شر سے۔

دونوں' بہت سال پہلے اپنے گاؤں سے بھاگ آئے تھے ذات پات' برادری' غیر برادری کا مسئلہ نوری کا ابا رشتہ کہیں پکا کر رہا تھا اس نے رات سے دن نہ ہونے دیا بھنک پڑتے ہی جاوید کے کان بھرے اور دونوں شہر بھاگ آئے چھ سات ماہ درباروں کے مہمان خانوں میں سوتے جاگتے رہے جاوید کام کرنے چلا جاتا رات کو وہیں آجاتا' دونوں نے نکاح کیا اور پہلی بچی ہوئی۔

دونوں ایک کمرے کے خستہ حال گھر میں رہنے لگے کمرہ اتنا چھوٹا کہ ہاتھ لگاؤ تو چھت چھولو۔ بیٹھے بیٹھے چاروں دیواروں کو پکڑ لو بارش ہو تو کمرے سے ہی پانی بھر لو گندی نالیوں اور گٹر کا سارا پانی اندر آجاتا دونوں نوالے گن گن کر کھاتے محبت کے لیے قربانی دے رہے تھے ایک وقت کا کھاتے تو اگلے تین چار وقت بھوکے رہتے گاؤں کا فقیر شہر کے غریب سے بھلا ہوتا ہے گاؤں میں بھوکوں مرنے کی نوبت نہیں آتی' رحمت ہے اللہ کی گاؤں والوں کے ساتھ' شہر والوں کی طرح اناج کے

دانے نہیں گنتے جاوید اور نوری نے ایسے دنوں کا کبھی نہیں سوچا تھا جاوید چار چار پراٹھے کھانے والا سوکھی روٹی سے بھی گیا دیسی مرغیاں کھانے والے قربانی کے موقع پر عید کے گوشت سے بھی گئے غربت' بہت بری ہوتی ہے شیطان پر سارے الزام ایسے ہی دھرے جاتے ہیں شیطان کا اگلا نام غربت ہے یہ۔ جو انسانیت کی معراج کے قصے لکھنے والے ہیں نا وہ غریب نہیں ہوتے ورنہ وہ طے کرتے کہ غربت میں شیطانیت معراج ہی ہوتی ہے

جاوید سبزی کی ریڑھی لگانے لگا گلی' محلے' کالونیوں' سوسائٹیوں میں جاتا ایک دن ایک زنانہ سا آدمی گھر لے آیا

"بھابھی سلام" اس کا انداز بھی زنانہ تھا۔

"رشید ہے یہ" جاوید بلاوجہ مسکرائے جا رہا تھا

"رشید کون رشید"

"رشید عرف چاند' رشید ولد بشیش ولد لاپتہ" بس رشید کا تعارف یہ ہی تھا۔

"اتنی سی ہے یہ" اسے دیکھ کر رشید نے چٹکی بنائی۔

"تیرے پاس دو پیسے نہیں کہ اسے کھلا دے" وہ سنجیدہ نظر آنے لگا جاوید اپنے پیلے دانتوں سے ہنسنے لگا۔

"چل تجھے منڈی لے کر چلوں۔"

جاوید رشید کے ساتھ جھٹ منڈی چلا گیا واپس آیا تو تازہ پھلوں کے کریٹ ساتھ تھے' دونوں اس پر ٹوٹ پڑے۔ سیر ہو گئے دونوں۔

چند دن گزرے تو وہ پھر سے آیا

"ہاں اب ٹھیک ہے" پھر جاوید کے کان میں سرگوشی کی۔

"پکی ہے نا یہ" جاوید نے صرف سر ہلایا

"فکر نہ کر تو باپ ضرور بنے گا میں تجھے باپ ضرور بناؤں گا۔"

"سچی۔" رشید چاند نے جاوید کا ماتھا چوم لیا کندھے پر ہمہ وقت دھرے چیک کے رومال سے آنکھیں صاف کیں۔ داڑھی نہیں تھی لیکن شیو بڑھی ہوئی دکھائی دیتی سفیدی مائل بال ایک ہاتھ کو سینے کے پاس رکھتا تھا لٹکا ہوا سا اور ایک ہاتھ سے اشارے کرتا بات کے دوران چال زنانہ نہ تھی بس انداز میں ہی کچھ جھلک دکھائی دیتی تھی۔

چند سال ہوئے وہ اپنی بنیاد چھوڑ چکا تھا۔ پہلے گاہک ڈھونڈتا تھا اب خود گاہکوں کی صف میں آکھڑا ہوا تھا' کرائے کے گھر میں رہتا تھا شاذ ہی گھر سے باہر نکلتا تھا جاوید سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

جاوید وہ تو جیسے تیار ہی بیٹھا تھا یہ سب کرنے کے لیے۔

چند ہفتے جاوید نے رات دن نوری کو بکری کا گوشت کھلایا' پھل دودھ پلایا خشک میوے لا کر دیے نوری رات دن اس طرح کھائے جاتی کہ پھر شاید ملے یا نہ ملے اس رات نوری بکرے کے گوشت کی ہڈیاں' بوٹیاں چبا رہی تھی کہ جاوید نے کہا کہ

"رشید کو ایک بچہ چاہیے" وہ خود بھی گوشت کو دانتوں سے نوچ نوچ کر کھا رہا تھا کہ آج بکرے کی ہر نسل ختم کر کے ہی اٹھے گا اتنی اہم بات اس نے اور ایسے بول دی جیسے سبزیوں کی قیمتیں بتا رہا ہو کہ منڈی میں یہ بھاؤ چڑھ گیا ہے۔

"میں نے کہا میں تجھے باپ ضرور بناؤں گا۔" اس نے انگلی سے دانت میں پھنسی بوٹی نکال کر دوبارہ چبائی۔

"تو کیسے؟" نوری گوشت کھانے میں اتنی مگن نہ ہوتی تو ذرا حیران ہوتی۔

"یہ ہے نا" جاوید نے اس کے پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا نوری نے نان کے ٹکڑے کو پٹخا منہ میں دبی بوٹی تھوکی۔

"کتی سمجھا ہے مجھے کہ بچے جنتی جاؤں اور تو اٹھا کر دے دے۔"

"نوری" جاوید دھاڑا۔

"تیرا ہے یہ بچہ بول۔ میرا ہے یہ بچہ میرا۔"

"تو اپنی کوکھ میں رکھتا تھا نا اپنا بچہ"

ایک تھپڑ پڑا نوری کے گال پر نوری نے سب

برتن، گوشت نان اٹھا کر پھینک دیے۔

"اگر تیرا باپ ڈھونڈتا آگیا ہمیں تیرے وہ بھائی تو تو دیکھتے ہی مار دیں گے ہمیں؟"

"تو؟" نوری پھنکاری

"اری او پاگل نہ سر چھپانے کے لیے جگہ ہے نہ جی داری کے لیے روپیہ، میں نے تیرا ساتھ نبھایا کہ نہیں بھگا لایا تجھے گاؤں سے تیرا باپ تو اس کتے کی شکل والے سے تیرا رشتہ کر رہا تھا۔"

"تو؟" نوری کی آواز کی لے وہی پرانی تھی۔

"تو کی بچی سمجھ نالی سے بھی گندے گھر میں سڑ رہے ہیں گھر بدل لیں گے۔ بڑے شہر چلے جائیں گے رشید پورے پانچ لاکھ دے رہا ہے۔"

تازہ تازہ بکرے کا گوشت کھاتی نوری کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

"پانچ لاکھ؟" اس کے انداز پر جاوید دلیر ہوا۔

"ہاں جی پانچ لاکھ اور یہ سارے پھل فروٹ بھی وہی لا رہا ہے یہ گوشت اور باڑے کا خالص دودھ وہ ہی لاتا ہے۔" نوری سوچ میں غرق ہو گئی۔

"وہ آدمی ٹھیک نہیں۔" وہ بولی۔

"بڑا نیک ہے وہ"

رشید جاوید کو سب صاف صاف بتا چکا تھا رہی نیک ہونے کی بات، تو وہ تھا یا نہیں لیکن پانچ لاکھ کے لیے اسے نیک بتانے میں جاوید کا کیا جاتا تھا۔

"بہت بھلا مانس ہے۔"

"میں کیوں دوں اپنا بچہ"

"اپنا اکیلی کا نہ بول میرا بھی ہے پگلی بات سمجھتی ہی نہیں ہے۔ بہت چکر لگائے اس نے یتیم خانوں کے اسے تو یتیم خانے والے گھسنے بھی نہ دیں، بہت گھن چکر بنا بے چارہ ایک تو پیسے لے کر بھاگ گئی۔ دو چار اور دھوکے ہوئے۔ کہتا ہے کسی ماں کی آہیں نہیں لے گا۔ ہاں جو ماں خوشی سے اس کی گود میں ڈال دے ورنہ ہزار بچے نہ اٹھا لیتا ہے کہ نہیں؟ بڑا دکھی ہے۔ بڑے دکھ سے بتا رہا تھا کہ نیک انسان بناؤں گا، اسے پڑھائے گا، سکھائے گا، ڈاکٹر بنائے گا لڑکی نہیں مانگ رہا، لڑکا پائی پائی جمع کر کے رکھی ہے اس کے لیے گھر بند کیے روتا تڑپتا رہتا ہے۔ بہت بھلا ہے مزاروں پر جاتا ہے چادریں چڑھاتا ہے۔ اس دن اذان ہو رہی تھی بولا جاوید اذان کے وقت نہیں بولتے اب خود دیکھ لے کتنا نیک ہے بڑا دلارا ہے قسم سے، کیا تو اور میں ایسے نیک ہیں؟ تو نے تو خود کبھی نماز نہیں پڑھی، پھر پیسے والا ہے، اچھی طرح بچہ پالے گا۔ تڑپ اٹھتا ہوں میں اس کے دکھ سن کر۔ انسان ہوں میں بھی۔"

جس وقت رشید جاوید کے ہاتھوں نیک ثابت کیا جا رہا تھا ٹھیک اسی وقت رشید ہاتھ جوڑے دربار پر کھڑا تھا، پہلے اس نے چادر چڑھائی پھر پھول پھینکے اس سے پہلے وہ تبرک بانٹ چکا تھا پھر ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا وہ گھنٹوں کھڑا رہتا۔

"میری بھی تو آس کوکھ خالی ہے۔"

ہر خواہش ایک کوکھ ہوتی ہے صدیوں بانجھ رہنے والی عورت کی کوکھ جو زمین و آسمان ہلا دینا چاہتی ہے لیکن کوکھ کو بھر لینا چاہتی ہے یہی کوکھ ہر انسان کے اندر اپنی اپنی شکل میں کروڑوں بار جنم لیتی ہے، سب کی اشکال جدا تو رشید کی شکل بھی جدا۔

"کورا کھو کھلا مرد ہوں تو کیا چاند ہوں تو کیا ٹیسیں اٹھتی ہیں ان ٹیسوں کو سرور دلانے کا من کرتا ہے بچے سینے سے لگانے کا۔ میاں کی میں نہیں کرنے والا میری خدمت کون کرے گا۔ میری بھی کوئی نہ کرے لیکن۔" وہ سسکنے لگا وہ جھوٹ بول رہا تھا۔

اس کے پاس کوئی بڑی دلیل نہیں تھی خدا کو دینے کے لیے ایسی دلیل جسے التجا میں شامل کیا جاتا ہے کہ التجا پر اثر بن جائے اس نے ہر دلیل کو پرے پھینکا کچھ اور مانگا تو کالا کر کے چھتر لگا مسجد بھیجوں گا اسے ڈاڑھی رکھے گا، حاجی بنے گا قسم پنج تن پاک کی، واسطہ ہے پیر و مرشد کا اسے اپنا راہ بنا رہا ہوں اسے اپنا راہ بنا رہا ہوں۔"

وقت گزر گیا رشید وہیں ہاتھ جوڑے کھڑا رہا وہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا، ہاتھ پھیلائے نہیں۔

وہ مانگ نہیں رہا تھا التجا کر رہا تھا حق سے مانگنے اور التجا میں بڑا فرق ہوتا ہے، یہ فرق بڑا خاص ہے۔ دعا بہت بڑا مان ہے، رشید نے خود کو اس مان کے قابل نہ سمجھا، گاہک کے بھاؤ تاؤ ۔۔۔ کرنے والے نے خود کو اس مان کے قابل نہ جانا کوئی دیکھ لے اور پوچھ بیٹھے کہ اتنی دیر سے بت بنے کیا مانگ رہے ہو تو؟ رشید کیا بتائے کہ "ماں اور باپ بننا چاہتا ہوں۔ دل کا ارمان ہے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ شادی کے قابل نہیں۔ باپ بن نہیں سکتا پھر بھی بچہ چاہتا ہوں۔"

چند سال ہوئے اس نے لاہوری کوٹھا چھوڑا تھا بڑا گھاگ تھا رشید چاند۔ گاہکوں کو ایسے گھیرتا جیسے گڑ آپ ہی آپ مکھیاں گھیر لیتا ہے۔ تازہ تازہ پرپرزے نکالتے اس کے گلاس سے پانی پیتے اس کے ہاتھ سے نمک چاٹتے نائیکہ بھر بھر بنک میں پیسے رکھواتی۔

اب رشید کے کانوں میں اسی نائیکہ کی بیٹھی بیٹھی آواز گونجتی تھی۔ گالیوں کی بھرمار اور ایسی باتیں جو وہ سن چکا تھا اور کہہ چکا تھا اور جو ان کے لیے کہنی سنی جائز اور باہر کی دنیا کے لیے غلیظ ترین گردانی جاتی تھیں اسے ہر پل سنائی دیتیں ایسی ہر آواز سے دھیان ہٹانے کے لیے اسے کوئی چاہیے تھا۔ اتنا پاگل بھی نہیں ہو گیا تھا لیکن بہت کچھ ہو گیا تھا، بدل گیا تھا تو کسی اور ہی راہ سے بدل گیا تھا، زندگی بھر کام سے لگا رہا اب خواہش سے لگ گیا تھا جو کام نہیں کیا تھا اب وہ کرنا چاہتا تھا اولاد والا بننا چاہتا تھا۔

رات دن گھر میں بند رہتا۔ اٹھ جاتا تو معلق ہو جاتا، سو جاتا تو کھو جاتا، ہوش میں آتا تو رونے لگتا اس کا حال برا تھا، برے حال سے ہی زندہ تھا۔

☼ ☼ ☼

رشید کے گھر کا دروازہ بج رہا تھا، منہ اور آنکھوں کو صاف کر کے وہ اٹھا۔

"مان گئی بھابھی جی۔" جاوید کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

"مان جائے گی فکر نہ کر۔ ورنہ میں اسے گاؤں چھوڑ آؤں گا۔"

"نہ ایسا نہ کرنا۔" رشید کو برا لگا۔

"تیرے پاس پیسے ہیں بھی کہ نہیں۔" جاوید کی آنکھیں سکڑیں۔

"چیک بک دکھاؤں۔"

"ہاں۔" جاوید چیک بک دیکھ کر ہی ٹلا۔

"بڑا پیسہ ہے نوری اس کے پاس، دو دو بنکوں میں پیسے رکھے ہیں۔"

"تو" نوری کو کوئی اور سوال ہی نہیں کرنا آیا اب تک۔

"یہ تو بار بار تو تو کسے سناتی ہے؟" جاوید چیک بک دیکھ آیا تھا اب بھی نہ بھڑکتا۔

"تو کیا کروں۔" وہ رونے لگی۔ "نہیں دل مانتا۔ خراب آدمی ہے نہ جانے اسے کیا سے کیا بنا دے گا پھر کیوں دوں اسے بچہ ضروری ہے کیا۔"

"پگلی ابھی تک نہیں سمجھی۔ ہمارے پاس کیا ہے؟ دوسرے بچے کو کیسے پالیں گے۔ یہ گڑیا کی طرف دیکھ شہر میں رہ کر بھی تجھے عقل نہیں آئی یہ جو بارشوں میں کیڑے نکلتے ہیں ان جیسی ہے یہ اپنی گڑیا شہریوں کے بچے دیکھے ہیں۔ تبھی ہمیں دکان کھول لوں گا گروی پر ایک اچھا گھر لے لیں گے یہ بچہ دن بدل دے گا وہ اسے پڑھائے گا لکھائے گا کیا ہم پڑھا سکیں گے ہم تو کھلا بھی نہیں سکیں گے خود بھی کھائیں گے وہ بھی پلتا رہے گا۔"

نوری چپ ہی رہی آج کل اسے کھانا نہیں پکانا پڑتا تھا جاوید روز بازار سے ہی لے آتا تھا ہر طرح کے گوشت ہی آ رہے تھے۔ مچھلی، تکے، کباب، کڑاہی، کوفتے۔ ہزار قسمیں تھیں گوشت کے پکوانوں کی، وہ دن گئے جب دونوں کو نمک کے ساتھ روٹی کھانی پڑتی تھی اب زیادہ نمک والا گوشت ایک طرف کر دیتے تھے کہ کڑوا ہے۔

چند ہفتوں بعد بارش ہوئی تو آس پاس کے گٹر بھر کر ابلنے لگے، پانی ان جیسے گھروں میں گھس آیا، بدبو مشکل سے نوری مرنے کے قریب ہو گئی۔

اب اس بدبو میں گزارا نہیں ہوتا تھا' پیٹ میں جو کچھ بھر بھر کر ڈالا باہر آنے کو تھا۔

رشید آیا' دیکھ کر چلا گیا' پھر آیا' سامان نکال کر باہر رکھا سامان بھی کیا چند چیزیں دونوں کو لے کر ایک خالی گھر آ گیا دو کمروں کا صاف ستھرا گھر تھا سامان وہاں لا کر جمایا۔

"خوش بھابھی جی۔" پہلی بار نوری سے سیدھی بات کی تھی اس نے نوری نے سر ہلا دیا۔ دو "ضرورت مند" اکٹھے ہو گئے رشید اور جاوید۔

جاوید نے سبزی کی ریڑھی ہی لگانی چھوڑ دی رزق گھر بیٹھے مل رہا تھا باہر نکل کر کمانے کی کیا ضرورت تھی' تھا ہی نکما جاوید' اس کے بھائی گاؤں میں جانوروں کی طرح رات دن کام کرتے اور وہ ادھر ادھر تانک جھانک میں رہتا اب کہاں کا کام؟ رشید کھلا رہا تھا انہیں' شروع میں وہ چھوٹے سے ایک ہوٹل میں رات دن برتن دھونے پر لگا تھا پھر ٹیبل مین بن گیا۔

"شہر کے لوگ۔" جاوید گالی دے کر کہتا۔ "اتنا کام لیتے ہیں اور چند سکے پکڑا دیتے ہیں۔" اب ٹھیک تھا رشید اسے لاکھ تھما رہا تھا اب سب ٹھیک تھا۔

رشید جاتا تو نوری کو دیکھ کر خفا ہو جاتا۔

"پرے ہٹو۔" جھاڑو چھین کے خود لگانے لگتا' برتن دھو جاتا' بستروں کی چادریں جھاڑتا' جاوید موڑھے پر بیٹھا دانتوں میں تیلی پھیرتا رہتا اور مسکرا مسکرا کر نوری کو چڑاتا۔

رشید کبھی جو سر لے آتا کہ تازہ تازہ رس نکال کر پیو۔ نوری سے زیادہ جاوید پی جاتا جگ بھر بھر کر۔ دودھ میں کیلا ڈالا اور پی جاتا' اس دن جاوید کے کان میں سرگوشی کی۔ "بھابھی جی کے پاؤں دبا دے۔" جاوید گلا پھاڑ کے ہنسا۔

"جا تو دبا دے یہ کام بھی تو کر دے۔" رشید کو سانپ سونگھ گیا جیسے سانپ نے ڈس لیا۔ "اب کہا تو زبان کھینچ لوں گا۔" جاوید سچ مچ ڈر گیا۔

"بازاری تو میں ہوں پر لگتا ہے تو بھی نیا نہیں۔" جاوید اندر تک بھڑک اٹھا لیکن پانچ لاکھ کا سوچ کر چپ رہا ورنہ اتنی بڑی بات پر ہاتھ پکڑ کر باہر کرتا کنڈی لگا کر آرام کرتا لیکن کمینی ہنسی ہنس کر چپ رہا۔

خالص دودھ' تازہ جوس اور ملک شیک پینے والی نوری پانی پیتی تو متلی ہوتی۔ دال روٹی کا سوچتی تو دل گھبراتا' جاوید گھر ڈھونڈ رہا تھا تین لاکھ گروی پر سوا ہوا رشید نے جھٹ تین لاکھ نکال کر پکڑا دیے' ڈھونڈ ڈھانڈ کر دائی کا انتظام کیا جس کمرے میں نوری پڑی کراہ رہی تھی اسی کمرے کی چھت پر رشید ہاتھ جوڑے لڑکے کے لیے التجا کر رہا تھا لڑکی اسے خود ہی نہیں لینی تھی وہ صرف ایک لڑکا ہی لے کر پال سکتا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا جاوید نے رشید کو آواز دی' رشید بھاگا نیچے آیا۔

"جا نکل جا دوبارہ کبھی ہمیں اپنی شکل نہ دکھانا۔" پاک ناموں کا ورد کرتے ہوئے رشید نے اپنے بازوؤں میں بچے کو تھام لیا اور سینے سے لگائے اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ وہ سارے انتظام پہلے ہی کر چکا تھا' بچہ ملتے ہی شہر سے نکل گیا بے شک وہ گھر میں بند رہتا تھا پھر بھی بہت لوگ اسے جانتے تھے۔

✻ ✻ ✻

نوری کئی دن خاموش رہی' چلنے پھرنے لگی تو اسے جاوید بازار لے گیا جس چیز پر ہاتھ رکھا وہ لے کر دی۔ فریج' ٹی وی' بیڈ' قالین سب مل گیا اپنی سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل پر جاوید اسے لیے لیے گھوما' بازاروں میں' ہوٹلوں میں' پارکوں میں نئی نئی چیزیں کھلائیں' نوری نے کبھی سمندری جھینگا نہیں کھایا تھا وہ تک کھلایا نوری دنوں میں ہٹی کٹی ہو گئی روز نئے کپڑے پہن لیتی رات کو چند بار رو لیتی پھر چپ کر جاتی' شاموں اور دوپہروں میں آہیں بھرتی جاتی اور سیب کیلا کھائے جاتی اور جلدی جلدی چکنے فرش پر گیلا کپڑا لگائے جاتی۔ آئینے کے سامنے بیٹھتی آنکھوں کے گرد حلقے دیکھتی اور کوئی نا کوئی کریم اٹھا کر منہ پر لگا لیتی۔

رشید نے پانچ لاکھ کا کہا تھا پورے آٹھ لاکھ دے کر گیا تھا اتنا مہنگا گوشت کا لوتھڑا خرید کر لے گیا تھا۔

بچے کی پیدائش کے تین دن بعد ایک ٹولہ ان کے گھر آ دھمکا تھا جاوید نے تو صاف انکار کیا کہ ان کے یہاں کوئی بچہ وچہ نہیں آیا گرو نے زور سے تالی پیٹی۔

"ہائے میری میا پیسے دھیلے پر سولہ ڈال بچے سے انکاری ہو رہا ہے' ہم پکے کام کرتے ہیں خبر نہیں ثبوت کے ساتھ آتے ہیں۔ لاؤں کیا اس دائی کو یہاں بول پھر بولے گا کہے گا پھر کہ کوئی بچہ وچہ نہیں۔ چل چھٹکی تو شروع ہو۔ ذرا آواز نکال باہر کی طرف آس پڑوس ہی اکٹھا کر لے۔ دادا' نانا تو یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا۔"

"میں نے کہا نکلو یہاں سے۔" جاوید بھڑک اٹھا۔

"کوئی بچہ نہیں ہے یہاں۔" جاوید نے گھنگھرو باندھتی چھٹکی کو دھکا دیا وہ فرش پر گر گئی۔

"اے۔" چھٹکی نے گالی دی اور تیوری چڑھائی۔

"آئے ہائے" گرو بھی بھڑک اٹھا تالی پر تالی بجانے لگا' چھٹکی بھی تالی بجانے لگی۔ ڈھولکی استاد بھی اٹھ کھڑا ہوا سب زور زور سے تالی بجانے لگے۔ تالی کا یہ وہ انداز تھا جو وہ غصہ' غم' دکھ اور سوگ میں پیٹتے ہیں۔

"او میری میا بیٹھے بٹھائے بچہ نگل رہا ہے۔" وہ صحن سے اندر کمرے میں جانے لگی جاوید نے دھکا دیا ایک کو' چھٹکی پھر دیوار کے ساتھ جا لگی دھکا کھا کر گرو الٹا جاوید کو دھکا دے کر اندر کمرے میں آ گیا۔ نوری چارپائی پر لیٹی تھی اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکی۔ تالیوں کی گونج کمرے میں پھیل گئی دروازے پر جاوید ڈھولکی استاد کے ساتھ الجھ رہا تھا۔

"اے چھٹکی یہ رہی زچہ' اسے خدا مبارک کرے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے نوری کی بلائیں لیں۔

"چاند کے ٹکڑے کے درشن کرواؤ آنا' چینی' چادر منے کا ہاتھ لگوا کر دے دیو۔ یہ تو بھڑکے جا رہا ہے ہمارا بھی حق ہوتا ہے ناچ لیں گے گا لیں گے' ہزار پانچ سو لے کر چلے جائیں گے۔ اے ہے چھٹکی چل شروع ہو یہ رہی زچہ لا بھئی دے بچہ گود میں بٹھا کر ایسی لوری دوں کی سارے رونے بھول جائے گا راج کرے گا راج۔"

"نہیں ہے منا۔" نوری سے کہا ہی نہ گیا کہ مر گیا منا نوری جس طرح چلائی' ایک پیر کو اٹھائے رقص کے انداز میں گھومتی چھٹکی ہاتھ پیر روک کر اسے دیکھنے لگی گرو تو بھڑک اٹھا نوری کا بستر ٹٹولا گڑیا ڈر کر رونے لگی جاوید گالیاں دے رہا تھا ہاتھا پائی کر رہا تھا نوری بستر میں دبکی جا رہی تھی اسے گرو سے ڈر لگ رہا تھا۔

"لڑکا ہوا ہے گھر سونا پڑا ہے نہ کوئی دادی' دادا نہ نانی' ماموں اتنے بھی غریب نہیں لگتے۔" اس نے ہاتھ کھول کر چاروں طرف اشارہ کیا۔

"دو دن پہلے رات کو بچہ آیا پیارا سا چاند سا منا کہاں گیا اے چھٹکی پتا کر کہاں گیا منا کہاں چھپایا ہے چاند" چھٹکی چارپائی کے نیچے جھک گئی۔

"یہاں تو نہیں۔" چھٹکی نے دونوں کندھے مٹکائے' انگلی کو ٹھوڑی پر رکھا۔

"کہاں گیا۔" گرو بار بار تالی بجا رہا تھا۔

"اے منے تو ہی بول کہاں چھپا ہے منے" نوری کے کان پھٹنے کے قریب ہو گئے پھر چھٹکی اور گرو ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"ہیجڑے ضرور ہیں الو کے پٹھے نہیں۔" گرو بولا جس انداز سے وہ بولا جاوید ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ اندر آیا اور نرمی سے بولا۔

"اس کی بہن بے اولاد تھی وہ لے گئی۔"

"او رہ یہ اتنے دل گردے والی تھی کہ اپنا پہلا ہی بیٹا بہن کو تھما دیا۔" تالی بجا کر تینوں ہنسے۔ "دوسروں کو اولاد دینے والی بڑی دیکھی ہیں لیکن پہلا پھول کسی کو دیتے نہیں دیکھا چل آ اس کی بہن کے ہاں چلتے ہیں۔ وہاں سے بدھائی دلوا ہمیں چل۔" گرو نے جاوید کا بازو پکڑ کر گھسیٹا۔

"چل آ۔"

"وہ دوسرے شہر رہتی ہے۔ گوجرانوالہ۔" جاوید ہکلا گیا۔

"چل ٹھیک ہے' اپنی برادری وہاں بھی بہتیری ہے تو پتا دے میری برادری والے بدھائی لے لیں گے۔"

"بہت پرہیزگار ہیں وہ۔ تمہیں گھسنے نہیں دیں گے۔"

اس بات پر وہ تینوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسے۔
"بدھائی دیتے کسی کو گناہ نہیں ہوتا سارے گناہ ہم نے اپنے سر لے لیے ہیں تو بے فکری رہ تو پتا دے۔"
اس نے ہاتھ آگے کیا۔
"دے چل۔" جاوید پھر بھڑک اٹھا۔
"نکلو یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ۔" وہ گالیاں دینے لگا گرو تو اور بھڑک اٹھا۔ اپنی پاٹ دار آواز میں دہائیاں دینے لگا۔ تالیاں پیٹتا رہا صحن میں آگیا اور چلا چلا کر منا منا کرتا رہا۔
"کھا گئے، دبا گئے، دفنا گئے، جلا ڈالا یا بیچ ڈالا۔ کہاں گیا منا او میری میا ہیجڑے تو ہم ہیں بدھائی کون لے اڑا۔ کون کھا گیا گوری کی بدھائی کس کے پیٹ میں گئی بدھائی۔"
استاد زمین پر بیٹھا ڈھولکی بجا رہا تھا دونوں کھڑی ہو کر صحن میں گول گول گھوم کر دہائیاں دے رہی تھیں باہر محلے والے آ آ کر تماشا دیکھنے لگے جاوید نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا بہت دیر تک تماشا ہوتا رہا۔ کچھ دیر بعد جاوید کو عقل آئی کمرے سے نکل کر باہر کا دروازہ بند کیا دو ہزار نکال گران کے ہاتھ میں دینے چاہے۔
"یہ لو اور جاؤ۔"
"بھیک لینی ہوتی تو ہیجڑے نہ بنتے۔" گرو نے جاوید کا ہاتھ جھٹکا۔
"تیری دال میں بہت کچھ کالا ہے۔ گوری کو بہت سے لوگوں نے دھتکار کر نکالا۔ لیکن بنا منے کے ملنے والی یہ دھتکار گوری ہمیشہ یاد رکھے گا۔ ان پیسوں کو اپنی اور اپنی جورو کی گودی میں رکھ منا تو رہا نہیں جسے تم گودی میں لیے لیے پھرو اے منے تجھے آسمان لے اڑا یا زمین نگل گئی ارے منے تو کہاں گیا۔"
منا، منا کرتا وہ چلا گیا رات گئے تک گھر میں منا منا ہوتی رہی محلے والوں سے جان پہچان نہیں تھی لیکن باری باری سب آئے جاوید نے سب کو نکال باہر کیا۔ پہلی فرصت میں گھر بدلا وہ علاقہ ہی چھوڑ دیا پرچون کی دکان کھول لی دکان پر ایک لڑکا دن بھر بیٹھا رہتا اور خود ایک اسکول میں کینٹین کا ٹھیکا لے لیا تھا اچھا خاصا بڑا اسکول تھا دنوں میں ہی اچھا منافع ہونے لگا تھا رات گھر آتا تو کھانے سے پہلے پیسے گنتا نہانے سے پہلے کل آنے والے پیسوں کا حساب کرتا اور سونے سے پہلے آ چکے اور آنے والوں کا اچھی طرح پھر سے حساب کر کے سوتا۔
وہ کوفتے بناتی یا کھیر۔ جاوید کو ہر چیز میں پیسوں کا ہی مزا آتا اس کا ہاتھ پکڑتا جیسے سونے کے پہاڑ کی ڈلی مٹھی میں لے لی ہو۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہتے تھے۔ اچھا کاروبار بن گیا پیٹ تین وقت سے زیادہ بار بار بھرنے لگا منے نے جہاں جانا تھا وہ تو چلا گیا نا، پہلا سودا ٹھکانے لگا۔

☼ ☼ ☼

تھوڑا منافع ہوا تو اس نے ایک اچھے علاقے کے بڑے اسکول کا ٹھیکا لے لیا کھاگ تو وہ پہلے ہی ہو چکا تھا کینٹین سے اسٹاف روم تک گھسنے لگا بلاوجہ کی علیک سلیک بڑھانے لگا سارا وقت اپنے آپ میں ہی گم رہتا بھاگ دوڑ میں لگا رہتا۔ دراصل اسے پیسہ کمانا آگیا تھا۔ ہوٹلوں میں برتن دھوتے، ٹیبل مین بنے، گلی گلی سبزی کی ریڑھی گھماتے اس کی زبان کو پر لگ گئے تھے۔ لیکن بولتا بھی دیکھ بھال کے تھا اور کس سے بولتا ہے یہ تو ضرور ہی دیکھ لیتا تھا۔ آئے دن کھانا کھاتے اسٹاف کی میڈموں کی باتیں کرتا اس کی سنا اُس کی سنا چھ سال ہو گئے میڈم کی شادی کو، پہلی رات کی بات یہ اونچی لمبی گوری چٹی آنے والے دنوں کی بات امریکہ تک گئی علاج کروانے بڑی نازک مزاج ہیں چائے کی پیالی سے ایک قطرہ بھی چھلک جائے تو چائے نہیں پیتی۔ پرے کھسکا دیتی ہیں نجانے سب کے سانسوں سے رچی اس ہوا میں کیسے سانس لیتی ہیں۔"
وہ بلاوجہ ہنسا۔
"میڈم کی چائے تو بیتا تا ہے۔" نوری الٹی ہی بات پکڑتی تھی۔ "میں کیوں بتانے لگا اسکول کا باورچی بتا رہا تھا۔"
"تو اس سے میڈم کی باتیں پوچھتا رہتا ہے۔"

"نہیں پاگل۔" وہ چڑ گیا "مجھے معلوم ہو جاتا ہے بہت کچھ آپو آپ ہی۔" وہ پھر ہنسا۔
"تو کیوں معلوم کرتا پھرتا ہے اس کے بارے میں۔" جاوید نے نوالہ پلیٹ میں پٹخا۔
"کیا لینے گی مجھ سے؟"
"کتنے پیسے دے رہی ہے وہ۔" نوری جم کر بولی۔
جاوید نے نوالہ اٹھا لیا سوچا کھا کر بات کرے منہ کھول کر نوالہ اندر کیا آرام سے چبایا۔
اتنی جلدی کہاں کی ہے۔
نوری اسے چار سال تک چھپا چھپا کر اپنے گھر کے گودام میں لاتی رہی تھی، وہ تو اس کی رگ رگ سے واقف تھی اب یہ سوال کیسے نہ پوچھتی۔
"کہتی ہے گلشن اقبال میں تین مرلے کا ایک پلاٹ ہے۔" جاوید کوئی ڈرتا تھا نوری سے "اسے تو بچے کے سبھی گر آنے لگے تھے، محبت کا اندازہ ہو چکا تھا پیسے سے عشق ہو گیا تھا۔
کہیں دور پہاڑوں پر، گاؤں، قصبوں میں اور دور صحراؤں میں رہنے والے بڑا سمندر سمندر کرتے ہیں سوچتے ہیں نیلے سمندر کو دیکھیں گے تو کیسا لطف آئے گا، پانی سے پیر بھیگیں گے تو کیسا لگے گا وہ رات دن سمندر سمندر کرتے پھرتے ہیں خواب دیکھتے آہیں بھرتے ہیں تگ و دو کرتے، آنے جانے والوں سے سمندر کا احوال پوچھتے پھر جب وہ خود سمندر کے کنارے تک آ جاتے ہیں تو خوف کھا جاتے ہیں متلی ہونے لگتی ہے سمندری ہوا بری لگنے لگتی ہے سمندر منہ کھول نگل لینے والا نظر آنے لگتا ہے۔
اور کچھ جو سمندر سے خوف کھائے ہوتے ہیں وہ پانی میں ڈبکی پر ڈبکی لگا رہے ہوتے ہیں تو یہی کچھ انسان ہے جب تک دور ہے تب تک پتا نہیں ہے کہ وہ کیا ہے سمندر جو کہ وقت، زمانہ، حالات، خواہشات ہیں قریب آنے پر ہی پتا دیتا ہے کہ انسان کا اصل ہے کیا۔
جاوید گاؤں کا تھا ہوٹل میں برتن دھوتا تھا سبزی لگاتا تھا اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا ہے رشید کے ملتے ہی وہ نقل سے اصل ہو گیا بہروپ سے روپ میں آگیا، اصل سمندر میں ڈبکی لگائی تو سب دھل کر صاف ہو گیا۔ رشید کے بعد نوری کو بتائے بغیر وہ ایک اور گاہک کی تاک میں تھا ایسے ہی — اسکول کے ملازموں سے پوچھتا پھرتا تھا۔ میڈم گوہر کی بے اولادی کا پتا چلا تو اس نے میڈم گوہر پر باقاعدہ نظر رکھنی شروع کر دی۔ میڈم گوہر سے علیک سلیک بڑھائی۔ عادت کی اچھی تھی وہ، اسکول میں وائس پرنسپل تھی جوان تھی خوب صورت تھی، اگر کہا جائے کہ بھولی بھی تھی تو غلط نہیں ہو گا۔
"یتیم خانے سے کیوں نہیں لیتی۔" نوری نے پوچھا۔
"کہا تو ہے گند میں ہاتھ نہیں ڈالتی۔ حلال کا چاہیے اسے۔" جاوید آرام سے دل لگا کر کھانا کھانے لگا وہی بکرے کا گوشت اور فرائی مچھلی۔ کتنے آرام سے وہ کاروباری باتیں کر رہا تھا نوری کب سے اپنا کھانا چھوڑ چکی تھی۔
"تجھے شرم نہیں آتی۔" نوری کو کچھ شرم آگئی۔
"کہاں کی شرم۔۔ منہ میں زبان ڈال ورنہ مجھے ڈالنی آتی ہے۔"
"ایک کا سودا کر تو لیا اب ہر ایک کا کرے گا۔"
"ہاں! ہر ایک کا کروں گا بھلے کا کام ہے ضرور کروں گا۔ بھلا کرتا ہوں لوگوں کا دل تڑپتا ہے ان کے دکھوں پر۔"
"بھلے کے نام پر پیسے کیوں لیتا ہے۔" نوری تڑخی۔
"خوشی سے دیتے ہیں وہ کمینہ نہیں ہوں میں۔ تو کیا جانے بے اولادی کا دکھ، تیری تو ہر سال کوکھ بھر جاتی ہے۔"
"اجڑ بھی جاتی ہے۔" نوری کو منا یاد آ ہی گیا۔
"کہاں کا اجڑنا۔۔ عیش نہیں کر رہی۔"
"وہی تو کہہ رہی ہوں۔ عیش کر رہے ہیں نا۔ گاؤں سے نکلے تو چار چار وقت روٹی نہیں ملتی تھی اب چار مہینے کا سامان رکھا ہے باورچی خانے میں پکانے کو۔ گھر بھرا پڑا ہے۔"
"یہ سب میری محنت سے آیا ہے۔"

"بچہ میں نے جنا تھا۔" دونوں مقابلہ کرنا چاہتے تھے کہ دراصل یہ سب جو عیش ہے یہ کس کی وجہ سے ہے۔

"ہاں تو میں جن لیتا۔" جاوید چلایا۔ "کس پہ اترا رہی ہے پیچھے سے لائی ہے یہ بچے۔"

"پیچھے سے لاتی تو تجھے سوا کرنے دیتی۔" جاوید نے لپک کر اس کی چوٹی پکڑلی چار پانچ گالیاں دیں اسے اور پھینک کر چلا گیا وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد آیا اسے اٹھایا' بٹھایا' آنکھیں اور منہ صاف کیا۔

"تو میری نوری نہیں۔"

جب دونوں میں پیار کی پینگیں بڑھنی شروع ہوئی تھیں تو جاوید اسے نہ جانے کے لیے ہاتھ پکڑنے کے لیے پاس بٹھانے کے لیے اور ایسے ہی بہت سے ڈھکے چھپے کام کروانے کے لیے لاڈ سے کہا کرتا تھا اور نوری فوراً" اترا کر کہتی تھی۔ "نہیں" مطلب ہاں' پکی ہاں' عورت تھی جلدی مان جاتی تھی۔

"میری محبت پر شک ہے تجھے۔ بے چاری میڈم کے دکھ کا سوچ' محبت کی شادی کی تھی' دوسری بیوی ہے اپنے صاحب کی' شوہر خود اولاد والا ہے یہ اکیلی تڑپتی ہے کہہ رہی تھی کہ بچہ مل جائے تو اسے لے کر اپنے ماں باپ کے پاس کینیڈا چلی جاؤں گی۔ خود سوچ کینیڈا میں کتنے عیش سے رہے گا وہ۔ گاڑی۔ گھر ہمارے پاس نہ سہی اس کے پاس تو ہوگا' اتنی بے چاری نہ بن۔ اس عورت کا بھی سوچ تو بھلا کرے گی اس کا تو تیرا کیا جائے گا۔"

نوری ہنستی رہی اٹھ کر نہ گئی۔ جاوید نے اس کے گرد ہاتھوں کا حلقہ مضبوط کیا' نوری اس حلقے میں اندر تک مدغم ہوگئی۔

"مجھ سے تو میڈم کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ ورنہ یہ گڑیا تین کی ہوئی ہے نا ابھی اسی کی بات کرلیتا ہوں۔" نوری نے فوری ہاتھ بڑھا کر جاوید کا منہ بند کردیا۔

"گڑیا کا نام نہ لینا۔"

"چل پھر تو اس کی تیاری کر' دل سے سمجھ لے تو نے کسی اور کا قرض دینا ہے۔"

"کس کا؟" نوری نے اتنا بڑا طنز کیا کہ جاوید کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔

"دیکھ نوری مجھے ایسے طیش نہ دلوا۔ قسم خدا پاک کی' میں تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ دکان اور کاروبار ہیں میرے پاس کہاں جائے گی تو۔ بہتیری عورتیں مجھے اور نہیں تو یہ فٹ پاتھوں پر بنجارنیں جھولتی پھرتی ہیں انہی میں سے ایک کو گھر لا بٹھاؤں گا۔ مجھے سکھ کھاتا ہے دکھ تجھے بھلے باہر نکل کر گلی گلی جاکر کمانا پڑے نا تو تجھے پتا چلے یہاں گھر بیٹھی تو سارا دن ٹی وی دیکھتی ہے تو اس پیٹ کو قرض سمجھ لے جسے تجھے چکانا ہے۔ بھولی بگی۔" جاوید نے ہاتھ بڑھا کر اسے سینے سے لگایا۔

"یاد نہیں گاؤں کی حاجن بی۔ اوپر تلے کے اپنے دو بیٹے دیے تھے ایک تو ساتھ والی پڑوسن کو دیا تھا جو ہر وقت حاجن بی سے لڑتی رہتی تھی روتی پیٹتی رہتی تھی رات دن بین کرتی رہتی تھی کیسے پھر گڑ والے چاول پکا پکا کر بانٹا کرتی تھی یہ سامنے کا گھر ہی تھا نا حاجن بی کا تو کیا سانپ لوٹتے ہوں گے ان کے سینے پر کیسی راضی تھیں وہ' کیسا نور برستا تھا گاؤں بھر نے تعریف کی تھی تو کیا وہ بچہ دینے سے بری بن گئی' ہم کہاں کے برے دوسروں کی آس مراد ہم سے پوری ہو رہی ہے تو میں اسی میں راضی بارضا ہوں۔"

نوری بمشکل سترہ سال کی تھی جب جاوید کے ساتھ گاؤں سے بھاگی تھی۔ جاوید ہٹا کٹا بیس بائیس کا ہوگا پر لگتا چھ سات سال بڑا ہی تھا اصل عمر سے۔ گاؤں میں ان کا چکر بہت دیر رہا بہت جگہوں پر ملے جاوید تو کہتا تھا سارے گاؤں کو آگ لگا دے گا اگر نوری کے گھر کوئی اور بارات لایا۔ بارات تو خیر کسی کی نہ آئی' دونوں اپنی بارات لے کر شہر آگئے۔

جس رات جاوید نے اسے کہا کہ شہر بھاگ چلتے ہیں اسی رات کے پچھلے پہر دونوں بھاگ گئے۔ سوچتا کیا' سورج کے اشارے پر جس طرح دن نکلتا ہے ایسے ہی نوری جاوید کے اشارے پر چلتی تھی۔ گاؤں میں اس نے اپنی پکی سہیلی کو بھی ہوا نہ لگنے دی کہ اس کا جاوید کے ساتھ چکر ہے اتنے سال اس کے گھر والے اسے چپ چھپتی گائے سمجھتے رہے وہ دو دو گھنٹے جاوید کے ساتھ گزار آتی اماں بے فکر رہتی' ہوگی دس بارہ سہیلیوں میں سے کسی کے پاس' اماں اسے پچھلے پہر اپنی دو آنکھوں سے بھاگتے ہوئے دیکھ لیتی تو بھی یقین نہ کرتی کہ یہ نور فاطمہ نوری بھاگی جارہی ہے۔ سارا دن زبان منہ میں دیے بھیڑ بکریوں کی طرح کام کرنے والی نوری خاندان کے ہر چھوٹے بڑے لڑکے کو بڑھ بڑھ کر بھرا جی' بھرا جی کہنے والی کسی چھوکرے کے ساتھ رات گئے بھاگ رہی ہے۔

نوری کے لیے تو جاوید ہی نا خدا تھا' جی جان لگا کر اس کی پرستش کرتی جاوید تو خیر کیا ڈرتا اسے ضرور ڈرا کر رکھتا اس کے باپ اور بھائیوں کے ہاتھوں مرجانے سے' وہ اسے کہتا کہ وہ تو بھاگ جائے گا گردن تو نوری کی جکڑی جائے گی اور پھر منہ کھول کر پرانے انجن کی سی آواز لیے ہنسنے لگتا نوری واقعی ڈر جاتی' سو سو بار اس سے پوچھتی' قسمیں لیتی۔

"تو مجھے چھوڑ کر بھاگے گا تو نہیں' بتا بول نا۔"

اور وہ انجن چلائے ہی جاتا۔ جب وہ رونے لگتی تو وہ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیتا۔

"مگر تیرے بھائیوں نے میری گردن دبوچ لی تو... تو بھاگ جائے گی" نوری فوراً" سر نفی میں ہلا دیتی ساتھ جینے مرنے کی قسمیں ابھی یاد تھیں۔

"پھر میں کیسے بھاگ سکتا ہوں تو میری نوری میں تیرا نور۔ بات ختم۔" جاوید نوری کو سینے میں چھپائے پیار کی لوری سنا رہا تھا جو عورت محبت میں غرق ہوجاتی ہے وہ غلط درست سے تو پرے ہی ہوجاتی ہے نا' وہ محبت ہی کیے جاتی ہے۔ محبت ہی کیے جاتی ہے۔ کسی کام کی نہیں رہتی اسی لیے کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کرپاتی اب یہ نہیں تھا کہ جاوید ہی بے غیرت تھا' نوری اپنی سہیلیوں کی نظریں بھٹکا کر بندے' ہار چرانے والی' بھابھی ذرا اِدھر اُدھر ہوتی اور ان کے میکے سے آئے مربے منہ میں بھر لیتی' دور پرے رہنے والی پھوپھی یا خالہ کے ہاں جاتی تو چھوٹی بڑی ہزاروں چیزیں اٹھا لاتی۔ حاجن بی قرآن خوانی کرواتیں تو سستی کی ماری ایک' ایک' دو' دو صفحے چھوڑ کر سپارہ پڑھتی اور باقی کا سارا وقت ہونٹ بلا وجہ ہلاتے اونگھتی رہتی۔ اماں کہتی نوری ابالے پر ابالا آجائے دودھ اچھی طرح سے کڑھ جائے تو ہی اتارنا۔" وہ ایک ہی بار دودھ ابال ایک طرف رکھ پھر قسمیں کھائے کہ اتنا تو کڑھ گیا تھا جب ہی اتارا۔

نوری میں بڑے چور در تھے۔ ایسے ہی نہیں اماں کے فرشتوں کو بھی سلا کر وہ جاوید سے کئی کئی بار مل آتی۔ صحن میں بھائی سو رہے ہوتے اور وہ سامنے کے ہی دروازے سے جاوید کو لا کر گودام تک لے جاتی بوریوں کے پیچھے گھپا سی بنا رکھی تھی وہیں جاوید چھپا بیٹھا ہوتا پچھلے پہر جاوید چلا جاتا اور مجال ہے کہ کوئی اتنا سا بھی دعوا کردے کہ رات کون اٹھ کر چل دیا تھا یا باتیں کر رہا تھا یا فلاں کھڑک ہوا۔

بڑی بھابھی ذرا تیز تھیں ادھر ادھر نظر رکھتی تھیں انہیں بھی اندھا کیے بیٹھی تھی نوری' گودام کی گھپا میں وہ جاوید کے ساتھ لپٹی رہتی' اسے کھلاتی' پیار کی لوری سناتی' دونوں باہم تھے' مشترک تھے' بڑے سیانے تھے' کیا اچھا ہے کیا برا ہے اس کی کسے پڑی تھی کیا چاہیے اور کیا نہیں وہ اس کی عقل رکھتے تھے' ماں باپ کو بے وقوف بنا رہے تھے' انہیں گالیاں دیتے تھے' نوری اپنی اماں تک کی برائیاں جاوید سے کرتی جسے صرف وہ اور جاوید ہی آسمان سے ایک ساتھ اتارے گئے تھے باقی سب گند بلا ہیں۔

جاوید ادھر ادھر ہاتھ صاف کرتا رہتا تھا فخر سے نوری کو چوری کا مال دکھاتا یہ اتنے کا ہے یہ اتنے کا ہے' مال کی قیمت نوری کو بتاتا اور پھر اس مال سے سگریٹ لیتا عیش کرتا دونوں میں بہت ناکارہ عادتیں تھیں' دونوں ایک دوسرے کے لیے درست تھے' ٹھیک کرتے تھے' ٹھیک سوچتے تھے۔ نوری کا جی چاہتا جاوید کا تعویذ بنا کر پہن لے جلد سے جلد شادی ہوجائے لیکن اس کے بھائی اسے مار دیتے لیکن غیر برادری میں رشتہ نہ دیتے اور دے بھی دیتے شاید۔ لیکن دونوں الگ دنیا بسانے کا ہی سوچے بیٹھے تھے۔

☆ ☆ ☆

ساتواں مہینہ آیا تو جاوید سارے کام دھندے چھوڑ چھاڑ کر اسے لیے لیے پھرتا۔ یہاں کھلا، وہاں کھلا یہاں گھوما وہاں گھوما نوری گلاب کی طرح کھلی رہتی دونوں نے اپنے اپنے ذاتی فلسفوں سے ماں اور باپ کو سلا دیا تھا اب دونوں انسان بنے پھرتے تھے وہ انسان نہیں جس کے نام پر کائنات بنی۔۔۔ شاید وہ انسان جس کے لیے دوزخ بنانے کے بارے میں سوچا گیا۔ جاوید رات گئے چندی آنکھوں سے نوری کو سوتے دیکھتا۔ دن گنتا۔۔۔ پیسے، ضرب۔۔۔ جمع اور تفریق کرتا؟ اس کا جی نہ بھرتا بار بار ضرب جمع کیے جاتا۔
دو چور، ڈوڈا کو، دو لٹیرے، نوری جاوید۔

☆ ☆ ☆

نوری نے دیکھا کہ جاوید بڑا پھنے خان بنتا ہے نا بچے وہ جنے اور روڈا وہ بنے۔ اس نے جاوید کو آڑے ہاتھوں لیا۔
"کتنے کا ہو گا وہ تین مرلے کا پلاٹ۔"
"قیمت نہیں لگوائی میں نے۔" جاوید کو غصہ آگیا۔
"تو لگوا جا کر میں نے کیا یہاں اتوار بازار کھول رکھا ہے۔ ٹھیلے پر بیٹھی ہوں کیا آؤ جی آؤ لیتے جاؤ جو جی چاہے دیتے جاؤ۔"
"او پگلی جانتی ہے تین مرلے کتنے ہوتے ہیں؟"
"جتنا ہمارا گودام تھا۔" نوری سب جانتی تھی۔
"اپنے اس پنڈ کے گودام کی دو کوٹھڑیاں لے لے مجھ سے۔ پتا ہے یہاں زمین کا بھاؤ۔"
"تجھے اس زمین کے بھاؤ کا پتا ہے۔" اس نے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔
"یہ پلاٹ کی طرف میں ہی لایا اسے۔۔۔ سودا نہیں کر رہی وہ۔ میں نے کہا ایک بچی ہے بے گھر ہوں۔۔۔ یہ ہوں وہ ہوں۔ کتنے جھوٹ سچ بولے افسوس ہی کرتی رہی بے چاری، اس لائن پر تو میں لایا اسے اب کیسے بھاؤ تاؤ کرلوں۔ بس ٹھیک ہے جو ہے۔"
پرائیویٹ کلینک کے ویٹنگ روم میں جاوید نے میڈم کے ہاتھوں میں بچی تھمائی جسے گود میں لیتے ہی وہ رونے لگی چومنے لگی، افسوس کرنے لگی۔ جاوید اسے اب ملا پہلے کہیں مل جاتا تو اتنا عرصہ اکیلے نہ گزارتی۔ اگلے دن جاوید اس کے گھر بچی واپس لینے گیا ساری رات تو میڈم گوہر بچی سارہ کو گود میں لیے بیٹھی رہی تھی اس کی تصویریں بناتی رہی تھی اب جاوید آگیا تھا واپس لینے۔ کیوں؟
اب ٹھیک وقت آیا تھا بھاؤ تاؤ کرنے کا۔ واپسی کا ہی سن کر گوہر کا دم نکل گیا۔ ایک ہی رات میں وہ اس کی سچ مچ کی ماں بن گئی تھی اپنا آپ وار کر بھی اس سے الگ نہ ہوتی، اس کا شوہر اس کے اس اقدام سے خوش نہیں تھا اور ایک عرصے سے دونوں کے درمیان یہی چپقلش چل رہی تھی اب گوہر نے اکیلے ہی یہ فیصلہ کرلیا تھا۔ اکیلے کیا۔۔۔ جاوید ملا اس نے راستہ دکھایا کہ شریفوں کا بچہ ملنا کون سا مشکل ہے، چھوڑے شوہر کو۔ وہ خود تو اولاد والا ہے آپ کا دکھ کبھی نہیں جانے گا اور نہ ہی کچھ کرنے دے گا، بچوں کے اخراجات سے بچتے ہیں اب آپ خوب صورت ہیں جوان ہیں سوچتے ہوں گے ایسے ہی ٹھیک ہے۔ بچوں کی دم کیوں لگائی ساتھ۔ اصل بیوی سے اولاد پر فخر کرتے ہوں گے گوہر تو اب کبھی سارہ واپس نہ دیتی ایک ہی رات میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ زندگی کیسے بدل جاتی ہے۔
جاوید پر غصہ تو آیا لیکن اب وہ کیا کرتی سارہ کے لیے اس نے اسے پلاٹ اور چند لاکھ اور دے دیے اور جھٹ کاغذات بنوا کر کینیڈا چلی گئی۔
جاوید نے پلاٹ بیچ دیا دکان خالی کی اور لاہور آگیا پہلے وہ فیصل آباد میں تھا، کرائے کا گھر لیا اور اچھے علاقے میں اسٹور کھول لیا۔
نوری چند دن روئی، دل مسوس کر رہ گئی لیکن میووں والے منہ کے ساتھ چپکی رہی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ بچہ بیچنے والی تھی۔۔۔ توبہ۔ بس وہ بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے ایسا کر رہی تھی، بے اولادوں کی مدد کر رہی تھی۔ بچے خوش تو بچوں کے ماں باپ خوش۔

بڑے فلسفے تھے نوری کے پاس اب تو۔ باتیں گڑھنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ جتنی چاہے اپنی مرضی کی کشید کیے جاؤ۔ اپنی ہی مرضی ہے جہاں چاہے چلا لو۔
جاوید نے اسٹور کھولا تو تازہ ڈبل روٹی، انڈوں، مکھن کی روز صبح ترسیل کا کام بھی شروع کر دیا، کالونی کی کوٹھیوں سے فون آجاتا کتنا کیا کیا چاہیے۔ کوٹھی نمبر، لین نمبر اور سب ان کے گھر پہنچ جاتا۔ صبح صبح وہ یہی کام کرتا۔ باقی دن کام والے دو لڑکے اسٹور دیکھتے وہ ادھر ادھر کسی ایسے کام کا پتا کرتا پھرتا جس میں وہ دو پیسے لگا سکے اور منافع زیادہ ہو جائے۔ بہت علیک سلیک ہو گئی تھی اس کی کالونی کی بیگمات کے ساتھ، آتے جاتے ان کے حسن اور طریقے سلیقے کے قصیدے پڑھتا رہتا۔ ان کے گھروں کو دیکھتا رہتا۔ گاڑیوں کو گنتا رہتا ایک پستول بھی خرید لیا تھا اس نے۔ پاس رکھتا، نوری کو ڈراتا، اب خود ڈرنے لگا تھا نوری کے گھر والوں سے، گبرو جوان تھا پہلے تو کبھی ایسے نہیں ڈرا تھا، کہتا تھا دو پیسے آجائیں تو ڈرنا ہی پڑتا ہے، کوئی میری جان فضول میں کیوں لے گا، دولت کے لیے ہی مارے گا نا۔
نوری سارا سارا دن چرتی رہتی۔ کھا کھا کے گائے بن رہی تھی، کہتی تھی گھر جاؤں گی اپنے ٹھاٹ دکھاؤں گی انہیں۔
"ہونہہ کتنی لڑائی کی تھی بھابھی نے کہ میرے ٹرنکوں میں گھس کر میری چیزیں کھا جاتی ہے، منہ پر مار آؤں گی وہ ساری چیزیں کھاتی پھرے گی سارا سال۔"
جاوید سوچ میں پڑ گیا۔
"ہاں اگر انہیں دکھا آئے اپنے ٹھاٹ تو ڈر بھی جاتا رہے، پستول رکھی کھلی الماری کو بھی تالا لگا دے گا وہ پھر۔"
جاوید نے کرائے پر ایک کار لی اور نوری گڑیا کو بٹھا کر گاؤں لے آیا، پہلے اپنے گھر گیا، ماں نے بٹھایا ماتھا چوما گڑیا کو گود میں بٹھایا، نوری کو منہ بھی نہ لگایا۔ بھاوجیں۔۔۔ آئیں چار باتیں دونوں کو سنا کر چلتی بنیں بھائی گھر ہی نہ آئے، باپ ایک طرف بیٹھا حقہ پیتا رہا جیسے گھر میں کوئی آیا ہی نہیں۔ جاوید نے پیسے نکال کر اماں کو دیے انہوں نے پلو سے باندھ لیے اور پھر جاتے وقت گڑیا کے ہاتھ میں دے دیے۔
"تو نے دیے میں نے رکھ لیے اب میری طرف سے یہ گڑیا کے لیے۔" جاوید کا منہ بگڑ گیا کیا ضرورت تھی اسے آنے کی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ابا نے منہ اندر کی طرف کر کے اماں کو کہا تھا کہ آنے جانے والوں کو گلی تنگ پڑ رہی ہے وہ ڈبا ایک طرف کروا، ہمیں تو اس گاؤں میں رہنا ہے، گاؤں والوں کی راہ کیوں ڈنگا کریں۔ جاوید اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں کے ٹھاٹ بھاٹ وہیں راکھ ہو گئے، منہ اتر گیا پیسہ جیب میں ہی پڑا رہ گیا، کار گدھا گاڑی سے بدتر لگنے لگی۔
جاوید نے نوری کے گھر کی طرف کار کی، دروازے پر بڑا تالا لگا تھا، گاؤں میں نیا پرندہ بھی اڑ کر جاتا تھا تو سب کو خبر ہو جاتی تھی ان کے آنے کی خبر نہ ہوئی ہو گی؟ مرگوں میں بھی جاتے تو ایک کو گھر چھوڑ جاتے کہ منہ تو قبروں کے بند ہوتے ہیں نہ واہ نہ در۔ گھروں کے در کھلے ہی رکھنے چاہئیں کار کی ڈگی میں رکھے شہری کپڑے، برانڈے، شیشے کے گلاس، سیب کے مربے اور مٹھائی کا بڑا ڈبا بڑا قہقہے لگا رہا ہو گا نوری کی آنکھیں گیلی ہو گئیں جاوید کو کار میں ہی چھوڑ کر وہ حاجن بی کے گھر آئی انہوں نے پیار سے بٹھایا پانی کا پوچھا اس نے گھر والوں کا پوچھا۔ وہ مسکرائیں۔
"ٹھیک ہیں سب۔"
"کہاں گئے ہیں سب؟"
وہ سچ بول کر اسے دکھی نہیں کرنا چاہتی تھیں شاید۔
"جاوید اندر کیوں نہیں آیا۔" نوری اٹھ کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ کر بلاوجہ گڑیا کو مارا۔
"اب نہیں لاؤں گا تجھے۔ عزت سواہ کر دی میری ابا کو دیکھا تھا گوبر کے پاس بیٹھا رہا گند میں۔۔۔ حقہ گڑگڑاتا رہا مکھی مچھر کی بھنبھناہٹ سنتا رہا۔" جاوید سارے راستے بکتا رہا نوری چپ ہی رہی اس کے گھر والوں کو بھی گالیاں دیتا رہا۔ نوری نے کام والی کو ساری چیزیں دے دیں اسے منہ کھول کر حیرت کے اظہار کا سلیقہ بھی نہ آیا، جھٹ چیزیں اٹھا کر نکل گئی کہ باجی سٹھیا گئی

ہے کہیں عقل ہی نہ پکڑ لے۔

گاؤں کا اپنا راستہ نوری بھاگ کر بند کر آئی تھی تا اس پر لگا تالا بھی کل دیکھ ہی آئی تسلی ہو گئی۔

جاوید نے پستول والی الماری کو تالا لگا دیا وہ تو گھر کو ہی تالا لگا کر بھاگ لیے تھے اس کے پیچھے کیا خاک آئیں گے۔ نوری کا خیال تھا کہ اس کے بھائی گاؤں گاؤں پھرے ہوں گے اسے ڈھونڈنے ' ریلوے اسٹیشن ' لاری اڈے ' جانے کہاں کہاں مہینوں کھپتے رہے ہوں گے 'نوری مل جائے کہیں نوری مل جائے مارنا ہی ہے لیکن پکڑ میں تو آئے اسے لگا انہوں نے تو اسے اتنی وقعت بھی نہ دی کہ ڈھونڈ کر مار ہی ڈالیں۔ انہوں نے زمین پر تھوکا ہو گا۔

"تھو اماں سمجھ لے وہ کبھی اس گھر میں رہی ہی نہیں 'پیدا ہی نہیں ہوئی بھاگ گئی ہے تو اولاد والی ہو گی تو اولاد اس سے بھاگے گی اور وہ اولاد سے۔ بار بار بھاگے گی ایک بار کی بھاگی بار بار بھاگتی ہے۔ ٹھکانے بدلتی ہے کبھی دل کے اور کبھی جسم کے۔"

بھائیوں نے ٹرنک میں سے اس کے کپڑے نکال کر آگ لگا دی ہو گی ہر نشان مٹا دیا ہو گا جو کوئی پوچھنے آتا ہو گا اسے صاف کہتے ہوں گے۔

"کون نوری؟ ہم تو نہیں جانتے۔ ہم سے نہ پوچھو۔"

اماں نے جہیز کا سامان نکال نکال نائین یا چمارن کو دے دیا ہو گا اور ابا اُس نے دو بار زمین پر چپل ماری ہو گی۔

"لے یہ گئی اب سب اس پر تھوکتا۔" ابا کی جب کسی سے لڑائی ہوتی تو وہ زمین پر دو بار چپلیں مارتا اور دو چار گالیاں دے کر کہتا "لو یہ پڑا ہے کر لو جو کرنا ہے" تو اب ان سب کے لیے وہ گند ہوئی۔ اس کا ابا کتنی جلدی اس کی اصلیت کو جان گیا خود نوری کے جاننے سے بھی پہلے۔ وہ جان گیا کہ ایسے لوگ کیا ہوتے ہیں شہری زبان میں وہ غلاظت ہوتے ہیں ایسی غلاظت جسے ڈھیر پانی سے بہا دیا جاتا ہے گھروں میں گھسنے نہیں دیا جاتا۔

☼ ☼ ☼

نوری ایک بیٹی کی ماں بن گئی اس میں رچ بس گئی بیٹے کے لیے آہیں بھرتی مانو کی جگہ بیٹا ہوتا تو اس کا دل خوش ہو جاتا گڑیا اسکول جانے لگی مہینے میں ایک بار وہ بار لے چلی جاتی 'بال بھی رنگوا لیے تھے کبھی بار جاوید نے گھر آکر اسے بتایا کہ بیگمات کیسے چلتی ہیں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر ایسے جیسے ہوا میں ہلکورے لے رہی ہوں 'تو کبھی ایسے چلا کر 'وہ ویسے تو خاک چلتی ہاں کچھ قریب قریب ضرور ہو گئی تھی باہر نکلتی تو چال کو قابو میں رکھتی اور گھر آتے ہی کم کیے سانس کی طرح ایکدم سے چال کو کھلا چھوڑ دیتی۔ بہت سی چیزوں کا ملغوبہ بن گئی تھی 'بال رنگوانے ہیں کٹوانے نہیں 'برقع پہننا ہے 'نقاب نہیں کرنا' فرائی جھینگا کھانا ہے اور پیٹ بھرنے کے لیے الگ سے نان کباب کھانے ہیں جھینگے سے زبان بھرتی ہے پیٹ نہیں ' بے شک زبان بھرنے والے کھانوں سے پیٹ گلے کی آنت تک آجاتا۔

کام والی کام کر جاتی تو اس کی چندی آنکھوں کو گند نظر آنے لگتا پانی کا پائپ لگا کر دھونے بیٹھ جاتی 'دل کرتا تھا کھانا گھر پکا لیتی پھر چکھتی تو اچھا نہ لگتا اور اگلے دن کام والی لے جاتی جاوید کو فون کر کے بازار سے ہی منگواتی جاوید سیدھا سادا ہی رہا گھر آتا نان کباب ' مچھلی ' گوشت ' سلاد ' کھیر ' گاجر کا حلوہ ' دس بندوں جتنا لے آتا خوب ٹھس ٹھسا کر کھاتا دو گلاس پانی اوپر سے پیتا ' پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ڈکار لیتا اور پیسوں کا حساب کتاب کرتا اور سو جاتا وہ روز کا روز ایک ہی رہا صبح کام والی آتی تو میز پر رات کا بچا کھانا اٹھا کر شاپر میں ڈال کر جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے جاتی۔

اکثر رات کو نوری اٹھ بیٹھتی ' نہ جانے کس احساس کو لیے رونے لگتی کبھی ایک بار بھی نہیں ہوا تھا کہ جاوید نے آنکھ کھول کر اسے دیکھا ہو اور اسے سو جانے کے لیے کہا ہو وہ گڑیا کے بستر پر آجاتی اسی کے ساتھ سو جاتی ' مانو سادھو سی بچی تھی کم شکل ہی روتی بھوکی ہو کر بھی نہ مچلتی۔ پڑے پڑے خود سے ہی سو جاتی۔

گڑیا ناک پر ہاتھ رکھ کر کہتی۔

"ماں بدبو۔ نہاتی نہیں ہو کیا۔" نئی نئی اسکول جا رہی تھی تو نئی نئی باتیں کرنے لگی تھی۔ نوری خود کو تسلی دیتی نہاتی تھی صاف کپڑے پہنتی تھی کہاں کی بدبو۔

"ماں تمہارے دانتوں میں خون جما ہے۔" ایک آدھ میں کیڑا لگا تھا گڑیا کو خون نظر آرہا تھا جاوید گدھے کی سی ہچکوں ہچکوں ہنسی میں ہنسنے لگا۔

"ہاں خون ہی ہے گڑیا' تیری ماں خون پیتی ہے ' چڑیل ہے یہ بڑے لوگوں کو مار کھائی ہے۔" ہچکوں ' ہچکوں۔

"میں اکیلی تو نہیں مار کھائی۔" نوری پھنکاری۔

جاوید نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

"اب بول نا کہہ کہ ہم سب اودھ بلائیں ہیں مل کر کھا رہے ہیں۔" جاوید غصے سے اٹھ کر چلا گیا لیکن نوری کو منا اور منی یاد آگئے ایسے وقت وہ ٹی وی کی آواز اونچی کر دیتی یا پرس اٹھا کر بازار چلی جاتی۔ کپڑے جوتے خریدتی دکان داروں سے بلاوجہ بحث کرتی اٹھ کر چلی جاتی پھر واپس آکر وہی کپڑا لے جاتی گھر آنے تک منا منی بھول چکی ہوتی۔ کپڑے ساتھ لگا لگا کر دیکھتی جوتے جیولری پہن پہن کر شیشے کے آگے کھڑی رہتی نوری عورت ہی بنی رہی کھانے پینے والی گڑیا۔ بیاہ بیاہ رچانے والی گڑیا ۔ کبھی کھیل کھیلنے والی گڑیا۔

اب نوری کو جلد سے جلد بیٹا چاہیے تھا بیٹے کی پیاس لگ گئی تھی اسے بیٹا بیٹا کرتی رہتی تھی ہر وقت امید سے تھی بہت خوش رہتی تھی۔ جاوید بہت چپ چپ رہتا تھا کام کرتے اسے گنگناتے دیکھ لیتا تھا تو بلاوجہ چڑ جاتا تھا۔

"بند کر اپنے یہ سر۔" وہ ڈر کر اپنے سر بند کر لیتی۔

پھر بھی خوش ہی رہتی جی بھر کر خریداری کر رہی تھی جاوید کو ایک دن دکھانے بیٹھ گئی خریداری جاوید نے سارے شاپر اٹھا کر الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا وہ منہ کھول کر اسے دیکھنے لگی۔

"تالا کیوں لگایا۔"

"ابھی انہیں تالے میں ہی رہنے دے۔ دیکھیں گے کب باہر نکالنا ہے۔" جاوید ایک سگریٹ سلگا کر چلا گیا۔ اس کی رگ رگ سے واقف تھی نوری۔ ایک اور گاہک وہ بت بنی بہت دیر وہیں بیٹھی رہی۔ جاوید گھر سے بھی جا چکا تھا کیسے دل لگا کر کام کرتا تھا جاوید۔ وقت کے ساتھ بدل ڈالا تھا خود کو۔ اس کے ابا اسے ایک ہی گالی دیا کرتا تھا کہ "وہ ذات کا کمینہ ہے اور خواص کا شیطان۔" بالا ہی بالا وہ گندم کی کئی بوریاں بیچ کر کھا گیا تھا اس کے باپ کو پتا لگ ہی گیا کہ گودام میں سے گندم جا کہاں رہی ہے اپنی ماں کی سونے کی بالیاں بڑی چھوٹی پیٹی میں رکھے پیتل تانبے کے بڑے بڑے پتیلے گھر والے کسی شادی ' مرگ میں چلے جاتے اور وہ کچھ نہ کچھ بیچ کر پیسے کھا جاتا گھر کا کاٹھ کباڑ تو وہ سب کے سامنے ہی سائیکل پر لاد لاد کر کباڑیے کے پاس لے جاتا 'باقی سب ادھر ادھر ہوتے تو بہت کچھ نکال کر لے جاتا۔ اماں کا چاندی کا لوٹا تھا کبھی کبھار وضو کے لیے استعمال کرتی ایک دن وہ لے اڑا وہ ہر چیز پر نظر رکھتا کہ کیا کیا بک سکتا ہے کہتے ہیں اگر کوئی بیوپاری بن جائے تو اپنے سونے کا بستر اور پہننے کے کپڑے بھی بیچ دیتا ہے مول کھرے کرنے کا ایسا نشہ ہے کہ پیسہ بے شک زمین میں دبا دے لیکن مول کھرے کرنے کے نشے سے جان نہ چھڑوا سکے نہ چھڑوانا چاہے اپنے گاؤں کے گھر میں ایک ایک چیز پر نظر رکھ کر دل ہی دل میں اس کا مول رکھنے والے جاوید نے اب ایک ہی زمین پر نظر رکھ چھوڑی تھی مول بھی اسے معلوم تھا اور تول بھی وہ قیمت بھی جانتا تھا اور اسے نکلوانا بھی ذات کا کمینہ خواص کا شیطان

جاوید نے ایک اور گاہک ڈھونڈ لیا کوئی بیگم تھیں جن کے بنگلے پر جاوید انڈے ' ڈبل روٹی کی ترسیل کے لیے جاتا تھا جانتا تو وہ ہر بنگلے کی ہر بیگم کو تھا آنکھیں جو تراش لی تھیں اس نے اب سب پر نظر رکھتا تھا 'بیگم کی سہیلی ۔ امریکہ میں تھی چند سال ہی ہوئے تھے شادی کو 'لڑکی ماں نہیں بن سکتی تھی سب علاج کروا چکی تھی 'خاندان سے چھپا کر بیٹھے تھے دونوں میاں بیوی یہ

بات۔ جاوید نے بیگم سے بات طے کرلی تھی نوری امید سے ہوئی ہی تھی۔ بیگم نے سہیلی سے بھی بات کرلی تھی دونوں میاں بیوی سیاحت کا کہہ کر امریکہ سے پیرس چلے گئے وہاں سے دو ایک ملک گھوم کر پاکستان آگئے سہیلی نے امریکہ فون کر کے اپنے سسرال اور میکے بتا دیا کہ وہ امید سے ہے اب سفر منع ہے امریکہ نہیں آسکتی۔

یہ تو اتنی بڑی آسامی تھی کہ جاوید کی راتوں کی نیند اڑ گئی کیا مانگے؟ کتنا مانگے؟ کیا چھوڑے۔۔۔ کیا لے۔

جاوید میاں بیوی سے جا کر ملا جوان تھے دونوں خوب صورت تھے' اپنا کہہ کر بچہ گود لے جا کر خاندان والوں کی گود میں ڈالنے والے تھے پہلے انہوں نے کاغذات بنوائے بچے کی سپردگی کے اب اتنے بھی الو کے پٹھے نہیں تھے امریکہ سے آئے جانتے تھے بچے کوڑیوں کے بھاؤ رلتے ہیں تیسری دنیا میں وہ تو انہیں عین وقت پر مل رہا تھا تو دو پیسے بھی دے رہے تھے' ورنہ تیسری دنیا میں بچے بہت۔۔۔ چند لاکھ پاکستانی پیسے ہاتھ میں تھما گئے' دستخط کروائے اور یہ جا وہ جا۔ جاوید تو دیکھتا ہی رہ گیا اس کی تو ایک نہ چلی اس کا منہ کڑوا ہو گیا چند لاکھ امریکن ڈالرز کی جگہ وہ اسے پاکستانی پیسے دے گئے تھے۔ جاوید پچھتایا مول ٹھیک سے نہیں کمایا اس نے سوچا۔ رہا نہ وہ سیدھا سادا گاؤں کا دیہاتی جسے سب شہری الو بنا جاتے ہیں سو سو گالیاں دیں انہیں نوری سے بھی منہ ماری ہوئی اس نے الٹا کہا۔

"دو پیسے کی چیز تھی وہ تو لاکھوں میں لے گئے۔"

"میرا بچہ دو پیسے کا تھا۔" جاوید برا مان گیا چلانے لگا۔

"دو پیسے کا نہ ہوتا تو یوں کسی کو نہ دے دیتا۔" نوری نے منہ بگاڑ لیا۔

"بدشکلوں والے یہ امیر لوگ مر کیوں نہیں جاتے۔" اس بار نوری مہینوں روتی رہی اس بار بیٹا تھا پر جاوید نے ذرا بھی نہ سوچا نہ ہی اسے بتایا کلینک سے بیٹا لے کر نکل گیا کار میں بیٹھے تھے وہ دونوں اڑا لیا چیک دیا دستخط وہ پہلے ہی لے چکے تھے اور سودا ختم۔

جاوید کا اندر ٹھنڈا تھا چنگاری نوری کے اندر بھڑکی' جاوید سے بہت مار کھائی اس نے پیار سے منایا سمجھایا جب نہیں مانی تو مارنے لگتا

کون سے الزام دیتا کسے گناہ گار کہتا خود کو بری کیسے کرتا نوری کیسے جاوید کی طرف انگلی کرتی باقی کی چار انگلیاں خود اس کی طرف اٹھتیں نوری کس کو جا کر کہتی کہ جاوید کو باز کروائے باپ کو یا جاوید کے باپ کو دونوں کے باپ دونوں کو دھتکار چکے تھے وہ کس کے پاس جاتی اور جاتی بھی کیوں؟ وہ تو نوری بنی رہی جاوید کی محبوبہ بنی رہی جاتی تب جب ماں بنتی اور نہیں تو انسان ہی بن جاتی اب جاوید کو کون روکتا اس نے کھیل شروع کیا تھا اب ایک کھیلے سے پیچھے ہٹ جائے دوسرا تو کھیلے گا اپنی مرضی اپنی چاہ سے۔

اس ایک دوسرے منے پر ہی بس نہیں ہوئی ڈھلتی عمر کی ایک بیوہ وکیل عورت نے لڑکی لی۔ جاوید نے دی تو اس نے لی۔

خاندانی دشمنی تھی ان کے خاندان کی پشتوں سے دو بہن بھائی ہی بچے تھے۔ بھائی بیرون ملک جا کر لاپتا ہو گیا تھا سالوں بعد بڑی بہن سے رابطہ کر لیتا ڈرا ہی رہتا کہ کوئی رابطہ اسے لے ہی نہ ڈوبے ساری جائیدادوں پر قبضہ ہو چکا تھا سب کی جانیں جا چکی تھیں عورت وکیل فاخرہ کا شوہر بھی اسی دشمنی کے ہاتھوں قتل ہوا اسی شوہر کے قتل کا مقدمہ بھی لڑتی رہی تھی پریکٹس تھوڑی بہت چل رہی تھی ایک بار خودکشی کی کوشش بھی کر چکی تھی۔ جاوید کا آنا جانا تھا اس کی اجاڑ کوٹھی میں کبھی کبھار جاوید نے ہی اسے سمجھایا کہ وہ اپنی اجاڑ زندگی کو آباد کرلے کوئی بچہ لے کر پال لے۔" ایک بار گئی تھی ایک ادارے میں انہوں نے میری خاندانی تاریخ کا سن کر مجھے مشورہ دیا کہ میں انہیں بچے کی سیکورٹی کی ضمانت دے دوں میری اپنی جان کی ضمانت نہیں ہے چوکیدار آئے دن بھاگ جاتے ہیں بھائی ملکوں ملکوں بھاگ رہا ہے میرا تو اپنے منہ چھپا کر بھاگے پھرنے کو جی نہیں چاہتا شوہر کے گھر کو چھوڑ کر کیسے چلی جاؤں۔ موت تو جب آئے گی کسی بھی جگہ آجائے

گی۔"

اس اکیلی' دکھیاری' بیوہ عورت کو جاوید نے اپنی بیٹی دے دی تاکہ اس کی زندگی میں بہار آجائے۔ امیر دیوالیہ بھی ہو جائے تو فقیر نہیں بنتا۔ وہ بھی فقیر نہیں تھی اپنی طرف سے کچھ نہیں دیا تھا لیکن گھر کی ہر چھوٹی بڑی چیز بیچ آنے والے کے لیے وہ بہت۔۔۔ بہت تھا۔

شہر سے دور اس کی ایک کینال کی فیکٹری تھی جس پر اب قبضہ ہو چکا تھا اصل کاغذات اس کے پاس تھے پر وہ قبضہ نہیں لے سکی قبضہ گروپ سے۔ کاغذات جاوید کے ہاتھ میں دیے کہ جو قبضہ لے سکو تو فیکٹری تمہاری۔

پلاسٹک کے برتن بنانے والی فیکٹری تھی فی الحال بند تھی' جاوید نے چپکے سے جا کر فیکٹری کا جائزہ لیا جاوید کا حلقہ احباب اب کم نہیں تھا وہ تو عورت تھی کیا قبضہ چھڑواتی یہ تو مردوں کے کام ہوتے ہیں' جاوید ہٹا کٹا گھاگ عیار اور دلال اس کے تو بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

پیسے اور عقل سے سب ہو جاتا ہے اصل کاغذات لے کر جاوید گڈو کے پاس چلا گیا گڈو لاہور کا مانا ہوا بدمعاش تھا۔ یہ مردوں کے کرنے کے کام ہوتے ہیں عورتیں کیا جانیں گڈو نے کاغذات دیکھے فیکٹری دیکھی اور فیکٹری کے آدھے مالکانہ قبضے پر راضی ہو گیا یعنی بعد ازاں فیکٹری کا آدھا مالک وہ بھی ہو گا سودا یہ بھی گھاٹے کا نہیں تھا بے کار سے مفت بھلا اور مفت سے آدھا چھ مہینے کے اندر اندر گڈو نے فیکٹری کا قبضہ لے لیا بدمعاش ہی وہاں قبضہ کیے بیٹھے تھے بدمعاشوں نے ہی قبضہ چھڑوا لیا

اس ساری رات جاوید سو نہیں سکا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ کبھی وہ ایک سائیکل کا ہی مالک بن جائے گا آج وہ ایک فیکٹری کا مالک بن چکا تھا۔ پلاسٹک کے گھریلو برتن بنانے کا پلانٹ لگا ہوا تھا انہوں نے وہی کام شروع کر دیا فیکٹری شروع کرنے میں جو لاگت آئی تھی وہ لاگت گڈو نے اٹھائی اور وہ تین حصے کا مالک بن گیا یہ تو ہونا ہی تھا بدمعاشوں کی بدمعاشی سے کوئی نہیں بچتا جاوید اندر ہی اندر کھولتا رہا لیکن کیا کرتا چوں چاں کرتا تو قتل ہو جاتا اب جو تھا بہت تھا

نوری نے جو وائی تباہی مچا رکھی تھی اس کا انجام تھا یہ' گھر آکر جاوید نے نوری کی دل لگا کر دھلائی کہ اس کی نحوست سب کچھ نگلتی جا رہی ہے سب کچھ ہاتھ سے جا رہا تھا' پوری فیکٹری کا مالک اب تیسرے حصے کا حق دار رہ گیا تھا' سب اس کی نحوست کی وجہ سے تھا۔

"تیرا باپ بہت بیمار ہے۔" شام کو جاوید کو یکدم جیسے اسے بتانا یاد آگیا اس کا رابطہ تھا گاؤں کے یار دوستوں کے ساتھ اسے اطلاع دے کر سو گیا' آدھی رات میں پھر اٹھا اسے اٹھایا، وہ منہ دیکھنے لگی۔

"جلدی کر بی بی تیرا پیو مر گیا۔" وہ دوبارہ اسے اٹھا کر جا چکا تھا پر وہ پھر خراٹے لینے لگی اس کے ہوش و حواس میں آنے کا انتظار ترک کر کے جاوید نے اسے جھنجھوڑا اور کہا نوری بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

"اٹھے گی یا منہ بھی نہیں دیکھے گی۔" اپنے باپ کا مرا منہ دیکھنے کے لیے وہ اٹھ بیٹھی۔

☼ ☼ ☼

شامیانے میں وہ ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی کسی ایک نے بھی اسے پلٹ کر دیکھا نہ منہ لگایا بڑی چیز تھے وہ سب ایسے ظاہر کر رہے تھے جیسے نوری وہاں بیٹھی ہی نہیں' دو عورتیں اس سے الجھ کر گریں جیسے اس سے نہیں کسی اینٹ پتھر سے الجھ کر گری ہوں ہو نہ ہو جاوید مروانے میں تھا اس کی بھابھیوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا اور دونوں بہنوں نے بھی' کیسے نہ اٹھاتیں یہ وہی باپ تھا نا جس نے بہوؤں کا غصہ بیٹیوں پر اتار لیا اور بیٹیوں کا غصہ بیوی پر' لیکن انہیں کچھ نہ کہا کبھی نوری نے لعنت بھیجی جاوید پر' جس کی محبت میں اندھی ہو کر وہ گھر سے نکل گئی ورنہ آج وہ بھی دل کھول کر بین ڈالتی بال کھول مٹی سواہ ڈالتی۔ بڑی بوڑھیوں کے گلے لگتی کوئی اسے تسلی دیتا بہنوں کے ماں کے گلے لگتی۔

اس کا دل جلتے تیل کی کڑاہی میں ہر آن ابل رہا تھا وہ

چپکے چپکے آنسو بہارہی تھی لماں نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کراسے نہ دیکھا آپا کی طرح اس کا بھی جی چاہا کہ بار بار لپک کر اپنے باپ کی پیشانی چومے ہاتھوں کو گالوں سے لگائے اور نہیں تو قریب بیٹھ کر چپکے سے معافی ہی مانگ لے اب ابا تو چپل مارنے سے رہا لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ قریب گئی نہیں کہ سب نے چیلوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑنا ہے۔

"آگئی باپ کو پلید کرنے"

"چل پرے ہٹ"

وہ پرے ہی بیٹھی رہی بہانے سے گڑیا کو آگے کیا کہ نانا کو پہلی اور آخری بار دیکھ لے وہ آگے ہوئی نہیں کہ آپا نے ہاتھ بڑھا کر اسے پرے کردیا۔

جنازہ اٹھا تو حاجن بی اس کے پاس آئیں صبر کا کہا اور یہ بھی کہ اب وہ چلی جائے وہ ڈھیٹ بن کر بیٹھی رہی چلی جائے گی اتنی جلدی کیا ہے اس نے سوچا ذرا نظر بچا کر ابا کے ٹرنک سے اس کا ایک آدھ کپڑا ساتھ لے جائے جب وہ بھاگ رہی تھی تو اپنے کپڑے لے کر گئی تھی اور ساتھ باپ کی عزت اب اسے مرے ہوئے کا ایک کپڑا چاہیے تھا جسے سینے سے لگا کر وہ ابا کی خوشبو سونگھ سکے اور اسے یاد رہے کہ اس کا کوئی باپ بھی تھا، ایسا باپ جس پر بھاگتے ہوئے نظر نہیں ڈالی تھی اور مرے ہوئے کو مسلسل دیکھ رہی تھی، جس کی کھلی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی اور اب بند آنکھوں کو چومنا چاہتی تھی۔

ابا کے کمرے کی طرف نظر رکھے وہ موقعے کی تاک میں تھی لیکن اندر باہر سوگوار جمع تھے وہ کیسے ابا والے کمرے میں چلی جاتی رات کے آثار نمایاں ہونے لگے رشتے داروں کا رش ذرا چھٹا تو اماں اس کے قریب آکر بیٹھی۔

"کس دھندے سے لگی ہے تو نوری وہاں" نوری ہکا بکا رہ گئی مرگ والے گھر میں اماں کیا لے کر بیٹھ گئی تھی اسے گلے سے نہ لگاتی تسلی نہ دیتی اتنی بڑی گالی تو نہ دیتی بیوہ نہ ہوئی ہوتی اماں تو ضرور نوری پلٹ کر کھری کھری سناتی۔

"تہجد پڑھ کر سوتی ہوں تو تیرے ہاتھ پاؤں، منہ، ناک، کان سے پھنسی پھوڑوں سا خون نکلتا دکھائی دیتا ہے کس گند سے لگی ہے نوری غٹر غٹر کس کا خون پیتی ہے۔"

نوری کو لگا ابھی ابھی اسی کی میت اٹھ گئی ہے وہی مر گئی ہے قبر میں بھی وہی پڑی ہے بال کھولے اور مٹی پھانکے۔

"تیرا باپ قبر میں پڑا ہے نا مجھے بھی جانا ہے اولاد کے لیے بھی جواب دینا ہوگا ہمیں۔ کچھ رحم کر اپنے مرے باپ پر۔ اپنی پوچھ پڑتال کا بوجھ اس پر نہ ڈال نماز روزہ کیا کر باقی تجھے ہم معاف کر چکے ہیں اپنی دنیا میں بس۔ یہاں نہ آیا کر۔"

نوری نے چار بندوں کا انتظار کیا کہ آئیں اور اسے کندھا دے کر میت اٹھا کر لے جائیں اس سے اپنی لاش کا بوجھ اب کہاں اٹھایا جائے گا۔ گاؤں میں رہنے والی اس کی اماں نے کتنی باتیں جان لی تھیں کیا یہ مائیں ولی ہوتی ہیں؟؟

اماں نے زندگی بھر ایک تہجد نہ چھوڑی اور نوری نے ایک بھی فرض نہ پکڑا۔ دیواریں تھام کر نوری اٹھی باہر نکلی اس کے اتنے بڑے خاندان میں صرف جاوید ہی سیٹھ لگ رہا تھا اور وہ اکیلی سیٹھانی آپا بھابھیاں خاندان کی دوسری سب۔ اس کے سامنے چوڑی چمار سی لگ رہی تھیں ایک وہی مہارانی تھی ان میں۔ مہارانی چپکے سے اپنے محل میں واپس آگئی۔

★ ★ ★

چاند نے شاہی محلے میں ہی آنکھ کھولی تھی چلنے پھرنے لگا تو وہاں کبھی اندر کے کام کرنے لگا خدمت گزار بن گیا وہ اور اس جیسے لڑکے تھے لڑکیاں بھی تھیں اسی کی عمر کی لیکن انہیں سنبھال سنبھال کر رکھا جاتا بھاؤ سے طریقے سے باقیوں میں سے کوئی ایک اس کی ماں تھی کون تھی وہ نہیں جانتا تھا۔

کوئی بھٹک کر بچی بچے کو سینے سے لگا کر نہ کہتی کہ میں ہوں تیری ماں دنیا میں لے آنے سے ہی تو کوئی ماں باپ نہیں بن جاتا نا؟

آہستہ آہستہ اس نے شعور کی طرف قدم بڑھائے وہ بازار میں گاہک گھیرتا رہا انداز زنانہ سا تھا لیکن کسی کی مجال نہیں تھی کہ اسے نیچا دکھا جائے نیم زنانہ انداز میں بات گونج دار کرتا۔

کچھ عرصے سے ایک آدمی وقفے وقفے سے وہاں آرہا تھا۔ وہاں اس جیسے آدمی کا آنا بنتا تو نہیں تھا لیکن وہ ایسی جگہ تھی کہ وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا نورتن بائی سے آکر ملتا اس سے گالیاں سنتا اور چلا جاتا۔ اس دن چاند نے نورتن سے پوچھ ہی لیا کہ یہ بار بار یہاں گالیاں کھانے کیوں آتا ہے

بولی "بچہ ڈھونڈتا پھرتا ہے یہاں اپنا۔"

"کون سا بچہ یہاں تو اب کوئی بچہ نہیں؟"

"پہلے کبھی تھا یہاں والیاں نا سیدھی سیدھی انسان دکھتی ہیں اور کھوپڑی الٹی رکھتی ہیں۔ ایک کی کھوپڑی الٹ گئی تھی بچہ لے کر بھاگ گئی جس کا تھا اسی کے پاس۔ دو دن بعد ہی واپس آگئی ناک کان سوجا کر ہڈیاں تڑوا کر۔"

چاند کو...... ہنسی آگئی۔ "گئی کیوں تھی؟؟"

"پھٹکار پڑی تھی دل پر روڑی پر گند پھینکنے سب ہی جاتے ہیں کسی کو لاتے دیکھا ہے اب آیا ہے وہی گند اٹھانے میں نے کہا پیسہ دو لے جاؤ۔"

"کیا کہتا ہے؟"

"کنگال ہے؟"

"یہ کون کس بچے کا باپ ہے؟"

"تجھے کیا تو اپنا کام کر دوبارہ مت پوچھیو؟"

چاند نے دوبارہ نہ پوچھا نئی باتیں نہیں تھیں یہ سب، آئے دن کے قصے تھے ایک دن پھر آیا ساٹھ ہزار لایا اور پیروں پر گر گیا اپنی لمبی داڑھی کے واسطے دیئے نجانے کیا کیا بکتا رہا چاند اور اس جیسے چار کو نورتن نے بلا لیا آگے وہ جانتے تھے انہیں کیا کرنا ہے چھوٹی بڑی گالیاں دے کر اسے ایک سرنگ نما اندھیرے کمرے میں لے گئے اور خوب لاتوں گھونسوں سے اسے مارا۔ وہ بے چارا ضعیف آدمی مار کھاتا رہا چلاتا رہا۔

"مار ڈالو تم میں سے کوئی تو جانتا ہوگا میرے پاس ساٹھ ہزار ہیں لے لو صرف اتنا بتادو گلابی مر گئی ہے یا کہیں چلی گئی ہے؟"

رشید عرف چاند زندگی میں پہلی بار اندر کہیں اٹھنے والی ایک ٹیس سے آشنا ہوا گلابی اس کی ماں تھی اور یہ داڑھی والا مسجدی ٹوپی والا کندھے پر دھرے صافے والا ضعیف کمزور لاغر دھنسی آنکھیں۔ آنسوؤں سے بھیگے گال یہ کس بچے کا پتا کرتا پھر رہا تھا۔ کون تھا اس کا بچہ

گلابی کا ایک ہی بچہ تھا چاند

چاند کے اندر جو ٹیس اٹھی وہ بڑھتی ہی چلی گئی وہ وہاں سے بھاگ گیا چھوٹی چھوٹی تنگ گلیوں کو پار کرنے لگا چوباروں کے نیچے سے اندھیروں کے اوپر سے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دور نکل گیا

بہت دیر تک بھاگتے رہنے کے بعد ایک جگہ بے ہوش ہو کر گر گیا بھنگی کالیا اسے ڈھونڈتے آئے اٹھا کر ساتھ لے گئے، رات گئے اسے ہوش آیا تو اس سرنگ نما کمرے کی طرف بھاگا وہ تو جا چکا تھا جانا ہی تھا۔

گاہکوں پر نظر رکھے رکھے چاند نے ان میں انسانوں کو تلاشنا شروع کردیا الٹا سیدھا سا ہوگیا دماغ کوٹھے سے پرے ہوتا گیا، وہ کیا ہے کیا ہوتا گیا اسے خبر نہیں تھی۔

ایک دن پھر آگیا وہ چمڑے کا چھوٹا بیگ بغل میں دبائے شاید زیادہ رقم کا انتظام کرلیا تھا اس نے چاند کو اپنی اصل قیمت کا ابھی ابھی اندازہ ہوا آج کوئی اس پر بھی لٹانے آیا تھا اس کے لیے دام لایا تھا کیا چاہیے بھنگی اور کالیا کو ایک طرف کر کے چاند آگے بڑھا۔ کالیا تو پھر سے چانٹے مارنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

"بچے ایک آخری بار نورتن سے ملنے دو اسے کہو چھ لاکھ بیس ہزار لایا ہوں۔"

"کسے بیچ کر لائے ہو۔" چاند کی آواز سپاٹ تھی۔

"اب کچھ نہیں بچا تو بیچنا کیسا اچھے وقتوں کا ایک دوست تھا اس نے مدد کی ہے۔" وہ بہت خوش تھا۔

"تو بھی تو یہاں ہے۔ تجھے پتا ہوگا گلابی کا‘ یہ سارے پیسے تو رکھ لے" اس نے چمڑے کا بیگ نکال کر ہاتھ میں پکڑا۔

"مر گئی ہے وہ" چاند نے اسے گھور کر دیکھا۔

"یہ تو نورتن بھی کئی بار کہہ چکی ہے کہیں اور ہوگی گلابی یہاں رہنے والوں سی نہیں تھی"

"پھر رکھنا تھا اسے اپنے پاس۔"

"کیسے رکھ لیتا رکھ لیتا تو اب یہ دھکے جوتے کیسے کھاتا‘ بچے تو نہیں سمجھے گا تب میں‘ تب میں شیطان تھا۔"

اس نے سرگوشی کی "یہاں گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا بہت پیسے والا تھا یہاں آتا جاتا رہتا تھا یاروں کے ساتھ‘ گلابی کو اپنے پیچھے لگالیا عین میری شادی سے مہینہ پہلے بچے کو گود میں لیے آگئی میرے پیچھے مجھے تو اس وقت پتا چلا میں کون ہوں دو دن رکھ کر ابا جی نے خوب پٹوایا اسے بھوک پیاس سے بچہ بھی دو دن بلکتا رہا اب اس عمر میں اس کا بلک بلک کر روتا کان کے پردے پھاڑے دیتا ہے‘ تو نہیں سمجھے گا بچے اب کیا کیا گزرتی ہے مجھ پر اوپر تلے کے تین بیٹے جوان ہو کر جائیداد کے لیے قتل ہو گئے بیوی بیماری سے چلی بسی بیٹی جل کر مر گئی آل اولاد گئی مال اسباب گیا تجھے نہیں پتا‘ بچے یہ سب کیوں ہوا مجھے جب معلوم ہوا تو ایک مومن پرہیز گار کے پیچھے بھاگا سب کہہ سنایا انہیں‘ اسی بندہ مومن نے مجھے یہاں کی راہ دکھائی‘ کہتے ہیں جاؤ جا کر سمیٹ لو دونوں کو جہاں ملیں‘ میں آگیا ہوں انہیں سمیٹنے۔ اپنے گناہ سمیٹنے پیروں پر سر رکھنے۔"

وہ بول رہا تھا چاند چلتے پھرتے لوگوں کے پیروں کی دھول ہو رہا تھا۔

گلابی مر گئی ہے سنا تھا اس کا ایک بچہ تھا بیمار رہ کر وہ کب کر مر چکا سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔

داڑھی والے کو ایک زور دار جھٹکا سا لگا کھڑے کھڑے ڈگمگا گیا۔

بہت دیر تک وہ ڈگمگائے انداز سے ہی کھڑا رہا۔

"قبروں کا ہی اتا پتا دے دو"

"کسی بھی قبر پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھ لو۔"

"فاتحہ کسے پڑھنی ہے۔ مغفرت تو انہیں میری کرنی ہے" صافے سے آنکھیں صاف کرتا وہ بولا سرکار کہتے ہیں جتنوں کو اپنا سکوں اتنا ہی اچھا‘ بچے تو چل میرے ساتھ‘ اللہ کی راہ بھلی سرکار کا نام بھلا چل نکل جا یہاں سے چھ لاکھ لے لے مجھ سے کاروبار کر بیوی بچے کر۔"

اس بار چاند پھیکی ہنسی ہنسا۔

"ہر انسان اپنی مرضی والا‘ میں نے کر دیکھی اپنی مرضی اب سرکار کی مرضی مجھے پیاری‘ بہت دیر کر دی پر تو دیر نہ کر راستہ بدل لے تو بھلا مانس لگتا ہے‘ مجھے ہم سب ہی بھلے مانس ہوتے ہیں بس یہ جو ادھر ادھر اپنی اپنی کرتے ہیں یہ برا ہے‘ میرے ساتھ چل شادی کر گھر بنا اپنا یہاں سے کوئی ایک نکال کر لے جا اپنے ساتھ خدا خوش ہوگا باپ بنے گا تو قدر آجائے گی خدائی کی پتا لگنے لگے گا تجھے کہ خدا بندے سے کیا چاہتا ہے۔ باپ بن کے دیکھ بچے کو سرکار دو عالمؐ کا نام سکھا پڑھا اور پھر اسے سینے سے لگا تجھے سرور آجائے گا چل میرے بچے تو میرے ساتھ چل میں تجھے سرکار دو عالمؐ کا نام سکھاتا ہوں پڑھاتا ہوں بندہ مومن کہتا ہے کہ اطاعت میں کبھی دیر ہی نہیں‘ علم میں کوئی شرم نہیں خدا کے بندوں میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں چل آ میرے ساتھ۔"

چاند کے کندھے پر رکھا ہاتھ جو چاند نے جھٹک دیا۔

"تم جیسے دیر نہیں‘ بہت دیر کر دیتے ہو میری تو اپنی جوانی جا چکی اور کتنی دیر ہو گی۔ خدا کے یہاں دیر ہی نہیں ہوتی اس معاشرے میں‘ بہت دیر ہو گئی‘ جہنم کا اگلا ہی پل‘ بہت دیر ہی کر دیتا ہے۔"

میاں وہیں کھڑا رہا چاند وہاں سے بھاگ گیا پھر کبھی نہ آیا میاں وہاں چاند کو پاش پاش کر گیا اس کے سوراخ ٹھوک گیا دھڑ دھڑ کئی در بنا گیا میاں اسے برباد کر گیا تھا علم سے لاعلمی بھلی درباروں میں جا جا فقیروں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھا رہتا

نورتن نکالنے کو تیار‘ وہ نکل بھاگنے کو‘ بہت جمع پونجی تھی اس کے پاس۔ لیکن اب وہ اس سے وہ نہیں خرید سکتا تھا جو میاں کو چاہیے تھا‘ شہروں شہروں گھومتا کہیں مہینہ کہیں سال کہیں ایک دن

اس کے اندر ایسی بچہ بچہ ہوئی کہ اسے ساری دنیا اپنی طرح بنا بچے کے نظر آنے لگی اسے لگتا کہ کبھی کچھ مانگا نہیں اب مانگا ہے تو آسمان والا ضرور ہی بچہ آسمان سے ٹپکا دے گا وہ اس کا باپ بنے گا ماں بنے گا اس کے ولار کرے گا بچہ کی خواہش اس میں آن بسی اب جانے کا نام نہیں لے رہی تھی

وہ میاں کی مغفرت کا باعث نہیں بن سکا اس کا بچہ ضرور بنے گا‘ پارکوں میں بیٹھا بچوں کو دیکھا رہتا چند ایک نرسوں کی اس نے منت کی‘ ایک دو غریب عورتوں سے انہوں نے بات کی عین وقت پر ایک عورت نے پیسے واپس کر دیئے کہ نہیں دینا بچہ

انسان کے اتار چڑھاؤ انسان ہی جانے چاند تو چاند نہ رہا بنا بچے کے اماں ابا بن گیا ماں کو یاد کر کے روتا‘ میاں کو یاد کرتا اسے معاف کر دیا تھا اپنی معافی کے لیے تڑپتا تھا اب۔ ڈھلتی عمر میں کیا سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ ڈھلتی عمر میں سوچ کے اتنے در کیوں کھل جاتے ہیں پچھتاوے کیوں جاگنے لگتے ہیں گناہوں کی سمجھ کیوں آنے لگتی ہے ہنسی ٹھٹھول گناہ کیوں لگتے ہیں یہ عمروں کا آخر انسانی خاتمہ یہ ایک اختتام کا آغاز یہ اتنی قیامت کیوں لاتا ہے؟؟

اس کے اندر دونوں سمندر بیک وقت ٹھاٹھیں مارنے لگے پدرانہ و مادرانہ پل پل وہ پاگل ہونے لگا جیسے بن چاہی دلہن پل پل مرتی ہے‘ رشید کو لگتا کہ اس کی شادی کو عشرے بیت گئے ہیں اب گود بھرنے کا انتظار اور نہیں ہوتا یا انگارے بھر دو یا گود بھر دو وہ بانجھ پن کا بوجھ اٹھائے سیاہ بڑتی عورت کی طرح باؤلا ہو گیا وہ ڈاکٹروں اور حکیموں کے پاس جاتی ہے یہ مزاروں اور بچہ دینے اور دلانے والوں کے یہاں جانے لگا‘ ورنہ کیا تھا کسی بھی اٹھائی گیر کو پیسے دیتا اور کسی کا بھی بچہ اٹھوا لیتا لیکن وہ ذات کا بے ذات ہو سکتا تھا خصائل میں اچھے اثرات باقی تھے۔

بچی ذات وہ رکھ نہیں سکتا تھا پھر اس کی شادی کا مسئلہ ہوتا‘ لڑکا کوئی دیتا نہیں تھا‘ ایک بچی تو مفت مل رہی تھی اس نے ہاتھ جوڑ کر انکار کیا‘ رشید جب چاند بنا تو خوب بنا اب باپ بننا چاہتا تھا تو خوب تڑپ رہا تھا‘ اس نے ہر سوانگ بہت دل سے اور جم کر رچایا تھا۔

رشید نے داڑھی رکھ لی تھی سرحد کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی طرف چلا گیا تھا‘ ہر اس امکان سے دور جہاں اسے پہچان لیا جائے‘ رات دن محنت ضروری کرتا تھا‘ اچھے لوگوں میں تھا‘ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ جتنے پیسے تھے وہ اس نے امین کے نام بینک میں رکھوا دیئے تھے فی الحال وہ اسے اپنی کمائی ہی کھلا رہا تھا‘ راستے کی ایک مسجد کے مولوی صاحب سے اس کے کان میں اذان دلوائی تھی اور نام بھی انہوں نے ہی بتایا تھا۔ امین چاند کا چاند تھا اسے‘ بہت پیارا تھا۔

جب امین چلنے لگا تو وہ اسے پانچ وقت مسجد لے جاتا بولنے لگا تو اسے مدرسے کے استاد کے پاس چھوڑ آیا اس گاؤں میں کوئی اسکول نہیں تھا مسجد کے ساتھ ہی چھوٹا سا مدرسہ تھا جہاں ابتدائی تعلیم بھی دی جاتی تھی‘ رشید امین کو نہلاتا کھلاتا اور رات کو اسے سرکار دو عالمؐ کا درود سکھا کر سلا دیتا درود کی لوری سناتا اسی سے اٹھاتا رشید خوش تھا اب اپنی زندگی سے اسے وہ مل گیا تھا جو اس نے کبھی نہیں چاہا تھا اور جب چاہا تو ویسا ہی ہو گیا۔

سب سے دور کرائے کے چھوٹے سے گھر میں وہ دونوں خوش تھے‘ سوچا کہ آنے والے وقت میں وہ امین کو اس کے ماں باپ بہن بھائیوں سے ملوا دے گا دونوں ملتے رہیں گے‘ رشید جانتا تھا کہ امین اس سے اتنا پیار کرتا ہے کہ اسے کبھی چھوڑ کر نہیں جائے گا وہ اسے سب سچ سچ بتا دے گا کہ رشید کا ماضی کیا تھا کہاں رہا اور امین کو کیسے لیا وہ اس کا لے پالک باپ ضرور تھا لیکن محبت کی ہر حد سے زیادہ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔

وہ امین کے دونوں ہاتھ دعا کی صورت اٹھوا کر میاں اور گلابی کے لیے دعا کرواتا‘ امین ایک اچھا بچہ تھا پیارا اور من موہنا۔

★★★

گوہر سارہ کو لے کر کینیڈا اپنے والدین کے ساتھ

رہنے لگی تھی بچی بہت خوبصورت تھی اس کے گھر والوں نے اس کے فیصلے کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا تھا۔ گوہر سارہ سے پہلے سکون آور گولیاں کھاتی تھی اس عادت سے چھٹکارا ملا' نفسیاتی مریضہ بننے لگی تھی' سارہ اس کی زندگی میں انقلاب لے آئی تھی' کینیڈا میں اس نے اپنا گھر سیٹ کیا جاب کرنے لگی سارہ کو لے کر گھومتی رات کو اس کے ساتھ باتیں کرتے کرتے سوجاتی گوہر کے والدین بھائی' بہن سب ہی سارہ سے بہت پیار کرتے تھے' وہ سب گوہر کی خوشی میں خوش تھے سالوں وہ سب آپس میں ناراض رہے تھے ان سب کے درمیان گوہر کی اپنی مرضی کی شادی نے خلیج پیدا کردی تھی گوہر کو ثاقب کے ساتھ طوفانی محبت ہوگئی تھی سانس نہیں آرہا تھا ثاقب کے بغیر وہ شادی شدہ تھا کینیڈا میں ہونے والی ایک کانفرنس میں دونوں کی ملاقات ہوئی تھی' گوہر ثاقب کے پیچھے پاکستان تک گئی اپنے گھر والوں کو ناراض کرکے نہ صرف گئی بلکہ شادی بھی کی اتنے سال اس کے لیے پاکستان میں رہی ثاقب کو اولاد کی پروا نہیں تھی کیونکہ وہ خود اولاد والا تھا دو بیٹے تھے اس کے گوہر خود ہی علاج کرواتی رہی امریکہ بھی اکیلی ہی گئی اس کام کے لیے ثاقب کے پاس وقت نہیں تھا وہ ایک اچھی کنسٹرکشن کمپنی کا مالک تھا پیسے کی کمی نہیں تھی وقت کی بہت کمی تھی

چند سالوں میں ہی گوہر کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ کئی بار ثاقب سے لڑ کر طلاق کی بات بھی کی پر ایسے موقع پر وہ اپنی شدید محبت کا اظہار کرنے لگتا اور وہ خود کو بے وقوف کہتی جو طلاق کی بات کی' ایک دوبار وہ اس کے ساتھ چلا گیا چیک اپ کے لیے پھر بھی گوہر ماں نہ بن سکی دوبار کینیڈا گھر والوں سے ملنے بھی گئی لیکن پھر بھی وہ ناراض ہی رہے انہیں ثاقب پسند نہیں تھا ان کا کہنا تھا کہ وہ بہت معصوم ہے لوگوں کی پہچان نہیں رکھتی ثاقب کو چھوڑدے لیکن وہ ثاقب کو نہیں چھوڑ سکی اولاد کے لیے تڑپتی رہی ثاقب اسے بے بی لینے بھی نہیں دیتا تھا سخت خلاف تھا وہ اس سوچ کے کہ کوئی بے بی لیا جائے مشہور یہ تھا کہ وہ خود نازک مزاج ہے اور کسی کا بچہ نہیں رکھ سکتی۔

جاوید نے اسے بے بی دینے کا کہا تو وہ منع نہ کرسکی اس نے خود سے ہی فیصلہ کرلیا ثاقب نے صاف کہا کہ وہ اپنے کسی کے بچے کے ساتھ گھر میں نہیں گھسنے دے گا کچھ جاوید کا ڈر اور کچھ ثاقب سے اس کا اختلاف وہ فوراً کینیڈا آگئی ہمیشہ کے لیے' سارہ کے لیے اس کے گھر والے خوش تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ثاقب سے طلاق لے لے لیکن یہی ایک فیصلہ وہ نہیں کرپارہی تھی' سارہ آگئی تو وہ سب کچھ بھول کر اس میں لگ گئی

آٹھ ماہ بعد ثاقب اس سے ملنے آیا یہ ٹھیک ہی تھا کہ وہ گوہر سے محبت کرتا تھا اب وہ گوہر سے ملنے سال میں ایک بار آجاتا گوہر کے لیے یہی کافی تھا سارہ اسکول جانے لگی تھی وہ ابھی بھی سارہ کو پسند نہیں کرتا تھا اس پر ایک نظر ڈالتا اور بس' جن دنوں ثاقب آتا گوہر سارہ کو امی ابا کے ہاں چھوڑ دیتی۔ ثاقب شاذو نادر ہی سارہ کو دیکھ پاتا سارہ سات سال کی ہوئی تو ثاقب اس پر نظر ڈال کر نظر ہٹانا بھول گیا۔

"ادھر آؤ" ثاقب نے اسے پہلی بار بلایا اپنے پاس بٹھایا باتیں کیں اس کے بال سہلانے لگا گالوں پر چٹکی لی اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھا رہا گوہر بہت خوش ہوئی' سارہ بھی خوش نظر آنے لگی' بہت دیر تک نئے نئے بنے پاپا سے باتیں کرتی رہی۔ پاپا اسے آئسکریم کھلانے لے گئے ثاقب کی سارہ سے یہ ملاقات اتفاقیہ تھی سارہ تھوڑی دیر کے لیے گھر آئی تھی اس کے نانا کو کہیں جانا تھا اور وہ اسے گوہر کے پاس چھوڑ گئے ثاقب کو تو کوئی پسند ہی نہیں کرتا تھا وہ آتا چند ہفتے صرف گوہر کے پاس ہی رہ کر چلا جاتا۔

سارہ کو ثاقب نے اپنے پاس ہی رکھ لیا وہ اسے گھمانے لے جاتا گوہر جاب پر چلی جاتی وہی اسے اسکول چھوڑ دیتا۔ لے بھی آتا سارہ پاپا کو پسند کرنے لگی پاپا جو اس کا نہیں تھا لیکن بنا ضرور تھا ثاقب کے اس بدلے انداز پر گوہر نے جاب سے ایک ماہ کی چھٹی لے لی اور وہ سب مل کر گھومنے امریکہ چلے گئے ثاقب پاکستان واپس چلا گیا چند ماہ میں ہی پھر آگیا پہلے ثاقب

ایک لمبے وقفے کے بعد آتا تھا گوہر چھٹی لے لیتی تھی اب اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا' لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ وہ وقت سے ذرا پہلے آگئی سارہ کو اسکول لینے گئی پتا چلا ثاقب اسے لے کر جاچکا تھا جبکہ ثاقب نے اسے کہا تھا کہ آج اسے کسی ضروری کام سے جانا تھا۔

وہ گھر آئی بیل دیتی رہی اگر ثاقب گھر آچکا تھا سارہ کو لے کر تو وہ گھر لاک کیوں تھا اس نے چابی نکال کر دروازہ کھولا فون نکال کر ثاقب کو فون کیا اس کا فون آف تھا۔ چار بجنے والے تھے اس نے دو گھنٹے دونوں کا انتظار کیا کہ شاید سارہ کو کہیں گھمانے لے گیا ہو۔ گوہر کو تشویش ہوئی وہ فون پر فون کرتی رہی ثاقب کو' اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ ثاقب کا فون چارجنگ نہ ہونے کی وجہ سے بند ہوگیا ہو۔

انتظار کرتے کرتے تین گھنٹے اور گزر گئے وہ کھانا پکاتی رہی رات ہونے لگی اس نے پاپا کو کال کی وہ بھاگے آئے۔

"سارہ کو تم نے اس کے ساتھ کیوں جانے دیا۔" وہ آتے ہی چلانے لگے۔

"وہ اسے اکثر گھمانے لے جاتا ہے پاپا۔"

"کیوں جانے دیتی ہو ثاقب کے ساتھ تمہیں کتنی بار منع کیا میں نے۔" وہ ٹھیک کہہ رہے تھے انہوں نے بہت بار گوہر کو منع کیا تھا کہ وہ ثاقب کے ساتھ سارہ کو اکیلا نہ چھوڑا کرے۔ ثاقب کے ساتھ رہتے گوہر یہ سب باتیں بھول جاتی تھی۔ اس کی شخصیت کا جادو گوہر کے سر چڑھ کر اسے مدہوش رکھتا تھا اس کی باتوں کے سحر میں ڈوبی رہتی ثاقب سارہ کو پسند کرنے لگا تھا اور گوہر اس پر بہت خوش تھی باقی وہ سب بھول گئی تھی' پاپا نے پہلی فرصت میں پولیس کو فون کیا گوہر حیران رہ گئی۔

"پولیس کیوں پاپا۔" پاپا نے صرف اسے گھورا۔

"تمہیں وہ ہمیشہ اچھا لگا اور مجھے ہمیشہ برا۔ تمہاری آنکھوں پر محبت کی پٹی تھی اور میری پر تجربے کی۔ تم نے کبھی میری نہیں سنی گوہر سوچا تھا ماں بن کر سمجھنے لگو گی لیکن جانچ پرکھ والی آنکھ ہی تم نے بند کر رکھی ہے۔"

پولیس آگئی۔ گوہر کا بھائی' بہن اور بہنوئی بھی آگئے دونوں کا کچھ پتا نہیں تھا رات گزرنے لگی گوہر بے ہوش ہو کر اسپتال پہنچ گئی۔ ایئرپورٹ سے کنفرم ہوچکا تھا ثاقب نامی پاکستانی آدمی رات نو بجے کی فلائٹ سے جاچکا تھا' سارہ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ سارہ گم شدہ تھی پولیس ڈھونڈ رہی تھی رات گزر رہی تھی گوہر بار بار ہوش میں آکر سارہ کا پوچھ کر بے ہوش ہوتی رہی۔ رات بھر پولیس سارہ کو ڈھونڈتی رہی۔ گوہر کے پاپا بھائی رات بھر دوڑ دھوپ کرتے رہے۔

دن چڑھے شہر سے دور آبادی سے دور ویرانے میں جنگل کی طرف کرائے کی ایک کار کی پچھلی سیٹ پر سارہ نیم مردہ حالت میں ملی کوئی ہوش والا اس کی حالت کو دیکھ کر ہوش میں نہیں رہ سکتا تھا۔

گوہر کی سارہ نوری کی سارہ جاوید کا سودا۔

ٹھیک اسی رات پہلی بار وہ گڑ نوری کے خواب میں آیا تھا نوری ڈر کر سارے گھر میں بھاگتی پھری چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا۔

"میرا دل پھٹا جارہا ہے جاوید۔" وہ زمین پر لڑھک گئی جاوید کے لیے مشکل ہوگیا اسے سنبھالنا۔ کانوں پر ہاتھ رکھے فرش پر پھیلتے اس نے ایک دلخراش چیخ ماری پھر بھاگ کر سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی تیسری سیڑھی سے گر گئی اور منہ سے خون نکلنے لگا۔ جاوید نے رکھ کر دو طمانچے مارے منہ پر۔

"پاگل ہوگئی ہے کیا ہوا؟ کیا موت پڑی ہے کیسے دیکھ لیا خواب میں۔" "خواب تو وہ بھول گئی نجانے کیا کیا یاد آرہا تھا اور یاد بھی نہیں آرہا تھا۔ جاوید نے اس کا منہ صاف کیا ساتھ لے کر آیا بیڈ پر سلایا۔

"نوری یہ حرکتیں چھوڑ دے مجھے غصہ نہ دلایا کر ورنہ گھر سے نکال باہر کروں گا۔" جاوید نے الماری میں سے نکال کر دو نیند کی گولیاں اسے دیں اور لائٹ بجھا کر خود سو گیا نوری "جاننے نہ جاننے" میں معلق سوتی جاگتی رہی۔

جس حمل سے اب نوری تھی اس بچے کے دماغ

میں پانی تھاڈاکٹروں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ پیدا ہوا بھی تو نہیں بچے گا اور پیدا ہونے سے پہلے ایک بھی مر سکتا ہے اور دونوں بھی۔ نوری نے چھ مہینے تکلیف سے چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھائے رکھا دھرتی ہلائے رکھی پر بچے کو پیٹ میں ہی رکھا۔ ساتویں مہینے دنیا میں آیا اسپتال میں رہا نوری پندرہ دن بعد گھر آگئی اور پورے نو ماہ کا ہو کر بچہ مردہ ہو کر گھر آگیا۔ نوری نے جاوید کا گریبان پکڑ لیا۔

"بچہ دے میرا بچہ نکال جاوید بچہ چاہیے مجھے۔" اس کی میت کی پاس وہ یہ کہتی رہی۔ "نکال میرے بچے دے میرے بچے۔" اٹھتے بیٹھتے وہ یہ کہنے لگی' ایک دو بار تو جاوید نے برداشت کر لیا پھر رکھ رکھ کر مارنے لگا گالیاں دیتا رہتا۔ جب حمل نہیں ٹھہرا تھا تو نوری مزاروں پر دیے جلاتی' جمعراتوں کی پابند ہو گئی تھی۔ صبح و شام درباروں میں گزارتی' ایک بار پہلے بھی وہ درباروں کی ہو گئی تھی جب اسے جاوید سے شادی کرنی تھی۔ اماں کہا کرتی نوری نماز پڑھ لے نماز پڑھ لے اور وہ دربار جا کر منت کے نفل پڑھتی رہتی وہ دو بیٹیوں کی ماں تھی لیکن اب اسے صرف ایک لڑکا اور چاہیے تھا۔ لڑکا اسے اس شدت سے چاہیے تھا جیسے وہ صدا سے بے اولاد ہے بانجھ ہے اولاد والی ہوئی ہی نہیں' ماں بننے کا مزا چکھا ہی نہیں۔ ابا کے مرنے کے بعد اسے لڑکی ذات سے نفرت ہو گئی اس رات وہ گھر آکر سو نہیں سکی تھی پہلی بار بہت واضح خلل آیا تھا اس کی ذات میں اس کی اماں نے کس دھڑلے سے اس کی پوٹلی کھول دی تھی۔ نوری کو بددعا لگ گئی تھی کس کی؟ کس کس کی نہیں لگی ہوگی۔ ابا کی قبر میں پہلی رات اس کی اپنی پہلی رات بن گئی اس کا حساب کتاب شروع ہو گیا وہ تھر تھر کانپنے لگی ایسی کپکپاہٹ جو نظر نہیں آتی' جو تھمتی بھی نہیں اس نے ڈھیروں ڈھیر چیزیں منگوا کر بچوں میں بانٹنی شروع کر دیں گاؤں میں جس جس کا جب بھی دل پریشان ہوتا وہ یہی کرتا۔ نوری کا دل پھر بھی ویسا ہی رہا اسکول سے گڑیا مانو آجاتیں انہیں سلا کر وہ دربار آجاتی۔ جاوید فون کرتا

"گھر آنا ہے کہ نہیں" وہ دیکھتی رات ہو گئی کتنی اذانیں' جماعتیں کھڑی ہو چکیں اور وہ وہیں ایک طرف کی ایک طرف بیٹھی رہی۔ وہ دعا کرتی کہ وہ منحوس بھیڑا مرجائے اس کی جان لے کر ہی ٹلے گا گیا۔ بدھائی میری بدھائی۔ بتا کسے کھلائی میری بدھائی؟ کون کھا گیا میری بدھائی۔

ایک دن سڑک کے پار بیٹھے فقیر کے کالے کشکول میں اس نے چند سکے اور پیسے ڈالے۔ دو ہی قدم چلی تھی کہ سکے کو اس نے اپنے پیروں کے پاس آتے دیکھا سکے کی کھنک کی آواز اتنی گونج دار تھی نوری رک گئی۔۔۔ پلٹی۔۔۔ کبھی کسی نے کہا تھا کہ جو پلٹتا ہے پتھر کا بن جاتا ہے۔ ٹھیک کہا تھا قیامت اور حشر کا پتھر ہو جانا جب پاؤں زمین میں ہی دھنسے رہیں گے اور دل دہل کر پگھل جائیں گے جب ارواح بین کریں گی آہ و بکا کریں گی اور کہیں گی "یہ کیا کیا تو نے ہمارے ساتھ ہمیں رسوا کیوں کیا؟"

فقیر کشکول کو سڑک پر الٹ چکا تھا۔ اس نے فقیر کی طرف دیکھا اور فقیر نے اس کی طرف۔۔۔ اور بس۔۔۔ اور نوری کی روح کی آہ و بکا شروع ہو گئی "کیوں لے ڈوبی مجھے یہ کیا کر دیا میری لگا میں نفس کے ہاتھ میں دے دیں اے نوری تجھے خدا پوچھے۔" نوری بے نور ہو گئی سکے کی گونج سے اس کے کان پھٹنے کے قریب ہو گئے اس کی سانسیں اندر جا کر گم ہو رہی تھیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا انہیں سکے اور پیسے سڑک پر بکھرے ہوئے تھے لوگ آ جا رہے تھے پوں پاں کرتی گاڑیاں' رکشے' بسیں گزر رہی تھیں وہاں کھڑی ایک ذات جامد اور ساکت تھی۔ "نوری"

فقیر کشکول کو خالی کیے بیٹھا تھا۔۔۔ اس کا کشکول کہہ رہا تھا "ہونہہ" فقیر اس کشکول کو تھامے بیٹھا تھا اور نوری کو دھتکار چکا تھا۔

"کن کے لیے دیے جلانے آئی ہو۔۔۔ کیا چاہیے اب۔۔۔ یہ جو کشکول انسانوں نے تھام رکھے ہیں نا یہ کبھی نہیں بھرتے کبھی نہیں۔۔۔ بچے بیچ کھائی ہو۔ ایمان بھی بیچ کھاؤ گی۔۔۔ اپنی کھال کے اندر کا سودا کر ہی

بیٹھی ہو نا توبہ کرنے نہیں آتی اور اور مانگنے آجاتی ہو اور کتنا چاہیے کب تک چاہیے اے انسان تو انسان کب بنے گا انسان نہیں بنتا تو بے لگام نفس پرور بھی نہ بن۔ مجھے بھیک دیتی ہو۔ آ میرے ساتھ تو بھی بیٹھ جا۔ کٹورا پکڑ لے۔ صدائیں لگا معتبر رہے گی' بچی رہے گی۔ صدا لگا کر مانگ' التجا سے مانگ چل آ بیٹھ میرے ساتھ۔"

ایک رشید والا' ایک بیگم گوہر کا' ایک بیگم کی سہیلی کا' ایک وکیل عورت کا' اس نے سب کے ناموں کے سکے پیسے بار بار چنے اپنے بٹوے میں رکھے رکشا لیا اور گھر آگئی۔ وہ سکے اور پیسے لا کر اس نے جاوید کے منہ پر دے مارے۔ "میری تیری کمائی" وہ دھاڑی۔

"کمینی" وہ اس کی طرف لپکا

"سودے باز" وہ اس سے زیادہ چیخی اور گالیاں دیتی رہی نوری کے دن پورے ہو رہے تھے اسے پیٹ کے وہ دن یاد آ رہے تھے جن میں بچے آکر ٹھہرے تھے اس کے جسم میں ہر ہر بچے کا لمس جاگنے لگا اس پر ہر ہر بچے کی ابتدا ہونے لگی منہ کے راستے وہ بہت کچھ پیٹ میں ڈال چکی تھی جو کوکھ میں پلے تھے انہی کی وجہ سے پیٹ بھرا تھا۔ انسان کی ازلی بھوک جو کبھی ختم نہیں ہوتی' شیطان کے ہاتھوں سارا ایمان بیچ کر بھی۔ اب یہ بھوک کوکھ میں اٹھنے لگی تھی ایک در بند ہوتا تو دوسرا منہ کھول لیتا۔ ایسے ہی ایک بھوک ختم ہوئی تو دوسری بے دار ہونے لگی۔ نوری عورت سے بیوی سے انسان سے ماں بننے لگی اب اسے اجنبی زبانیں سنائی دیتیں وہ جو اس کے چار بچوں کی تھیں اجنبی زبانوں میں اسے خواب آتے۔ اجنبی لوگ اسے نجانے کیا کیا کہتے رہتے جانے کہاں کی مخلوق تھی جو آتی اور اسے دھتکار کر سنا کر چلی جاتی۔ نوری' نوری نہ رہی وہ ماں بننے لگی اس دن پہلی بار۔ جاوید سفید ماربل کے فرش پر رکھے اسی ہزار کے ڈریسنگ ٹیبل کی ایک کرسی پر بیٹھا روسٹ کھا رہا تھا۔ بوٹی بوٹی توڑ رہا تھا' نوری نے اپنا پنجہ مارا اور اس کے دانتوں میں دبی ہوئی بوٹی کھینچ کر باہر نکالی' جاوید گڑیا مانو تینوں بیک وقت ڈر کر اسے دیکھنے

لگے۔ اس نے اپنی انگلیاں اس کے منہ میں گھسا دیں۔ "نکال میرے بچے۔۔۔ میرے بچے نکال۔ نکال انہیں باہر۔"

کرسی گری۔ ٹیبل پر رکھے سب برتن گر گئے' جاوید نے اس کو دھکا دے کر خود سے الگ کیا اس وقت تک وہ اچھی طرح اس کا منہ کھرچ چکی تھی۔ اس کے منہ میں سے خون نکلنے لگا۔

"اماں!" گڑیا اس کی طرف لپکی۔ مانو ڈر کر رونے لگی اور اس کی طرف آنے لگی تو سالن سے پھسل کر گر گئی سر فرش پر زور سے لگا جاوید نے لپک کر مانو کو اٹھایا اس کے ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے اسے صوفے پر لٹایا پانی پلایا نوری پکے فرش پر اپنا سر مار رہی تھی۔ خون نکل کر بہہ رہا تھا وہ دیوانی ہو گئی تھی۔

"مجھے میرے بچے چاہئیں۔ مجھے میرے بچے دے دے۔"

جاوید لپک کر اس کی طرف آیا گڑیا الگ رو رہی تھی بہت خون نکل رہا تھا۔ جاوید نے اسے قابو کرنا چاہا۔

"مجھ پر رحم کر۔" وہ چلانے لگی "میرے یہاں' یہاں' یہاں وہ ہیں۔" اس نے نجانے کہاں کہاں اشارے کرنے شروع کر دیے جاوید بمشکل اسے اٹھا کر کمرے میں لایا ڈاکٹر کو بلایا اس نے انجکشن لگایا تو وہ سو گئی لیکن وہ نہیں سوئی وہ آنکھیں جو کسی کی تھیں لیکن اس کے وجود میں اگی تھیں وہ کروڑوں دھڑکنیں لامحدود سانسیں جو اس کی نہیں تھیں لیکن

اسی میں تھیں اسے چین نہیں لینے دے رہی تھیں نیند تو سکون والوں کو آتی ہے اسے اب نیند کیسے آتی؟

ایسے دورے اسے آئے دن پڑنے لگے۔ جاوید فیکٹری اور اسٹور میں لگا رہتا اس کے پاس اب وقت نہیں ہوتا تھا' وہ دیواروں سے ٹکریں مارتی بھوکی پیاسی کسی کونے میں پڑی رہتی گڑیا گیارہ سال کی ہو چکی تھی اتنی بڑی تو نہیں تھی پھر بھی تھوڑا بہت گھر کا خیال رکھ لیتی تھی۔ گھر میں دو کل وقتی ملازم بھی آ گئے تھے وہ اپنی لوٹ کھسوٹ میں لگے رہتے جاوید آ کر اسے باتیں سنا کر چلا جاتا۔

"میں دوسری شادی کرلوں گا نوری۔" ایک دن دھمکی دینے لگا۔

اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے کھڑے اس نے اجڑی آنکھوں سے جاوید کو دیکھا۔ "نئی فیکٹری لگانے لگا ہے۔" نوری نے دانت کچکچائے جاوید نے الٹے ہاتھ کا ایک چانٹا لگایا۔

"کس چیز کے طعنے دیتی ہے مجھے تو بھی میرے ساتھ تھی۔"

"وہی تو"

"اتنے بڑے بڑے گھروں میں گئے ہیں سب عیش کرتے ہوں گے۔"

"گھر تو یہ بھی بڑا ہے۔"

"یہ گھر اب بڑا ہوا ہے۔ تو سمجھتی کیوں نہیں۔"

"سمجھنے لگی ہوں اب۔"

"دماغ سے یہ خناس نکال' جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہے' گھر سنبھال' بچوں کا خیال کر۔ نوکروں پر گھر چھوڑ رکھا ہے سب پاگل کہتے ہیں تجھے۔"

"میں سمجھی کچھ اور کہتے ہوں گے۔" مدہوش سوگوار سا انداز۔

"بچوں کا خیال کر نوری۔" جاوید اس کے قریب آیا۔

"کس کس بچے کا۔" نوری کی آنکھیں اور ویران ہو گئیں وجود میں دھڑکتی سب کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

"اپنی حالت بدل لے آخری بار کہہ رہا ہوں۔ دوسری ملنے میں مجھے دیر نہیں لگے گی اپنا گھر برباد نہ کر۔"

"بربادی کی اب کسے پڑی ہے۔"

"تو کیسی باتیں کرتی ہے۔" وہ جھنجلا گیا کیونکہ وہ ہمیشہ سے سیدھا سادا ہی رہا تھا اس لیے نوری والی سوچ میں نہیں پڑا تھا۔ گھاک ہوا کاروبار کے لیے عیار ہوا پیسے کے لیے مکار بنا پیٹ کے لیے وہ سیدھا ہی رہا نہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر بیٹھتا نہ کبھی بے چین و بے قرار ہوا۔ کماتا' کھاتا اور سو جاتا۔ گالیاں دیتا بھول جاتا گالیاں سنتا وہ بھی بھول جاتا پیسے کتنا تھا یاد رکھتا تھا خرچ کر کے بھول جاتا تھا سیدھا سادا ہی تھا دکانوں پر بیٹھنے والے' کتنا مال گیا یاد نہیں رکھتے کتنا مال بنا یہ یاد رکھتے ہیں۔

رات گئے وہ ہڑبڑا کر اٹھی بس ابھی آنکھ لگی تھی اس کی تو۔ جاوید الماری کھنگال رہا تھا بہت جلدی میں تھا۔

"نوری اٹھ جلدی کر تھوڑا سامان رکھ جلدی اٹھ۔" اسے اٹھتے دیکھ کر وہ اپنے کام کرتا جلدی جلدی بولا وہ اٹھ بیٹھی۔

"یہ بیگ پکڑ کر تھوڑے سے کپڑے رکھ لے گڑیا کو اٹھا جا کر تیری مدد کروائے۔"

"کیا ہوا؟" اس نے جاوید سے بھی پوچھا اور خود سے بھی کہ کیا ہوا تھا کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

"جو کہا وہ کر اٹھ بس تھوڑے دنوں کے لیے شہر سے باہر جانا ہے۔" وہ نہیں اٹھی جاوید کی طرف دیکھنے لگی۔

"اٹھ جا نوری۔" وہ پھر چلایا۔

"کون مرا ہے؟" اس کے انداز پر جاوید اپنے کام سے ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔

"کوئی نہیں۔"

پٹ پٹ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ کیا خبر کیوں لیکن گرنے لگے ترس آمیز نظروں سے جاوید نے اسے دیکھا اس کے آنسو صاف کیے۔

"نوری تجھے کیسے پتا چلا۔" جاوید نرمی سے پوچھنے لگا۔

"کیا؟" نوری کا "کیا" اتنا درد انگیز تھا کہ جاوید نے اسے سینے سے لگالیا۔

"کہ کوئی مر گیا۔" وہ بولا۔

"کیا کوئی مر گیا؟"

"وکیل اس کے گھر فائرنگ ہوئی ہے بیگم فاخرہ۔"

"جو ہمارا بچہ لے گئی تھی نا۔ اسی کے گھر نا؟"

نوری ایسے پوچھ رہی تھی جیسے دکان دار سے کپڑے کی قیمت پوچھ رہی ہو۔ نوری خاموش بیٹھی رہی پھر بنا دوپٹے اور جوتی کے گھر سے باہر بھاگی رات تین بجے کا وقت تھا وہ باہر کا دروازہ کھول کر سڑک پر نکل آئی تیز تیز بھاگنے لگی پیچھے ہی جاوید تھا۔ اس کے پیچھے آوازیں دیتا بھاگ رہا تھا لیکن وہ بڑی سڑک پر بھاگتی رہی۔ آنسو نکل نکل کر زمین پر گرتے رہے۔ جاوید نے اسے پیچھے سے جالیا۔

"نوری خدا کے لیے مجھ پر رحم کر۔"

"خدا کے لیے مجھ پر رحم کر۔" نوری سنسان سڑک پر چلانے لگی۔ "چھوڑ مجھے۔ جانے دے وہاں مجھے۔ میں جاؤں گی وہاں۔" سنسان سڑک پر نوری کی آہ و بکا گونجنے لگی۔

"چل میرے ساتھ وہاں۔" جاوید مان گیا۔ گڈو نے جاوید کو فون کر کے کہا تھا کہ وہ وہاں سے فی الحال چلا جائے ہو سکتا ہے اس کے دشمن نئے فیکٹری مالکان پر بھی غصہ نکالیں۔ یہ وہ لوگ بھی ہو سکتے تھے جن سے ان دونوں نے قبضہ لیا تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا منظر سے غائب ہو جانا ہی ٹھیک تھا ارادہ بدل کر جاوید نے گڈو کو فون کیا اور اسے سب بتایا اور جاوید نوری کو ساتھ لے کر ڈیفنس میں واقع اس کی کوٹھی لے آیا۔ فاخرہ کے گھر آدھے گھنٹے تک فائرنگ ہوتی رہی تھی گھر چھلنی پڑا تھا پولیس کی نفری موجود تھی گھر سیل تھا۔ چوکیدار کی کل وقتی ملازم کی' گھر کی مالکن کی اور مالکن کے گود کی بچی کی ہلاکت ہو چکی تھی۔ لاشیں اٹھائی جا چکی تھیں وہ دونوں اسپتال آ گئے وہاں چوکیدار اور ملازم کے خاندان کا مجمع اکٹھا تھا۔ عورت کی طرف سے کوئی نہیں تھا اور بچی کی ماں نوری پہنچی تھی وہاں۔ چوکیدار کے بیوی بچے رو رہے تھے' ملازم کی ماں بہنیں بین کر رہی تھیں اور نوری وہ جاوید کے گلے سے جھول گئی۔

"ایک کا جنازہ تیار ہو گیا۔" اس کی آواز وہاں موجود ہر زندہ اور مردہ وجود کو پار کر گئی۔ "میری بچی میت بن گئی ہم نے اسے مار دیا ہم قاتل ہیں اس کے" نوری گری اور بے ہوش ہو گئی۔

بچے کی حوالگی کے قانونی کاغذات پولیس کو دکھائے اور جاوید بچے کا مردہ جسم لے کر گھر آ گیا۔ جسم ڈبے میں سیل بند تھا جسے کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایسی لاشیں جو بری طرح مسخ ہو چکی ہوں انہیں ایسے ہی سیل بند کر کے دیا جاتا ہے۔ نوری تابوت سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ نوری اس بچی نیلم کی ماں اپنے گناہ کو کوس رہی تھی پر اب دیر ہو چکی تھی۔ بہت دیر ہو چکی تھی فیکٹری کا مالک ابھی بھی جاوید ہی تھا۔ فائرنگ والے وہی لوگ تھے جو اس عورت کے خاندانی دشمن تھے۔ ماضی سے چلتی آ رہی تھی دشمنی ساری جائیدادیں چھین لی تھیں جانیں چھین لی تھیں۔ بھائی اسی ڈر سے باہر بھاگ گیا تھا۔ جاوید اور گڈو نے فیکٹری پر قبضہ کیا تو ان کا پرانا غصہ اُمڈ آیا۔ جائیدادیں انہیں بہت تھیں ایک عورت کا یہ منہ توڑ جواب انہیں اچھا نہیں لگا۔ باقی معاملہ بھی گڈو نے ہی سنبھالا بالا ہی بالا ان سے معاملات طے کیے ان دونوں کی ذاتی دشمنی تو تھی نہیں' بات صاف کی کہ عورت سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ دشمنی چلتی بنی ہاں فیکٹری ہاتھ سے نکل گئی۔

جاوید ایک عرصہ پیچ و تاب کھاتا رہا اتنا گھاٹے کا سودا نہ بچی رہی نہ فیکٹری وہ اور گڈو اب مل کر ایسی ہی دوسری فیکٹری لگا رہے تھے اتنے پیسے تھے اب ان کے پاس فیکٹری نے ان دو سالوں میں انہیں خوب منافع دیا تھا۔ جاوید پھر سے اپنی جمع تفریق میں لگ گیا۔ بچی تفریق ہو گئی۔ قلم اٹھا کر اس نے دیوالیے کے خانے میں بھی نیلم کا نام نہ لکھا۔

نیلم انسانوں سے مردوں میں شامل ہو گئی۔ صرف آدھ گھنٹہ نیلم کا تابوت نوری کے پاس رہا صرف آدھ گھنٹہ وہ اس کے پاس رہی نوری نوری نہ رہی۔

وہ گاؤں بھاگی۔۔۔ رو رو کر اس نے سارا گاؤں اکٹھا کرلیا' نہ وہ اس گھر سے نکلتی۔ نہ اس کی بچی مرتی۔ اس کی حالت پر گاؤں کی عورتیں جو اپنی چھتوں کے ساتھ لگی دیواروں پر کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں بلبلا اٹھیں۔ بھابیوں نے بڑھ بڑھ کر سینے سے لگایا۔

"اماں میں اپنے بچے کھا گئی۔" وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔

"سب کھا گئی۔ مال سمجھ کر کھا گئی' خون پی گئی۔"

بھائی سینے میں چھپائے بیٹھے رہے لیکن اب اسے چین نہیں مل رہا تھا۔ اب اسے چین نہیں ملنا تھا اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ بھابیاں ہاتھ پاؤں دبانے لگیں وہ اکیلی ہی گاؤں آ گئی تھی۔ منہ اندھیرے ہی نکل آئی تھی جب وہ ہیجڑا آیا تھا تب وہ تالی بجا رہا تھا ٹھمکے لگا رہا تھا ناچ رہا تھا' گا رہا تھا نوری او نوری کر رہا تھا۔

"آنچل کے بدھائیاں لے آ ناچ لے گا لے خوشی منا۔"

اماں کے گلے سے لگ کر اس نے ایک ایک بات بتا دی۔ اماں پھونکیں مارتی رہیں۔ حاجن بی کو بلوایا انہیں سب بتایا۔ نوری نے صاف صاف بتایا کہ وہ راضی بہ رضا تھی بچے بیچنے میں۔ اسے معصوم نہ سمجھو اسے بے گناہ انجان بھولا نہ سمجھو۔ وہ سب سودے جانتی تھی۔ وہ ہر سودے میں شریک تھی۔ وہ ماں کبھی نہیں بنی' وہ انسان بھی کبھی نہیں بنی۔ وہ گوشت کے لوتھڑے سونے کے بھاؤ بیچتی رہی وہ سارے حساب کتاب کرنے والی تھی۔

اماں حاجن بی سن سن روتی رہیں کوئی اور ہوتا تو ضرور بار بار کانوں کو ہاتھ لگاتا لعن طعن کرتا تھوک دیتا۔ ماں تھی صبر کرکے بیٹھی رہی توبہ استغفار کرتی رہیں۔

"مجھے معافی دے اماں۔" اماں نے بڑھ کر پیشانی چومی۔

"معافی دلوا دے اماں۔" اس پر اماں خود ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئی چھوٹی انگلی میں تسبیح تھی۔ وہ آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ "دعا کرو ان سب کے لیے وہ سب خوش رہیں" حاجن بی نے کہا۔

"اولاد بنا کرلے کر گئے ہیں انہیں اولاد ہی بنا کر رکھیں گے۔"

چند دن گاؤں رہ کر نوری واپس آ گئی گڑیا اور مانو پر توجہ کرنے لگی جو اس کے پاس تھیں ان کا اسے خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اس کی ذات میں بدلاؤ آیا ساتھ کرب اور تکلیف ہی لایا بس۔

☼ ☼ ☼

نیم مردہ حالت میں سارہ کو اسپتال لایا گیا تھا اور گوہر کو زبردستی اس کا بھائی گھر لے گیا تھا تاکہ وہ سارہ کو نہ دیکھے گوہر کو ہسٹریائی دورے پڑنے لگے اس کی لاڈلی کے ساتھ یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ ثاقب نکل چکا تھا اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ یہ سب اسی شیطان کا کیا تھا وہی شیطان۔ جس سے اس کا باپ بار بار اسے خبردار کرتا رہا تھا۔ بچے والدین کے ہر تجربے کو جھٹلا کر اپنا تجربہ خود کرنا چاہتے ہیں۔ گوہر جیسی ضدی لڑکی نے اپنے خاندان کی "نا" کے باوجود ثاقب سے شادی کی اتنے سال اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اسے پہچان نہ سکی۔ ٹھیک کہا تھا کسی نے کہ خوب صورتی کے پتلے کو وہ ساتھ رکھنے کے لیے لایا ہے بیوی اور ماں وہ پہلی بیوی کو بنا چکا ہے۔ وہ بس ماڈل بنی اس کے پہلو سے لگی رہے دونوں مرد عورت کا کھیل کھیلتے رہے۔ بس

وہ فوراً "پاکستان آ کر اسے پکڑوانا چاہتی تھی' اس نے ایسا کیوں کیا' سوچا بھی کیسے۔ نام کی ہی سہی بیٹی تھی اس کی' واقعی گوہر بہت بھولی تھی اس کی ماں نے تاسف سے اسے دیکھا "یہاں سگے باپ بیچھے نہیں اور گوہر کو یہ دکھ کھائے جا رہا تھا کہ ثاقب تو اس کا پاپا بن چکا تھا۔ پاپا بن جانے اور پاپا ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے' یہ فرق ہمیشہ رہتا ہے۔ یہ فرق انسان مٹاتے ہیں شیطان نہیں۔"

ثاقب دو بیٹوں کا باپ تھا بیٹی کا نہیں۔ خود سے بارہ سال چھوٹی لڑکی کا شوہر تھا۔ نجانے اپنے غیر ملکی دوروں پر کیا کیا کرتا ہوگا۔ گوہر نے زندگی میں ایک بار بھی یہ نہیں سوچا کہ اس کی فیملی آخر کیوں ثاقب کو پسند نہیں کرتی۔ صرف اس کا شادی شدہ ہونا ہی مسئلہ نہیں تھا۔ پہلی بار جب پاپا اس سے ملے تو انہوں نے صاف انکار کردیا کہ وہ اس سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں آخر میں وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے "اگر وہ برا نہیں ہے تو اچھا بھی یقیناً" نہیں ہے' ثبوت تو نہیں ہے میرے پاس ہاں چھٹی حس ضرور ہے۔"

چھٹی حس کس زمرے میں آتی ہے؟ محبت کے زمرے میں تو بالکل بھی نہیں۔ گوہر اس کی محبت میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اب اس کی نفرت میں پاگل ہو رہی تھی۔ اتنے سال اس کے ساتھ رہتے اسے جان نہیں سکی۔ یہاں گوہر ٹھیک تھی عشرے گزار کر انسان خود کو نہیں جان سکتا کسی کو کیا جانے گا۔

سب نے گوہر کو سمجھایا کہ اب سارہ کو اس کی ضرورت ہے' پاکستان جیسے ملک میں جہاں ہزاروں ایسے واقعات ہوتے ہیں اور کوئی شنوائی نہیں وہاں وہ ثاقب کو کیسے سزا دلوائے گی۔ وقت ہی ضائع ہوگا اور یہ وقت اب صرف سارہ کو چاہیے گوہر سارہ کو دیکھ دیکھ روتی رہتی' وہ زندہ بچ گئی تھی لیکن اب وہ صرف سارہ نہیں رہی تھی۔

جس کی چیخوں سے سناٹا گونج اٹھا ہو اب اس کی مسکراہٹوں سے زندگی کیسے مہکے گی۔

گوہر نے اتنا ضرور کیا کہ پاپا کے ساتھ ایک آخری بار پاکستان گئی اس کی پہلی بیوی' دونوں بیٹوں کے سامنے ثاقب کا پول کھول کر آئی۔ ثاقب نے صاف انکار کردیا الٹا دھمکیاں دیتا رہا لیکن اسکول سے سارہ کو لے جاتے اسے بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا اور پھر خود سارہ کا بیان۔

ثاقب نے گوہر کو طلاق دے دی۔ وہ اسے بیوی بنا کر رکھنا نہیں چاہتا تھا جو اپنے شریف شوہر پر کیچڑ اچھال رہی تھی گوہر ثاقب کی دی پراپٹی اس کے منہ پر مار آئی۔

دونوں میں سب کچھ شروع ہو کر ختم ہو چکا تھا۔ اور سارہ؟ اس کی زندگی پر اتنے سوالیہ نشان لگ چکے تھے کہ انہیں مٹانے کے لیے کئی زندگیاں چاہیے یقیں پر یہ سوال نہیں مٹتے بلکہ اور سے اور بنتے چلے جاتے۔

☼ ☼ ☼

امین بڑا ہونے لگا تو رشید بیمار رہنے لگا۔ مسافروں کے اڈے پر چائے کے ایک ہوٹل میں کام کرتا تھا وہ قریب ہی گھر تھا مدرسے سے آنے کے بعد امین کو بھی وہیں اپنے ساتھ لے آتا' امین ایک طرف بیٹھا پڑھتا رہتا' کام کرتا تو اور بیمار ہو جاتا۔ کام بھی نہ ہوتا ہر وقت پیٹ میں ایک طرف درد اٹھتا رہتا۔ زیادہ بیمار ہو گیا تو کام سے بھی گیا۔ بہت عرصہ اسی حالت میں رہا جلد کا رنگ سیاہ پڑنے لگا تو اسے تشویش ہوئی درد ناقابل برداشت ہو گیا' اپنی جان کی تو اسے رتی بھر بھی پروا نہیں تھی فکر اب امین کی تھی وہ سات سال کا ہونے والا تھا اب رشید کو فکر لگ گئی۔

رشید شہر آ گیا سرکاری اسپتال سے ٹیسٹ کروائے' چاند جو دیسی شرابیں' چرس' گانجا پیتا تھا ان سب کی رپورٹس آئی تھیں اس کے گردے تقریباً" ناکارہ ہو چکے تھے اب اسے گردے واش کروانے آنا پڑے گا زندگی سکڑ سمٹ کر اس کے ہاتھ میں آ گئی نظر آنے لگا تھا ناکارہ گردوں کے ساتھ اس کے پاس کتنی زندگی رہ گئی ہے۔ کسی ایک وقت کا کیا عمل کسی دوسرے وقت میں ردعمل دکھاتا ہے تو بال نوچ لینے کا جی چاہتا ہے جس وقت چاند مر جانے کے لیے تیار تھا میاں کی توبہ کے لیے اپنی شناخت کے لیے اس وقت جسم ہٹا کٹا رہا اب اسے امین کے ساتھ رہنا تھا تو قبر کی مٹی یاد کرنے لگی تھی۔

اس سے ایک بڑی غلطی ہو گئی' وہ تو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ امین کو کسی وقت اس کے ماں باپ سے ملوائے گا لیکن ان کا اتا پتا نہیں رکھا تھا جس وقت امین اس کی گود

میں آیا تھا اس وقت وہ سب کچھ فراموش کیے بیٹھا تھا اس نے جلد سے جلد وہ شہر چھوڑنے کی سوچی۔ جاوید اور اس کے درمیان یہی طے ہوا تھا پھر وہاں اس علاقے میں لوگ ان دونوں کو جانتے تھے امین کو لے کر وہ سب کچھ بھلا دینا چاہتا تھا لیکن سب بھلا کر اس نے ٹھیک نہیں کیا' امین اسے ملا اور اب اس کے ساتھ تھا لیکن وہ خود امین کے ساتھ کب تک تھا وہ نہیں جانتا تھا اب وہ یہ سوچ سوچ کر دہل رہا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو امین کہاں جائے گا۔ امین کا کیا ہوگا؟ اس نے امین کو لیتے وقت اپنی موت کا نہیں سوچا تھا۔ دراصل سوچتا تو کوئی بھی نہیں' وہ بھی وہی بشر تھا موت سے بے خبر' لاپروا۔ وہ کیسے سوچ لیتا لیکن اب سوچ رہا تھا اسے اب موت سر پر کھڑی نظر آ رہی تھی ہر چیز کا اختتام نظر آ رہا تھا سب کچھ جاتا ہی دکھائی دے رہا تھا آتا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

امین کی پیاری صورت دیکھتا تو افسوس کرتا کیا ضرورت تھی اسے لینے کی۔ اس نے بھی اپنے باپ والی ہی حرکت کی نا۔ "پا کر چھوڑ دینے والی۔" امین کی محبت میں پچھتا رہا تھا اب' اب کون تھا جسے امین کا خیال رکھنے کے لیے کہتا چند ہفتے پہلے ہی وہ اس جگہ سے ہو کر آیا تھا جہاں سے اس نے امین کو لیا تھا۔ وہاں ان کا کوئی نشان نہیں تھا۔ جاوید اور کہاں ملتا؟ کس کے پاس جاتا کہ اس کی مدد کرے وہ ایک مسئلے میں نہیں روگ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ امین کے پیار میں پاگل ہو رہا تھا اس کی جان ہلکان ہو رہی تھی امین کا سوچ سوچ کر کوئی امید نظر نہ آتی تھی رشید کو اندھیرا ہی گہرا ہوتا دکھائی دینے لگا۔

اسے سرحدی گاؤں چھوڑ کر پنجاب آنا پڑا' جہاں سے وہ گیا تھا' جہاں سے وہ بھاگا تھا بہت سکون میں تھا وہ گاؤں میں اب پھر اسی گند کے قریب آ گیا تھا۔

لاہور کی ایک غریب آبادی میں اس نے کرائے کا ایک گھر لیا۔ یہاں سے وہ سرکاری اسپتال سے مفت علاج کروا سکتا تھا آنا جانا بھی آسان تھا اس کے لیے اب وہ اتنا چاہتا تھا کہ کسی طرح چند سال اور زندگی میں گھسیٹ لائے تاکہ امین تھوڑا سا اور سمجھ دار ہو جائے۔

امین سرحدی گاؤں کے سادہ سے لوگوں میں رہتے بھولا بھالا سا ہی تھا میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہوٹل پر سب کا لاڈلا تھا اجنبی لوگوں کو دیکھ کر ڈر جاتا تھا رشید سے چپک جاتا تھا' رشید کے کانوں میں آ آ کر سرگوشیاں کرتا وہ اتنا پیارا صابر بچہ تھا کہ چند دنوں کا ہی تھا تب بھی گلا پھاڑ کر نہیں روتا تھا اس نے رشید کو اتنی آسانیاں دیں کہ رشید نے اسے آسانی سے بڑا کر لیا۔ وہ رشید کی لوری "اللہ — اللہ" پر آنکھیں موند لیتا اور آنکھ کھلنے پر چپ پڑا رہتا' وہ رشید کے لیے ایک تحفہ تھا جو نجانے اپنی یا کسی کی دعا کے ثمر میں چلا تھا

رشید اسے خوب پیار کرتا ابھی اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ اسے حالات کے بارے میں بتائے' وہ سن لے گا لیکن سمجھے گا نہیں وہ امین کا بابا جی تھا اور بابا جی کی وہ جان تھا۔

اب اسے علاج بھی کروانا تھا' جاوید کو بھی ڈھونڈنا تھا اور امین کا خیال بھی کرنا تھا۔ اس نے امین کو ایک مدرسے نما اسکول میں داخل کروا دیا جہاں وہ شام تک رہ سکتا تھا شام تک جاوید کا اتا پتا تلاش کرتا قریب کے چھوٹے شہروں میں جاتا وہ خود بھی مایوس ہی تھا لیکن کوشش کیے جا رہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ منہ چھپا کر رات گئے اپنے پرانے ٹھکانے پر گیا اسی بازار جہاں کی وہ دھول تھا۔ وہاں اس کا ایک دوست تھا "جوبلی" کل پرزہ تھا ہر مسئلے میں فٹ ہو جاتا تھا۔ رشید نے اسے اپنا مسئلہ بتایا ساری بات بتا دی۔

رشید کا دل پریشان ہو رہا تھا امین کو گھر سلا آیا تھا پر اس کا دھیان اس میں لگا تھا وہ بچہ کبھی اکیلا نہیں سویا تھا۔ دن کے وقت وہ یہاں آنا نہیں چاہتا تھا سو لوگ پہچان لیتے۔ اب سوچ رہا تھا کہ وہ کس سودے کے لیے رات کو آیا ہے راتیں گناہی دن ہی بھلے۔ جوبلی اپنی ہانک رہا تھا رشید اپنی سوچ رہا تھا اب وہ منحوس مارا جوبلی نشے میں آتا جا رہا تھا سر ہلا رہا تھا وعدہ نہیں کر رہا تھا کہ "ہاں مسئلہ ای کوئی نئیں" رشید جانتا تھا کہ جب وہ یہ کہہ

دیتا ہے تو واقعی میں مسئلہ حل ہو جاتا ہے سر ہی ہلا دیا تھا کافی تھا یعنی اب کام ہو جائے گا یہ جوبلی کا سر ہلا تھا کسی عام آدمی کا نہیں نام نجانے کیا تھا پر بازار میں جوبلی کے نام سے جانا جاتا تھا ہر جگہ۔ ہر سو بھی ہر بنگلے میں ہوتا تھا ہر شخص کو جانتا تھا ہر ایک سے دوستی تھی اور انہی سے دشمنی تھی۔ اچھا تو نجانے کن کن کے ساتھ تھا لیکن برا بہت سوں کے ساتھ تھا ہر وقت گالیاں دیتا رہتا ایک پیک جیب میں رکھتا رشید سے چند سال چھوٹا تھا بھینسے کی طرح پھٹا ہوا تھا سر گنجا رکھتا ہمہ وقت چلتے وقت آس پاس والوں کو دھکے دیتا ٹھڈے مارتا آگے پیچھے ہنٹر مارتا رہتا کوٹھے پر کوئی نوٹنکی کرتی تو گردن سے پکڑ کر چوبارے سے نیچے لٹکا دیا کرتا تھا سارا بازار نوٹنکی والی کا تماشا دیکھتا رہ جاتا اور یہ گردن چھوڑ دینے کے قریب ہو جاتا نام ہی کافی تھا ایسوں کے لیے اس کا "جوبلی"۔

رشید مر کر بھی اس کے پاس نہ آتا پر وہ جانتا تھا کہ جوبلی ہی ہے جو اب یہ کام کر سکتا ہے ہر جگہ اس کے رابطے تھے نہیں بھی تھے تو وہ بنا لیتا تھا رشید ملنگ بنا اس کے سامنے بیٹھا تھا جوبلی کو بڑی طمانیت ہوئی رشید کو ایسے دیکھ کر وہ اندر ہی اندر اکڑ رہا تھا کبھی وہ دونوں ساتھ کے تھے اب کیسے رشید مسکین بنا اس کی منت کر رہا تھا جوبلی کی رشید سے اچھی دوستی تھی دشمنی کہاں تھی۔ جوبلی کو اس نے ایک لاکھ دینے کا کہا' جوبلی کی آنکھیں کھل گئیں کون نہیں جانتا تھا کہ رشید کتنے پیسے والا ہے۔ جوبلی سراپا اقرار بن گیا۔ پیسے کے لیے تو وہ قبر سے مردہ نکال لائے۔

"ٹھیک ہے ہو جائے گا کام" سر بھی ہلا اور زبان بھی' رشید مطمئن ہو کر گھر آ گیا امین کو کہانیاں سنانے لگا خوش تھا آج رشید بہت نوالے بنا بنا کر اسے کھانا کھلایا اور پھر سلا دیا۔

امین کی ایک عادت تھی اسے زیادہ بھوک نہیں لگتی تھی لیکن سوتے میں اسے بار بار بھوک لگتی۔ وہ چند نوالے کھاتا اور سو جاتا اور رات بھر میں ایسا کئی بار ہوتا' رشید بہت شوق سے بار بار اٹھ کر اس کے لیے کھانا گرم کرتا اور اسے نوالے کھلا کر سلا دیتا بہت خوب صورت تعلق تھا دونوں کا' محبت آمیز' سکون بھرا' ایسے تعلق کے لیے انسان ترستے ہیں۔

دو بار رشید کے گردے واش ہو چکے تھے پھر بھی اس کی تکلیف کم نہیں ہو رہی تھی وہ بہت لاغر ہوتا جا رہا تھا' اس کی بیماری بڑھ رہی تھی' وہ بار بار جوبلی کی طرف چکر لگاتا جوبلی بہانے بہانے اور پیسے لیتا پھر جوبلی رشید کے گھر کے چکر لگانے لگا۔ اپنی عادت کا حامل امین اس کے جثے کو دیکھ کر ڈر گیا اور رشید کے پیچھے چھپ گیا۔ اس بدمعاش نے جانتے بوجھتے ہاتھ بڑھا کر امین کو آگے کیا۔ "پتر جی مکھڑا وکھیوں ذرا" رشید ضبط کیے بیٹھا رہا اب وہ جوبلی کو کیسے کہتا کہ بچے کا ہاتھ چھوڑ دے وہ ڈر رہا ہے۔ اتنی سی بات پر ہی جوبلی مرنے مارنے پر تل جاتا۔ امین رونے لگا باقاعدہ "بڑا ڈرپوک اے کاکا۔" جوبلی ہنسنے لگا رشید ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا یہ وقت بھی آنا تھا جوبلی جیسے لوگ امین پر تبصرہ کر رہے تھے اسے رلا رہے تھے۔ جوبلی رشید کے گھر آنے جانے لگا ادھر ادھر کی سنا جاتا کہ یہاں گیا' اس سے ملا' یہ کیا' وہ کیا۔

قیامت کا وقت جا رہا تھا رشید تکلیف سے بے حال رہتا' چھ مہینے پہلے گردے واش ہوئے تھے۔ اب تین ماہ بعد ہونے تھے۔ امین کو کہاں چھوڑتا' پہلی بار دل مسوس کر جوبلی کے پاس ہی چھوڑا تھا ہسپتال میں کہاں امین کو رکھتا۔ رشید بڑا مجبور ہو گیا تھا۔ اس کی جان نکلی تھی یہ سوچ کر کہ امین اس بازار کے کسی ٹھکانے میں رہے۔ اس نے ایک بار اسے سمجھا دیا کہ "بیٹا جوبلی انکل کے ساتھ چلے جاؤ میرا اسپتال جانا ضروری ہے یہاں بہت درد ہوتا ہے۔" سر ہلا کر امین نے آنکھیں صاف کیں اور جی کہا۔ رشید کا دل کٹ گیا۔ ہائے ہائے کرنے لگا "میرے بچے مجھے معاف کر دے۔" رشید نے ہاتھ جوڑ دیے "یہ کیا کر دیا میں نے تیرے ساتھ تجھ سے پھول کو کہاں چھپاؤں میں۔" جوبلی کے پاس امین کچھ کھاتا پیتا ہی نہ تھا' جوبلی کا کہنا تھا کہ گم سم امین ایک طرف پڑا رہتا ہے' رشید کے بغیر وہ

رہتا نہیں تھا اور جوبلی جیسے بندے کے ساتھ اسے رہنا پڑتا۔ امین کو جوبلی کے پاس چھوڑ کر رشید ہسپتال آگیا۔ گھنٹے بعد ہی بھاگ آیا بناواش کروائے۔ امین کو ساتھ لیا اور گھر آگیا' جوبلی کی منت کی کہ جلد سے جلد اس کا کام کر دے اب جب وہ علاج نہیں کروائے گا تو مطلب جلد ہی بستر پر پڑنے والا تھا اب وہ چاہتا تھا کہ رات سے دن نہ ہو اور امین کے اماں ابا مل جائیں' اس نے اخبارات میں اشتہار بھی دیے تھے لیکن نتیجہ صفر ہی نکلا۔ وہ جاوید اور نوری کو ڈھونڈ رہا تھا وہ دونوں اپنا بچہ نہیں ڈھونڈ رہے تھے۔

رشید بد ترین وقت سے گزر رہا تھا اس کے گردوں میں ناقابل برداشت تکلیف ہوتی' ڈاکٹر نے اسے بتا دیا تھا کہ اگر وہ ایسے ہی دیر اور غفلت کرتا رہا تو خون کا اخراج شروع ہو جائے گا زندگی کے گنے چنے دنوں کی گنتی اور کم ہو جائے گی۔ کیسی قسمت تھی رشید کی پہلے وہ باپ سے الگ ہوا اور اب اسے اپنے بیٹے سے الگ ہونا تھا۔ ایک کے عمل نے الگ کیا ایک کی بیماری کر رہی تھی۔ سیدھے لفظوں میں موت

چند مہینے گزرے۔ وہ بنا علاج کے چلتا پھرتا رہا۔ تکلیف سے بلبلاتا۔ تڑپتا۔ گردے پھٹنے کے قریب ہوگئے۔ خون کا اخراج شروع ہوگیا۔ یہ ابتدائی لیکن آخری سنگین علامت تھی' اب سمجھ لینے میں دیر کیسی۔ اب وہ لبیک کہے نہ کہے موت لبیک کہلوا کر جائے گی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر رشید امین کو چومنے لگتا اس سے بار بار معافی مانگتا۔

"میری خواہش تجھے لے ڈوبی۔" سینے سے لگائے رشید روتا رہتا۔ اگلے دن نئے لوگوں سے ملتا' اصل جونک جوبلی تھا جو اس کا خون چوس رہا تھا' رشید اپنے حال سے اتنا بے حال نہ ہوتا تو شاید جوبلی کو پہچان ہی جاتا۔

امین مدرسے سے آنے کے بعد تالا کھول کر اکیلا ہی گھر بیٹھا رہتا' اب جب حالات اتنے خراب ہو چکے تھے تو رشید نے کچھ اور ہی سوچنا شروع کر دیا تھا' جاوید تو مل کر نہیں دے رہا تھا' نہ ہی ملتا نظر آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ امین کو کسی اچھے ادارے میں داخل کروا دے' نو سال کا ہونے والا تھا وہ۔۔۔ چند سالوں بعد جوان ہو کر خود کو سنبھال لے گا۔ پیسے اس کے پاس تھوڑے سے بچ گئے تھے اس کا کام بن سکتا تھا۔ جیسے تیسے وہ پندرہ سال کا بھی ہو جاتا تو کافی تھا۔

رشید اب ایسے کسی ادارے کی تلاش میں جت گیا۔ جہاں امین چند سال اچھے ماحول میں گزار سکتا۔ رشید امین کو اچھی طرح سے سمجھانے والا تھا کہ اسے آئندہ زندگی میں کیا کیا کرنا ہے۔ اپنے ماں باپ کو ڈھونڈے ورنہ پڑھ لکھ کر اچھی زندگی گزارے۔۔۔ زندگی برے موڑ پر آئی ہے تو اچھے موڑ پر بھی آ ہی جائے گی۔ رشید نے اگر کچھ بگاڑ دیا تھا تو سنوار بھی سکتا تھا۔۔۔ رشید کچھ سکون محسوس کرنے لگا تھا' امین کا ذہن بنا رہا تھا وہ' بہت سے ایسے ادارے تھے' جو اس کی نظر میں تھے اور جہاں وہ پرورش حاصل کر سکتا تھا' محفوظ رہ سکتا تھا۔ اچھی سوچ تھی' لیکن اس نے اس اچھی سوچ کا اظہار جوبلی کے سامنے کر دیا۔ جوبلی اس دن اس کے ساتھ ہی تھا۔ شام کو وہ گھر آیا تو امین گھر نہیں تھا' تالا کھول کر وہ اندر ہی بیٹھا رہتا تھا۔ رشید آیا تو گھر کا دروازہ کھلا تھا' وہ کبھی باہر جاتا ہی نہیں تھا آج کیسے جا سکتا تھا' رشید نے اسے باہر جانے سے منع کر رکھا تھا پھر بھی رشید آس پاس اسے دیکھ آیا۔ رشید پر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی جیسے کچھ بہت برا ہو گیا ہے۔ اس نے جوبلی کو فون کیا کہ وہ آ کر اس کی مدد کرے۔ جوبلی کے جواب سے رشید ڈگمگا کر گر گیا اور زمین کی رفتار کے ساتھ گھومنے لگا۔

"وہ میرے پاس ہے پیسے دو اور لے جاؤ۔"

پیسے۔۔۔ پیسے۔۔۔ یہ پیسے سب برباد کر چکا ہے برباد کو بھی اور برباد کرے گا؟ کتنا اور۔۔۔؟

جوبلی کو بھی پیسے چاہیے تھے۔ اتنے پیسے تو وہ اسے دے چکا تھا۔ یک دم رشید کو احساس ہو گیا۔ رشید کیسے بھول گیا کہ جوبلی انسانیت یا پرانا تعلق اس کے ساتھ نبھا سکتا ہے۔ اسے سب سمجھ آگئی کہ دراصل جوبلی نے جاوید کو ڈھونڈا ہی نہیں تھا۔ اسے بس پیسے چاہیے تھے۔ رشید نے کیسے توقع کر لی کہ وہ اس کے ساتھ کوئی بھلائی کرے گا وہ بازاری ہے بھاؤ کرے گا کہ چاؤ؟ رشید غصے سے کھولنے لگا۔ وہ اس کے اتنے پیسے کھا چکا تھا۔۔۔ اب تو وہ اسے ایک کوڑی بھی نہ دے گا جو تھوڑا بہت بچا تھا وہ تو امین کا تھا۔ اس کے بیٹے کا' اس کی تعلیم کا۔۔۔ اسے استاد بنانا چاہتا تھا۔ امین کو یاد کروا دیا تھا کہ اسے کیا بنانا ہے۔ اس نے اسے بہت سی باتیں یاد کروا دی تھیں۔

"بڑے بابا کا کیا نام ہے؟"

"بابا رشید۔۔۔"

"سب سے بڑے بابا کا؟"

"میاں جی۔۔۔ اللہ انہیں پیار سے اپنے پاس رکھے' آمین۔"

"ابو۔۔۔ امی؟"

"پیارے ابو جاوید اور پیاری امی نور فاطمہ"

"اور امین کون۔"

"امین۔۔۔ بابا کا بیٹا' میاں جی کا بیٹا' پیارے امی' ابو کا پیارا۔۔۔ امین سب کا پیارا۔۔۔ سب پیارے' امین بھی پیارا۔۔۔ آمین۔" دونوں ہاتھ منہ پر پھیر کر رشید کی آنکھوں پر رکھ دیتا۔

"ہم سب مر جائیں گے؟"

"ہاں! سب۔"

"جو مر جائیں گے وہ کیا کریں گے؟"

"وہ اللہ کے سوالوں کے جواب دیں گے۔"

"جو زندہ رہیں گے وہ کیا کریں گے' امین پیارے۔"

"وہ دعا کریں گے خدا سب کو معاف کر دے۔ آمین"

"تم یہ دعا کرتے رہو گے۔" اس نے سر ہلایا۔

"ہمیشہ۔۔۔"

"ہر روز۔۔۔ سونے سے پہلے۔۔۔ اٹھنے کے بعد۔"

"ہم سب مر جائیں گے۔ میں مر جاؤں تو روؤ گے تو نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پر میں کس کے ساتھ سوؤں گا؟" رشید نے اسے بے تحاشا چوما۔

"بہادر بن جاؤ۔"

"میں بہادر ہوں۔"

اس نے کہہ تو دیا۔ لیکن اکیلا کوئی بھی بہادر نہیں ہوتا۔ اپنوں کے بغیر رہنا سیکھ لینا۔ یہ بہادری کوئی بھی نہیں کرنا چاہتا۔

گھر کو تالا لگا کر رشید غصے میں جوبلی کی طرف آیا۔ اس کے اپنے اڈے سے ذرا پرے اس کا ڈیرہ تھا جہاں رات رات بھر شراب اور دوسرے نشے چلتے۔۔۔ وہیں کالج یونیورسٹی کے لڑکے نشہ کرنے آتے اور ادھر ادھر کے دوسرے غنڈے بدمعاش بھی موجود ہوتے۔ رات کا وقت ہو گیا جب بے تحاشا کھانستا رشید وہاں پہنچا۔ جو پہلا منظر دیکھا' اس منظر کو دیکھنے سے پہلے کاش وہ تیز دھار چھری سے اپنا گلا کاٹ لیتا۔ ایک موٹے گجر بدمعاش کی ایک ٹانگ کو امین اپنے چھوٹے چھوٹے پیارے ہاتھوں سے دبا رہا تھا۔ جوبلی ذرا فاصلے

پر کرسی پر بیٹھا تھا۔ اِدھر اُدھر چند اور نشئی لڑکے بیٹھے تھے۔ جوبلی جانتا تھا کہ رشید بس آیا کہ آیا اور جان بوجھ کر امین کو اس کام سے لگایا۔ وہ بے چارہ ڈھلتی عمر کا کھنڈر۔۔۔ ناکارہ ہوئے گردوں سے اس کی طرف لپکا۔ جوبلی نے پہلے ہی امین کا ہاتھ ایک آدمی کو پکڑا دیا۔ جس وقت وہ زمین پر جھک کر امین کو اٹھانے لگا تھا' ٹھیک اسی وقت اس گجر بدمعاش نے ایک زوردار لات اس کے منہ پر دھری۔ رشید درد سے ضرور بلبلاتا' لیکن وہ پہلے ہی امین کے لیے بلبلا رہا تھا۔ اسی گجر نے دو' تین اور لگائے "طریقہ سے بات کر۔۔۔ بچے کو ہاتھ نہ لگا۔" وہ بھونک رہا تھا۔ جوبلی اطمینان سے کرسی پر بیٹھا رہا۔ نشئی لڑکوں نے سر اٹھانے کی زحمت بھی نہ کی۔ امین اندر کہیں جا چکا تھا وہ بابا' بابا چلا رہا تھا۔ رشید تڑپ کر اندر کی طرف لپکنے لگا۔ جوبلی کے دو آدمیوں نے اسے پیچھے کی طرف گھسیٹا۔ بدمعاش نے اس کی گردن پر پیچھے سے ہاتھ ڈالا اور اسے زمین پر پٹخا۔۔۔ رشید زمین پر بری طرح سے گرا۔ ڈھائی تین سال سے وہ بیمار تھا ڈیڑھ سال سے گردوں کے عارضے میں مبتلا تھا۔ وہ تو ایک بچے کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا کہاں ایک موٹے وزنی بدمعاش کا ہاتھ' وہ زمین پر پڑا رہ گیا۔ منہ اور ناک سے خون نکلنے لگا اٹھنے کی ہمت نہ رہی۔ اس موٹے نے لاتوں کی بوچھاڑ کر دی' اس کے پیٹ پر۔ رشید درد سے چلانے لگا' چلاتے ہوئے بھی وہ امین کا ہی نام لے رہا تھا۔ کوئی کہہ گیا ہے کہ جو محبت کر لیتا ہے وہ کسی اور کام کا نہیں رہتا۔ رشید اس کی زندہ تصویر بنا ہیرا منڈی سے ذرا پرے زمین پر پڑا تکلیف سے کانپ رہا تھا وہ امین کے علاوہ ہر کام سے گیا۔ یہی وہ بازار تھا اور یہی وہ لوگ تھے جنہیں وہ اپنی چٹکی کی دھول سے برباد کر سکتا تھا کیا اوقات تھی جوبلی کی۔ اس کی بچائی ہوئی شراب اور سگریٹ کے ٹوٹے پیا کرتا تھا اس کی ٹانگیں بھی دبا دیا کرتا تھا۔ اسی ڈیرے پر وہ سب موج مستی کرتے۔ اپنی من پسند محفلیں لگاتے' جھومتے' جوا کھیلتے۔ آج نرالا ہی کھیل چل رہا تھا۔ اسی کا امین اور اسی کے پیسے۔۔۔ رشید کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ اس کا جی چاہا ایک ایک کا خون کر دے۔ رشید اٹھا اور جوبلی پر جھپٹ پڑا۔۔۔ اس کا گلا دبوچ لیا۔ رشید تو شیر بن چکا تھا۔ جوبلی کی اتنی ہمت کہ سیپارہ پڑھتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے والے ہاتھوں سے اس بدمعاش کی ٹانگیں دبوائے' اس پر اپنا جوا کھیلے' اس کا سودا کرے۔ امین کا سودا! یہ کم ذات بازار والے کیا جانیں۔ امین کیا ہے؟ وہ سب کے لیے دعا مغفرت کرنے والا' سرکار کا نام لے کر چومنے والا' اس کے سینے پر سر رکھ کر درود پڑھتے پڑھتے سو جانے والا۔ امین کیا ہے؟ کوئی رشید چاند سے پوچھے۔ اپنی پیاری آواز میں اسے لوری دے کر سلانے والا۔ اللہ ہو۔۔۔ اللہ ہو۔۔۔ پیارے ہمارے اللہ۔۔۔ اللہ ہو' جی اللہ ہو۔۔۔ کوئی سنا سکتا ہے ایسی لوری۔

گردن رشید کے کانپتے ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ڈیرے پر موجود باقی لوگ اس پر پل پڑے۔ ایک نے پستول نکال کر اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ سب مل کر رشید چاند کو مار رہے تھے۔

گلابی مر چکی تھی' میاں جی کا خدا جانتا ہے کیا بنا۔ رشید چاند دھڑ دھڑ مار کھا رہا تھا۔ امین اندر سے بابا' بابا چلا رہا تھا۔

"کیا یہ سب قسمت کے کھیل ہیں؟"

میاں کو کس نے کہا تھا کہ ہیرا منڈی آ کر گناہ کرے؟

رشید چاند بن کر نہ بنتا تو کیا بنتا؟ حلال کے ہوتے ہوئے بھی جاوید نے اپنے بچوں کی دکان سجائی وہ اگر سود اگر نہ بنتا تو امین کہاں ہوتا؟

یہ سب تو انسان کے رچائے کھیل ہیں۔ جو کھیل انسان رچاتا ہے ان کے انجام بہت بھیانک ہوتے ہیں اور پھر وہ صرف انجام نہیں کہلاتے۔ عبرت ناک مثالیں بن جاتی ہیں۔

"امین۔۔۔ امین اور بابا۔۔۔ بابا۔۔۔" کی آوازیں گونجتی رہی۔ ان میں سے ایک آواز بند ہو گئی۔ رشید اتنی مار

کھا کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ دونوں اسے اٹھا کر ڈیرے سے ذرا دور۔۔۔ سڑک کے کنارے پھینک گئے۔

رات گئے سڑک کے کنارے پھیلتے خون اور بے ہوش آدمی کو چند ایک لوگوں نے دیکھا تو ایک نے لاش سمجھ کر ایدھی سینٹر فون کیا۔ ایمبولینس آئی۔ اس کی سانسیں تھیں ابھی۔۔۔ اسے قریبی اسپتال میں لے گئے۔

بس اس کی سانسیں ہی باقی تھیں۔ خون بہت نکل چکا تھا۔ اندر سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ تین دن وہ سرکاری اسپتال کی ایمرجنسی میں رہا۔ وہ چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ چند دنوں کا مہمان بن گیا تھا۔ اسے ایمرجنسی سے وارڈ میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ وہ مرگ نیند میں اونگھ رہا تھا۔ کپکپاتی پلکوں اور بے چین پتلیوں کے ساتھ۔۔۔ اندر کہیں بہت اندر۔۔۔ امین۔۔۔ امین کی آوازیں لیے۔

اسے وارڈ میں لے جایا جا رہا تھا کہ ایک طرف بیٹھی نوری یک دم چونکی۔ پہلے اسے سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیوں چونکی۔۔۔ کیوں چونکی؟

"یہ کیا ہوا تھا رشید بھائی۔" اس نے پیشانی کی طرف اشارہ کیا۔ "چند بدمعاشوں سے بھڑ گیا تھا آنکھ بچ گئی۔ ورنہ آج ہوتا۔"

پیشانی سے کنپٹی کی طرف آتا گہرا نشان تھا جو رشید کو تیز دھار چاقو سے لگا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی پہلی نظر اس نشان پر ضرور پڑتی تھی اور یہی پہلی نظر اتنے سالوں بعد نوری کی بیڈ پر نیم مردہ بوڑھے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔

"رشید۔۔۔" وہ بڑبڑائی۔۔۔ گم سم حالت میں وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

رشید نے داڑھی رکھ لی تھی۔ بیماری کی وجہ سے بہت کمزور ہو چکا تھا۔۔۔ لاغر اور بوڑھا لگنے لگا۔ شکل پہچانی نہ جاتی۔

"رشید۔۔۔" نوری بڑبڑائی۔۔۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اس نام کا۔۔۔ وہ وہاں اپنی اماں کے ساتھ آئی تھی ان کی آنکھ میں موتیا اتر آیا تھا اور آج ان کا آپریشن تھا۔ وہ سب جاوید کو پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہی نوری کے گھر آتے تھے۔ نوری ہی ملنے چلی جاتی تھی۔ اماں بھائی کے ساتھ آئی تھیں گاؤں سے سیدھی اسپتال وہ بھی آ گئی اپنے گھر سے۔

"رشید۔۔۔" یہ وہ چیخ تھی جو اس کے اندر کے سناٹے کو چیر کر نکلی۔ اور اس پر حقیقت کے در کھول گئی۔ کوریڈور میں موجود سب لوگ اسے دیکھنے لگے۔

"اس کا بچہ۔۔۔ رشید۔"

نوری کا جی چاہا دیواریں گر جائیں اور وہ رشید تک پہنچ جائے۔

"میرا بچہ کہاں ہے رشید۔۔۔ ایک بار ملوا دو۔۔۔ رشید بھائی۔"

اس کا بھائی ایک طرف کھڑا تھا اماں کا آپریشن ہو رہا تھا۔ وہ اس طرف کو بھاگی جس طرف رشید کا اسٹریچر گیا

تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگ رہی تھی۔ سر کی چادر گلے میں جھولنے لگی تھی۔ "رشید بھائی" پاگل تھی نوری... آوازیں دینے لگی۔ وارڈ اسے نظر ہی نہیں آرہا تھا' جبکہ وہ وارڈ کے قریب سے ہی گزر کر آئی تھی۔ "مجھے رشید بھائی کے پاس جانا ہے۔" اس نے ایک نرس کا ہاتھ ہی پکڑ لیا۔ "وہاں کاؤنٹر پر معلوم کر۔" وہ کاؤنٹر کی طرف بھاگی۔ رشید انہیں کیا معلوم کون رشید۔ وہ مریض نامعلوم کے نام سے... مخصوص نمبر کے ساتھ... وہ آگے پیچھے بنے وارڈوں کی طرف لپکی' ایک ایک بیڈ کے پاس جاتی دیکھتی۔ تیسرے وارڈ کی دوسری قطار کے آخری بیڈ پر اسے رشید چاند نظر آ ہی گیا۔

"رشید بھائی۔" وہ اونچی آواز سے چلائی۔

"میں... میں نوری... میرا بچہ کہاں ہے... آپ... آپ کو کیا ہوا... وہ کیسا ہے... کس کے پاس ہے... رشید بھائی... میرا بچہ... میرا بیٹا۔" اندھا بھی رشید کی حالت دیکھ کر سمجھ جائے کہ وہ اٹھ کر بیٹھنے یا بات چیت کے قابل نہیں ہے۔ وہ اس کا ہاتھ ہلانے لگی۔

"رشید بھائی... رشید... وہ چلا رہی تھی۔" ایک مریض کا رشتے دار نرس کو بلا لایا۔ وارڈ میں موجود سب ہی مریض اور عورتیں اسے ہی دیکھ رہے تھے' نرس آئی۔

"نظر نہیں آرہا... آخری سانسیں لے رہا ہے۔ کون ہو تم اس کی؟"

"آخری سانسیں۔" نوری نے ذرا غور سے رشید کو دیکھا۔

"یہ کیسے آخری سانسیں لے سکتا ہے۔ اس کے پاس تو میرا بیٹا ہے۔ یہ کیسے..." اندر گھنٹیاں بجیں۔

"میں ان کی بہن ہوں... یہیں رہنے دیں مجھے۔"

"طریقے سے رہو اور لوگ بھی ہیں یہاں۔" نرس منہ بنا کر چلی گئی۔ نوری قریب کھڑی رونے لگی۔

"کیا یہ مر رہا ہے؟" کیوں مر رہا ہے؟ کیسے مر سکتا ہے؟" نوری کا وجود پور پور جھنجھنا اٹھا۔

وارڈ میں موجود ہر شخص اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"بھائی ہے یہ میرا۔" ساتھ کے بیڈ کے مریض کی ایک عورت ٹانگیں دبا رہی تھی۔ نوری کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی تو نوری نے رندھے گلے سے اسے بلاوجہ ہی کہا۔

"میرے بچے کا باپ ہے۔" بلاوجہ ہی بتایا۔ عورت کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔

"بھائی... بچے کا باپ؟"

نوری بیڈ کے قریب جھک کر رشید کے منہ کے پاس ہوئی۔

"رشید بھائی" سرگوشی کی' ایک آنکھ وارڈ کی طرف رکھی' لیکن اکا دکا ابھی بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ جس جنونی انداز کو اپنائے وہ اندر آئی تھی وہ کافی تھا۔ اسے گھورنے کے لیے' نوری بہت دیر تک سرگوشی میں پکارتی رہی۔ رشید... بچہ...

نوری ساری دنیا ہار کر وہاں کھڑی تھی۔ ایک ایسی ماں جس کے بچوں نے اسے ترنوالے کھلائے تھے۔ اب ایسی عورت جب ماں بنے گی تو قیامت سے گزرے گی۔ وہ بچوں کو پیدا کرنے کے بعد ماں نہیں بنی تھی۔ وہ ان کی قسمت آنکنے کے بعد ماں بنی تھی۔ ایسی عورت پر خدا رحم کرے۔ ایسی عورت پر سب مل کر رحم کریں تو بھی کم ہے۔

نوری کا بھائی اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ ناکام ہو گیا تو اکیلا ہی اماں کو لے کر واپس چلا گیا۔ اس بے چارے نے سوچا کہ نوری اپنے گھر واپس چلی گئی ہوگی اور وہ بت بنی رشید کو تکے جا رہی تھی۔ جیسے کسی نے اس پر ظلم کر دیا۔ جیسے رشید اس کا بچہ لے کر بھاگ گیا۔ اب ملا... نوری خاکوں خاک ہو کر اسے ڈھونڈتی رہی' اب ملا رشید۔

"او میری میا' منحوس ماری یہ آواز کس نہ خانے سے پھر نکل آئی... ہر دیوار پر اس آواز کے گھڑیال لٹک گئے' فرش پر بچھ گئی۔ سر پر تن گئی۔ اب تو بخش دیتی یہ آواز نوری کو' پر گوری باز نہیں آئی تالی پر تالی بجاتی

رہی۔

رشید آنکھیں کھولنے' زبان کو حرکت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے وہاں تکے شام سے رات ہو گئی اور پھر رات گزرنے لگی۔ وہ ویسے ہی کھڑی رہی ایک ہی انداز' ایک ہی التجا کو لیے کہ رشید اس کی طرف کب متوجہ ہوگا۔ رشید جس کے پاس اس کا بہت کچھ تھا۔

"اے بی بی... بی بی۔" وہی عورت اس کا کندھا ہلا رہی تھی۔ بی بی کے حواس کام ہی نہیں کر رہے تھے۔ وہ صرف رشید کے ہونٹوں کی جنبش پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اس کی سانسوں کی آمد و رفت کو گن رہی تھی۔ عورت اسے بیٹھنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ بیڈ کے پاس بینچ رکھا تھا۔ وہ اسے وہاں بٹھانا چاہ رہی تھی۔ نوری اکڑوں بیٹھ گئی۔ بت بنی نظریں رشید پر گاڑے' ایک آنکھ کہیں اور بھی لگی تھی۔ کہیں پچھلے وقت کی طرف۔

"کبھی کبھی مجھے منا بہت یاد آتا ہے۔" ایک رات وہ کہنے لگی۔

"کون منا؟" جاوید کے سینے پر اس کا سر تھا۔

"ہمارا منا۔" نوری خفا ہوئی۔ جاوید نے سانس لی' بدمزا سی سانس' نوری جان گئی۔

"تو نے اس بردکر کو دے دیا۔" جاوید کا دل چاہا نوری کو زمین پر پٹخ دے۔

"سوچا..." اس نے کہا۔

"اب تو بولنے لگا ہوگا' بھاگتا دوڑتا ہوگا۔" نوری کو منے کی ہی یاد زیادہ ستاتی۔

"ہماری بلا سے وہ کچھ بھی کرے۔" جاوید نے اس کے سر کو ایک طرف کیا۔

نانا' دادا کی نشانیاں بیچ کر کھا جانے والا وہ کن کن بلاؤں کی فکر کرتا۔ جاوید نے جواب نہ دیا اور سوتا بنا نوری بھی سونے لگی۔ ایسی بھول چوک سے آنے والی یادوں کو وہ بڑے طریقے سے نکال باہر کرنے لگی۔ اب سارے طریقے بھلائے جامد ہوئی بیٹھی تھی۔ جیسے دنیا

میں سیدھی یہیں اتاری گئی ہو۔ عین رشید کے سرہانے' صرف بچہ لینے۔

گھر سوتا جاوید سمجھا کہ وہ گاؤں اپنی اماں کے ساتھ چلی گئی ہوگی۔ سب غلط سمجھ رہے تھے نوری وہاں کہیں نہیں تھی۔ نوری اپنے اصل ٹھکانے پر تھی۔

رات کے آخری پہر رشید کے ہونٹ لرزے' نرس اسے کہہ گئی تھی کہ اس میں کوئی حرکت ہو تو اسے آکر بتائے۔ ایک بار آکر وہ رشید کو دیکھ گئی تھی۔ لیکن بے ایمان نوری خود تن کر بیٹھ گئی۔ نرس کے پاس نہ گئی۔ رشید کے ہونٹ پھڑپھڑا کر وا ہوئے۔ نوری جھٹ قریب ہوئی۔ کانپتی ہوئی' ہکلاتی اور حواس گم کرتی۔

"رشید بھائی... میرا بچہ... کہاں ہے۔" اگلے پندرہ منٹ تک وہ یہی کہتی رہی۔ رشید میں کوئی اور حرکت نہ ہوئی۔ نوری نے اس کا بازو ہلانا شروع کر دیا۔

"بی بی کیوں اودھی جان دے پیچھے پیئے ایں۔" عورت تڑخ کر بولی۔ نوری نے سنا ہی نہیں۔ رشید جان کنی کے عذاب سے گزر رہا تھا۔ انگلی کی پور بھی اس پر بھاری تھی۔ رشید کراہنے لگا۔ اس کے اعضا سکڑنے سمٹنے لگے۔ ہونٹ کھلے۔ بھنویں اچکیں پیشانی پر بل آئے' سارا جسم کراہ بن گیا۔ رشید نے کچھ کہا۔ نہ جانے کیا... لیکن الفاظ تڑمڑ کر نکلے تھے۔ اس کے اتنے قریب بیٹھی نوری سن نہیں سکی تڑپ اٹھی۔

"بولو... کیا کہا... کچھ تو بولو... کیا ہوا تمہیں... کہاں ہے میرا بچہ... ٹھیک تو ہے نا وہ... رشید بھائی مجھ پر رحم کرو' خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔ میرے حال پر رحم کرو' کس کے پاس چھوڑ آئے اسے کہاں ہے میرا بچہ؟" وہ اپنا منہ اس کے کان کے پاس رکھ کر کہتی ہی رہی۔

بہت دیر گزری رشید نے دونوں آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔ نوری جھٹ اس کے سامنے آئی۔ گردن گھما کر وارڈ سے باہر بنے کاؤنٹر کی طرف بھی دیکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی

نرس اس کے سر پر آجائے۔ رشید نے نوری کی طرف دیکھا۔ لیکن صاف نظر آرہا تھا کہ جیسے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔

"میرا بچہ کہاں ہے؟" نوری کی آواز ذرا بلند ہوئی۔ رشید نے جیسے ایک آخری بار دنیا دیکھنے کے لیے آنکھیں کھولی تھیں۔ اسے کچھ دکھائی اور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ آنسو نوری کی آنکھوں سے رواں تھے۔ وہ کب سے ماتم کرنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ رشید یہاں آکر آخری سانسیں لے رہا تھا تو اس کا بچہ کہاں تھا۔

رشید گہرے گہرے انجانے سانس لے رہا تھا آنکھوں کی پتلیاں ڈگمگا رہی تھیں، ہونٹ سیاہ تر ہوتے جارہے تھے۔

نوری نے اس حالت کو دیکھا تو زور سے چلائی کہ چیخ سے وارڈ کے سب مریض ان کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نرس لمبے وارڈ کے کنارے سے آتی نظر آئی،

"میرا بچہ کہاں ہے۔" وہ چلائی ساکت ہونے کے قریب پتلیاں ذرا کی ذرا پھڑپھڑائیں۔ نرس تیز تیز چلتی آرہی تھی۔ رشید کی نظریں نوری پر ٹکیں اس نے اپنا ایک ہاتھ ذرا سا بلند کیا۔ سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں... کہاں؟ وہاں۔" نوری ہاتھ کے اشارے پر مرتکز ہوگئی۔ الفاظ گڑبڑائے۔ رشید کچھ بول ضرور رہا تھا۔ لیکن... نرس اس کے سر پر آچکی تھی۔

"ان کا ماسک کس نے اتارا۔" وہ زور سے بولی۔

"کیوں چلا رہی ہو تم۔" اس نے آتے ہی آکسیجن ماسک کو رشید کے منہ پر رکھا جسے نوری نے ہی آنکھیں کھلنے پر اتار دیا تھا۔ نوری نے ماسک فوراً اتار دیا۔

"نکلو یہاں سے۔" نرس تڑخ کر بولی اور ماسک واپس لگایا۔ اور نرس کو دھکا دیا۔

"میرا بچہ کہاں ہے رشید بھائی... جلدی بتاؤ..." وہ مسلسل چلا رہی تھی... نرس اسے گھسیٹنے لگی۔ باقی سب تماشا دیکھنے لگے۔ بیڈ کے قریب حلقہ بنائے لوگ پرے ہوگئے۔ نرس نوری کو گھسیٹ کر باہر لے جانے کی کوشش کررہی تھی۔ نرس کو ایک زوردار دھکا دے کر نوری رشید کی طرف لپکی۔ اس کے منہ کے پاس کان لے کر گئی۔

"جلدی بتاؤ رشید۔" دونوں کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ نرس باہر وارڈ بوائے اور ڈاکٹر کو لینے کے لیے بھاگی نوری نامی چیز اس کے قابو سے باہر تھی۔

رشید کا ہاتھ پھر ذرا سا بلند ہوا اسی دیوار کی طرف جس کے بہت پرے بہت سی سڑکوں کے پار ہیرا منڈی تھی اور بہت سی گلیوں سے آگے جویلی کا ڈیرہ تھا۔ الفاظ سرگوشی بن کر نکلے۔

"مم... مم... منڈی۔"

"منڈی..." نوری ہر حال سے بے حال ہوگئی۔

"کس منڈی؟ سبزی منڈی... کس کے پاس؟ کہاں؟" رشید کی آنکھیں ساکت ہونے کے قریب تھیں۔

"ب... ب... بازا... مم... منڈ۔" نرس، وارڈ بوائے، ڈاکٹر بھاگے آئے۔

"بازار..." نوری اس کا ہاتھ ہلا رہی تھی، اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ وارڈ بوائے نے پکڑ کر اسے باہر کی طرف گھسیٹا۔

"کس بازار... کون سی منڈی؟" اس کی اونچی دل دہلا دینے والی آواز نے وارڈ کا سناٹا توڑ دیا تھا۔ جہاں کوئی آخری سانسیں لے رہا تھا۔

ڈاکٹر رشید کو دیکھنے لگا ماسک پہنایا پمپ کرنے لگا۔ نوری 'بازار منڈی چلا رہی تھی۔

وارڈ بوائے کے ہاتھوں سے خود کو آزاد کروانے کی کوشش کررہی تھی۔ گلے سے چادر اتر کر گر چکی تھی۔ دو، تین عورتیں قریب آئیں اسے قابو میں کرنے کے لیے نوری خود کو چھڑواتے، ہاتھ پاؤں مارتے بے حال ہورہی تھی۔ وہ مڑ مڑ کر صرف رشید کی طرف دیکھ رہی تھی جس کی آنکھیں اب ساکت ہوچکی تھیں۔

"میرا بچہ..." آخری چیخ مار کر وہ فرش پر گر گئی۔

رشید مرچکا تھا ڈاکٹر اس کا ماسک اتار چکا تھا۔ نوری بے ہوش ہوگئی تھی۔ نرس نے ہی دو تین عورتوں کی مدد سے اسے ایک بیڈ پر لٹایا۔ ایک بیڈ پر نوری بے ہوش دوسرے پہ رشید بے جان۔ ایک ہر فکر سے بے نیاز ہوگیا دوسرا اب گرفتار بلا ہوا۔ سفر دونوں کے شروع ہوچکے تھے۔

☼ ☼ ☼

رشید چاند کے بارے میں جاوید سب جانتا تھا۔ ہیرا منڈی میں اس کا ٹھکانہ معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ جاوید نے جویلی کو بھی ڈھونڈ لیا لیکن وہ امین کو نہیں ڈھونڈ سکا۔ گڈو بدمعاش کے ذریعے جاوید نے جویلی کے ڈیرے پر جاکر بات کی۔ لیکن وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جاوید نے پیسوں کا لالچ بھی دیا۔ لیکن وہ نہیں مانے... اندرون خانہ جو کچھ معلوم کروالیا اس کا لب لباب یہ تھا کہ بچہ بھوکا پیاسا رو، رو کر مرگیا۔ کچھ خبریں ایسی تھیں کہ بچہ انہوں نے بیچ دیا۔ اگر بیچ دیا تھا تو ایسی جگہ بیچا تھا جہاں سے مل نہیں سکتا تھا اور اگر مرگیا تھا تو... اس نے نوری کو صاف بتادیا کہ رشید کا کوئی پتا، ٹھکانہ نہ ملا... وہ ہر روز... آکر نوری سے یہی کہتا پر نوری کہاں مانتی... وہ منہ اندھیرے... کڑی دوپہروں میں... شاموں میں، شاہی محلے... اندرون، بیرون بازاروں میں... بچہ بچہ کی رٹ لگائے... ہر شخص کی طرف لپکتی۔

جاوید کہتا وہ حواسوں میں نہیں رہی... جھوٹ بکتا تھا۔ اب ہی تو حواس آئے تھے۔ اماں اسے زبردستی اپنے ساتھ گاؤں لے گئیں۔ حاجن بی اسے سارا سارا دن اپنے ساتھ لگائے رکھتیں۔ مانو اور ثریا کبھی کبھار اس سے آکر مل جاتیں... جاوید نے دوسری فیکٹری لگالی... مطلب دوسری شادی کرلی۔ وہ امیر سے امیر تر ہونے لگا۔

نوری پانچ وقت نماز پڑھتی۔ تلاوت کرتی اور باقی کا فارغ وقت گھر سے نکل کر اپنے بچوں کو ڈھونڈتی... وہ پاگل نہیں تھی۔ لیکن اپنے حواسوں میں بھی نہیں وہ صرف گاؤں میں ہی رہتی ہے۔ گاؤں سے باہر نہیں نکلتی۔ نمازوں کے اوقات میں حاجن بی کے گھر آجاتی... ورنہ... ورنہ... نوری کے لیے بہت گلیاں... بڑے راستے...

بہت ہفتے... مہینے... گزرے... چند سال گزرے... ثریا ایک میڈم کو اپنے باپ کی کار میں بٹھا کر گاؤں لائی... یہ گوہر تھی... جو سارہ کو اس کے اصل ماں... باپ سے ملوانے لائی تھی۔ وہ پچھلے چند سالوں سے جاوید کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اب ملا تو فوراً پاکستان آگئی سارہ کو لے کر... سارہ... ایک مضبوط لڑکی کی مکمل تصویر... وہ اپنی ماں کے سینے سے لگی... اس کی آنکھوں کو چوما... بے نور نوری میں کچھ نور در آیا۔

یہ اس کہانی کا انجام نہیں ہے... اس کہانی کا کوئی انجام نہیں ہے۔ جب نفس کی موت ہوگی... اعمال کا حساب ہوگا، بس اسی وقت اس کہانی کا انجام ہوگا۔

☼

ریحانہ امجد بخاری

وہ اک سرپھرا سا ہے

فرزان ایک دن کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو چائے پینے کی نیت سے باہر جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات چند علماء کرام سے ہوتی ہے جو اسے باقاعدگی سے مسجد آنے اور نیک اعمال کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ فرزان کی ان سے بحث ہو جاتی ہے۔ تو تکرار میں بہت سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی دوران پولیس آجاتی ہے جو ان سب کو پکڑ کر تھانے لے جاتی ہے وہاں پر بھی فرزان پولیس والوں سے عجیب و غریب گفتگو کرتا ہے۔ پولیس والے اسے پاگل قرار دے کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اذان کو ایک اسٹیج پلے کرنے کی آفر ملتی ہے۔ ساری ذمہ داریاں اسی پر ہوتی ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ تیاریوں میں لگ جاتا ہے۔ اسکرپٹ کے مطابق ڈرامے میں ایک لڑکی کی ضرورت ہے مگر ان کی ٹیم میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ ایک دوست رانا فہیم اسے بتاتا ہے کہ وہ ایک ایسی لڑکی کو جانتا ہے جو یہ کردار بہت اچھا کر سکتی ہے۔ اذان اس لڑکی ماہم سے ملتا ہے۔ ماہم بہت پراعتماد اور خوب صورت لڑکی ہے جو پوری ذمہ داری سے اپنا کام کرتی ہے۔ اذان اس کے حسن اور صلاحیتوں سے متاثر ہو جاتا ہے مگر اس کے سامنے اعتراف نہیں کرتا۔ ماہم اس کے گروپ کے تمام لڑکوں سے فری ہو جاتی ہے اور باری باری سب کو اپنا موبائل نمبر دیتی ہے۔ اذان کو یہ بات بہت بری لگتی ہے۔ مگر وہ اس سے موبائل نمبر نہیں مانگتا۔ اذان کا اسٹیج پلے بہت پسند کیا جاتا ہے مگر اسی دوران اس کے اپنے دوست رانا فہیم سے تلخی ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ماہم اب تمہارے پلے میں کام نہیں کرے گی۔ تم کوئی متبادل انتظام کرلو۔ اذان جیسے تیسے باقی کے پروگرامز کرتا ہے مگر وہ ماہم کو بھول نہیں سکا۔ وہ دل ہی دل میں اسے یاد کرتا ہے، اس کے دوست اور ٹیم ممبرز اسے بتاتے ہیں کہ ماہم فون پر سب ہی سے بات کرتی ہے لیکن وہ ملنے کے سخت خلاف ہے اور ایک مخصوص حد تک بات کرتی ہے۔ وہ دوستی کرنے کے حق میں نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ جو شخص اس سے مخلص ہوگا اور اس سے شادی کا خواہش مند ہوگا وہ اسی سے تعلق رکھے گی۔ ماہم کے خیالات سن کر اذان کو خوشی ہوتی ہے۔ ماہم کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہوتا ہے اس کی ماں ایک اسکول میں کینٹین چلاتی ہے اور باپ سائیکل پر گھوم کر صبح کے ناشتے کے لیے چھولے بیچتا ہے۔ مگر وہ اپنی غربت کے باوجود ماہم کو اعلا تعلیم دلا رہے ہیں۔ ماہم بی کام کی اسٹوڈنٹ ہے۔ ذہین اور حساس مگر اپنی غربت سے نالاں ہے۔ اذان کو اپنے ایک دوست سے پتہ چلتا ہے کہ ماہم ایک کریمنل آدمی سے ٹیلی فونک رابطے میں ہے اور اس کی دوستی کا دم بھرتی ہے۔ اذان کو تشویش ہوتی ہے مگر وہ اپنے دوستوں سے اس کا نمبر پوچھنا پسند نہیں کرتا۔ اسی دوران اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ اس کا ایک دوست رشتے میں ماہم کا چچا لگتا ہے۔ اذان اس سے ماہم کا نمبر حاصل کر لیتا ہے۔ اذان اور ماہم کی دوستی ہو جاتی ہے۔ جو رفتہ رفتہ محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ محلے دار فیضی صاحب سے فرزان کی الٹی سیدھی حرکتوں کی شکایت کرتے ہیں۔ فیضی صاحب بہت شرمندہ ہوتے ہیں اور فرزان سے سخت رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ دوٹوک انداز میں کہتے ہیں کہ یا تو اپنے دوستوں کو چھوڑ دو یا اس گھر کو..... فرزان ضد میں آکر اپنی بیوی زارا کو ساتھ لیتا ہے اور گھر چھوڑ دیتا ہے۔ فرزان کے گھر چھوڑنے کے بعد فیضی صاحب فرزان کی بہت کمی محسوس کرتے ہیں مگر اس کا اظہار نہیں کرتے۔ ذکیہ بیگم جو ایک ماں ہیں۔ بیٹے کی جدائی ان پر بھی بہت اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ بیٹے کی وکالت کرتی ہیں مگر فیضی صاحب انہیں سمجھا دیتے ہیں کہ وہ یہ سختی بیٹے کی بھلائی کے لیے کر رہے ہیں۔ فرزان گھر چھوڑنے کے بعد مالی پریشانیوں کا شکار ہے اور اس کے گھریلو حالات بہت خراب ہیں۔ اس کا ایک دوست اسے ایک این جی او میں کام کرنے کی دعوت دیتا ہے جہاں اس کی ملاقات نیلم سے ہوتی ہے۔ نیلم کو فرزان بہت اچھا لگتا ہے مگر وہ اسے بتا دیتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے یوں نیلم کے دل میں فرزان کی محبت پروان چڑھنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ فیضی صاحب کو بیٹے کی نافرمانی اور جدائی نے مل کر اندر سے توڑ دیا ہے۔ انہی دنوں فیضی صاحب کا دوسرے شہر جانا ہوتا ہے۔ وہ وہاں جا کر شدید بیمار ہو جاتے ہیں۔ اذان فرزان سے کہتا ہے کہ وہ جا کر ان سے معافی مانگ لے اور انہیں گھر لے آئے مگر فرزان اس سے بھی ہیری کرتا ہے اور اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ فرزان کو فیضی صاحب کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو اسے اپنی ضد اور ہٹ

دھرمی پر دل ہی دل میں بہت شرمندگی ہوتی ہے مگر بجائے اس کے کہ وہ اپنی اصلاح کرتا اور غلط کام کرنے لگتا ہے۔ تدفین والے دن شراب کے نشے میں دھت ہو کر الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے۔ فرزان کی وہی روٹین ہوتی ہے اب تو اسے روکنے ٹوکنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا اس کی اور اس کے دوستوں کی چاندی ہو جاتی ہے' زارا دبے لفظوں میں اسے سمجھاتی ہے مگر وہ اسے ڈانٹ دیتا ہے۔ فرزان سنجیدگی سے سوچتا ہے کہ اسے اپنے آپ کو بدلنا چاہیے اور ڈھیر ساری دولت کمانی چاہیے وہ ان باتوں کا ذکر محبوب خان سے کرتا ہے۔ محبوب خان جلال زئی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور لنڈی کوتل کا رہائشی ہے جو اسے منشیات اور اسلحہ کے کاروبار کے متعلق معلومات دیتا ہے جس میں فرزان خاصی دلچسپی لیتا ہے۔ معاشی حالات اور تنگ دستی سے گھبرا کر وہ محبوب خان کے ساتھ لاہور چلا جاتا ہے۔ ان کا پروگرام ہوتا ہے کہ کچھ دن لاہور رہ کر سیر و تفریح کریں گے پھر وہاں سے لنڈی کوتل روانہ ہو جائیں گے لیکن وہاں ایک حادثے میں فرزان شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ محبوب خان فرزان کو زخمی حالت میں اسپتال چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے لیکن وہ فون کر کے نیلم کو اس کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ فرزان ہوش آنے پر ڈاکٹر فریال سے حسب عادت عجیب و غریب گفتگو کرتا ہے تو ڈاکٹر فریال کو اس سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اسے کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر لے جاتی ہے۔ اذان اور ماہم میں بے تکلفی پیدا ہوتی ہے تو اذان اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے لیکن ماہم انکار کر دیتی ہے جس پر اذان سخت ناراض ہو جاتا ہے۔ ماہم اسے دوبارہ کال کرتی ہے تو وہ ماہم سے کہتا ہے کہ اس نے اس کے انکار پر دل برداشتہ ہو کر دیوار میں ٹکریں ماری ہیں جس کی وجہ سے اس کا سر پھٹ گیا ہے اور پیشانی پر زخم آیا ہے۔ ماہم پسیج جاتی ہے اور اگلے ہی دن اذان کی مزاج پرسی کے لیے آنے کا وعدہ کر کے فون بند کر دیتی ہے۔ اذان پریشان ہو جاتا ہے کیوں کہ اس نے دیوار میں ٹکریں ماری ہوتی ہیں نا ہی اس کی پیشانی پر زخم آیا ہوتا ہے۔ وہ بوکھلا کر اپنے دوست علی کو فون کرتا ہے اور اپنے اس جھوٹ کو نبھانے کے لیے اس سے مشورہ طلب کرتا ہے۔ علی کہتا ہے کہ وہ کاٹن پر رنگ لگا کر سر پہ پٹی باندھ لے لیکن اذان مطمئن نہیں ہوتا اسے خدشہ ہوتا ہے کہ ماہم پٹی کھول کر دیکھ لے گی اور اس کا جھوٹ پکڑا جائے گا وہ پریشان ہو کر اپنا سر پھاڑنا چاہتا ہے مگر تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے اس کا حوصلہ نہیں کر پاتا۔ تنگ آ کر وہ پیشانی پر زخم بنوانے اسپتال جا پہنچتا ہے۔

☆☆☆

اب آپ آگے پڑھیے

۱۳ تیرہویں قسط

جتا رہا ہے مجھے کتنی صحبتوں کا فراق
بجھا بجھا یہ بدن، ہاتھ سرد سرد ترا
وہ فاصلہ جسے صحرائے آگہی کہیے
بھٹک گیا اسی صحرا میں رہ نورد ترا

اذان صحرائے آگہی میں بھٹک رہا تھا، لیکن آبلہ پائی کے مرحلے سے پہلے ہی آگہی کا یہ سفر ختم ہو گیا اور وہ زمانہ حال میں واپس لوٹ آیا۔

سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے اور اذان کو یہ کڑواہٹ اپنے پورے وجود میں سرائیت کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے گہری نظروں سے گھور کر ماہم کا جائزہ لیا پھر اس کے ہونٹوں پر کئی سوال سر سرا اٹھے۔

''کیا اب بھی تمہارا نمبر اس کے پاس ہے؟ کیا وہ تمہیں کال کرتا ہے؟ کیا وہ ابھی تک تم سے رابطے میں ہے؟''

ماہم نے ایک نظر اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر ملائمت سے جواب دیا۔

''نمبر تو اس کے پاس ہے میرا...... لیکن اب وہ مجھے فون نہیں کرتا، کیونکہ آپ سے رابطے کے بعد میں اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی ہوں۔''

اذان نے بے صبری سے اس کا جملہ مکمل ہونے کا انتظار کیا۔ پھر وہ جلدی سے بولا۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ حافظ عامر...... میرا مطلب ہے کہ فاروق ملک کا نمبر تمہارے پاس بھی سیو ہوگا!

''جی ہاں! میرے پاس بھی نمبر موجود ہے؟''

ماہم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اذان چند لمحوں تک خاموش بیٹھا اضطراری انداز میں انگلیاں مروڑتا رہا پھر دوبارہ گویا ہوا۔

''تم یوں کرو کہ اپنی سم مجھے دے دو، میں ابھی تمہیں دوسری سم منگوا دیتا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ اب کوئی بھی میرے اور تمہارے درمیان آنے کی جرات کرے۔''

ماہم نے بغیر کسی ردعمل کا اظہار کیے خاموشی سے موبائل کی بیٹری نکالی اور سم نکال کر اذان کی طرف بڑھا دی۔ اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد دکان کے اکلوتے ملازم سمیر نے ایک نئی سم مہیا کر دی۔ جب ماہم اذان سے رخصت ہوئی تو اس کے موبائل میں اذان کا فراہم کردہ نیا نمبر ایکٹو ہو چکا تھا۔

ماہم کو رخصت کرنے کے بعد اذان اپنی سیٹ پر آ کے بیٹھا تو اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے ریوالونگ چیئر پر بیٹھے بیٹھے اس نے پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ذہنی طور پر اپ سیٹ اور خاصا الجھا ہوا ہے اس کی یہ الجھن اس کے چہرے سے مترشح تھی۔

وہ کچھ دیر تک کرسی پر آگے پیچھے جھولتا رہا پھر کچھ سوچ کر سیدھا ہو گیا۔ اور جیب سے ماہم کی دی ہوئی سم نکال کر اسے بغور یوں دیکھنے لگا جیسے ابھی اس میں سے کوئی جاندار چیز برآمد ہو گی پھر سر جھٹکتے ہوئے اس نے موبائل نکالا اور اپنی سم نکال کر ماہم کی سم ڈالنے لگا۔

موبائل آن کرنے کے بعد اس نے کانٹیکٹ لسٹ اوپن کی اور باری باری تمام نمبر اور ناموں کا جائزہ لینے لگا۔ شاہدہ خالہ، حسین ماموں، مانی پھپھو...... وہ مسلسل اسکرول کرتا رہا اور پھر ایک نام پر اس کی نظریں جم گئیں۔

فاروق ایم کے نام سے سیو نمبر اس کی توجہ کا مرکز تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر رکھا رائٹنگ پیڈ اور پین اپنی جانب گھسیٹا اور وہ نمبر کاغذ پر منتقل کرنے لگا۔ نمبر لکھ کر اس نے صفحہ پھاڑا اور تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا اب وہ پرخیال انداز میں موبائل اسکرین پر نظر آتے فاروق ایم کے نام کو گھور رہا تھا۔ لیکن اس کا دماغ جیسے کہیں اور تھا۔ اس وقت اگر کوئی اس کے چہرے کا جائزہ لیتا تو صاف محسوس کر لیتا کہ وہ خالی الذہنی کی کیفیت کا شکار ہے۔

اس کی نظریں بظاہر اس نام پر جمی ہوئی تھیں لیکن آنکھوں میں لرزتے دھندلے نقوش کسی اور کے تھے...... پھر یوں ہوا کہ وہ دھندلاہٹیں چھٹ گئیں اب اس کے سامنے واضح شبیہ تھی جو ماہم کے علاوہ اور کسی کی نہ تھی۔

جھکی ہوئی غلافی پلکیں کپکپائیں، یاقوتی لب حرکت میں آئے۔

''میں ایک تھرل پسند لڑکی ہوں...... میری نظر میں وہ آدمی نفسیاتی مریض ہے اور میں اس کا دماغی علاج کر رہی ہوں......''

اذان کے چہرے پر دھواں پھیل گیا۔ چند لمحے پہلے تروتازہ نظر آنے والا اذان برسوں کا بیمار دکھائی دے رہا تھا۔ تازیانے کی گونج دوبارہ بلند ہوئی۔

''اذان وہ کوئی جاہل شخص نہیں ہے۔ کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر کیا ہے اس نے۔''

اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تناؤ میں مزید اضافہ ہو گیا وہ شدید اعصابی دباؤ کا شکار رہا۔ اس کا ذہن خلا میں ادھر سے ادھر ڈگمگاتا پھر رہا تھا۔ چاروں طرف بے کراں وسعتیں تھیں جس کے درمیان یک و تنہا اذان یا پھر فضاء میں لہریں لیتی ہوئی ماہم کی آواز۔

''گفتگو بتا رہی ہے اذان! وہ واقعی پڑھا لکھا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے''

بے مائیگی اور بے خبری کا ایک عجیب امتزاج تھا جس میں وہ گم ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی عالم بے خبری میں نہ جانے کب بے اختیارانہ اس کی انگلیاں حرکت میں آئیں اور موبائل کا گرین بٹن پش ہو گیا۔

اب وہ موبائل کان سے لگائے بیٹھا تھا اور فاروق ملک کے نمبر پر بیل جارہی تھی۔

☆☆☆

انسان ہیں کہ پتھر کے تراشے ہوئے بت ہیں
سانسوں میں حرارت ہے نہ شہ رگ میں لہو ہے
دیکھوں تو ہر اک موڑ پہ ہنگامۂ محشر
سوچوں تو بھرے شہر میں اک عالم ہو ہے

''روش تبدیل کرنی ہوگی! کیونکہ تبدیلی ہی زندگی کا ثبوت ہوا کرتی ہے۔ تحریک زندگی ہے اور جمود موت کا دوسرا نام...... یاد رکھیں کہ زندگی بسر کرنا یا زندگی گزارنا کامیابی نہیں، کیونکہ زندگی ایک سرکش چیز کا نام ہے۔

اگر آپ اپنی زندگی کو ایک ہی مخصوص ڈگر پر چلتا رہنے دیں گے تو آپ کبھی کامیاب انسان نہیں کہلاسکیں گے۔ زندگی ریل کی پٹری نہیں ہے کہ ریل گاڑی ہمیشہ اور ہر بار اسی پٹری پر چلتی رہے، زندگی ایک دریا کی طرح ہے جو اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ بنے بنائے راستوں پر چلنا آپ کو کنویں کا مینڈک بنا کر رکھ دے گا۔ بہت زیادہ ترقی کرلیں گے تو کولہو کا بیل کہلانے لگیں گے۔

اپنے اردگرد کے ماحول کو اپنی عادت مت بنائیں کیونکہ عادتوں والی زندگی گزارنے والے لوگ میرے خیال میں زندہ انسان نہیں ہوتے۔ وہ مردہ لوگ ہیں...... اپنی زندگی کو اپنا راستہ خود بنانے کی اجازت دیں، ہر نئی چیز کو قبول کریں تب آپ جس مقام پر پہنچیں گے وہ آپ کی منزل کہلائے گی۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ایک چیز جان لیتے ہیں تو اسی پر قناعت کرکے بیٹھ جاتے ہیں......''

فرزان ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور وسیع و عریض کانفرنس روم میں موجود تمام افراد کے چہروں پر نظر دوڑانے لگا۔

جہازی سائز گلاس ٹیبل کے دونوں اطراف کرسیوں پر موجود بیس، بائیس افراد جو بغور فرزان کی فلسفیانہ گفتگو کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف عمل تھے۔ اپنی وضع قطع اور حلیے کے اعتبار سے دور سے ہی خالصتاً کاروباری افراد نظر آرہے تھے۔

فرزان نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ اور ایک مرتبہ پھر لیڈنگ چیئر پر براجمان ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سلسلہ کلام دوبارا جوڑتے ہوئے بولا۔

''شاید میری باتوں کو سمجھنے میں آپ کو مشکل پیش آرہی ہے، چلیں میں آپ کو آسان الفاظ میں سمجھاتا ہوں۔ جیسے ہر شخص شاعر نہیں بن سکتا، ہر شخص سائنس دان یا ریاضی دان نہیں بن سکتا، ہر شخص موسیقار نہیں ہوسکتا، کسی بھی چیز کے بارے میں آپ کی جستجو، آپ کی لگن اور آپ کی محنت آپ کو اس کی تکنیک سمجھا سکتی ہے۔

بار بار کی مشق کرنے سے آپ ساز بجانا تو سیکھ سکتے ہیں مگر پھر بھی آپ موسیقار نہیں بن سکتے۔ آپ صرف ایک تکنیک کار کہلائیں گے۔ جو موسیقی پیدا تو کرسکتا ہے لیکن اس میں فطری بے ساختگی مفقود ہوگی کیونکہ تخلیقی تحریک اس میں شامل نہیں ہوگی، اسی طرح زندہ رہنا ہی کافی نہیں ہوتا، زندہ رہنے کے آگہی کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔

بات صلاحیت کی نہیں شعور کی ہے، کوئی بھی ملک یا قوم محض قدرتی وسائل، افراطِ زر، افرادی قوت سے نہیں پنپ سکتی، اس کا مرکز، اس کی پیداواری طاقت ہوا کرتی ہے۔ کسی بھی کمپنی میں ترقی کی بنیاد تین بنیادی اصول ہوا کرتے ہیں۔

لاگت میں کمی، کارکردگی میں اضافہ اور موثر طریقہ کار۔ بات یہ نہیں کہ آپ کو کیا کرنا ہے، بات یہ ہے کہ کیسے کرنا ہے، انفرادیت ہی آپ کا اصل کام ہے۔ ہم میدان میں نئے نئے اترے ہیں اور مقابلے کے اس میدان میں وہی کامیاب ہوسکتا ہے۔ جس کے پاس قیمتیں کم اور معیار اعلا ہوگا۔

ہمارے پاس افرادی قوت کی کوئی کمی نہیں۔ ہمیں اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرون ملک بھی اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑنے ہیں، اسی پر ہماری ترقی اور خوشحالی کا دارومدار ہے۔ آپ سب کی ہنر مندی اور مہارت مل کر اس ادارے کو ایک کامیاب ادارہ بنائے گی۔

ہمیں ایک ایسا ماحول تشکیل دینا ہوگا کہ ترقی کے بہتر مواقع پیدا ہوسکیں، بہتر سے بہتر اقتصادی پالیسی وضع کریں، مقامی سرمایہ کاروں کے ایک پرعزم گروہ کو اپنے ساتھ مسلسل شامل رکھیں تاکہ مقامی سطح پر صنعت کاری کے علاوہ عالمی سطح پر بھی کامیابی کے روشن مواقع موجود رہیں۔ سرمایہ کاروں کو ترغیب دیں، پرکشش مراعات کی پیشکش کریں تاکہ وہ دوسری کمپنیز پر ہمیں ترجیح دیں۔

ہماری کمپنی ایک پبلک لمیٹڈ کمپنی کے طور پر سامنے آنی چاہیے۔ آج سے آپ سب اپنی اپنی ذمہ داریاں سنبھال رہے ہیں میں یہی امید رکھوں گا کہ آپ اس کمپنی کو صرف فرزان اینڈ کمپنی ہی نہیں بلکہ اپنا ذاتی ادارہ سمجھتے ہوئے خلوص دل اور نیک نیتی سے اس کی ترقی اور خوشحالی کے لیے میرے شانہ بشانہ ہوں گے۔ آپ سب کا بہت شکریہ......''

بات ختم کرکے فرزان نے ایک نظر سب کی طرف دیکھا تو نفیس ٹو پیس سوٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر کلین شیو شخص اٹھ کر کھڑا ہوا اور پھر ناک پر جمے چشمے کا زاویہ درست کرتے ہوئے مودب انداز میں بولا۔

''فرزان صاحب! ہماری ٹیم کے تمام افراد تجربہ کار اور اپنے کام میں منجھے ہوئے لوگ ہیں، مجھے یقین ہے آپ کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ انشاء اللہ فرزان اینڈ کمپنی بہت جلد اور بہت اچھے انداز میں ابھر کر سامنے آئے گی......''

فرزان نے بغور مخاطب کی جانب دیکھا اور پھر کرسی سرکا کر اٹھتے ہوئے گویا ہوا۔

''اوکے، تو مسٹر صفدر خاکوانی صاحب! بحیثیت منیجر آپ کا فرض بنتا ہے کہ عام لوگوں کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کردیں۔ مجھے امید ہے کہ اس سلسلے میں مجھے دوبارہ کوئی بریفنگ دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

فرزان نے ایک لمحے کے لیے رک کر کھڑے کھڑے اپنا جملہ مکمل کیا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں چلتا ہوا کانفرنس روم سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

شامل میرا دشمن صفِ یاراں میں رہے گا
یہ تیر بھی پیوست رگِ جاں میں رہے گا
اک رسم جنوں اپنے مقدر میں رہے گی
اک چاک صدا اپنے گریباں میں رہے گا

اگر اپنے گریبان میں جھانکا جائے تو بے کراں خلاؤں سے الجھ کر نڈھال ہونے کے علاوہ کبھی کچھ ہاتھ نہیں آتا...... سو وہ بھی اسی کیفیت میں تھا لیکن یہاں معاملہ کچھ مختلف تھا کہ گریبان کے اندر اور گریبان کے باہر تاحد نظر لامحدود خلاؤں کے علاوہ کچھ نہیں تھا...... اگر تھا تو صرف ایک خیال...... ایک اذیت دیتی ہوئی سوچ، جو اس کے لیے سوہان روح تھی۔

رقابت کی آگ ایسی ہی آگ ہوتی ہے۔ جو بظاہر نظر نہیں آتی لیکن بندہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ سلگ کر اندر ہی اندر راکھ کا ڈھیر ہوجاتا ہے۔

ذرا سی تحریک، ہوا کا ایک ذرا سا جھونکا، مہمیز کا کام کرتا ہے اور ایسے میں پلک جھپکتے ہی قطرہ قطرہ پگھلتی، سلگتی، گیلی لکڑی چند ساعتوں میں خس و خاشاک کی طرح جلنے لگتی ہے۔

بھڑک اٹھی ہے لو دیوانگی کی
سبھی آشفتہ سر جلنے لگے ہیں

جب یہ آگ بھڑک اٹھتی ہے تو پھر بجھائے نہیں بجھتی...... اذان بھی جل رہا تھا۔ لیکن یہ جلنا ایسا جلنا تھا کہ دھواں تک نہیں اٹھ رہا تھا، دوسری بیل پر اس نے بے اختیار سلسلہ منقطع کردیا اور موبائل جیب میں ڈال لیا۔ وہ اس آگ کے ہاتھوں شکست کھانے کو تیار نہیں تھا، اس کے ذہن میں بے اختیار ایک فلم کا ڈائیلاگ گونج اٹھا۔

''ٹینشن لینے کا نہیں...... ٹینشن دینے کا''

اس کے ہونٹوں پر ایک زہر خند مسکراہٹ پھیل گئی پھر وہ فیصلہ کن انداز میں اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا

اور کاؤنٹر کے پیچھے گھوم کر باہر نکلتے ہوئے دکان کے اکلوتے ملازم سمیر سے مخاطب ہوا، جو ہاتھ میں صافی اٹھائے ریکس میں سجی الیکٹرونکس مصنوعات پر سے گرد جھاڑنے میں مصروف تھا۔

"سمیر! یہ سب بعد میں کرنا ذرا کاؤنٹر پر آجاؤ..... میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔"

سمیر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے واپس مڑا تو اذان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دکان سے باہر نکل گیا۔ پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ اپنی بائیک پر بیٹھا ایک جانب اڑا چلا جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ موٹر سائیکل کھڑی کرنے کے بعد وہ سہولت سے چلتے ہوئے آگے بڑھا اور پھر گلاس ڈور کو دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

یہ ایک معروف جی ایس ایم موبائل کنیکشن کمپنی کی فرنچائز تھی۔ وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھا تو ایک دبلا پتلا اور خوب صورت نقوش کا مالک نوجوان کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جمائے کی بورڈ سے الجھتا دکھائی دیا۔ اذان خاموشی سے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا لیکن نوجوان پورے انہماک سے اپنے کام میں مصروف رہا، چند ساعت انتظار کے بعد کاؤنٹر کی سطح پر اذان کی انگلیاں حرکت میں آگئیں۔ کاؤنٹر بجنے کی آواز پر نوجوان نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور پھر اذان پر نظر پڑتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"آہاہ..... اذان صاحب! آج آپ کو ہماری یاد کیسے آگئی؟"

اذان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ضرورت ایجاد کی ماں ہے آصف میاں! دیکھ لو ہماری ضرورت آخر کار ہمیں کھینچ ہی لائی۔"

اذان نے اپنے قریبی دوست ملک آصف کا مصافحہ کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر گرمجوشی سے دباتے ہوئے جواب دیا۔

ملک آصف اس کے اچھے دوستوں میں سے ایک تھا۔ جو اس فرنچائز میں بطور منیجر کام کرتا تھا۔

"ارے نہیں..... نہیں اذان صاحب! اب ایسا بھی کیا! آپ حکم فرمائیں؟ ضرورت ایجاد کی ماں ضرور ہو گی لیکن اگر ضرورت آپ جیسے دوست کی ہو تو ہم ضرورت کے باپ ثابت ہوں گے۔ بتائیں کیا خدمت کر سکتا ہوں میں؟"

آصف نے انکسارانہ لہجے میں کہا تو اذان نے جیب سے مڑا تڑا کاغذ برآمد کیا اور پھر اسے سیدھا کرتے ہوئے آصف کی جانب بڑھا دیا۔ بلاشبہ یہ وہی کاغذ تھا جس پر اس نے فاروق ملک کا نمبر نوٹ کیا تھا۔

آصف نے کاغذ پکڑتے ہوئے نمبر پر نظریں دوڑائیں اور پھر سوالیہ انداز میں اذان کو تکنے لگا۔ اس کا مطلب سمجھتے ہوئے اذان گویا ہوا۔

"ذرا اس نمبر کا اسٹیٹس تو نکالو!"

آصف دوبارہ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ابھی اذان صاحب! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے!"

چند لمحے کی بورڈ کے مختلف بٹن پریس کرنے کے بعد اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے آصف کی آواز بلند ہوئی۔

"غفران نیازی کے نام پر ہے! ایڈریس اور آئی ڈی کارڈ نمبر بھی موجود ہے، دوں کیا؟"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں....." اذان نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم یوں کرو کہ اس نمبر پر میری آنر شپ ڈال دو۔"

آصف نے دزدیدہ نظروں سے اذان کی طرف دیکھا پھر قدرے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں گویا ہوا۔

"معاملہ کیا ہے اذان صاحب! کچھ پتا تو چلے! کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے؟"

"او کے رہنے دو..... بہت شکریہ" اذان دوٹوک انداز میں بولا اور پھر ایک جھٹکے سے واپس مڑتا ہوا

بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ عقب سے آصف کی آواز بلند ہوئی تو اذان کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

"ارے نہیں اذان صاحب! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ اصل میں کمپنیز کی کچھ پالیسیاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ہمارے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں لیکن اب ایسا بھی نہیں کہ آپ کے لیے اتنا بھی نہ کر سکوں۔ آئی ڈی کارڈ دیجیے۔"

اذان جو اس دوران واپس کاؤنٹر کے قریب آچکا تھا اس نے جیب سے آئی ڈی کارڈ نکالتے ہوئے آصف کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

چند لمحوں بعد جب وہ فرنچائز سے باہر نکلا تو فاروق ملک کے زیر اہتمام نمبر جو غفران نیازی کے نام سے رجسٹرڈ تھا وہ اذان کے نام منتقل ہو چکا تھا اور اذان دھیمے سروں میں سیٹی بجاتے ہوئے بائیک پر بیٹھا مطمئن انداز میں اپنی دکان کی جانب رواں دواں تھا۔

☆☆☆

پھر لہو وقت کی سولی کو ہمیں دینا ہے
لہو کے مصلوب بدلنا ہے ہمیں دار کا رنگ
ایک دیوار کے سائے سے پناہ مانگی تھی
اڑ گیا بیٹھتے ہی سایہ دیوار کا رنگ

سیاہ لینڈ کروزر تیز رفتاری کے تمام تر ریکارڈ توڑتی ہوئی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ جس کے تعاقب میں مسلح باڈی گارڈز کی ایک فوج ظفر موج تھی جو دو عدد کھلی جیپوں میں سوار تھی۔ دونوں جیپوں کے باوردی ڈرائیورز اپنی صلاحیتوں کے جوہر آزماتے ہوئے لینڈ کروزر کی رفتار کا ساتھ دینے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے لیکن اگلی گاڑی کا ڈرائیور تو شاید لینڈ کروزر کے بجائے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا جو اڑتا ہی چلا جا رہا تھا۔ متعاقب ڈرائیورز کو مخصوص فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے دانتوں پسینے آرہا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ڈیوٹی از ڈیوٹی، یہ سب تو انہیں کرنا ہی تھا کیوں کہ ان کے فرائض میں شامل تھا۔

تینوں گاڑیاں گولی کی رفتار سے اڑی چلی جا رہی تھیں۔ سڑکوں پر موجود ٹریفک کائی کی طرح چھٹتا چلا جا رہا تھا اور وہ تینوں گاڑیاں بغیر کسی رکاوٹ کے آگے پیچھے فراٹے بھرتی ہوئی چلتی چلی جا رہی تھیں۔ اس طویل ریس کے بعد آخر کار شاید وہ لوگ اپنی منزل پر پہنچ گئے کیوں کہ لینڈ کروزر ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے پہنچ کر ایک جھٹکے سے رکی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ دونوں پچھلی گاڑیاں بھی رکتی چلی گئیں۔ بریکوں کی تیز چرچراہٹ نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ باوردی گن مین اپنی اپنی بندوقوں سمیت میکانکی انداز میں اچھل کر گاڑیوں سے باہر نکلے اور لینڈ کروزر کو اپنے حصار میں لے کر الرٹ کھڑے ہو گئے۔

ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا اور سفید وردی پوش ڈرائیور جلدی سے باہر نکلا۔ اس نے دوڑ کر عقبی دروازہ کھولا اور بلیک سوٹ میں ملبوس وہ وی آئی پی شخصیت گاڑی سے باہر نکل آئی۔

مقناطیسی شخصیت کے مالک اس شخص نے لمحے کے لیے رک کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ان کی گاڑی بالکل گیٹ پر آرکی تھیں۔ حالاں کہ دونوں اطراف خوب صورت اور سرسبز بلند قامت باڑھ کے ساتھ ساتھ نئے اور پرانے ماڈل کی ان گنت گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں سلیقے سے پارک کی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

اس نے سر اٹھا کر پرشکوہ عمارت کی جانب دیکھا پھر اس کی گھومتی ہوئی نظریں واپس آئیں اور اپنے باوردی گارڈز کا جائزہ لینے لگیں۔ ڈرائیور نے جلدی سے آگے بڑھ کر عقبی سیٹ پر رکھا ہوا قیمتی بریف کیس اٹھایا اور ایک گارڈ کو تھمانے کے بعد گاڑی کا عقبی دروازہ بند کر دیا۔ اب بلیک سوٹ میں ملبوس اس شخص نے قدم آگے بڑھائے، سیاہ ماربل کے چمکتے فرش پر قدم رکھتے ہی خود کار لفٹ کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ وہ لفٹ میں داخل ہوا تو بریف کیس تھامے باڈی گارڈ بھی اس کے ساتھ لفٹ میں داخل ہو گیا۔ اس

کے ساتھ دو مزید گارڈ داخل ہو کے اس کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ خودکار دروازہ بند ہوا اور لفٹ اوپر اٹھنے لگی۔ چند ہی لمحوں کے بعد لفٹ میں ایک مدھم سی موسیقی گونجی اور لفٹ رک گئی۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کوریڈور لفٹ میں موجود تمام افراد آگے پیچھے باہر نکلے۔

ریڈ کارپٹ کو اپنے جوتوں سے کچلتے ہوئے طویل کوریڈور عبور کر کے وہ گلاس ڈور تک پہنچ گئے۔ جہاں مستعد ایستادہ چوکیدار نے انہیں آتا دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

''سلام صاحب!'' چوکیدار نے مؤدب انداز میں سلام کیا۔ اس نے خفیف سے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور اندر داخل ہو گیا۔

تینوں گارڈ اب اس سے دو قدم پیچھے تھے۔ یہ اب وسیع و عریض ہال تھا جس کی دونوں جانب کیبن بنے ہوئے تھے اور ان میں موجود افراد اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ کچھ کمپیوٹر کی اسکرین پر نظریں جمائے تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہے تھے کچھ فائلز کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے آتے ہی ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آواز بھی بند ہو گئی اور سب یوں الرٹ ہو گئے جیسے کلاس میں ٹیچر آ گیا ہو۔ جس جس نے دیکھا وہ خود کھڑا ہو گیا۔ پھر اس خاموشی میں

''گڈ مارننگ سر!''

''السلام علیکم سر!''

''سلام صاحب!''

اور ''صبح بخیر'' کی آوازیں گونجنے لگیں۔ لیکن وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر سر کے خفیف سے اشارے سے جواب دیتا آگے بڑھتا چلا گیا۔

ہال کے اختتامی گوشے پر سیاہ شیشے کا ایک اور دروازہ نظر آیا جس کی داہنی جانب پیتل کے ابھرے ہوئے الفاظ سے مزین ایک نیم پلیٹ چسپاں تھی جس پر مینجنگ ڈائریکٹر لکھا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔

دو قدم پیچھے چلتا ہوا ایک گارڈ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے مؤدب انداز میں دروازہ کھول دیا۔ وہ بنا رکے کمرے میں داخل ہو گیا اور دو گارڈز دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے جبکہ دروازہ کھولنے والا گارڈ اس کے عقب میں اندر داخل ہو گیا۔ اس نے ہاتھ میں موجود بریف کیس ٹیبل پر رکھا اور خاموشی سے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ سیاہ۔۔۔۔ ٹیبل کے گرد گھومتے ہوئے وہ اپنی مخصوص نشست پر جا بیٹھا اور آگے پیچھے جھومتے ہوئے اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ٹیبل کے ایک جانب بیش قیمت ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ رنگ برنگی فائلیں، فائل کیبنٹ میں سلیقے سے چنی ہوئی تھیں۔

اس نے آگے بڑھ کر۔۔۔۔ پین ہولڈر سے پین اٹھایا۔ کچھ دیر سوچا پھر اسے واپس اس میں رکھ دیا اور ڈائمنڈ کے اسٹائل میں بنا پیپر ویٹ اٹھا کر اس کے رنگوں کو دیکھنے لگا جو پیپر ویٹ کم اور بڑا سا ڈائمنڈ زیادہ لگ رہا تھا۔ اس کے منعکس ہوتے قوس و قزح کے رنگ سب بھلے لگ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر ان رنگوں کو غائب دماغی سے دیکھتا رہا۔ پھر اکتا کر اسے بھی رکھ دیا۔

اب وہ اٹھ کر مہمانوں کے لیے بنے مخصوص اس حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں مخملیں صوفے اور اسٹائلش سی میز رکھی تھی۔ وہ ان صوفوں کے قریب گیا اور دیوار کے ساتھ رکھے ریک پر سے کتاب اٹھا کر نرم و گداز صوفے میں دھنس گیا اور کتاب کے صفحے پلٹتا رہا۔

اس کی ان تمام تر حرکات و سکنات پر کسی کی گہری نظر تھی۔ گلاس وال کے پیچھے بیٹھی حسین و طرح دار لڑکی نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی پہلے سے سنواری ہوئی زلفوں کو ایک بار پھر سنوارے اور پرس سے آئینہ نکال کر میک اپ کا تنقیدی جائزہ لیا۔ پھر مطمئن ہو کر وہ دوبارہ اس طرف متوجہ ہو گئی۔ جواب صوفے پر بیٹھا کتاب کے صفحے الٹ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے اکتا کر کتب میز پر ڈال دی اور اٹھ کر دوبارہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

انٹر کام اٹھا کر کان سے لگایا۔ گلاس وال کے عقب سے اسے دیکھتی شیریں الرٹ ہو گئی۔

''مس شیریں! آج کی کوئی اہم اپائنٹمنٹ؟''

پھر چند لمحے دوسری جانب کی آواز سننے کے بعد اس نے انٹر کام واپس رکھتے ہوئے میز کے کونے پر موجود بیل کا بٹن پش کر دیا۔ چپڑاسی نمودار ہوا۔

''یس سر!''

اس نے پرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔

''چائے۔''

''جی سر۔'' چپڑاسی نے گردن خم کی اور کمرے سے نکل گیا۔ ٹھیک اسی وقت ہاتھ میں فائل اور پین تھامے شیریں کمرے میں داخل ہوئی۔ فائل کھول کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''سر مسٹر قاسم بلوچ آج تین بجے آپ سے میٹنگ کریں گے۔ جاپان سے مسٹر لیاؤ آن کی کال آئی تھی۔ انہوں نے میسج دیا تھا کہ آپ ان سے بات کر لیں۔ ایاز گنڈا والا کے ساتھ ڈیل فائنل ہو گئی ہے۔ کھوسہ صاحب نے اطلاع دی اور سر وہ۔۔۔''

شیریں نے ہچکچاتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور درزدیدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

وہ جو بغور اس کی بات سن رہا تھا، ہچکچانے پر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''مس شیریں! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میرے پاس پہیلیاں بوجھنے کا وقت نہیں ہوتا۔ جو بھی کہنا ہے تفصیل سے کہیں۔''

''جی۔۔۔ جی سر۔۔۔!'' شیریں نے گھبرا کر کہا۔

''وہ سر کھوسہ صاحب نے بتایا ہے کہ بلور انڈسٹریز والے فرزان اگریمنٹ کرنے پر تیار نہیں ہیں کیوں کہ گنڈا والا ان کو اس سے زیادہ پیمنٹ کر رہا ہے۔'' شیریں کی بات سن کر اس کی پیشانی پر بننے والی سلوٹیں اور گہری ہو گئیں اور چہرے پر غصے کے تاثرات نمودار ہو گئے۔ پھر جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں بھی تلخی گھلی ہوئی تھی۔

''کھوسہ صاحب سے میری بات کروائیں۔''

شیریں جلدی سے میز پر رکھے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ رابطہ قائم ہونے پر ریسیور اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

''سر کھوسہ صاحب لائن پر ہیں۔''

''مسٹر کھوسہ! گنڈا والا کے ساتھ کھل کر بات کریں۔ کہیں کہ وہ بلور انڈسٹریز کا مال اٹھانے سے انکار کر دیں۔ اگر وہ اس پر رضامند نہیں ہو رہے تو ان کے ساتھ ہونے والی حالیہ ڈیل کے علاوہ تمام سودے منسوخ کر دیں۔ ہمیں ان کے ساتھ کام نہیں کرنا۔ انڈر اسٹینڈ۔''

''لیکن سر۔۔۔!'' کھوسہ صاحب نے منمناتے ہوئے کہا۔

''ہم اس کی کیا وجہ بتائیں گے؟''

''مسٹر کھوسہ! یاور زماں پر اتنے برے دن نہیں آئے کہ وہ لوگوں کو اپنے کیے ہوئے فیصلوں کی وجوہات بتاتا پھرے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر ہم ایاز گنڈا والا سے اپنی تمام تر ڈیل کینسل کر دیں تو وہ روڈ پر آ جائے گا۔ ایک بات کان کھول کر سن لیں ہر قیمت پر فرزان اینڈ کمپنی کو آگے آتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ بلور انڈسٹری کا مال بہر حال فرزان اینڈ کمپنی اٹھائے گی ورنہ ان کا مال ان کے گوداموں میں سڑے گا۔ یہ یاور زمان کا فیصلہ ہے۔ سمجھ گئے آپ؟'' یاور زمان نے دھاڑتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

شیریں کی پیشانی پر اے سی کے خنک ماحول میں بھی پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنے باس کو اتنے غصے میں آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ٹھیک اسی وقت چپڑاسی ٹرے اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اور ٹیبل پر رکھنے کے بعد واپس پلٹ گیا۔

شیریں نے ایک نظر یاور زمان کے چہرے کی

جانب دیکھا اور پھر گھبرا کر نظریں چراتے ہوئے جلدی جلدی چائے بنانے لگی۔

☆☆☆

تشخیص بجا ہے کہ مجھے عشق ہوا ہے
نسخے میں لکھوا ان سے ملاقات زیادہ
عشق ہو اور ملاقات نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے؟

سو وہ بھی اسی نسخے پر عمل کر رہے تھے دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس خوبصورت سنہری جھیل کی جانب بڑھ رہے تھے جس میں سے سورج کی روشنی یوں منعکس ہو رہی تھی جیسے سورج جھیل کے اندر سے طلوع ہو رہا ہو۔

قریب پہنچ کر ماہم نے بیگ جھیل میں اترتی ہوئی سیڑھیوں کے ایک کنارے پر رکھا اور پھر سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہاتھ کی مدد سے جھیل کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں سے چھینٹے اڑانے لگی۔

گرمیوں کے دن تھے اور گرمی کے اس سفر کے بعد یہ دلکش ماحول اور یہ نظارہ بہت ہی پرسکون تھا۔ ماہم مصنوعی جھیل کے کنارے لگے پودوں اور پھولوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔ جو ٹھنڈی ہوا میں جھوم رہے تھے۔

اذان قریب ہی گھاس پر نیم دراز سا ہو گیا۔ ماہم بیگ سے موبائل نکال کر ارد گرد کے مناظر کی تصویر لینے لگی۔ وہ اس کام میں انتہائی محو تھی کہ اسے اپنی گردن پر گرم سانسوں کی حدت محسوس ہوئی۔ اس نے تھوڑا سا رخ پھیر کر اس طرف دیکھا۔ اذان اپنی جگہ سے کھسک کر اس کے بہت قریب آ گیا تھا۔

ماہم غیر ارادی طور پر سمٹ گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اذان کی نگاہوں کی حدت اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔

یہ ہم نے دیکھا تھا خواب پیارے، ندی کنارے
زمیں پہ اترے تھے دو ستارے، ندی کنارے
اتر کے مہتاب بن گیا آئینہ کسی کا !
کسی نے بال اپنے یوں سنوارے، ندی کنارے

اس نے اپنے ماتھے پر جھولتی شریر لٹ کو سنوارا اور پھر گھبراہٹ آمیز انداز میں موبائل اپنے بیگ میں رکھا پھر کچھ غیر محسوس انداز میں پیچھے ہٹی لیکن اذان نے اس کی یہ حرکت نوٹ کر لی تھی، وہ زیر لب مسکرایا۔

''پریشان ہو؟'' اذان نے نرمی سے پوچھا۔

اذان کے رویے کی تبدیلی نے ماہم کو محجوب کر دیا۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس کی قربت سے گھبرا رہی ہے یا اس کی توجہ، اس کی نگاہوں کی تپش اسے بے چین کر رہی ہے۔

وہ بہت لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی۔ فون پر بات کرنا اور بات تھی اور اس طرح روبرو بیٹھنا اور بات۔ وہ لاکھ خود کو مضبوط ظاہر کرتی مگر اندر سے تھی تو ایک کمزور لڑکی۔

اس لیے اسے اس وقت کی یہ صورت حال کچھ مشکل اور کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اس نے خود کو سنبھال کر اذان کی طرف دیکھا اور مضبوط لہجے میں بولی۔

''نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''اچھا...... تم کہتی ہو تو یقین کر لیتا ہوں۔''

اذان اسی شوخ سی مسکراہٹ سے اسے دیکھتا رہا۔ ماہم کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اسے زچ کر رہا ہے۔ ماہم نے نظریں چرا لیں، اس کی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ شرماتی، گھبرائی ماہم اس وقت اذان کو خوبصورت لگی اور اس نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

بے حجابانہ ملے اس سے تو یہ بھید کھلا
خلق کا خوف نہیں ہے اسے ڈر اپنا ہے

''تمہاری شفاف رنگت میں کھلی گلابیاں ان پھولوں کو بھی مات دے رہی ہیں جو یہاں کھلے ہوئے ہیں۔ کیا میں انہیں......''

''اذان......!''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی فرمائش کرتا اور ماہم اس کی نگاہوں کے والہانہ پن سے پگھل جاتی ماہم نے اسے پکار لیا۔

''میرا خیال ہے کہ یہاں بیٹھنے سے بہتر ہے ہم واک کریں ...... دیکھیں کتنا خوب صورت راستہ بنا ''

اس سے پہلے کہ اذان جواب میں کچھ کہتا ماہم ...دی سے کھڑی ہو گئی اور بیگ کندھے پر ڈال کر ...ی وہ دو ہی قدم چلی ہو گی کہ اذان نے اس کا بازو ...م کر اسے روک لیا۔ اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ ...ر کر اسے زبردستی اپنی جانب رخ پھیر لینے پر مجبور ...ر دیا۔ ماہم نے کچھ ناراضی، کچھ پریشانی سے اسے ...یکھا۔

''میری بات نہیں سنو گی؟ تم کیا سمجھ رہی ہو میں ...وئی بہت انہونی بات کرنے والا ہوں یا بہت ...اپسندیدہ؟''

اذان کا لہجہ ذرا برہم سا تھا۔ ماہم خفیف سی ...ہو گئی۔

''سن تو رہی ہوں...... بولیں کیا کہہ رہے تھے؟''

''جو کہوں گا مانو گی؟''

اذان نے ایسے گھمبیر لہجے میں کہا کہ ماہم کا ...سانس اس کے سینے میں اٹکنے لگا۔ اس نے کچھ لبوں ...سے کہنے کے بجائے صرف اثبات میں سر ہلایا اور ارد گرد دیکھنے لگی۔

''میری طرف دیکھو!''

اذان نے نرمی سے کہا۔ ماہم نے ایک بار اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اس کی نگاہوں کا جادو اس کو حصار میں لے کر اپنے اندر جذب کرنے لگا۔ وہ چند لمحوں تک اپنی نگاہوں کو علیحدہ نہیں کر پائی۔

اذان دھیرے سے آگے بڑھا اور پھر اس نے مسحور کھڑی ماہم کی پیشانی چوم لی۔

☆☆☆

گم ہے جو تیری آنکھ کا منظر تلاش کر
باہر جو کھو گیا ہے وہ اندر تلاش کر
جو تجھ کو تیری ذات سے باہر نکال دے
دشت جنوں میں ایسا قلندر تلاش کر

نیلے آسمان کی آغوش میں سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور اپنی قوس و قزح کے رنگوں کی گرم شعاعیں زمین پر بکھیر رہا تھا۔ ایک گرم سی دھند نے پورے شہر کو ڈھانپ رکھا تھا۔

ہلکے سرمئی رنگ کے قیمتی سوٹ میں ملبوس وہ شخص دیکھنے والے کو ایک لمحہ ٹھٹک کر دوبارہ دیکھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ کسرتی جسم جو معمولی سوٹ میں بھی اچھا لگتا تھا۔ اس میں بے حد وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس کی لمبی سفید انگلیاں سیل فون سے کھیل رہی تھیں۔ چمک دار ناخن اس کے صحت مند ہونے کی دلیل تھے۔ اس کا چہرہ ذہین اور پختہ ارادے والے شخص کا چہرہ تھا۔ چہرے سے منعکس ہوتی چمک دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ عرصے پہلے پڑنے والی غربت و مفلسی کی گرد کو معاشی خوش حالی نے رگڑ کر صاف کر دیا ہے۔

پہلے وہ غریب تھا تو صرف خوب صورت تھا۔ اب وہ دولت مند تھا تو خوب صورت بھی تھا اور طاقت ور بھی۔

اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور وہ گاڑی سے باہر نظر آتے مناظر کو اپنی بے تاثر آنکھوں سے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے مکانوں کی دیواروں پر اور کشادہ سڑکوں پر چلنے والی ہر چیز پر پڑتے دھوپ کے دھبے گن رہا ہو۔

اے سی گاڑی کی خنکی میں باہر کی حدت کا اندازہ روڈ پر چلتے پھرتے لوگوں کی حالت دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

گرد آلود اور پسینے میں شرابور لوگوں کے گروہ با آواز بلند باتیں کرتے اپنی اپنی مصروفیات میں مشغول تھے۔ سگنل پر گاڑی رکی تو اس کی نظریں منظر پر جم کر رہ گئیں۔

فٹ پاتھ کنارے ایک اونچی سی عمارت کے سائے میں چار کھدائی کرنے والے مزدور پتھروں پر بیٹھے کھانا کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک سفید بالوں والا بوڑھا بڑی احتیاط سے روٹی کے برابر کے حصے کر رہا تھا۔

اس کے قریب ہی تپتے ہوئے پتھروں پر ایک بے حد سیاہ بالوں والا تنومند نوجوان ٹانگیں پسارے پڑا تھا۔ اس نوجوان کو شاید کھانے میں دلچسپی نہیں تھی۔

مگر وہ بوڑھا شخص جو اس نوجوان کا باپ تھا، محبت و شفقت سے روٹی کا ٹکڑا اصرار سے اس نوجوان کو کھلا رہا تھا۔ مگر اس نوجوان کے انداز میں بے رخی تھی اور وہ نفی میں گردن ہلاتا مسلسل انکار کر رہا تھا۔ بوڑھے نے روٹی رکھ کر پانی کا گلاس اٹھالیا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ شاید اسے بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔ اس نے رک کر دوبارہ نوجوان کو دیکھا۔ پھر نوالہ بنا کر ایک شگفتہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ نوالہ نوجوان کی طرف بڑھایا جسے نوجوان نے جھٹک دیا۔ بوڑھے کے سخت چہرے پر جس پر گہری گہری جھریاں پڑی تھیں سایہ سا گزر گیا۔

سگنل کھلنے پر گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔ مگر اس منظر نے بہت سی یادوں کے در وا کر دیے۔ گاڑی خاصی آگے آچکی تھی اور وہ منظر دھیرے دھیرے معدوم ہو گیا لیکن اس کی تاثر انگیزی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ گاڑی چلتی رہتی ہے، منظر بدلتے رہتے ہیں لیکن کچھ منظر ایسے ہوتے ہیں جو ذہن و دل پر ہی نہیں روح پر نقش ہو جاتے ہیں۔ گاڑی تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہی تھی اسی تیزی سے اس کے ذہن میں مناظر تبدیل ہو رہے تھے، بہت سے سائے لہرا رہے تھے۔ بہت سے عکس ڈوب اور ابھر رہے تھے۔ پھر ایک خفیف سے جھٹکے کے ساتھ تمام مناظر جیسے یک لخت ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ گاڑی تب عالی شان بلڈنگ کے سائے میں جا کر رکی تھی اور ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے اتر رہا تھا۔

اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ونڈ اسکرین سے باہر نظریں دوڑائیں۔ بلند و بالا عمارت کی پیشانی پر "فرزان اینڈ کمپنی" کا نام سجا ہوا تھا۔ ہلکے سے کھٹکے کی آواز بلند ہونے پر فرزان نے واپسی کا سفر طے کیا اور اس کی تیرتی ہوئی چشم نظارہ ڈرائیور پر جا ٹھہری جو گاڑی کا دروازہ کھولے مؤدب کھڑا تھا۔ وہ شان بے نیازی کے ساتھ گاڑی سے باہر نکلا اور عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی اس نے دوسرا ہی قدم اٹھایا تھا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے وجود سے کوئی توپ کا گولہ آ ٹکرایا۔ وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی پشت گاڑی کے ساتھ جا لگی۔ اس نے گاڑی کا سہارا لے کر سنبھلتے ہوئے اس دھماکے کی وجوہات جاننے کے لیے نظریں اٹھائیں تو اس کی آنکھوں نے عجیب ماجرا دیکھا۔

پرانے کپڑے، جھاڑ جھنکاڑ اور گرد آلود بال، بے ترتیب الجھی ہوئی داڑھی، منہ سے بہتی ہوئی رال اور ہاتھ میں سی کسی درخت کی مڑی تڑی شاخ تھامے، اچھلتا کودتا اور ناچتا ہوا وہ وجود اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ وہی دیوانہ فقیر تھا جو اس سے پہلے فریال کے گھر کے سامنے بنے پارک میں بھی اس کو زچ کر چکا تھا۔

فرزان عالم حیرت میں یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے لیے یہ بات شدید حیرت کا باعث تھی کہ یہ دیوانہ ملنگ یہاں کیسے آن پہنچا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں کئی خیالات تھے جو اس کے ذہن میں لہرا کر رہ گئے۔ دوسری مرتبہ اس شخص کا اس تک پہنچنا ایک اتفاقی امر ہے یا یہ معاملہ اپنے اندر کچھ گہری حقیقتیں چھپائے ہوئے ہے۔

بے ترتیب بالوں اور پھٹے پرانے لباس والا وہ شخص بے ڈھنگے انداز میں ناچ رہا تھا۔ پھر شاید ڈرائیور ہی کو ہوش آیا وہ ایک جھرجھری سی لے کر آگے بڑھا اور اپنی فرض شناسی کو آواز دیتے ہوئے اس فقیر نما شخص کو دھکیلتے ہوئے بولا۔

"اے پاگل! چل یہاں سے نکل۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے آجاتے ہیں منہ اٹھا کر۔"

لیکن دوسرا ہی لمحہ جہاں ڈرائیور کے لیے چودہ طبق روشن کر دینے والا تھا وہیں فرزان کے لیے بھی حیرت انگیز تھا۔ فقیر نما شخص ناچتے ناچتے یک لخت رک گیا اور پھر اس کے جسم میں ارتعاش سا پیدا ہوا اور ڈرائیور اچھل کر کئی فٹ پیچھے یوں جا گرا جیسے اس کے ہاتھ اس مجذوب صورت انسان کے وجود سے نہیں بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گئے ہوں۔

اب وہ پلٹ کر فرزان کو اپنی قہر بار نظروں سے گھور رہا تھا۔ پھر جب وہ بولا تو کڑک دار آواز کے

ساتھ ساتھ تھوک کی چھینٹیں بھی برآمد ہوئیں۔

"کیڑوں کی فوج جمع کر لی۔۔۔ اندھوں میں کانا راجہ بنا بیٹھا ہے۔۔۔ جب طوفان آتا ہے تو کیڑے مکوڑے سب اڑ جاتے ہیں۔۔۔ پر ٹوٹ جاتے ہیں۔ کوئی کہیں جا کر گرتا ہے تو کوئی کہیں۔۔۔ پھر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔۔۔ ابھی بھی جاگ جا۔۔۔ ہوش میں آجا۔۔۔ کب تک بے ہوش رہے گا۔۔۔ تیری دنیا یہ نہیں ہے۔۔۔ بلاوا تو کہیں اور سے آرہا ہے۔۔۔ جانتا ہے کہاں سے۔۔۔؟"

پھر وہ رازدارانہ انداز میں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر شش کی آواز نکالتے ہوئے لپک کر فرزان کے قریب آگیا۔

"تیرا بلاوا وہیں سے ہے جہاں سے میرا بلاوا ہے۔ جہاں سے سب کو بلاوا آتا ہے۔۔۔ سنبھل جا۔۔۔ لبیک بول دے۔۔۔ نہیں تو پچھتائے گا۔۔۔"

فرزان نے اس کے جسم سے اٹھتی بدبو سے گھبرا کر ناک پر ہاتھ رکھا اور پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ کیوں کہ اس کی پشت پہلے ہی گاڑی سے ٹکرا رہی تھی۔ مجذوب نے اس کی یہ اضطراری حرکت دیکھی تو اس کا حلق پھاڑ قہقہہ بلند ہوا۔

"ہاہاہاہا۔۔۔۔" اور پھر وہ بے ڈھنگے پن سے ہنستا ہی چلا گیا۔ لیکن پھر یک لخت یوں خاموش ہو گیا جیسے کھلونے کی چابی ختم ہو گئی ہو۔

اب وہ اپنی لال انگارہ آنکھوں کے ساتھ فرزانہ کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ فرزان نے گھبرا کر نظریں چرانے کی کوشش کی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ سرخ انگارہ آنکھیں اس کے اندر کی گہرائیوں میں اترتی چلی جا رہی ہوں اور وہ اسے پرت در پرت پڑھ رہا ہو۔ اسے اپنا ڈگمگاتا وجود پاتال کی گہرائیوں میں گرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے فقیر کی آواز بلند ہوئی۔

"بھاگنا چاہتا ہے؟ بھاگ کر کہاں جائے گا؟ اس سے کون بھاگ سکتا ہے آگے کنواں، پیچھے کھائی۔۔۔" اور پھر وہ آگے کنواں پیچھے کھائی، آگے کنواں پیچھے کھائی کی گردان کرتے ہوئے دوبارا سے ایک دائرے کی صورت میں رقص کرنے لگا۔ فضا میں چاروں طرف اس کی گونجیلی آواز لہریں لیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

آگے کنواں پیچھے کھائی
آگے کنواں پیچھے کھائی

اور پھر حسب سابق ناچتے ناچتے یک دم اس نے ایک جانب دوڑ لگا دی اور کچھ ہی لمحوں کے بعد اس کا وجود فرزان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ فرزان حیرت سے آنکھیں پھاڑے ابھی تک اسی سمت دیکھے جا رہا تھا جدھر وہ بوسیدہ حال فقیر بگٹٹ دوڑتا ہوا غائب ہو گیا تھا۔ پتا نہیں وہ اور کتنی دیر اسی طرح غائب دماغی کی حالت میں کھڑا رہتا لیکن سنائی دینے والی ایک آواز اسے ہوش کی وادیوں میں گھسیٹ لائی۔ باوردی ڈرائیور کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کر فرزان کے قریب پہنچتے ہوئے بولا تھا۔

"پاگل تھا سالا۔۔۔"

☆☆☆

اذان دونوں ہاتھ گردن کے نیچے جمائے بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر خاموش لیٹا چھت کی جانب نگران تھا۔ اس کے دماغ میں بہت سے خیالات کے تانے بانے تھے جن کو وہ سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں موجود تھا رات کے تقریباً ایک یا ڈیڑھ بجے کا وقت رہا ہو گا۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی اور ایسے عالم میں اس کے دل کی دھڑکنوں کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ چہرے سے پریشانی۔۔۔۔ تھی اور وہ بہت زیادہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ کوئی پھانس تھی جو کہیں اٹکی ہوئی تھی۔ کوئی ایسی الجھن تھی جو حل نہیں ہو رہی تھی۔

لیٹے لیٹے کافی وقت گزر گیا تو اس کے جسم میں حرکت کے آثار نمودار ہوئے۔ اب وہ کسلمندی سے اٹھ بیٹھا تھا۔ خالی خالی نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد اس نے موبائل اٹھایا پھر کچھ سوچ کر

جیب تھپتھپانے لگا۔ شاید ہو کسی نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ فرنٹ پاکٹ میں داخل کیا اور جب وہ ہاتھ جیب سے نمودار ہوا تو اس کے ہاتھ میں ماہم کی سم دبی ہوئی تھی۔ چند لمحوں تک وہ سم کی جانب پرخیال نظروں سے دیکھتا رہا پھر اپنا موبائل کھولنے لگا۔ بیٹری نکالنے کے بعد اس نے سم بھی باہر نکال لی۔ اب وہ موبائل کے اندر ماہم کی سم لگا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ موبائل آن کر کے ایک مرتبہ پھر کونٹیکٹ لسٹ کھنگال رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر آڑی ترچھی لکیروں کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ جو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ شدید ذہنی کشمکش کا شکار ہے۔ اب وہ ہونٹ سکوڑے موبائل اسکرین کو گھور رہا تھا۔ اس پر فاروق کا نام جگمگا رہا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے نمبر ملایا اور موبائل کان سے لگا لیا۔

سنائی دینے والی بیل کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تو پیشانی پر بکھری شکنوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

ایک بیل۔۔۔

دوسری بیل۔۔۔

اور پھر تیسری بیل کے بعد اس نے سلسلہ منقطع کر کے موبائل ایک جانب اچھال دیا۔ اب وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا اپنی کنپٹیاں دبا رہا تھا۔

کوئی ایسی بات تھی ضرور جو اسے بے چین کیے دے رہی تھی۔ لیکن شاید اس کا کوئی مناسب حل اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحے وہ اسی انداز میں بیٹھا رہا۔ لیکن سنائی دینے والی آواز پر اسے چونک کر موبائل فون کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔

''ایکسکیوز می باس! یو ہیو آ ٹیکسٹ میسج۔''

میسج ٹون سنائی دینے پر اسے سوچوں کے صحراؤں سے واپس پلٹ کر موبائل فون اٹھانا ہی پڑا۔ لیکن اسکرین پر دکھائی دینے والا نام شاید اس کی توقع کے خلاف تھا۔

اس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ گئے۔

میسج فاروق ملک کا تھا۔ اس نے بے صبری سے میسج اوپن کیا اور عبارت پر نظریں دوڑانے لگا، لکھا تھا۔

''اگر تڑپا ہی دیا ہے تو تمہیں محمد (ﷺ) کا واسطہ ایک بار مجھ سے بات کر لو۔''

ابھی وہ میسج کے بارے میں سوچ بچار ہی کر رہا تھا کہ موبائل فون مسلسل چلانے لگا اور اسکرین پر فاروق۔۔۔ کا نام جگمگا اٹھا۔ اذان نے پریشانی سے موبائل کی جانب دیکھا اور پھر اسے بیڈ پر ایک جانب ڈال دیا۔ شاید اسے فاروق ملک کی جانب سے ایسے کوئیک رسپانس کی توقع نہ تھی۔

رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا اور شاید اذان کی طرح وہ بھی جاگ رہا تھا کہ ماہم کے نمبر سے مس کال جاتے ہی پہلے میسج اور پھر کال آنا شروع ہو گئی تھی۔

موبائل کا چیخنا ختم ہوا تو اس نے سکون کی سانس لی۔ لیکن اس کا یہ سکون زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکا کیوں کہ کال ایک مرتبہ پھر آ رہی تھی۔ اس نے ہیش کی پریس کر کے موبائل کو سائلنٹ کر دیا لیکن کال کرنے والا بھی شاید قسم کھائے بیٹھا تھا کہ جب تک ریسیو نہ ہو وہ فون کرتا ہی رہے گا۔

وہ بار بار کال کرتا رہا اور اذان کے چہرے کے تاثرات یکے بعد دیگرے تبدیل ہوتے رہے۔ آخر کار اذان نے کال اٹینڈ کرنے کا فیصلہ کیا اور موبائل کا گرین بٹن پش کرتے ہوئے موبائل کان سے لگا لیا اور اس کی آواز بلند ہوئی۔

''ہیلو۔'' لیکن دوسری جانب خاموشی چھائی رہی۔ اذان نے ایک مرتبہ پھر ہیلو کی صدا بلند کی تو دوسری جانب سے ایک دبنگ مردانہ آواز سنائی دی۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون بات کر رہے ہیں۔''

اور وہ سوال سن کر اذان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

شاید اس کی کسی مخصوص حس کی تسکین ہوئی تھی۔ پھر اذان کی آواز سنائی دی۔

''اتنے نا سمجھ تو نہیں ہیں آپ فاروق ملک صاحب! میرے خیال میں تو میری آواز سنتے ہی آپ کو سمجھ جانا چاہیے تھا کہ اس نمبر پر ماہم کے علاوہ اور کس کی آواز سنائی دے سکتی ہے۔'' دوسری جانب سے ایک ٹھنڈی سانس بھرنے کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک یاسیت انگیز لہجے میں کہا گیا۔

''اوہ۔۔۔! اذان صاحب! واقعی شاید اتنی جلدی مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ اور سنائیں کیسے ہیں آپ؟ اور کیا مصروفیات چل رہی ہیں؟'' ''صرف شعر ہی لکھتے ہیں یا کچھ اور کام بھی کرتے ہیں۔'' اس کا جملہ مکمل ہونے پر چند لمحوں کے لیے اذان خاموش ہو گیا۔ پھر وہ نپے تلے لہجے میں بولنے لگا۔

''مسٹر فاروق فلک! میں جو کچھ بھی کرتا ہوں میرے علاوہ ماہم کو بھی پتا ہے اور اس پورے شہر کو بھی۔ لیکن یہاں پر تو کچھ پردہ نشین ہستیاں ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں کسی کو یہ پتا ہی نہیں ہوتا کہ وہ کس وقت کہاں ہوتے ہیں اور ان کا اصل دھندا کیا ہے۔''

اذان کی بات مکمل ہوئی تو دوسری جانب سے ایک جان دار قہقہہ بلند ہوا۔ کچھ دیر کے بعد ایک مسکراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''بہت خوب! اذان صاحب مزا آ گیا۔ لیکن ایک بات واضح کر دوں کہ اگر آپ گہرا طنز کرنے کا ہنر جانتے ہیں تو ہمیں بھی سمجھنے کا سلیقہ آتا ہے۔''

اذان کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں بھی اسی طنز کی آمیزش تھی۔

''جی آپ صحیح کہہ رہے ہیں آپ کی سلیقہ مندی کے تو ہم بھی قائل ہو گئے ہیں۔''

دوسری جانب سے پھر ہنسنے کی آواز آئی۔ پھر اس کے بعد وہ گویا ہوا۔

''چھوڑو یار یہ باتیں اچھا ہوا کہ میری آپ سے بات ہو گئی اذان صاحب! میں آپ سے یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ ماہم بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ قسمت والے ہیں کہ اس نے آپ کا انتخاب کیا۔ میں بس آپ سے ایک ہی درخواست کروں گا کہ اس کا بہت خیال رکھیے گا اور کبھی اس کا دل مت دکھائیے گا۔

اذان کے ہونٹ بھنچ گئے۔ پھر وہ سخت لہجے میں بولا۔

''مسٹر فاروق! مجھے کیا کرنا ہے اس کے لیے مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ کس سے کیا تعلق رکھنا ہے اور اس تعلق کو نبھانا کیسے ہے یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ آپ اس بات کو چھوڑیں۔ آپ مجھے صرف یہ بتائیں کہ آپ میرے علم کے مطابق خاصے پڑھے لکھے واقع ہوئے ہیں پھر جو کچھ آپ کے بارے میں کچھ اور لوگوں سے سنا ہے اس نے مجھے خاصا حیرت زدہ کیا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کا تعلق زمین دار فیملی سے ہے اور یہ بھی پتا چلا کہ آپ نے ایم اے کیا ہوا ہے لیکن کسی دوسری جگہ سے مجھے یہ پتا چلتا ہے کہ آپ روتے کرلاتے اور بسورتے ہوئے ایک ڈھابا ہوٹل میں جاتے ہیں اور جھوٹ بول کر دو تین ہزار کا موبائل ہتھیاتے ہیں۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔''

اذان کی بات ختم ہوئی تو دوسری جانب سے ایک جھنجھلاتا ہوا قہقہہ بلند ہوا۔ پھر فاروق ملک کی آواز سنائی دی۔

''فاروق ملک کو سمجھنا ہر کسی کے بس کی بات بھی نہیں ہے اور آپ کیا سمجھتے ہیں کہ فاروق ملک بہ نفس نفیس ڈھابا ہوٹل قدم رنجہ فرمائیں گے اور پھر موبائل بھی ہتھیائیں گے۔ آپ ان باتوں پر سوچ بچار کر کے اپنے چھوٹے سے ذہن کو مت تھکائیں۔ آپ کی تسلی کے لیے بتا دیتا ہوں کہ ایسے چھوٹے موٹے کام میرے چھوٹے موٹے ہرکارے سرانجام دیتے ہیں میرے اتنے برے دن نہیں آئے۔''

اذان کے ہونٹوں پر پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اوہ تو آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ باقاعدہ کسی گروہ کو لیڈ کر رہے ہیں۔''

دوسری جانب سے فوراً ہی سنائی دی جانے والی

آواز نے اذان کی بات کی تائید کر دی۔

"آپ درست سمجھے اذان فیضی صاحب! صرف گروہ ہی نہیں فاروق ملک اور کیا کیا کرتا ہے آپ تصور ہی نہیں کر سکتے۔ کہاں ٹارگٹ کلنگ ہوئی، کہاں بم بلاسٹ ہوگا اور کتنے لوگ مریں گے اس کا فیصلہ پس پردہ رہتے ہوئے اکثر اوقات کار آپ کا یہ خاکسار کرتا ہے۔ لیکن اب میں اس زندگی سے ویسے ہی کنارہ کش ہو رہا ہوں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں کینسر کی لاسٹ اسٹیج پر ہوں اور اس وقت بھی آغا خان ہاسپٹل کراچی میں ایڈمٹ ہوں۔۔۔ ایک منٹ ہولڈ کیجیے گا۔ دوسرے مریض ڈسٹرب ہو رہے ہیں میں ذرا چھت پر جاتا ہوں پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ہلکی ہلکی کھٹ پٹ کے علاوہ اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ تقریباً تیس سے چالیس سیکنڈ کے بعد فاروق ملک کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔

"جی تو اذان فیضی صاحب! ہم کہاں پر تھے۔"

فاروق ملک کے سوال پر اذان ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔

"مسٹر فاروق ملک! آپ کینسر کی آخری اسٹیج پر ہیں، آغا خان جیسے عظیم الشان اسپتال میں زیر علاج ہیں اور وارڈ سے چھت تک پہنچنے کے لیے آپ کو صرف چالیس سیکنڈ کا وقفہ درکار ہوتا ہے۔ یہ کیسا کینسر ہے بھائی!"

دوسری جانب چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر فاروق ملک قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔

"خاصے ذہین ہیں آپ اذان صاحب! بہر حال آپ کے اندازے اپنی جگہ میں یہ ہی درخواست کر سکتا ہوں کہ فاروق ملک کے بارے میں زیادہ باریکیوں میں جانے کی کوشش نہیں کریں۔ اسپتال میں ہوں یا چھت پر، آغا خان میں ہوں یا ۔۔۔ میں۔ کراچی میں ہوں یا لاہور میں۔ اس کا سراغ تو آج تک اس ملک کی ایجنسیاں نہیں لگا سکیں تو آپ اس فکر میں کیوں ویلے ہو رہے ہیں۔ یہ آپ کے بس کا کام نہیں ہے۔" اس کی بات سن کر اذان ہتھے سے اکھڑ گیا۔

پھر وہ تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"اچھی طرح جانتا ہوں فاروق ملک کہ تم ایک جعلساز اور بہروپیے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ تم ایک جھوٹ اور فراڈ شخص ہو۔ انہی لچھے دار باتوں سے تم ماہم جیسی لڑکیوں کے سامنے تو اپنے آپ کو زمین دار فیملی کا چشم و چراغ اور ویل ایجوکیٹڈ پرسن ثابت کر سکتے ہو۔ ایسی سادہ دل لڑکیاں شاید تمہیں پرائم منسٹر بھی تسلیم کر لیں لیکن میرا نام اذان فیضی ہے۔ اس ملک کی ایجنسیاں تمہیں ڈھونڈ سکیں یا نہ ڈھونڈ سکیں اگر اذان کو چیلنج کرو گے تو وہ تمہیں ہر اس بل میں سے گھسیٹ کر باہر لے آئے گا جہاں تم چھپ کر بیٹھو گے۔ ٹیلی فون پر تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ ہوتا ہے۔ بندہ اپنے آپ کو کچھ بھی ثابت کر دیتا ہے لیکن میں لفظوں کے اندر چھپی حقیقتوں کا سراغ لگانا اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ میں لہجوں کی بناوٹ سے شخصیت کی عکاسی کر لیتا ہوں۔ اتنا بڑا گینگسٹر ٹکے ٹکے کے موبائل نہیں ہتھیاتا پھرتا۔ کینسر کے مریض بن کر تم ماہم کی ہمدردیاں تو بھلے حاصل کر لو لیکن تمہاری اندرونی خباثت کا اندازہ لگا چکا ہوں۔"

دوسری جانب سے گھن گرج سے بھرپور ایک اور قہقہہ سنائی دیا پھر اس کی تاؤ دلاتی آواز بلند ہوئی۔

"بہت جلد اوقات پر آ گئے مسٹر اذان فیضی صاحب! چلو اچھا ہے مجھے بھی آپ جناب سے بڑی چڑ محسوس ہو رہی تھی۔ اب کھل کر دونوں بات کرتے ہیں مزا آئے گا۔"

☆☆☆

(باقی آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں)

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

اللہ سے حیا کرنے کا حق

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اللہ سے حیا کرو جیسی اس سے کرنی چاہیے۔" "صحابہ نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم الحمد للہ' ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ نہیں' بلکہ جو اللہ سے ایسی حیا کرتا ہے جیسی کرنی چاہیے' اسے چاہیے کہ سر اور ذہن میں جو افکار و خیالات ہیں ان سب کی نگہداشت کرے اور پیٹ کی اور جو کچھ اس میں بھرا ہوا ہے ان سب کی نگرانی کرے (برے خیالات سے دماغ کی اور حرام و ناجائز غذا سے پیٹ کی حفاظت کرے) موت کو اور موت کے بعد قبر میں جو حالت ہونی ہے وہ یاد رکھے۔ جو آخرت کو چاہتا ہے وہ دنیا کی زیب و زینت کو ترک کر دیتا ہے۔ تو جس نے ایسا کر لیا اس نے اللہ سے حیا کا حق ادا کر دیا۔" (مشکوۃ)

جویریہ عمیر ۔۔۔ لاہور

قبر کی ہولناکی

چوتھی صدی ہجری کے مشہور ادیب اور عالم دین "علامہ بدیع الزماں" کی موت کا حال احمد بن محمد بن ابو بکر خاکان اپنی کتاب "وفیات الاعیان" میں تحریر فرماتے ہیں۔ علامہ بدیع الزماں شدید بیمار ہوئے اور اس بیماری کے دوران آپ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اعزہ و اقربا نے جب دیکھا تو وہ یہ سمجھے کہ آپ وفات پا گئے ہیں۔ لہٰذا ان کی تجہیز و تکفین کر دی گئی۔ تدفین کے فوری بعد آپ ہوش میں آ گئے اور زور سے چیخے' شرکائے جنازہ قبر کی جانب آواز سن کر لپکے اور قبر کو دوبارہ کھولا۔ تو محققین نے منظر دیکھا کہ آپ اپنی داڑھی پکڑے ہوئے ہیں اور قبر کی ہولناکی کی وجہ سے انتقال فرما چکے ہیں۔

راحت دلشاد ۔۔۔ کراچی

محبت کہیں جسے

☆ محبت کے مسافر راستے میں نفرت کا پڑاؤ نہیں ڈالتے۔

☆ دعائیں مانگو مگر کبھی بھی محبت میں کامیابی کی دعا مت مانگنا' ورنہ تمہیں محبت سے نفرت ہو جائے گی اور جب وہ تمہارے پاس پہنچے گی تو اپنی قدر کھو دے گی۔

☆ محبت نہ ملے تو انسان جی لیتا ہے لیکن جسے وہ محبت سمجھتا ہے اگر وہی شخص آپ کا مان نہ رکھے تو وہ ایسے ٹوٹتا ہے کہ پھر ریزے بھی نہیں ملتے۔

☆ محبت دل کے صحرا میں اک سرسبز و شاداب قلعہ ہے' جہاں فکر کے قافلے نہیں پہنچ سکتے۔

☆ محبت تو پتوں کی سائیں سائیں کی طرح ہوتی ہے نہ دکھائی دیتی ہے' نہ پکڑ میں آتی ہے۔ بس حصار میں لے لیتی ہے۔

☆ کبھی محبت نہ کرنے کے مقابلے میں محبت کر کے دھوکا کھا لینا بہتر ہے۔

ایمن زاہد ۔۔۔ کراچی

مینارہ نور

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمتہ اللہ علیہ درویشی سے پہلے ایک بہت بڑے ملک کے بادشاہ تھے لیکن اس وقت بھی رات دن سوچتے رہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے قریبی تعلق کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ ایک رات کو وہ

شاہی محل میں اپنے کمرے میں بستر پر آرام کر رہے تھے جبکہ چاروں طرف سپاہی پہرا دے رہے تھے۔ اچانک ان کی آنکھ کھل گئی۔ انہیں محل کی چھت پر لوگوں کے چلنے پھرنے کی آواز سنائی دی تو وہ اٹھ کر چھت پر گئے۔ وہاں انہوں نے نورانی شکلوں والے آدمی دیکھے۔ پوچھا "تم کون لوگ ہو اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟"

انہوں نے عاجزی سے گردنیں خم کر کے کہا۔ "اے بادشاہ! ہم اپنی گم شدہ اونٹنی کو تلاش کر رہے ہیں۔"

بادشاہ نے حیرت سے پوچھا۔ "اونٹنی بھلا شاہی محل کی چھت پر کیسے چڑھ سکتی ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "اے بادشاہ! اگر اونٹنی محل کی چھت پر نہیں چڑھ سکتی تو تو کیسے شاہی تخت پر بیٹھ کر خدا کو ڈھونڈ سکتا ہے؟"

بادشاہ نے یہ بات سنی تو اس نے فوراً ارادہ کر لیا کہ وہ تخت و تاج کو چھوڑ کر درویشی اختیار کرے گا کیونکہ تخت پر بیٹھ کر خدا اسے نہیں مل سکتا۔ اس کے لیے محنت شاقہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

حنا جیلانی..... ٹنڈو محمد خان

آتش اور سمندر

ریت گھروندے ابرو باد کی سازش اور سمندر
دونوں آمنے سامنے تھے کل آتش اور سمندر
کوئی مجھے تفصیل بتائے لہروں اور بوندوں کی
میں صحرا سے دیکھ رہا ہوں بارش اور سمندر
پیار بھرے دریا ، ساگر سے گہرے ہو جاتے ہیں
عشق بغیر نہیں ملتی گنجائش اور سمندر
(سلیم کوثر)

فوزیہ ثمر بٹ..... گجرات

میچنگ

ایک امریکی نے اپنے دوست سے پوچھا "سنا ہے تمہاری بیوی نے ڈیکوریشن میں ڈپلوما کیا ہوا ہے؟"

دوست نے جواب دیا "ہاں ٹھیک سنا ہے لیکن اب وہ مجھ سے طلاق لے رہی ہے" پہلے دوست نے حیرت سے پوچھا "وہ کیوں" دوسرے دوست نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"کیونکہ میں گھر کے فرنیچر اور پردوں سے میچ نہیں کرتا۔"

ارم کمال..... فیصل آباد

لفظ بولتے ہیں

○ نارسائی کی کوئی شکل ہوتی ہے نہ وجود یہ تو صرف ایک احساس کا نام ہے۔ جس دل سے اس کا گزر ہو۔ وہاں ایک کرب ناک خاموشی چھا جاتی ہے۔ سوز و غم میں ڈوبے دل میں ، مہکتی محبت کی خوشبو ، پھر بھی آس کا دامن نہیں چھوڑتی۔ آخر دم تک یہ جذبہ ثابت قدم رہتا ہے۔

○ زندگی کے کاسے میں سارے سکے اپنی مرضی کے نہیں گرتے۔ ہم کتنی ہی منتوں کے دیے جلا لیں وقت اپنی مرضی کی چال چلتا ہے۔ صرف تقدیر کے اشارے پر اور منت پوری نہ ہونے پر دل دیے کی مانند جلتا ہی چلا جاتا ہے۔

○ رویے موسموں کی طرح محسوس ہوتے ہیں ان سے نبٹنے کے لیے لہجوں کے لباس بدلنے پڑتے ہیں۔

ہانیہ عمران..... گجرات

دل درد کا دروازہ

دل درد کا دروازہ
ہر آن میں دے دستک احساس کوئی تازہ
دل درد کا دروازہ
ہر وقت نئی گھاتیں ، ہر لمحہ نئی باتیں
آزاد ہوئے پنچھی ، آباد ہوئیں راتیں
اس دشت کی وسعت کا کیا کیجیے اندازہ
آواز کا گلدستہ ، آباد ہوا رستہ
یہ شام کے ہاتھوں میں اک بھید بھرا رستہ
عمر کا رونا ہے اک خواب کا خمیازہ
دل درد کا دروازہ!"

امبر گل جھڈو..... سندھ

سمندر تلاش کر

آسانیوں سے پوچھ نہ منزل کا راستہ
اپنے سفر میں راہ کے پتھر تلاش کر
ذرے سے کائنات کی تفسیر پوچھ لے
قطرے کی وسعتوں میں سمندر تلاش کر

عاتکہ زبیری..... سندھ

لوگوں میں لگ کر اپنے آپ سے غافل نہ ہو جاؤ

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو یہ نصیحت فرمائی کہ لوگوں میں لگ کر اپنے آپ سے غافل نہ ہو جاؤ کیونکہ تم سے تمہارے بارے میں پوچھا جائے گا لوگوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا ادھر ادھر پھر کر دن نہ گزار دیا کرو وہ محفوظ کر لیا جائے گا جب تم سے کوئی برا کام ہو جائے تو اس کے فوراً بعد کوئی نیکی کا کام لیا کرو کیونکہ جس طرح نئی نیکی پرانے گناہ کو بہت جلد تلاش کرتی ہے اور اسے جلدی پا لیتی ہے اس طرح اس سے زیادہ جلدی تلاش کرنے والی کوئی چیز میں نے نہیں دیکھی۔

ام ایمان..... ڈیرہ غازی خان

شغل

مسز جانسن۔
"آپ کے شوہر کا دل پسند شغل کیا ہے؟"
مسز سمن۔
"لڑکیوں کا پیچھا کرنا۔"
مسز جانسن۔
"اس سے آپ کو پریشانی نہیں ہوتی؟"
مسز سمن۔
"نہیں کیونکہ کتے ہمیشہ کار کے پیچھے بھاگتے ہیں لیکن اگر وہ اسے پکڑ بھی لیں تو چلا نہیں سکتے۔"

گڑیا شاہ..... کہروڑ پکا

خیر

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔
"خیر کا یہ مطلب نہیں تمہارا مال اور اولاد بڑھا لو ، خیر کا مطلب یہ ہے کہ اپنا علم بڑھاو۔ اپنی بردباری میں عظمت پیدا کرو اور عبادت کر کے لوگوں میں برتری حاصل کرو۔ اگر اچھا کام کیا تو حمد رب کرو اور اگر برا کام کیا تو استغفار کرو۔

خیر دنیا میں صرف دو آدمیوں کے لیے ہے۔ ایک تو اس شخص کے لیے جو گناہ کرتا ہے اور اس کا تدارک توبہ کرتا ہے۔ دوسرے اس کے لیے جو نیک عمل میں جلدی کرتا ہے۔ جو عمل تقویٰ کے ساتھ کیا جائے وہ کم ہو بھی کیسے سکتا ہے۔

مہرین طارق ، کراچی

تو.....!

اب چراغاں کریں اشکوں سے
یا مناظر بجھے بجھے..... دیکھیں

اک طرف تو ہے اک طرف دل ہے
دل کی مانیں..... کہ اب تجھے دیکھیں

انیقہ انا..... چکوال

وقفہ نجات

ہوسٹس دو قسم کی ہوتی ہیں۔ "ارضی و سماوی" ارضی یعنی گراؤنڈ ہوسٹس نمازی شکل و صورت کی ہوتی ہیں۔ یعنی نماز پڑھیں نہ پڑھیں۔ پرہیزگار لگتی ہیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے دل نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے ، دنیا فانی معلوم ہوتی ہے اور ان کی صحبت میں ہوائی جہاز کی بجائے نزدیک ترین مسجد کی جانب

بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ سماوی ہوسٹس جہاز پر پائی جاتی ہیں اور ان کی تاثیر بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ان کی ہم سفری سے یادالٰہی میں تو نمایاں کمی آجاتی ہے' البتہ ان کی معطر سانسوں کے طفیل' ہوائی جہاز کی ایرکنڈیشنگ کے باوجود زندگی میں حرارت آتی ہے اور یہ چلتی پھرتی رہیں تو دنیا رہنے کے قابل معلوم ہوتی ہے۔ ان کی مہمان نوازی میں گھل کر جہاز کی فضا کو قطعی طور پر ایمان ربا بنا دیتی ہے' جس سے مسافروں اور مسافرات کے اپنے اپنے ارمان اور رومان تحت الشعور میں کروٹ لے کر اچانک جاگ اٹھتے ہیں۔ حتیٰ کہ بوڑھے اور بھاری بھرکم سینئر افسر بھی جو ریٹائرمنٹ کے دہانے پر کھڑے ہو کر آخری سرکاری دورے پر نکلے ہوتے ہیں' بار بار گھنٹی کا بٹن دباتے ہیں اور بار بار سنگتریاں طلب کرتے ہیں اور اس بہانے اپنی ہلکی پھلکی میزبانوں سے خوش وقت ہو کر اپنی ہم عصر اور ہم وزن بیگمات سے تیس ہزار فٹ کی بلندی پر وقفہ نجات مناتے ہیں' الغرض ارضی و سماوی ہوسٹسوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

(کرنل محمد خان کی کتاب "سلامت روی" سے اقتباس)

نسیم محمود الحسن۔۔۔ سعودی عرب

نصیحت

موسم یاد کا کوئی جھونکا اب جو گزرے تمہار خلوت سے
سوچ لینا ہمارے بارے میں پر ہمارا ملال مت کرنا

رتجگوں کی رتیں تو خیر یوں ہی آتی جاتی ہیں' پر یہ دھیان رہے
جاگنا بھی تو اس سلیقے سے اپنی آنکھوں کو لال مت کرنا
(خالد معین)

فوزیہ ثمروٹ۔۔۔ گجرات

جدائی کی ایک نظم

گو شب و روز
تیری یاد تیرے خواب سے آراستہ ہیں
پر میری جاں
فقط یاد سے کب شہر بسے
کب بھلا دشت سے کوئی خواب سے سراب ہوا
(آنکھوں کے پار چاند۔۔۔ فرحت عباس شاہ)

ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

افکار

○ جو قوم آزادی کی خاطر قربانیاں دینے کے لیے تیار ہو جاتی ہے وہ اپنے مقصد میں کبھی ناکام نہیں رہتی۔

○ بدترین ہے وہ شخص جو دو منہ رکھتا ہے' ایک منہ سے ایک کے پاس جاتا ہے اور دوسرے منہ سے دوسرے کے پاس جاتا ہے۔ جو فیصلے تلوار کی نوک سے نہیں لکھے جاتے' ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ پرانی لکڑی جلانے کے لیے' پرانے دوست اعتماد کے لیے اور پرانے مصنف مطالعہ کے لیے بہترین ہیں۔

☆ ☆

سانحہ ارتحال

ہماری مصنفین نفیسہ سعید اور حنا یاسمین کی والدہ قضائے الٰہی سے وفات پا گئیں۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

نفیسہ سعید اور حنا یاسمین کے لیے صدمہ بہت بڑا ہے۔ ادارہ کرن ان لوگوں کے دکھ میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

سیما شام' کی ڈائری میں تحریر

نصیر الدین نصیر کی غزل

میری زندگی تو فراق ہے وہ ازل سے دل میں مکیں سہی
وہ نگاہ شوق سے دور ہیں' رگ جاں سے لاکھ قریں سہی

ہمیں جان دینی ہے ایک دن' وہ کسی طرح وہ کہیں سہی
ہمیں آپ کھینچیے دار پر' جو نہیں کوئی' تو ہمیں سہی

سر طور ہو سر حشر ہو' ہمیں انتظار قبول ہے
وہ کبھی ملیں' وہ کہیں ملیں' وہ کبھی سہی' وہ کہیں سہی

نہ ہو ان پہ جو میرا بس نہیں' کہ یہ عاشقی ہے ہوس نہیں
میں انہی کا تھا میں انہی کا ہوں' وہ میرے نہیں تو نہیں سہی

جو ہو فیصلہ وہ سنائیے' اسے حشر پر نہ اٹھائیے
جو کریں گے آپ ستم وہاں وہ ابھی سہی وہ یہیں سہی

اسے دیکھنے کی جو لو لگی تو نصیر دیکھ ہی لیں گے ہم
وہ ہزار آنکھ سے دور ہو وہ ہزار پردہ نشیں سہی

ثناء بختاور' کی ڈائری میں تحریر

گلزار کی غزل

کھلی کتاب کے صفحے الٹتے رہتے ہیں
ہوا چلے نہ چلے' دن پلٹتے رہتے ہیں

بس ایک وحشت منزل ہے اور کچھ بھی نہیں
کہ چند سیڑھیاں چڑھتے اترتے رہتے ہیں

مجھے تو روز کسوٹی پر درد کستا ہے
کہ جاں سے جسم کے بخیے ادھڑتے رہتے ہیں

کبھی رکا نہیں کوئی مقام صحرا میں
کہ ٹیلے پاؤں تلے سے سرکتے رہتے ہیں

یہ روٹیاں ہیں' یہ سکے ہیں اور دائرے ہیں
یہ ایک دوجے کو دن بھر پکڑتے رہتے ہیں

بھرے ہیں رات کے ریزے کچھ ایسے آنکھوں میں
اجالا ہو تو ہم آنکھیں جھپکتے رہتے ہیں

ارم کمال' کی ڈائری میں تحریر

خلیل اللہ فاروقی کی نظم

سمجھوتا

خوشحال سے تم بھی لگتے ہو
یوں افسردہ تو ہم بھی نہیں
پر جاننے والے جانتے ہیں
خوش ہم بھی نہیں خوش تم بھی نہیں
تم اپنی خودی کے پہرے میں
اور دام غرور میں جکڑے ہوئے
ہم اپنے زعم کے نرغے میں
انا ہاتھ ہمارا پکڑے ہوئے
اک مدت سے غلطاں پیچاں
تم ربط و گریز کے دھاروں میں

ہم اپنے آپ سے الجھے ہوئے
پچھتاووں کے انگاروں میں
محصورِ تلاطم آج بھی ہو
گو تم نے کنارے ڈھونڈ لیے
طوفان سے سنبھلے ہم بھی نہیں
کہنے کو سہارے ڈھونڈ لیے

خاموشی سے تم ہم مہر بہ لب
جگ بیت گئے، اک بات کہے
سنو کھیل ادھورا چھوڑتے ہیں
بنا چال چلے بنا مات دیے
جو بھاگتے بھاگتے تھک جائیں
وہ سائے رک بھی سکتے ہیں
چلو توڑو قسم، اقرار کریں
ہم دونوں جھک بھی سکتے ہیں

صائمہ امتیاز ساہی، کی ڈائری میں تحریر

محسن نقوی کی غزل

شیشے کا سائباں تھا دغا دے گیا مجھے
وہ دھوپ میں سورج کی ردا دے گیا مجھے

مشکل سے اک چراغ جلایا تھا میں نے پر
آنچل سے اپنے سرد ہوا دے گیا مجھے

اب تو تمام عمر اذیت میں ہے جینا
اک بھول کی ایسی سزا دے گیا مجھے

میرا علاج میرا مسیحا نہ کر سکا
خالی ہاتھ اٹھا کے دعا دے گیا مجھے

اُس بے وفا کا یہ بھی احسان ہے محسنؔ
جاتے ہوئے وہ درسِ وفا دے گیا مجھے

خالدہ بشیر، کی ڈائری میں تحریر

خضر تمیمی کی نظم

مسلسل ربط یادوں کا
تصور کے
دریچوں میں
سدا اک شخص رہتا ہے
خفا اک شخص رہتا ہے
نجانے،
کیا ہوا اس کو
وہ کیوں ہم سے "رمیدہ ہے"
نہ ہونٹوں پر تبسم ہے
نہ آنکھوں میں شفق تارے
پتھرائی ہوئی نظریں
اور الجھن سے تھکا لہجہ
عجب وہ شخص ہے جس کو
نہ جینے کی تمنا ہے

نہ پانے کی کوئی حسرت
وہ جس کی آنکھ اشکوں کو
پلکوں میں چھپاتی ہے
مگر اس کی طبیعت میں اداسی لوٹ آتی ہے

انیقہ انا، کی ڈائری میں تحریر

ادا جعفری کی غزل

ہر اک حرف آرزو کو داستاں کیے ہوئے
زمانہ ہو گیا ہے ان کو مہماں کیے ہوئے

سرورِ عیش، تلخیٔ حیات نے بھلا دیا
دلِ حزیں ہے بے کسی کو ہجرِ جاں کیے ہوئے

کلی کلی کو گلستاں کیے ہوئے وہ آئیں گے
وہ آئیں گے کلی کلی کو گلستاں کیے ہوئے

سکونِ دل کی راتوں کو ان سے مانگ لوں
سکونِ دل کی راتوں کو بیکراں کیے ہوئے

وہ آئیں گے تو آئیں گے جنونِ شوق ابھارنے
وہ جائیں گے تو جائیں گے تباہیاں کیے ہوئے

میں ان کی بھی نگاہ سے چھپا کے ان کو دیکھ لوں
کہ ان سے بھی ہے آج رشکِ بدگماں کیے ہوئے

نمرہ اقراء، کی ڈائری میں تحریر

قتیل شفائی کی غزل

صدمہ تو ہے مجھے بھی کہ تجھ سے جدا ہوں میں
لیکن یہ سوچتا ہوں کہ اب تیرا کیا ہوں میں

بکھرا پڑا ہے تیرے ہی گھر میں ترا وجود
بے کار محفلوں میں تجھے ڈھونڈتا ہوں میں

میں خودکشی کے جرم کا کرتا ہوں اعتراف
اپنے بدن کی قبر میں کب سے گڑا ہوں میں

کس کس کا نام لاؤں زباں پر کہ تیرے ساتھ
ہر روز ایک شخص نیا دیکھتا ہوں میں

کیا جانے کس ادا سے لیا تو نے میرا نام
دنیا سمجھ رہی ہے کہ سب کچھ ترا ہوں میں

پہنچا جو تیرے در پہ تو محسوس یہ ہوا
لمبی سی اک قطار میں جیسے کھڑا ہوں میں

لے میرے تجربوں سے سبق، اے مرے رقیب
دو چار سال عمر میں تجھ سے بڑا ہوں میں

جاگا ہوا ضمیر وہ آئینہ ہے قتیلؔ
سونے سے پہلے روز جسے دیکھتا ہوں میں

سدرہ وزیر، کی ڈائری میں تحریر

رابعہ بصری کی نظم

اُسے کہنا،

شبِ تنہائی وہ جو بڑے سکھ میں ہے
اسے کہنا
کہ رات کا پہلا پہر ہے
اور ہم جاگتے ہیں
ہماری آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہے
ہمارے لب ابھی تک اس کے نغمے گنگناتے ہیں
ہمارا ذہن اب بھی اس کی باتیں سوچتا ہے
تو کبھی ہم ہنس دیتے ہیں
کبھی جی بھر کے روتے ہیں
شبِ تنہائی کی یخ بستہ ہواؤ
اسے کہنا
ہم اب بھی باوضو ہو کر تمہارا نام لیتے ہیں
اسے کہنا اپنا نقش دھو جائے
یا پھر اپنا ہو جائے

شگفتہ سلیمان

مجھے یہ شعر پسند ہے

نمرہ، اقراء ـــــــ کراچی
آرزو یہ ہے کہ ان کو ہر نظر دیکھا کریں
ہم ہی ان کے سامنے ہوں وہ جدھر دیکھا کریں
اک طرف ہو ساری دنیا اک طرف صورت تری
ہم تجھے دنیا سے ہو کر بے خبر دیکھا کریں

امبر گل ـــــــ جھڈو (سندھ)
ادب کی حد میں ہوں میں بے ادب نہیں ہوتا
تمہارا تذکرہ اب روز و شب نہیں ہوتا
کبھی کبھی تو چھلک پڑتی ہیں یونہی آنکھیں
اکثر اداس ہونے کا کوئی سبب نہیں ہوتا

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــ گجرات
آنکھوں میں کوئی خواب اترنے نہیں دیتا
یہ دل کہ مجھے چین سے مرنے نہیں دیتا
بچھڑے تو عجیب پیار جتاتا ہے خطوں میں
مل جائے تو پھر حد سے گزرنے نہیں دیتا

عتیقہ الصار ـــــــ اٹک
وفا کا ذکر بھی ہو گا، زمانے کو ہم بھی یاد آئیں گے
مگر طاقچوں میں رکھی بوسیدہ کتابوں کی طرح
میرے خواب تجھے جگائیں گے چاندنی بن کر
تیری یادیں تجھ پر برسیں گی چاندنی کی طرح

ندا، فضہ ـــــــ فیصل آباد
انداز کہ رنجیدہ ہوتے جاتے ہیں
اطوار کہ پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں
دیکھے کوئی چاہت کے کرشمے آ کر
ہم جیسے بھی سنجیدہ ہوتے جاتے ہیں

ارم کمال ـــــــ فیصل آباد
رات بھی، تیرا دھیان بھی، ہم بھی
چاند بھی، آسماں بھی، ہم بھی
ایک سچ، ایک جھوٹ، ایک واہمہ
وہ بھی، ان کا گمان بھی، ہم بھی

شفق راجپوت ـــــــ گوجرہ
ابھی سازش کا موسم ہے ابھی تم عشق مت کرنا
یہاں آندھی کا چرچا ہے ابھی تم ریت جیسے ہو

اقراء، ضوبیہ ـــــــ ڈلوال
میں نکل کر تیرے دام سے
نہ گروں گا اپنے مقام سے
میں جیوں گا تیرے بغیر بھی
مجھے زندگی کا شعور ہے

رانی ـــــــ کراچی
دل بھی آباد ہے اک شہر خموشاں کی طرح
ہر طرف لوگ، مگر عالم تنہائی ہے

ہانیہ عمران ـــــــ گجرات
کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر بات پہ رونا آیا
ہم تو سمجھے تھے کہ ہم بھول گئے ان کو
کیا ہوا آج یہ کس بات پہ رونا آیا

فائزہ اظہر ـــــــ خضدار
جہاں سوال کے بدلے سوال ہوتا ہے
وہیں محبتوں کا زوال ہوتا ہے
کسی کا بن کر رہنا ہنر ہی سہی
کسی کو اپنا بنانا بھی کمال ہوتا ہے

زاہدہ پروین ـــــــ سرگودھا
گرنے والے کو بھلا کون سہارا دیتا
شام کا وقت تھا ہر شخص کو گھر جانا تھا

آسیہ جاوید ـــــــ علی پور چٹھہ
جن پیڑوں پہ پرندوں کے گھر نہیں ہوتے
بلند جتنے بھی ہوں معتبر نہیں ہوتے

سیما حشام ـــــــ راولپنڈی
بس اک خواہش ہے کہ تجھے خود سے زیادہ چاہوں
میں رہوں نہ رہوں تجھے میری وفا یاد رہے

نادیہ ـــــــ گجرات
نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا
مڑ کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا

صبا ـــــــ گوجرہ
ساحل تھا جب قریب تو موجوں نے آ لیا
منظر وہ ڈوبنے کا کناروں سے پوچھیے

ثمینہ اکرم ـــــــ کراچی
چاک دل بھی کبھی سلتے ہوں گے
لوگ بچھڑے ہوئے ملتے ہوں گے
صبح زنداں میں بھی ہوتی ہو گی
پھول مقتل میں بھی کھلتے ہوں گے

صائمہ حبیبی ـــــــ کراچی
چھپائیں گے کہاں تک راز محفل شمع کے آنسو
کہے گی خاک پروانہ کہ پروانے پہ کیا گزری
مرا دل جانتا ہے دونوں منظر میں نے دیکھے ہیں
ترے آنے پہ کیا گزری ترے جانے پہ کیا گزری

ایم۔آر۔کے ـــــــ مظفر گڑھ
غم سے پھر غم کے سہارے جیتے
ہم سے پھر دوست ہمارے جیتے
حسن کی شرط لگا رکھی ہے
جو تیرا نام پکارے جیتے

سویٹی ـــــــ عبدالحکیم
میرے لفظوں سے نکل جائے اثر
کوئی خواہش جو تیرے بعد کروں

حمنہ، امامہ جٹ ـــــــ عبدالحکیم
تم کو اپنی مثال دیتی ہوں
عشق زندہ بھی چھوڑ دیتا ہے

عائشہ، تحریم ـــــــ گوجرہ
تیرے ہر رویے میں بدگمانیاں کیسی
جب تلک ہے دنیا میں اعتبار دنیا کر
جس نے زندگی دی ہے وہ بھی سوچتا ہو گا
زندگی کے بارے میں اس قدر نہ سوچا کر

آمنہ ناز محمد ـــــــ میرپور ساکرو
میں اس کو بھولنا چاہوں مگر بھلا نہ سکوں
وہ میری آنکھ کے پوشیدہ منظروں میں ہے

گل رعنا ـــــــ کراچی
پھر دل میں تری یاد کے منظر ہیں فروزاں
ایسے میں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے

فریال ـــــــ ڈیرہ غازی خان
جس کو معلوم نہیں منزل مقصود اپنی
کتنا بے کار ہے اس شخص کا چلتے رہنا
ہم نئے خواب بنیں گے نئے منظر لے کر
نئے سورج سے کہو روز نکلتے رہنا

کرن، بینش ـــــــ کراچی
دعا کا ٹوٹا ہوا حرف سرد آہ میں ہے
تری جدائی کا منظر ابھی نگاہ میں ہے
ترے بدلنے کے باوصف تجھ کو چاہا ہے
یہ اعتراف بھی شامل مرے گناہ میں ہے

صائمہ جہاں ـــــــ ٹنڈو آدم
تمہارے بعد ہر منظر مجھے بے رنگ لگتا ہے
یہ آنکھیں چھین لو یا اپنی بینائی مجھے دے دو

فرحت ـــــــ کراچی
لوگوں کی بے حسی کے مناظر ہیں چار سو
فرصت ملے تو چشم ندامت اٹھائیے

لائبہ، ایمن ـــــــ مظفر آباد
بادل جو گرجتے ہیں وہ برسا نہیں کرتے
محسن کبھی احسان کا چرچا نہیں کرتے
آنکھوں میں بسا لیتے ہیں روٹھے ہوئے منظر
جاتے ہوئے لوگوں کو پکارا نہیں کرتے

کہکشاں ـــــــ راولپنڈی
کس نے کھینچا مری تنہائی کا نقشہ عاصم
دشت اس شہر کے منظر میں کہاں سے آیا

عائشہ ـــــــ اسلام آباد
اگرچہ عمر گنوائی تھی سنگ تراشوں نے
اسے جو میں نے تراشا تو منظر اور تھا

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

سلاد کو اکثر ہمارے کھانوں کے ساتھ سائیڈ ڈش کے طور پر پیش کیا جاتا ہے' یہ ہلکی پھلکی اور غذائیت سے بھرپور ہوتی ہے جسم کو تازگی اور غذائیت دیتی ہے لفظ سلاد "سال" سے نکلا ہے لاطینی میں "سال" کا مطلب نمک (سالٹ) ہوتا ہے اور سلاد کا مطلب ہے نمک میں ڈوبا ہوا۔ اکثر سلاد پروٹین' وٹامنز اور منرلز پر مشتمل ہوتے ہیں اور خون میں الکلائن پیدا کرنے کا اچھا سبب بنتے ہیں "رائتہ" سلاد کی ہی ایک اور قسم ہے جو ہمارے تیز مصالحے دار اور روغنی کھانوں میں توازن پیدا کرتا ہے جیسا کہ تکہ' تندوری کباب' پلاؤ اور بریانی وغیرہ رائتہ دہی سے تیار ہوتا ہے اور بہت سادہ ہوتا ہے۔ بہت جلدی اور آسانی سے تیار ہو جاتا ہے' اکثر رائتہ میں پیاز' کھیرا' ٹماٹر' پودینہ' ہرا دھنیا ہری مرچ' نمک' کالی مرچ اور کالا نمک وغیرہ ڈالا جاتا ہے جبکہ کچھ لوگ اس میں باریک کٹی ہوئی سبزیاں بھی ڈالتے ہیں اور تازہ ہرا دھنیے سے سجا دیتے ہیں' رائتہ ٹھنڈا کر کے کھانے میں بھی مزا دیتا ہے۔

بند گوبھی کا رائتہ

اشیاء:

سخت بند گوبھی (چھوٹے سائز کی) ایک عدد
پیاز (باریک کٹی ہوئی) ایک عدد
سیب (باریک چھلا ہوا اور کٹا ہوا) ایک عدد
چند چیری ٹماٹو (آدھے کٹے ہوئے)
سرکہ یا عرق لیموں دو بڑے چمچے
تیل ایک بڑا چمچہ
شکر آدھا چھوٹا چمچہ
نمک حسب ذائقہ۔

ترکیب:

گوبھی کو باریک کاٹ لیں اس پر نمک چھڑک کر ایک گھنٹہ کے لیے پانی میں رکھ دیں ایک گھنٹہ کے بعد گوبھی کو نچوڑ کر پانی سے نکال لیں اور اسے پیاز کے ساتھ ملا کر ایک پلیٹ میں رکھ لیں' تیل' سرکہ اور شکر کو اچھی طرح پھینٹ کر انہیں گوبھی پر چھڑک دیں' اس پر سیب کے ٹکڑے اور پھر ٹماٹر پر رکھ کر چٹکی بھر نمک چھڑکیں اور استعمال کریں۔

مولی کا رائتہ

اشیاء:

مولی چھ عدد
دہی 250 گرام
لال مرچ پاؤڈر چھوٹا چمچہ
نمک حسب ذائقہ
سجاوٹ کے لیے دھنیے کے پتے (باریک کٹے ہوئے)

ترکیب:

مولی کو چھیل کر باریک باریک کاٹ لیں' اس پر نمک چھڑکیں اور دس منٹ کے لیے پانی میں رہنے دیں اس کے بعد اس میں سے پانی نتھار لیں' ایک پیالے میں دہی' نمک اور مرچ پاؤڈر کو اچھی طرح پھینٹ لیں' اس میں اب مولی کو شامل کر لیں اور فریزر میں رکھ دیں' اسے استعمال کرنے سے قبل اس پر دھنیا چھڑک لیں۔

بوندی رائتہ

اشیاء:

تیار بوندی 100 گرام
دہی 250 گرام
سجاوٹ کے لیے زیرہ (بھون کر پیس لیں) چوتھائی چمچہ
ہری مرچ 2 عدد (باریک کٹی ہوئی)
دھنیے کے پتے (باریک کٹے ہوئے)
نمک حسب ذائقہ۔

ترکیب:

دہی کو اچھی طرح پھینٹ لیں' اس میں پھر بوندی ملائیں اور اچھی طرح مکس کر لیں اب اس پر زیرہ چھڑک دیں ساتھ میں کٹی مرچ اور دھنیا چھڑک کر آخر میں نمک چھڑک دیں۔

مونگ پھلی کا رائتہ

اشیاء:

دہی 250 گرام
آلو ایک عدد (ابلا اور کٹا ہوا)
مونگ پھلی (بھنی ہوئی باریک) 2 بڑے چمچے
پسی ہوئی لال مرچ پاؤڈر آدھا چمچہ
سجاوٹ کے لیے دھنیے کے پتے (باریک کٹے ہوئے)
نمک حسب ذائقہ۔

ترکیب:

دہی کو اچھی طرح پھینٹ کر اس میں آلو' مونگ پھلی' مرچ اور نمک اچھی طرح مکس کر لیں' دھنیے کے پتے سے سجائیں اور پھر مہمانوں کو پیش کریں۔

لوکی کا رائتہ

اشیاء:

لوکی ایک عدد (درمیانے سائز کی)
دہی 250 گرام
ادرک لہسن ایک چھوٹا چمچہ
لال مرچ کا پیسٹ ایک چھوٹا چمچہ
تیل ایک چھوٹا چمچہ
نمک حسب ذائقہ۔

ترکیب:

لوکی کو تیل لگا کر اچھی طرح چولہے پر پکا لیں' بعد میں اس کے چھلکے اتار لیں اور ایک پیالے میں اسے بھوننے کی شکل میں کچل لیں بعد میں اس میں دہی اور ادرک لہسن کا پیسٹ ملا لیں اور نمک ملا کر اچھی طرح مکس کر کے مہمانوں کو پیش کریں۔

☼ ☼

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

نہلے پہ دہلا

عینی طفیل۔۔۔ کراچی

س - آپ بہت ہی اداس ہوں۔ ایسے میں آپ کو نہلے پہ دہلا مارنا پڑ جائے تو کیا آپ مار سکیں گے یا منہ پر بارہ بجا کر سوالات کی فائل ایڈیٹر کی میز پر رکھ کر یہ جا وہ جا؟

ج - جیسے تیسے کر کے نہلے پہ دہلا مارنے کی کوشش کر ہی رہے ہیں۔

خورشید جمال۔۔۔ کراچی

س - قرنی جان! جاتے جاتے بزم کا سارا حسن بھی لے گئے۔ آخر کیوں؟

ج - واپس تو آ گیا لیکن بزم کا حسن آتے آتے شاید دیر لگ جائے۔

سیما مقیم احمد۔۔۔ کراچی

س - آپ کو اس خوب صورت بزم میں میزبان بننے پر مبارکباد۔ امید ہے کہ ذوالقرنین صاحب کی طرح آپ بھی اس کو کامیابی سے چلانے کی کوشش کریں گی یا گے؟

ج - افسوس ہے کہ آپ کا سابق میزبان حاضر ہے، فرمائیے۔

فریدہ یاسمین۔۔۔ ملتان

س - نین یہ بتاؤ کہ کنوارے آدمی کو مکان کرائے پر کیوں نہیں ملتا؟

ج - اس لیے کہ آدمی کنوارا ہوتا ہے مکان نہیں۔

شہناز فیضی۔۔۔ کراچی

س - سویٹ سے بھیا جانی! آخر آپ کو کس حکیم نے افسانہ نگاری پر ستم ڈھانے کا مشورہ دیا تھا؟

ج - وہ بھی ایک مشہور افسانہ نگار تھے میری طرح۔

س - بھیا جانی آپ اپنے افسانے کے ہیرو کو اتنے سگریٹ کیوں پلواتے ہیں؟

ج - اس لیے کہ اب سگریٹ پینے سے ٹی بی نہیں ہوتی۔

مس شائستہ۔۔۔ نوڈیرو

س - نین بھیا! شاید آپ اب تک دلوں کے مہمانوں کے میزبان نہیں بنے۔ "کرن" میں کسی نے سوال کیا تھا آپ سے کہ دلوں کے مہمانوں اور گھر کے مہمانوں میں کیا فرق ہے؟ آپ نے جواب دیا۔ واپس چلے جاتے ہیں پھر آنے کے لیے۔ نین بھیا! یہ جواب تو بالکل غلط ہے۔ دلوں کے مہمان تو بہت سی خوشیاں لاتے ہیں اپنے ساتھ۔ جب جاتے ہیں تو بہت سی پریشانیاں دے جاتے ہیں۔

ج - پیارے بھیا عشق کی کتاب لکھ ڈالو۔ پیارے بھیا ہم بہنوں کو اس قسم کے لغو سوالات کے جواب دے ڈالو۔ بڑی آئی بہن کہیں کی۔

صائمہ شمس۔۔۔ رینالہ خورد

س - بھیا! آپ اپنی شادی پر اس محفل کی بہنوں کو (یعنی ہم کو) کیا تحفہ دیں گے؟

ج - محفل چھوڑنے کا مشورہ۔ اس سے بہتر تحفہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

حمیرا نازش حمی۔۔۔ راولپنڈی

س - آپ کہتے ہیں کہ اچھے اچھے سوالات بھیجا کریں اگر ہم اچھے سوالات بھیجیں تو آپ جواب ہی نہ دے سکیں گے۔ (دیکھا ہم کتنا خیال کرتے ہیں آپ کا؟)

ج - اس طرح کا خیال رکھنے پر شکریہ مگر اب اپنے شہر واپس بھی چلی جاؤ۔ کراچی میں ڈیرہ جما رکھا ہے تم نے تو۔

مس نقوی۔۔۔ فیصل آباد

س -

تم میں جو بات ہے وہ بات نہیں آئی ہے

کیا یہ تصویر کسی غیر سے کھنچوائی ہے

ج - جبھی تو بیڑہ غرق ہوا ہے تصویر کا۔

ثمن چوہان۔۔۔ ٹنڈو جام

س - گھر تو چلو بچو! ابا بیٹ لیے انتظار کر رہے ہیں موٹی فرنٹن کے ساتھ تمہارا حسین و جمیل فوٹو دیکھ کر۔

ج - وہ تو بعد کی بات ہے تمہیں کیوں جلن ہونے لگی۔

رضوانہ ضمیر خان۔۔۔ ساہیوال

س - لوگ دور جا کے بھلا کیوں دیتے ہیں؟

ج - آپ تو دور کی بات کرتی ہیں ہمیں تو قریب کا تجربہ ہے۔

نوڈانس۔۔۔ گوجرانوالہ

س - بھیا جی! انسان کس چیز کو اپنائے تو وہ عظیم بنتا ہے؟

ج - انسانیت کو۔

س - قرنی بھیا! انسان کی عظمت کس چیز میں پوشیدہ ہے؟

ج - اس کی نیک نیتی میں۔

گل نسرین۔۔۔ شاہ کوٹ

س - مجنوں کی جگہ آپ ہوتے تو؟

ج - نہ نہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

مس یوسف۔۔۔ سیالکوٹ

س - ذوالقرنین بھائی! آپ اس قدر مغرور کیوں ہیں؟

ج - دور سے ایسے ہی لگتے ہیں مس یوسف۔

سحر نسیم۔۔۔ کراچی

س - نین جی! سنا ہے آپ گھاس بھی کھاتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

ج - کھلاتے بھی ہیں کبھی کبھی، یہ بھی درست ہے۔

سدرہ نرگس زار۔۔۔ ڈیرہ غازی خان

س - بھیا! بھلا اس قدر سندر، پیارا اور خوب صورت ناولٹ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب جلدی سے صدقہ اتار دیں ایسا نہ ہو کسی دشمن کی نظر لگ جائے۔

ج - ہم نے دوست ہی نہیں بنائے تو دشمن کہاں سے لائیں۔ ویسے اتار دیتے ہیں صدقہ۔

☼ ☼

ماڈل	مریم
ٹرانسپیرنسی	موسیٰ رضا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر

حسن و صحت

ادارہ

مختلف ماسک کے ذریعے چہرہ شفاف بنائیں

جلد کی حفاظت کے لیے پھلوں اور سبزیوں کی مدد سے آپ خود گھر پر ہی ماسک اور کریم تیار کریں۔

"ٹی وی ماڈل کی اسکن اتنی فریش کیسے رہتی ہے یا اس اداکارہ کا چہرہ اتنا پیارا کیسے لگتا ہے؟" یہ سوال اکثر ہمارے ذہنوں میں اٹھتا ہے اور ہم یہ سوچ کر احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں حالانکہ اگر ہم شروع ہی سے اپنی کیئر کرتے رہیں تو ویسی نہیں تو بہت بہتر کنڈیشن میں ہم اپنی اسکن کو رکھ سکتے ہیں، بہت ساری خواتین اپنی جلد کے معاملے میں بے پروا ہو جاتی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی جلد اپنی خوب صورتی اور دلکشی کھو دیتی ہے اس کی وجہ یہاں کا موسم، سورج کی تپش اور گرمی بھی ہے یہ ہی وجہ ہے کہ ان کو بہت زیادہ توجہ کے ساتھ اسکن کی کیئر کرنی چاہیے جس کی وجہ سے ان کی جلد نرم و ملائم اور جھریوں سے پاک رہے گی کچھ چیزوں کا خیال ضروری ہے مثلاً" ہفتے میں دوبار ڈیپ کلینزنگ کو روٹین بنا لیں اس سے آپ کا چہرہ صاف ستھرا رہے گا پھر فیشل مساج بھی اہم ہے یہ جلد کو نمی اور تازگی فراہم کرتا ہے اس سے بلڈ سرکولیشن میں اضافہ ہوتا ہے یہ ہر ٹائپ کی اسکن کے لیے ضروری ہے لیکن اس کو صحیح ٹیکنک سے کرنا بھی ضروری ہے مثلاً" جب بھی مساج کریم اپلائی کریں تو دونوں ہاتھوں میں کریم لے کر نرمی سے اسٹروک لگائیں ٹھوڑی سے گردن کی طرف پھر کانوں کی طرف لے جائیں، آئی بروز سے ٹمپل کی طرف اور پھر آنکھوں کے حصے پر نرمی سے ہاتھ چلائیے ماتھے پر اوپر کی طرف اور گالوں کے اطراف اچھی طرح سے مساج کریں۔ اس کے لیے مختلف کریم اور آئل موجود ہیں اس کے علاوہ آپ گھر میں بھی ان کی تیاری کر سکتی ہیں۔

ہنی اینٹی رنکل کریم

اس کریم کی مدد سے آپ کا چہرہ نرم و ملائم رہتا ہے جھریوں میں کمی ہوتی ہے۔ یہ خاص طور پر ہونٹوں اور آنکھوں کے گرد بننے والی جھریوں کا سدباب کرتی ہے۔

دودھ	دو چمچے
شہد	ایک چمچہ
سنگل کریم	پانچ چمچے
انڈے کی زردی	1/2

تیاری :

ایک برتن میں بہت ہلکی آنچ پہ دودھ اور شہد مکس کر کے پکائیے جب شہد دودھ میں مکمل طور پر مکس ہو جائے تو اسے ایک برتن میں نکال کر اس میں سنگل کریم اور زردی مکس کر لیں اس طرح سے کہ یکجان ہو جائے پھر ٹھنڈا کر کے ایک بوتل میں بھر لیں اب اسے ان جگہوں پر خصوصی طور پر لگائیے جہاں جھریاں زیادہ ہیں، انگلیوں سے نرمی سے مساج کریں اور رات بھر چھوڑ دیں صبح صاف پانی سے منہ دھو لیں۔

اورنج اسکن فریشنس

چہرے کی کلینزنگ کے بعد اس کا استعمال بہترین ہے یہ ہر طرح کی جلد کے لیے موزوں ہے اس کے استعمال سے آپ کو فیس فریشنس حاصل ہو گا۔

اورنج پیل (تین موسمبیوں کے چھلکے اتار لیں)
ڈیڑھ لیٹر بوائل پانی۔

اب چھلکے کو سلائس کٹنگ کر لیں اور ساس پین میں ڈال کر اس میں پانی ڈال دیں ڈھکن ڈھک کر ہلکے دیں ہلکی آنچ پر تقریباً" دو گھنٹے پکائیں پھر چھان کر ٹھنڈا کر کے بوتل میں بھر کر رکھ لیں۔

میونیز کلینزنگ کریم

اس کریم سے آپ اپنا میک اپ آسانی سے صاف کر سکتی ہیں اور یہ ہر طرح کی اسکن والے استعمال کر سکتے ہیں۔

انڈے کی زردی	ایک عدد
سرکہ	ایک چمچہ
شوگر	1/2 چمچہ
اولیو آئل	آٹھ چمچے

تیاری :

انڈے کی زردی میں سرکہ اور شکر ملا کر جلدی جلدی پھینٹیں جب گاڑھا سا ہونے لگے تو تھوڑا تھوڑا اولیو آئل ملا کر پھینٹتی جائیے جب تک کہ گاڑھا مکسچر نہ بن جائے اب یہ کریم بن جائے گی اسے بوتل میں بھر کر ٹھنڈی جگہ رکھ دیں۔

SMOOTH اسکن کریم

گاجر، لیموں اور اورنج جوس ایک ایک چمچہ اولیو آئل ایک چمچہ، ہنچل دہی 1/2 چمچہ، خمیر کا سفوف ایک چمچہ

پہلے تینوں سبزیوں کا جوس اچھی طرح سے مکس کریں پھر اولیو آئل ملائیے پھر دہی ملا کے اچھی طرح سے مکس کریں پھر اس میں خمیر کا سفوف ملائیے جب ایک اچھا سا مکسچر بن جائے تو چہرے پر لگائیے 15 منٹ بعد پانی سے منہ دھو لیجیے۔

چہرے کے لیے ماسک کی اہمیت

چہرے کی کلینزنگ کے ساتھ چہرے پہ لگانے والے ماسک بھی جلد کی پروٹیکشن کرتے ہیں یہ جلد کو صاف و شفاف کرتے ہیں اور نرمی سے جلد کی بیرونی سطح کو پیل آف کرتے ہیں بلیک اور وائٹ ہیڈ سے نجات دلاتے ہیں Porse ٹائٹ کرتے ہیں لیکن جب بھی ماسک کا انتخاب کریں تو یہ خیال رکھیں کہ آپ کی کون سی skintype ہے اور اس کے لیے مناسب کون سا ماسک رہے گا آپ اپنی صاف ستھری جلد پہ ہفتے میں ایک بار ماسک اپلائی کر سکتے ہیں بس آنکھوں اور ہونٹوں کا حصہ محفوظ رکھیے جب بھی آپ کو پہچان ہو جائے کہ آپ کا فیس کون سی اسکن ٹائپ میں آتا ہے تو پھر ماسک کا انتخاب آپ کے لیے آسان ہو جائے گا جو کہ مختلف پھلوں، پھولوں اور سبزیوں کی مدد سے بھی تیار کیا جا سکتا ہے ہم آپ کو کچھ مختلف قسم کے ماسک بنانا سکھا رہے ہیں۔

گاجر کی مدد سے ایک بہترین ماسک بنائیے

گاجر وٹامن "A" سے بھرپور ہوتا ہے جو کہ حساس جلد کے لیے بہت ضروری ہے۔

گاجر دو عدد، شہد دو چمچے، گاجر کو کش کر کے اس کا جوس نکال لیں اسے شہد میں اچھی طرح سے مکس کریں اب اسے 15 منٹ کے لیے چہرے پہ لگا کر چھوڑ دیں پھر صاف پانی سے چہرہ صاف کریں۔

خشک جلد کے لیے ماسک

کچا آلو کش کیا ہوا ایک چمچہ دہی دو چمچہ دونوں چیزوں کو مکس کر کے چہرے پہ لگائیے۔ 15 منٹ بعد یا چہرے کے سوکھنے کے بعد منہ صاف کر لیں۔

Oily skin کے لیے ماسک

ٹماٹر ایک، لیمن جوس دو چمچہ، لیمن کے چھلکے ٹکڑوں میں دو ٹماٹر کے گودے میں لیمن سلائس کے باریک ٹکڑے اور جوس اچھی طرح سے بلینڈ کر لیں اب چہرے پہ لگا کے 15 منٹ کے لیے چھوڑ دیں پھر منہ دھو لیں۔

کولنگ ماسک

پاؤڈر ملک ایک چمچہ، بادام کا تیل دو چمچہ، گندم کا دلیہ باریک دو چمچہ، صندل کا چورا ایک چمچہ، جو کا پاؤڈر ایک چمچہ آدھا گھنٹہ بھگو دیں پھر تمام اجزا ملا کر پانی سے پتلا کر لیں اب اسے چہرے پہ لگائیں 15 منٹ بعد منہ دھو لیں۔ چہرے کی چمک کے لیے اور پارٹی میں جانے سے پہلے یہ ماسک استعمال کریں۔

☼ ☼

ریحانہ امجد بخاری

مسکراتی کرنیں

رفتہ..... رفتہ

ایک بڑے بزنس مین کا دفتری ملازم اس کے بنگلہ پر پہنچا اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر غمزدہ لہجے میں بولا۔ "بیگم صاحبہ! سیٹھ صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔"

بیگم صاحبہ نے ہلکی سی چیخ ماری۔ چند آنسو بہائے اور جب سنبھل گئیں تو ملازم نے کہا۔ "بیگم صاحبہ! بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے یہ خبر سننے کے بعد جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ویسے سیٹھ صاحب زندہ ہیں۔ دراصل اسٹاک مارکیٹ میں ان کا سارا سرمایہ ڈوب گیا ہے۔ وہ کنگال ہو گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے کہا تھا کہ یہ بری خبر میں آپ کو ایک دم نہ سناؤں..... بلکہ آہستہ آہستہ آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے بعد سناؤں۔"

حریم..... کراچی

چار بیویاں

"میں دیکھ رہا ہوں عاطف! تم آج کل گھر سے زیادہ باہر پھرتے رہتے ہو۔ آخر کیا وجہ ہے؟"

"کچھ نہیں یار عدیل! گھر میں چار بیویوں کی وجہ سے ناک میں دم رہتا ہے اس لیے میں زیادہ تر باہر رہتا ہوں۔"

"تو کیا تمہاری چار بیویاں ہیں؟" عدیل نے پوچھا۔

"نہیں بھئی! ابھی تو میں نے شادی بھی نہیں کی۔ یہ دوسروں کی بیویاں ہیں۔ ایک میرے باپ کی دوسری میرے بھائی کی، تیسری میرے دادا کی اور چوتھی میرے نانا کی۔" عاطف نے جواب دیا۔

رعنا عالم..... کمالیہ سٹی

ایک کشتی کے سوار

ایک دفتر کے ڈائریکٹر دوسرے دفتر کے ڈائریکٹر سے پوچھ رہے تھے۔ "بھئی تم نے اپنی سیکرٹری کو ملازمت سے کیوں نکال دیا؟"

"اسے کسی لفظ کی اسپیلنگ ہی نہیں آتی تھی۔ جب بھی میں کوئی خط ڈکٹیٹ کرانے بیٹھتا تھا' وہ لفظ کی اسپیلنگ پوچھتی رہتی تھی۔" دوسرے ڈائریکٹر نے جواب دیا۔

"یہ تو واقعی بڑا مسئلہ تھا' بار بار کی مداخلت سے تمہیں کوفت ہوتی ہو گی؟" پہلے ڈائریکٹر نے ہمدردی سے کہا۔

"مداخلت کی تو خیر کوئی بات نہیں لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ ہر لفظ کی اسپیلنگ کے لیے ڈکشنری دیکھتا رہتا۔" دوسرے ڈائریکٹر نے بے زاری سے جواب دیا۔

حمیرا سمیع..... بورے والا

علاج

نوجوان مارتھا کے سر میں پہلی بار درد ہوا تو وہ ڈر گئی' سمجھی کہ موت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ وہ بھاگی بھاگی پادری کے پاس پہنچی اور اس نے کہا۔ "فادر! میں مرنے سے پہلے اعتراف کرنے آئی ہوں کہ اب تک میری بارہ لڑکوں سے دوستی رہ چکی ہے۔"

پادری نے کہا۔ "گھر جاؤ اور بارہ لیموؤں کو نچوڑ کر شربت بناؤ اور پی جاؤ۔"

"کیا اس طرح میرے سب گناہ دھل جائیں گے؟" مارتھا نے سوال کیا۔

"نہیں..... ! ان سے تمہارے سر کا درد ختم ہو

جائے گا۔" پادری نے جواب دیا۔

صبا جیلانی..... ٹنڈو الہ یار

حیرت

ایک نوجوان سے اس کے دوست نے پوچھا۔ "جس بدصورت لڑکی سے تم محض دل لگی کر رہے تھے' جب اس کے باپ کے سامنے تم نے شادی کی تجویز رکھی تو اسے حیرت تو ہوئی ہو گی؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "حیرت..... ! ابھی اس کی یہ حالت ہوئی کہ بندوق اس کے ہاتھ سے نیچے گر گئی۔"

نشاط رحیم..... میرپور خاص

معذرت

بحری جہاز میں پہلی مرتبہ سفر کرنے والی ایک خاتون کافی خوفزدہ تھیں۔ چند گھنٹوں کے سفر کے بعد کیپٹن کے پاس پہنچیں اور تشویش زدہ لہجے میں بولیں۔ "اگر سمندر میں اچانک کوئی چٹان جہاز کے سامنے آ گئی تو کیا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں!" کیپٹن نے ملائمت سے کہا۔ "چٹان معذرت کر کے ایک طرف ہٹ جائے گی۔"

ثوبیہ حمید..... کراچی

بوجھ

لفٹ میں ایک ساتھ بہت سے لوگ سوار ہو گئے۔ آپریٹر نے بٹن دبایا لیکن لفٹ اپنی جگہ سے نہ ہلی اس نے درخواست کی کہ کم از کم ایک فرد ضرور لفٹ سے اتر جائے۔

ایک نہایت موٹی خاتون نے ایثار کا مظاہرہ کیا اور لفٹ سے اتر گئیں۔ کئی دوسرے لوگ لفٹ سے باہر اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے۔ آپریٹر نے دوبارہ دبایا تو لفٹ اوپر روانہ ہو گئی۔ موٹی خاتون نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے شرمندگی سے کہا۔ "میرا وزن اتنا زیادہ تو نہیں کہ میری وجہ سے لفٹ رک جاتی۔ دراصل آج میرے ذہن پر بہت زیادہ بوجھ ہے۔"

فوزیہ اسد..... ڈاہرانوالہ

صحیح طریقہ

قرض خواہ نے فون پر ایک شخص سے کہا۔ "کیا آپ آج ہمارا قرض ادا کر رہے ہیں؟"

"ابھی نہیں..... کچھ دن اور انتظار کر لیجیے۔" مقروض نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے..... ! اگر آپ ہمارا قرض ابھی ادا نہیں کریں گے تو میں آپ کے تمام قرض خواہوں سے کہہ دوں گا کہ آپ نے ہماری ادائیگی کر دی ہے۔" قرض خواہ نے اطمینان سے کہا۔

حور العین..... ڈسکہ

آثار قدیمہ

ایک شخص نے اپنے دوست کو بتایا۔ "مجھے ایسی جگہ ملازمت مل گئی ہے' جہاں آثار قدیمہ کی بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔"

"اچھا..... ! وہ کون سی جگہ ہے؟" دوست نے اشتیاق سے پوچھا۔

"مجھے ایک بیوٹی کلینک میں کام مل گیا ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔

ظفرانہ عباس..... کراچی

پبلسٹی

ایک رسوائے عالم کنجوس اپنی زندگی کے آخری ایام میں وصیت نامہ لکھوا رہا تھا۔ اس نے وکیل سے کہا۔ "اور یہ لکھو کہ میرے ہر اس ملازم کو جو پانچ سال سے زیادہ میرے یہاں کام کر رہا ہے۔ میری جائیداد میں سے پانچ ہزار روپے دیے جائیں۔"

جو وکیل وصیت لکھ رہا تھا اس نے متاثر ہو کر کہا۔ "یہ تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔ ایسی سخاوت کی مثال اس دور میں مشکل ہی سے ملے گی۔"

کنجوس رئیس نے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ "سخاوت وخاوت کچھ نہیں ہے یہ تو صرف پبلسٹی کے لیے ہے ورنہ میرے یہاں کوئی ملازم ایسا نہیں جو

ایک برس سے زیادہ عرصے سے کام کر رہا ہو۔"
نسبت زہرا۔۔۔ ہزارہ

مرمت

ایک صاحب کو ورکشاپ کے مالک نے فون کیا۔
"جناب میں کار ورکشاپ سے بول رہا ہوں۔ آپ کی بیگم صاحبہ ابھی ابھی اپنی کار مرمت کے لیے لائی ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔"
ان صاحب نے اکتائے ہوئے لہجے میں بات کاٹ کر کہا۔ "اچھا بھئی جتنے پیسے خرچ ہوں گے، میں ادا کروں گا۔"
ورکشاپ کا مالک بولا۔ "جناب میں کار کی مرمت کے بارے میں بات نہیں کر رہا ہوں، میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ ورکشاپ کی مرمت کون کرائے گا؟"
ناہید منظور۔۔۔ کراچی

قوت ارادی

وہ دوستوں کی کافی عرصہ بعد ملاقات ہوئی۔ ایک نے دوسرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے، کچھ بدلے بدلے نظر آ رہے ہو؟"
"دراصل میں نے شراب، جوا اور عورتوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیا ہے۔" دوسرے دوست نے بتایا۔
"اوہ۔۔۔! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم زبردست قوت ارادی کے مالک ہو۔" پہلے دوست نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ حرکتیں چھوڑنے کے لیے بڑی قوت ارادی کی ضرورت ہوتی ہے۔"
"قوت ارادی کا تو مجھے معلوم نہیں۔۔۔ مجھے تو یہ حرکتیں اس لیے چھوڑنی پڑیں کہ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔" پہلے دوست نے جواب دیا۔
صبا کاشف۔۔۔ لاہور

خصوصیت

ایک انتہائی بدمزاج اور خشک طبیعت آدمی کا انتقال ہو گیا۔ پورے محلے میں انہوں نے کبھی کسی سے ڈھنگ سے بات نہیں کی تھی، نہ کوئی اچھا کام کیا تھا۔ انتقال کے موقع پر لوگ مرنے والے کی اچھائیوں اور خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہیں مگر یہاں پر تمام لوگ خاموش بیٹھے تھے کہ مرحوم نے کسی سے اچھا سلوک کیا ہوتا تو کوئی خوبی بیان کرتا۔
جب سب چپ رہے تو محلے کا حجام ہمت کر کے بولا "مرحوم میں ایک خوبی تھی کہ ان کی داڑھی کے بال سخت نہیں تھے۔۔۔ حجامت آسانی سے بن جاتی تھی۔"
فوزیہ نعیم۔۔۔ ڈہرکی

بنیادی قابلیت

ایک صاحب نے ایک جگہ مجمع لگا دیکھا تو تجسس کی وجہ سے وہ بھی مجمع میں شامل ہو گئے۔ دیکھا بے وقوف سا دکھائی دینے والا ایک شخص مجمع کو اپنے کتے کے کرتب دکھا رہا تھا جو واقعی بڑے حیرت انگیز تھے اور لوگ ان سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے مجمع چھٹنے کے بعد وہ صاحب اس شخص کے پاس پہنچے اور حیرت سے بولے۔
"بھئی تم نے اپنے کتے کو اتنے کرتب کیسے سکھا دیے میں نے تو اپنے کتے کے ساتھ بڑی مغز ماری کی۔ میں تو اسے ایک کرتب بھی نہیں سکھا سکا۔"
سیدھی سی بات ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔
"کتے کو کرتب سکھانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو کتے سے زیادہ کرتب آتے ہوں۔"
فوزیہ ثمروٹ، ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

مجبوری

"ڈاکٹر صاحب! کیا نسوار سونگھنے سے دماغ کو نقصان پہنچتا ہے۔" ایک خاتون نے ڈاکٹر سے پوچھا۔
"نہیں۔" ڈاکٹر بولا۔
"کیونکہ جس کے پاس دماغ ہو گا وہ تو نسوار سونگھے گا ہی نہیں۔"
عینی۔۔۔ مردان

مدیرہ

نامے میرے نام

شمع مسکان۔۔۔ جام پور

اس مرتبہ کرن خلاف معمول لیٹ ملا۔ 17 کی حبس زدہ شام کو کرن کی آمد باد صبا کے خوشگوار جھونکے کی مانند ثابت ہوئی۔ حسب معمول حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد اداریہ پڑھا اور سیدھے پہنچے نامے میرے نام میں جہاں اپنا نام چمکتا دمکتا دیکھ کر سیروں خون بڑھ گیا۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" میں اپنا انتخاب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اگر اس ماہ کے کرن کو میں ایک لفظ میں واضح کروں تو وہ ہو گا "مضطرب نمبر" جی ہاں اس شمارے کی کون سی ایسی اسٹوری تھی۔ جس نے ہماری آنکھیں نم نہ کی ہوں۔ سب سے پہلے بات کروں گی نبیلہ عزیز کے "در دل" کی زری کے ساتھ بہت برا ہوا۔ اس کی شاعری قابل ستائش ہے۔ ایک حیرت کا جھٹکا لگا بتول شاہ کو "زہرہ" کے نام سے پکارا گیا تھا۔ بتول شاہ کی وفات اور دل آور شاہ اور علیزے کے نکاح کے منظر نے ہمیں بھی رلا دیا۔ زری کی شدتیں وہ نہ جانے کیسے سنبھال پائے گی۔ بہت بے چینی بھر دی اس قسط نے دل میں۔
فوزیہ یاسمین کا "دست کوزہ گر" میں خرم ڈفر نے نمل کے ساتھ منگنی ختم کر دی۔ بس فوزیہ جی ہم اپنے نازک دل پر اتنا بار نہیں اٹھا سکتے۔ ویسے ہی آج کل عجیب کلی ہی چھائی ہوئی ہے حالات سے بے قرار ہو کر رسالہ پڑھا تو اس نے ہمارے زخموں پر نمک پاشی کر دی۔
"خواب جلی آنکھیں" کا انجام حسب توقع ہوا چلو عنیقہ جی آپ نے ہمارا بھرم رکھا کہ ارسلان کو اگر کرن نہیں ملی تو میشا نے بھی اسے دھتکار دیا۔ برے کام کا برا انجام۔ اس نے بھی تو کرن کو دھوکہ دیا تھا۔ اب اسے بھی دھوکہ ملا۔ سعد اور کرن کے ملاپ پر خلاف توقع دل میں ڈھیروں سکون اترتا چلا گیا۔
"میرے ہمنوا کو خبر کرو" پر تبصرہ خاطر جمع ہے۔ مکمل ہونے پر کروں گی "وہ اک پری ہے" میں زارا نے صبر اور انتظار کے صحرا میں آبلہ پا سفر کرتے کرتے بھٹکتے بھٹکتے فرشتہ اجل کی دی گئی ردا اوڑھ لی اور پرسکون ہو گئی ہمیشہ کے لیے۔ بہت افسوس ہوا یہ سب پڑھ کر یقیناً "اب فرزان کو فریال ہی ملے گی۔
"اک داستان وفا" میں ذکیہ عباس نے واقعی وفا کی مثال قائم کی مگر دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو میرا خیال ہے کہ اس نے غلط بھی کیا۔ چلو والد اور بھائیوں نے تیمور سے اس کا رشتہ طے نہیں کیا مگر ماں نے تو اس کا نکاح کروایا تھا۔ اللہ کی رضا شاید اس میں تھی کہ ملنا ان کے نصیب میں نہیں تھا مگر ذکیہ صاحبہ نے بھی پھر ان کو بہت دکھ پہنچایا شادی نہ کر کے یہ باتیں ناولز تک تو ٹھیک لگتی ہیں مگر حقیقی زندگی میں بہت دکھ پہنچاتی ہیں۔ ماں باپ کب سکون سے مرے ہوں گے اپنی بیٹی کی سونی اور ویران زندگی دیکھ کر نہ سایہ اور نہ سائبان۔ ویسے یہ میسج اچھا تھا اس ناولٹ کا کہ لڑکیوں کی شادی ایک صحیح اور مناسب عمر میں ہو جانی چاہیے۔ اپنی مادی خواہشات، شہرت اور دولت کے حصول کے خاطر اپنی زندگی کے اہم فریضہ کو پس پشت نہیں ڈالنا چاہیے۔ "گھر ہونے تک" ابھی زیر مطالعہ ہے۔
افسانے سارے ہی سبق آموز تھے مگر پورے ڈائجسٹ میں ایک حرف "الیکشن الیکشن" ایسی تحریر تھی جس نے ہمارے ہونٹوں پر چند لمحے کے لیے مسکان بکھیر دی۔ اجازت چاہتی ہوں اللہ تعالیٰ کرن کو دن دگنی رات چگنی ترقی کرے۔

راشدہ پروین، نجمہ وارث۔۔۔ لالہ موسیٰ

"نامے میرے نام" میں اپنا شائع شدہ خط دیکھ کر ہمیں بہت زیادہ خوشی ہوئی اس لیے دو ماہ بعد ایک دفعہ پھر حاضری لگوا رہی ہوں۔
اس دفعہ کرن کا شمارہ 20 کو ملا اور ہم نے پڑھ کر سب سے پہلے خط لکھنے کی ٹھانی۔ کیونکہ ہمیں عنیقہ جی کے ناول "خواب جلی آنکھیں" کا انتظار تھا۔ واہ واہ عنیقہ جی

آپ نے تو کمال کر دیا ارسلان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا یا اس سے بھی برا اور کرن کو اس کی اچھائی کا بہت اچھا صلہ ملا ہمیں اس کا اختتام بہت اچھا لگا۔

اب باری آتی ہے نبیلہ عزیز کے ناول "دردل" کی جو کہ پہلے تو ہمارا موسٹ فیورٹ تھا مگر اب دل آور شاہ کا کردار بہت بہت زیادہ اوور ہو گیا ہے وہ انسان تو لگتا ہی نہیں (کوئی خلائی مخلوق تو نہیں؟) ہر انسان دنیا میں پرفیکٹ نہیں ہوتا کہ جہاں کچھ برا ہو اور اسے پتا لگ جائے اور وہ جن کی طرح حاضر ہو جائے اور اوپر سے دل آور کا نکاح علیزے کے ساتھ..... بہت افسوس ہوا ہمارے خیال سے نبیلہ جی اس کا جلد از جلد اختتام ہونا چاہیے کیونکہ اس کی طوالت اس کی بوریت میں اضافہ کر رہی ہے۔

باقی ناولٹ اور افسانے مزے کے تھے۔ کیونکہ کرن تو ہوتا ہی سب سے منفرد اور اعلا ہے۔ ہمارے خط کو پلیز پلیز ضرور شامل کیجیے گا۔ ہمیں بہت خوشی ہوگی اگر آپ نے ہمارا خط شامل کر لیا تو اگلے ماہ ان شاءاللہ ہم تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ ہماری آپ سے گزارش ہے کہ ایف ایم 97 کے ڈی جے نعمان صدیقی اور رحمان ملک کا بمع تصویر انٹرویو شائع کر دیں۔

فوزیہ ثمرین..... گجرات

مئی کا شمارہ اس بار بہت مشکل سے ملا۔ عمران صاحب کا شاپ پر چکر لگا لگا کر غصہ سوا نیزے پر تھا۔ موصوف فرماتے ہیں 'میں بینکر ہوں کوئی تمہارا اڈا کیا نہیں۔ سرورق دیکھ کر جتنے منہ کے زاویے بنا سکتی تھی بنائے۔ بھابھی طیبہ کو ماڈل کی معصوم سی مسکراہٹ پسند آئی۔ میں نے کہا اس کی اسمائل میرے جیسی ہے تو طیبہ نے جتنے (واٹ) بل ماتھے پہ ڈال سکتی تھی' ڈالے لو جی بھنوں بندہ سچ وی نہ بولے۔

ہمیشہ کی طرح اداریہ پڑھا رب رحیم محمود ریاض صاحب کی مغفرت فرمائے' سچا اور نیک عمل صدقہ جاریہ ہے اور ان کا یہ عمل تا ابد رہے گا۔ حمد باری تعالیٰ اور رسول مقبولؐ سے دل و دماغ کو معطر کیا۔ انٹرویو بھی اس بار اچھے نہیں لگے پتا نہیں کیوں۔

سب سے پہلے عنیقہ صاحبہ کو پڑھا۔ اینڈ میری توقع کے عین مطابق تھا۔ ارسلان دو کشتیوں کا سوار نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا ارسلان کی والدہ کا فیصلہ بہت اچھا لگا بہن ہونے کا حق ادا کر دیا اگر وہ خود غرض ہوتیں ارسلان کی طرح تو بھی بات ہے بہت دکھ ہوتا ہے۔ ویسے کرن جیسا کردار مثالی تھا اور اس کی والدہ بھی۔ کہانی تک تو ٹھیک تھا مگر ایک منگیتر کی خاطر اتنا کچھ کرنا مجھے کچھ ہضم نہیں ہوا منگنی کوئی پکا مضبوط رشتہ نہیں تھا۔ پر دیکھا جائے تو مصنفہ نے کرن کو سادہ پر خلوص بے غرض دکھایا اور ایسے لوگ دوسروں کی خدمت کر کے خوش ہوتے ہیں۔ حمنہ کا اپنے خاوند کی طرف لوٹنا اچھا تھا۔ اس تحریر نے واقعی دلی خوشی دی ہے۔ ایسی ہی کسی اور تحریر کے منتظر رہیں گے عنیقہ جی۔

"میرے ہمنوا کو خبر کرو" شروع کیا تھا تھوڑا سا بور رنگ لگا پھر آئندہ کی بیچ بھی ساتھ تھی اس لیے ادھورا چھوڑ دیا اگلے ماہ بشرط زندگی دو اقساط اکٹھی پڑھ لوں گی ناولٹ "ایک داستان وفا" اچھی کاوش تھی۔ ان بیٹیوں کے لیے جو اپنے والدین کی خاطر زندگی کی خوشیوں کی قربانی دیتی ہیں مگر کیا کریں۔ ایک چیز ہوتی ہے مقدر اب اس سے کون لڑ سکا کون اس کو ہرا سکا یہ نصیبوں کے فیصلے ہیں۔ سحر نے وقت پہ ایک اچھا فیصلہ کر لیا اور کچھ کو تو فیصلہ کا حق بھی نہیں دیا جاتا۔

"گھر ہونے تک" اچھی کہانی تھی۔ اسی لیے کہتے ہیں دوستی دیکھ بھال کر کرنی چاہیے۔ آپ کی شخصیت کا آپ کے دوست آئینہ ہوتے ہیں شکر ہے عروج کو زوہیب اچھی سوچ کا ملا ورنہ مرد اکثر معمولی معمولی بات کو ساری زندگی لئی کی طرح رگڑتے رہیں۔

افسانے میں مجھے "الیکشن" اچھا لگا۔

"گزارا" ہمارے ہاں ننانوے فیصد عورتیں گزارا ہی تو کر رہی ہیں کبھی اولاد کے لیے کمپرومائز اور کبھی گھر کی چار دیواری کی خاطر اپنا بھرم تو قائم رکھنا ہی ہوتا ہے نا اور ہاں مجھے "چھوئی موئی" تحریر کی سمجھ نہیں آئی۔ ہیرو کا نام عکاشہ کیا مطلب ہے اس کا اور شانزہ نے کیا ضد میں عکاشہ کو چھوڑا؟

امایہ خان کی "واپسی" شکر ہے رائٹر نے کہانی کا اینڈ مثبت انداز میں کیا۔ کیا فضول حرکت ہے ایک شادی شدہ عورت اپنی ماضی کی محبت کی تجدید کرے۔ آنیہ ہمیشہ سے اچھی سوچ رکھتی تھی اسی لیے بھٹکنے سے بچ گئی۔ ورنہ زوہیب نے تو اچھا خاصا آنیہ کا ذہن خراب کر دیا تھا۔

مستقل سلسلے اچھے تھے مجھے نسبت گیلانی کا "بہت رویا" بہت پسند آیا۔ جھٹ سے ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ "یادوں کے دریچے" سے نوشین اقبال' صائمہ جیسی

نے دل خوش کر دیا آپ نے اور پلیز وارث شاہ کا کلام زیادہ سے زیادہ شائع کیا کریں' فرزانہ کا شعر بہت ہی اچھا لگا۔ "مسکراتی کرنیں" حبیبہ جی کیا جدید ٹپ دی ہیں آپ نے لڑکوں کو "نہلے پہ دہلا" ہمیشہ کی طرح لاجواب ہوتا ہے۔ لگتا ہی نہیں یہ 78 کی دہائی کے سوال و جواب ہیں۔

ہاں جی اب آتے ہیں اپنے فیورٹ سلسلے کی طرف نامے میرے نام۔ سب سے پہلے اپنا خط پڑھا۔ ویسے میں اگر خود شاپ پہ ڈائجسٹ لینے جاؤں تو ایک نظر دیکھ کر دل کو تسلی دیتی ہوں ماہدولت کی حاضری لگی ہوئی ہے کہ نہیں سب نے اچھا تبصرہ کیا۔ آنسہ جی دوستی بہت خوب صورت اور ایک ذمہ داری کا جذبہ ہے شاید ہم اچھے دوست بن جائیں آپ میرا سیل فون ادارے سے لے سکتی ہیں۔

عائشہ خان مجھے آپ سے یہ کہنا ہے ہانیہ عمران میری بھتیجی ابھی صرف دو سال کی ہے۔ 24 مارچ کو پورے دو سال کی ہوئی ہے۔ یہ تو میں محبت میں اس کا نام لکھ دیتی ہوں۔ آپ انتظار کریں ٹھیک بیس سال بعد آپ ہانیہ عمران کو بھی کرن میں پڑھیں گی۔

اور ہاں مجھے ایک بات کہنی تھی۔ نامے میرے نام میں جو قارئین بہنیں میرے انتخاب کی تعریف کرتی ہیں ان کا تہہ دل سے شکریہ۔

ثمینہ اکرم..... بہار کالونی' لیاری' کراچی

مئی کے کرن کے لیے میں نے ایک ایک دن گھنٹہ اور ہر منٹ گن گن کر گزارا ہے۔ 15 مئی کو میرا یہ انتظار اختتام پذیر ہوا۔ نہایت بے صبری سے فہرست پر نگاہ دوڑائی مگر یہ کیا..... "مقابل ہے آئینہ" اس مرتبہ فہرست میں شامل ہی نہ تھا۔ قارئین کے لیے جو مستقل سلسلے شروع کیے گئے ہیں وہ کبھی کبھی غیر مستقل کیوں ہو جاتے ہیں؟ پھر دل نا سمجھ کو سمجھایا کہ اگلی بار تو ضرور یہ سلسلہ "مقابل ہے آئینہ" شامل اشاعت ہوگا اور شاید میرا ہی چھپ جائے (ہائے رے یہ خوش فہمی) دراصل میں نے اس سلسلے کے جوابات بہت محنت سے لکھے تھے اور ایک آس تھی کہ شاید پلیز میری یہ محنت ضائع نہ ہو تاحیات آپ کی مشکور رہوں گی۔

اب بات ہو جائے مئی کے شمارے کی تو رائل کلر میں ملبوس نکھری نکھری ماڈل اچھی لگی۔ بلیو کلر کسی پہ اتنا بھی بچ سکتا ہے؟ جبکہ اس ماہ کوئی بھی تحریر قابل ذکر نہ تھی (معذرت کے ساتھ) "خواب جلی آنکھیں" مجھے پہلی ہی قسط سے کچھ خاص پسند نہ آیا۔ تحریر میں پختگی نہ تھی ارسلان اور مہیشا جیسے خود غرض اور مفاد پرست لوگ ہر دور میں پائے جاتے ہیں تو دوسری جانب کرن اور ڈاکٹر سعد جیسے بے غرض اور بے لوث لوگوں کی وجہ سے اس کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ کرن نے ڈاکٹر سعد کا ہاتھ تھام کر اچھا فیصلہ کیا۔

دونوں مستقل ناولز اچھے جا رہے ہیں "دردل" میں دل آور کا نکاح علیزے سے ہو گیا اب بے چاری زری کیا کرے گی جبکہ زری تو دل آور کے عشق میں گوڈے گوڈے ڈوبی ہوئی ہے بتول شاہ کی موت کا بہت دکھ ہوا جبکہ وقار آفندی سے بتول شاہ کا تعلق ہنوز ایک راز ہی رہا۔ "دست کوزہ گر" کہانی ________ کچھ خاص آگے نہ بڑھ پائی۔ اب جو خرم نے انکار کیا ہے تو کہانی کو نیا موڑ ملا ہے..... ورنہ ہر بار قاری اس آس پر کہانی پڑھتا ہے کہ شاید اس بار.....

"وہ ایک پری ہے" قارئین میں کافی پسند کیا جا رہا ہے جبکہ میں نے اب تک نہیں پڑھا اختتام کے بعد اکٹھی سب اقساط ایک ساتھ پڑھوں گی۔

مئی میں بھی اب دکھ کے سوا کچھ نہیں۔ 4 مئی کا دن اب تاحیات میں اپنی خوشی نہ منا سکوں گی کیونکہ 8 مئی کو میرے شہید بیٹے کا جنم دن ہے۔ یہ پہلی 8 مئی گزری اس کی شہادت کے 6 ماہ بعد۔ میں نے معیز کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی اور درس کا اہتمام کرایا تو جناب محمود ریاض صاحب کی مغفرت کے لیے بھی دعا کرائی گئی 10 مئی کو ان کی برسی ہوتی ہے نا۔ اب وہ بھی ہر ہر لمحہ میری دعاؤں میں شامل ہوتے ہیں اللہ حافظ۔

صائمہ..... وگھہ شریف

سب سے پہلے میری طرف سے کرن ٹیم کو محبت بھرا سلام اور بے شمار دعائیں۔ 20 مئی کو کرن ہاتھ لگا' دیکھ کے دل باغ باغ ہو گیا۔ سرورق کی ماڈل بلیو کلر کے ڈریس میں بہت پیاری لگ رہی تھی سب سے پہلے حمد و نعت پڑھیں تمام انٹرویو بہت اچھے لگے۔

ناول میں "دردل" بہت اچھا جا رہا ہے شکر ہے نبیلہ آپی آپ نے کہانی کو تھوڑا آگے بڑھایا میں نے سوچا تھا کہ زری کی شادی دل آور شاہ سے ہو گی پر یہاں سب الٹ ہو

گیا خیر علیزے سے بھی ٹھیک ہے شادی۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ اپنا ایک شعر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھینک یو آپی سوچ۔

آپی میں کرن رسالہ گھر لگوانا چاہتی ہوں پلیز طریقہ کار بتادیں مجھے کسی مہینے رسالہ نہیں ملتا تو بہت دکھ ہوتا ہے۔

مدیحہ حرا..... کراچی

اپنا پہلا خط کرن میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ٹائٹل کا میک اپ بہت اچھا تھا۔ اب آتے ہیں "دردل" کی طرف۔ یہ کہانی اچھی چل رہی ہے مگر ماضی کب کھلے گا؟ بس اب ماضی سامنے لے ہی آئیں۔ شکر ہے "دست کوزہ گر" میں ماضی کھل گیا۔ یہ کہانی بہت زبردست ہے۔ "وہ اک پری ہے" منفرد کہانی ہے "خواب جلی آنکھیں" بس صحیح کہانی ہے۔ اتنی اچھی نہیں لگی۔ باقی سب افسانے اور ناولٹ اچھے تھے۔ اب آخر میں پلیز ماہرہ خان کا انٹرویو شائع کر دیں۔

وثیقہ زہرہ..... فیض پور

کرن ڈائجسٹ میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں اسی امید پر کہ آپ اس پیارے ڈائجسٹ میں ضرور جگہ دیں گے کرن ڈائجسٹ ہر لحاظ سے بہت اچھا ہے جو روشنی کی کرن بن کر اس دنیا میں روشنی بکھیر رہا ہے ہماری دعا ہے کرن یونہی دن بہ دن ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے سلسلے وار ناول دونوں بہت اچھے جا رہے ہیں۔

"دردل" میں پلیز نبیل اور زری کی شادی کروا دیجیے گا "دست کوزہ گر" میں تمل اور خرم کی صلح کروا دیجیے "وہ اک پری" بہت سلو جا رہی ہے پلیز اسے تھوڑا تیز کریں اور کچھ صفحے بڑھا دیں صفحے بہت کم ہوتے ہیں آپی مریم عزیز اور نایاب جیلانی سے مکمل ناول ضرور لکھوائیں ہم ہر ماہ ان کے ناول کا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں ناول اور ناولٹ سبھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔

نبیلہ خٹک..... چوٹالہ

آداب! آپی کیسی ہیں آپ؟ خدا آپ کو صحت کاملہ اور کرن کو مزید ترقی دے۔ آج ہی کرن ملا ہے اس لیے تفصیلی تبصرہ نہیں کرسکوں گی ٹائٹل بہت اچھا تھا ماڈل بھی پیاری تھی نبیلہ عزیز بہت بہترین جا رہی ہیں ویلڈن اینڈ کیپ اٹ اپ باقی سب ناول' افسانے بھی یقیناً" ہر دفعہ کی طرح اچھے ہوں گے۔ آپی میں نے "مقابل ہے آئینہ" میں اپنا انٹرویو بھیجا تھا وہ ابھی تک شامل نہیں ہوا حالانکہ سب سے پہلے میں نے بھجوایا تھا۔ مس عاصمہ' مس اسماء مس عابدہ کے لیے ڈھیروں دعائیں اور سلام' پلیز پلیز شاہد آفریدی کا انٹرویو بمع تصویر شائع کریں۔ زیتی (دیا ملک) مہوش اقرا (کینی) حمیرا تنزیلہ آپی گلشن آپی کے لیے ڈھیر سا سلام۔ خدا حافظ اگر زندگی رہی تو دوبارہ لکھوں گی۔

آصفہ نذیر..... خیرپور

آپی کافی ماہ بعد ہم نے سوچا کہ چلو اپنے پیارے کرن میں اس ماہ حاضری دیتے ہیں سب سے پہلے حمد و نعت پڑھیں اس کے بعد سلسلے وار ناول "دردل" کی طرف بڑھے آپی پلیز اس ناول میں نبیل زری اور دل آور اور علیزے کی جوڑی بنا دیں بچی بڑا مزا آئے گا دوسرا سلسلے وار ناول "دست کوزہ گر" میں تمل اور خرم کی اچھی طرح سے صلح کروا دیں رمیلہ اور عالیان کی جوڑی بھی اچھی ہے پلیز اس جوڑی کو توڑیے گا مت۔

باقی کے ناول ناولٹ افسانے بھی اچھے لگے مستقل سلسلے میں "کرن کرن خوشبو" یادوں کے دریچے' مسکراتی کرنیں' نہلے پہ دہلا' کرن کا دسترخوان' نامے میرے نام اور حسن و صحت بھی اچھے لگے آپی کافی ماہ بعد خط لکھا ہے پلیز ضرور شامل کریں اللہ تعالیٰ سے دعا کہ وہ کرن کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور کرن ٹیم کو صحت و تندرستی دے آمین۔

آنسہ شبیر..... گجرات

تمام ریڈرز اور رائٹرز کو محبتوں بھرا اور چاہتوں بھرا سلام قبول ہو۔ آپی آپ کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ کہ آپ نے میری کاوشوں کو قبولیت سند بخشی خوش ہے۔ کرن 13 کو ملا کرن ہاتھوں میں آیا تو دل بلیوں اچھلنے لگا۔ سکون تب ملا جب نامے میرے نام میں اپنا نام دیکھا۔ اداریہ پڑھا جی واقعی مئی کے تپتے ہوئے دنوں میں کرن نے ٹھنڈک کا احساس دلا دیا۔ حمد و نعت سے دل کو منور کیا۔ صنم جنگ سے ملاقات اچھی رہی۔ بابر خان نے بھی اپنی خوب سنائی اچھی لگی۔

میرا فیورٹ ناول "خواب جلی آنکھیں" عنیقہ جی ویری ویل ڈن زبردست' ارسلان جدھر سے چلا تھا۔ آخر وہی مقام ہی اس کا مقدر ٹھہرا۔ کیونکہ اس نے بچی محبت اور مخلص لوگوں کی قدر نہیں کی۔ میشا کا غرور خاک میں مل گیا۔ اور ہارون کی محبت نے آخر کار حسنہ کا دل زیر کر ہی لیا اور سعد اور کرن کو ان کا اصل مقام مل گیا۔ تمام کرداروں کے ساتھ مکمل انصاف کیا "وہ اک پری ہے" ریحانہ جی ایک بات تو بتائیں اتنی عمدہ شاعری آپ کی اپنی ہوتی ہے یا پھر؟ تبصرے میں ہمیشہ کی طرح فوزیہ کا تبصرہ اچھا تھا۔ ماریہ کا شعر بہت پسند آیا۔ کرن کتاب مئی کا یہ تحفہ میرے دل کو بہت بھایا۔ پتا ہے کیوں مجھے اس کی بہت ضرورت تھی۔ جو آپ نے پوری کر دی جہاں رہیں خوش رہیں خوشیاں بانٹیں۔

فوزیہ سلیم..... چیچہ وطنی (ساہیوال)

کرن کے لیے تبصرہ میں نہیں کر سکی کیونکہ ابھی میں نے پڑھا ہی نہیں! مئی کا شمارہ میرے پاس تو ہے لیکن وقت کی کمی سے پڑھ نہیں سکی! لیکن میں بات کروں گی "دست کوزہ" گر کی جو بہت اچھا جا رہا ہے زوبیہ کا کردار بہت سسپنس پھیلا رہا ہے یہی وجہ ہے اس ناول کی طرف دل خود ہی مائل ہوا اور رومیلہ الیان کا کپل بہت پسند آیا مجھے یہی کپل ناول کی خوبصورتی کو بڑھا رہا ہے ویلڈن فوزیہ یاسمین جی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

اور دوسرا ناول نبیلہ عزیز کا "دردل" نبیلہ عزیز کو میں بہت مبارکباد دوں گی اتنا زبردست ناول مکمل کرنے پر اور نبیلہ جی کیا الفاظ لکھتی ہیں۔ لکھنے کا انداز بہت ہی اچھا اور پیارا ہے سچ میں اس ناول میں میری جان ہے۔

اور کرن کے سارے ہی سلسلے اچھے ہیں مسکراتی کرنیں تو میری فیورٹ ہیں اور مجھے یہ شعر پسند ہے کی تو کیا ہی بات ہے نہلے پہ دہلا تو شروع سے پسند ہے۔

اللہ پاک آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو کامیابیاں اور آسانیاں دے آمین۔

آمنہ امداد..... سرگودھا

امید ہے کہ آپ بالکل ٹھیک ٹھاک اور فٹ فاٹ ہوں گی۔ پہلی بار کرن میں خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے کہ شائع ہو جائے گا' بھئی امید پہ دنیا قائم ہے۔ کرن کا شمارہ بہت انتظار کے بعد ملتا ہے۔ کرن کے تمام سلسلے ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔ چاہے وہ انٹرویوز ہوں یا ناولز' افسانے ہوں یا ناولٹ ہر چیز اپنی جگہ پرفیکٹ ہے۔ میں کرن کو گیارہ سال سے پڑھ رہی ہوں لیکن خط آج پہلی بار لکھ رہی ہوں وجہ نبیلہ عزیز کا ناول "دردل" ہے۔ نبیلہ عزیز کی میں جنون کی حد تک دیوانی ہوں' ان کی کوئی تحریر نہیں چھوڑتی میں۔ دردل کی اس قسط کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ میں اتنی خوش ہوں کہ بتا نہیں سکتی جب سے دل آور شاہ علیزے کا ڈرائیور بنا تھا۔ اس قسط سے مجھے ان کی شادی کا انتظار تھا۔ جو لوگ کہتے تھے کہ اگر دل آور نے علیزے سے نکاح کرلیا تو وہ کہانی پڑھنا چھوڑ دیں گے..... تو وہ لوگ بے شک پڑھنا چھوڑ دیں۔ کہانی اب ان کے مطلب کی نہیں رہی۔ نبیلہ عزیز کو میری طرف سے اتنا اچھا ناول لکھنے پر بے حد مبارک باد۔ کیا میرا ان سے رابطہ ہو سکتا ہے؟

مجھے ستمبر 2012ء کا کرن چاہیے۔ وہ ہمارے شہر سے نہیں ملا۔ اگر میں منی آرڈر بھیج کر منگوانا چاہوں تو کیا مجھے مل جائے گا؟ پلیز ضرور بتا دیں کرن میں نے ابھی پورا نہیں پڑھا آدھا پڑھا ہے اگر پورا پڑھا ہوتا تو تبصرہ کرنے کی ضرور کوشش کرتی۔

21 مئی سے میرے پیپرز شروع ہو رہے ہیں پلیز دعا کیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی حفاظت میں رکھے اور کرن کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے آمین ایک بات اور بتول شاہ کی وفات کا مجھے بہت دکھ ہوا۔ لیکن اس طرح تو ہونا ہی تھا۔ کیونکہ اگر ہنگامی صورت حال نہ ہوتی تو دل آور نے کبھی نکاح نہیں کرنا تھا۔ ہے نا.....؟ اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔

امبر گل..... جھڈو (سندھ)

اس بار مجھے پوری امید تھی کہ کرن 10 تاریخ کو تو لازما" مل جائے گا' کیونکہ 11 مئی کو الیکشن ہیں تو ادارے والے سوچ کر کہ نجانے کیا حالات ہوں ملک کے' تو جلد ہی شائع کر دیں گے' مگر نہ جی کرن موصوف نے تو اپنی درخشاں روایت کو برقرار رکھنا ہی تھا' سو 13 مئی کو ہی جناب کا دیدار ہو سکا۔ ٹائٹل بس نارمل ہی تھا' ہاں کرن کتاب کو اس بار دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔

فہرست پہ نظریں دوڑائیں بشریٰ احمد اور سائرہ رضا کے ناموں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ پھر یاد محمود ریاض پڑھی' نگہت سیما کے لفظوں میں سے جھلکتا درد بذات خود محسوس کیا اور تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کی۔

صنم جنگ اور بابر خان دونوں کے انٹرویوز ٹھیک تھے' مگر پلیز شاہین جی ہماری فرمائش کی طرف بھی اب غور کر ہی ڈالیں آپ' پلیز اینکرز کے انٹرویوز بھی کیجیے نا!

مکمل ناول "دردل" حسب توقع وہی ہوا جس کا اندازہ ہم تب ہی لگا چکے تھے جب منصور حسین کو بحیثیت ڈرائیور اپائنٹ کیا گیا تھا جنابہ علیزے کے لیے' خیر کہانی میں اگر ٹوئسٹ نہ آئیں تو پھر کیا فائدہ ایسی کہانی پڑھنے کا' کچھ یہی بات "دست کوزہ گر" میں بھی دکھائی دے رہی ہے' خیر دونوں مکمل ناولز میری تو تمام تر توجہ اپنی جانب کیے ہوئے ہیں دوسروں کا پتا نہیں!

اب بات ہو جائے کچھ سپرہٹ قسم کی تحریر "الیکشن الیکشن" کی تو جناب سائرہ جی کی تو بھئی میں جتنی بھی تعریف کروں وہ کم ہی ہے کیا کھول کھول کر حقیقت کو بیان کرتی ہیں' بھئی آج کل آپ کا ستارہ عروج پر ہے اور اللہ کرے کہ آپ کے عروج کو کبھی زوال نہ آئے پلیز آپ اپنی نظر ضرور اتار لیا کریں اور خبردار جو آپ ہمیں چھوڑ کر ٹی وی کی طرف گئیں تو ہم آپ سے پکے پکے ناراض ہو جائیں گے' بڑے دنوں بعد تو کوئی اچھی رائٹر ہمیں ملی ہے تو میں تو آپ کو کھونا افورڈ نہیں کر سکتی بھئی' اور ہاں ساون پر ایک تحریر ضرور لکھیے گا پلیز "اک داستان وفا" نے بھی بہت ہی خوب صورت تاثر چھوڑا واقعی ہم لوگ ان گوہر نایاب لوگوں کی اتنی قدر نہیں کرتے جتنا ان لوگوں کا حق ہوتا ہے بہت ہی پیاری تحریر تھی "گھر ہونے تک" بس ایک نارمل تحریر تھی چونکہ بہت پرانا موضوع ہے تو کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔

افسانوں میں چھوٹی موٹی واپسی' گزارا سب اچھے لگے "میرے ہمنوا کو خبر کرو" کچھ دلچسپ تو لگا ہے مگر باقی آئندہ دیکھ کر ہم بھی تبصرہ باقی آئندہ پر ہی چھوڑ دیتے ہیں' کرن کرن خوشبو میں فوزیہ ثمر' نسبت گیلانی' اور ذکیہ کے قطعات اچھے لگے "یادوں کے دریچے" میں' امرتا پریتم! اختر ملک اور سلمان قیصر کی نظمیں اچھی لگیں۔ تبصرے سب کے زبردست تھے۔

انیقہ انا' فوزیہ ثمر بٹ' نوابزادی سولنگی آپ سب کا بہت بہت شکریہ مجھے یاد کرنے اور یاد رکھنے کا' میں نے اپنا سیل نمبر اور ایڈریس ادارہ کرن کو دے دیا ہے آپ تینوں پلیز ریحانہ جی سے رابطہ ضرور کیجیے گا وہ آپ کو دے دیں گی میرا نمبر اور ایڈریس بھی' میں انتظار کروں گی آپ لوگوں کی کالز کا۔

اور اب ریحانہ جی آپ سے کچھ بات ہو جائے' آپ یقین نہیں کریں گی کہ جب میں نے آپ سے بات کی اور آپ نے اتنے اچھے طریقے اور اخلاق سے محبت سے مجھ سے بات کی تو جو خوشی مجھے ہوئی ہے وہ بیان سے باہر ہے تھینک یو سو مچ 'یقیناً" آپ کی پر خلوص دوستوں کی لسٹ میں میرا اضافہ آپ کو بہت پسند آئے گا اینڈ آئم شیور کہ میری پر خلوص محبت کی وجہ سے ایک دن میرا نام آپ کی فرینڈز کی لسٹ میں نمبر ون پہ ہو گا' اب مجھے اجازت دیں اپنا بہت خیال رکھیے گا اور میرے لیے دعا بھی کیجیے گا۔

ثمینہ سحر ثانی..... اوکاڑہ

کرن' شعاع' خواتین کی قاری سے رائٹر کا سفر طے کرنا چاہتی ہوں۔ سمجھ نہیں آتی کیا لکھوں' کیسے اپنے جذبات کا اظہار کروں' یہ تمام میگزین ایک ماں' بہن' بیٹی اور ایک دوست کی طرح ہیں۔ میں جب بھی کسی مسئلے میں الجھی' مجھے اپنے مسئلے کا حل ملا ان رسالوں کو پڑھتے پڑھتے میں دنیا کو جان گئی اس معاشرے کے طور اطوار کو سمجھ گئی۔ دل چاہتا ہے میں بھی ان رسالوں کی رائٹرز کی طرح قلم تھاموں اور لکھتی چلی جاؤں مگر..... ذہن و دل میں کلبلاتے لفظ میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگتے ہیں۔ جانے کس جگہ جا کر چھپ جاتے ہیں بارہا ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتے شاید مجھ میں ہمت کی کچھ کمی ہے۔

اب بھی ڈرتے' ڈرتے ہمت کی ہے کہ شاید اس ناپختہ سی لڑکی کی انگلی تھام کر اسے بھی نکھار دیا جائے اس کے ذہن میں چھپے خیالات کو "کرن" میں ذرا سی جگہ دے دی جائے۔ خیر امید پر دنیا قائم ہے۔ کسی بھی میگزین میں میرا یہ پہلا خط ہے امید کرتی ہوں میری ہمت افزائی کی جائے گی اللہ ادارہ خواتین کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ آمین!

زاہدہ پروین..... سلانوالی (سرگودھا)

کرن' شعاع اور خواتین جب سے ہوش سنبھالا تو اپنے گھر میں آتے دیکھے پھر 7th سے پڑھنے شروع کیے آپی سے چھپ کر پڑھتی تھی نامے میرے نام میں اس لیے شریک ہوتی ہوں کہ یہاں ہمیشہ پڑھنے کو ملا کہ نئے آنے والوں کو خوش آمدید کہا جاتا ہے تو جناب ہم بھی امید لیے آ گئے کہ کسی اور جگہ نہ بھی ملے نئے ہونے کے ناتے یہاں تو مل ہی جائے گی اب دیکھتے ہے امید بر آتی ہے کہ نہیں۔

میں نے کرن' شعاع اور خواتین باقاعدگی سے نومبر 2011ء سے پڑھنا شروع کیا ہے اور 1996ء تک کے بہت سے پرانے رسالے پڑھ چکی ہوں۔

☼ ☼